تالیف

ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحاق بسکوہری

مکتبہ اشاعۃ السنۃ

بسکوہر بازار یوپی

تاریخ تحفظِ سنت

اور

خدمات محدثین

تالیف

ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحٰق بسکوہری

ناشر
مکتبہ اشاعۃ السنۃ، بسکوہر بازار
یوپی

نام کتاب : تاریخ تحفظ سنت وخدمات محدثین

نام مؤلف : ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحٰق بسکوہری

ناشر : مکتبہ اشاعۃ السنۃ، بسکوہر بازار

سنِ طباعت : ۱۴۳۳ھ موافق ۲۰۱۲ء

قیمت : ۳۰۰/روپے

ملنے کے پتے

☆ الکتاب انٹرنیشنل

مرادی روڈ بٹلہ ہاؤس نئی دہلی۔۲۵، فون: 011-26986973

☆ الہدیٰ پبلیکیشنز

۴۰۹، اردو مارکیٹ، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔۶، موبائل: 9999029389

☆ مکتبہ فیضان

دکان نمبر۲، بلال پارک، نزد شاہین اپارٹمنٹ، کوسہ ممبرا، تھانہ۔۴۰۰۶۱۲

فہرست

باب دوم : تحفظ سنت کی علمی خدمات

باب سوم : تحفظ سنت کی دفاعی خدمات

باب چہارم : حدیث رسول کی تشریحی خدمات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

إن الحمدلله، نحمده ونستعينه ونستغفره۔ ونعوذبالله من شرور أنفسنا ومن سيآت أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادى له، وأشهد أن لاإله إلا الله، وأشهدأن محمدا عبده ورسوله۔ ﴿ يا أيها الذين آمنوا اتقوالله حق تقاته ولا تموتن إلا وأنتم مسلمون ﴾ (آل عمران : ١٠٢)

﴿ يا أيها الناس اتقوربكم الذى خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا كثيرا ونساء، واتقوالله الذى تسآء لون به والأرحام إن الله كان عليكم رقيبا ﴾ (النساء : ١)

﴿ يا أيها الذين آمنوا اتقوالله وقولوا قولا سديدا، يصلح لكم، أعمالكم ويغفرلكم ذنوبكم ومن يطع الله ورسوله فقد فاز فوزا عظيما ﴾ (احزاب : ٧١)

أمابعد

اللہ رب العالمین نے مسلمانوں کو جو شریعت عطا کیا۔ وہ دائمی اور ابدی شریعت ہے۔ لہٰذا اس کو تا قیامت باقی رکھنے کے لیے اس کے شایان شان اس کی حفاظت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ رب العالمین نے اپنے اس پسندیدہ اور کامل شریعت کی حفاظت کی ذمہ داری بذاتِ خود لیا اور یہ وعدہ کیا کہ ﴿ إنا نحن نزلنا الذكر وإناله لحافظون ﴾ (الحجر : ٩) ہم ہی نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

دین وشریعت کے حفاظت کی ذمہ داری سب سے پہلے انبیاء ورسل کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان کے اصحاب پر آتی ہے۔ ان سے بہتر نہ تو دین وشریعت کو کوئی سمجھ سکتا اور نہ ہی عمل کر سکتا ہے اور نہ ہی ان سے بہتر کسی کو اس سے لگاؤ اور الفت ہو سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جتنے انبیا و رسل آئے ان کے مددگاران کے اصحاب ہوا کرتے تھے۔ وہی نبی کی سنتوں پر عمل کرتے تھے اور اوامر کا اتباع کرتے تھے۔ (۱)

معلوم ہوا کہ اصحابِ رسل ہی دین کے اصل نگہباں و پاسباں ہوتے ہیں۔ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام بھی اس نظام کے پابند ہوئے۔ چنانچہ یہی وہ دین کے مددگار ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اس دین کو سمجھا، اس پر عمل کیا، بعد میں آنے والے لوگوں تک پہنچا دیا۔ اس طرح محافظِ اول ہونے کا حق ادا کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس کا حکم بھی دیا تھا اور بعد میں آنے والوں کی تعریف بھی کی تھی۔ آپ نے فرمایا "فلیبلغ الشاھد منکم الغائب فرب مبلغ اوعی لہ من سامع" (۲) موجود لوگ غیر موجود لوگوں تک میری باتیں پہنچا دیں کیونکہ بہت سے پہنچائے گئے ایسے لوگ ہوں گے جو سننے والوں سے زیادہ بہتر حفاظت کریں گے۔

بعد میں آنے والے حضرات نے اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔ محدثین عظام، علماء امت نے جن کو نبی کے علم کی وراثت کا شرف حاصل ہوا اس دین کی حفاظت میں جٹ گئے۔ اور وہ انتظام کیا جس کو دیکھ کر انسان انگشت بدنداں ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس کے لیے وہ قربانیاں دیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ پوری زندگی اس کے لیے وقف کر دیا۔ دنیا کے گوشہ گوشہ کی خاک چھان ڈالی۔ بحر و بر، خشک و تر کو عبور کیا۔ دنیا کی لذتوں، عیش و آرام سے منہ موڑ لیا۔ والدین، اعزا و اقربا کو خیر باد کہا۔ ان کی بس ایک ہی تڑپ تھی وہ یہ کہ رسول کا لایا ہوا نظام گھر گھر اپنی اصل شکل میں پہنچ جائے۔ جن لوگوں نے جس زمانے میں بھی اس کو داغ دار بنانے کی کوشش کی ان کا منہ توڑ جواب دیا۔ ان کے شکوک وشبہات کو رفع کیا۔ ملاوٹ کرنے والوں کی گرفت کی۔ کم فہموں کو فہم عطا کیا۔ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج بھی دین اسلام بالکل ویسے ہی تر و تازہ ہے جیسے ابتدا میں تھا۔

---

(۱) مسلم (۵۰)، مسند احمد (۱/۴۵۸، ۴۳۷۹)

(۲) بخاری (۱۰۴)، مسلم (۴۴۶)

تحریف وتبدیل سے بالکل پاک صاف خالص نظام الٰہی موجود ہے۔

اس کھلی ہوئی حقیقت کے باوجود موجودہ دور میں مسلمانوں کی بعض جماعتیں وافراد جو عمل میں کوتاہ اور فہم میں خواہش پرستی کا شکار ہیں، انتہائی بے شرمی اور ڈھٹائی سے سنتِ رسول کی پامالی کرتی ہیں، ان کا بیمار ذہن سنت نبوی کے ذخیروں پر اعتماد نہیں کرتا۔ دین اسلام کی معرفت کے لیے طاغوتی طاقتوں کے پروردہ مستشرقین کو اپنے لیے اسوہ ونمونہ سمجھتا ہے۔ اس تحریفی ٹولہ کے تحریروں کو تحقیق اور ان کی باتوں کو علم کی انتہا مانتا ہے۔

ان کی دینی حمیت اور غیرت پر ملحدانہ ذہنیت اور مغرب کی مرعوبیت نے قبضہ جما لیا ہے۔ یہ دین کی بیخ کنی میں دانستہ یا نادانستہ طور پر لگے ہوئے ہیں۔ اپنے آپ کو ان کے سامنے مجبور اور بے بس کر لیا۔ کیونکہ ان کا مبلغ علم یہی ہے۔ اپنے آباء واجداد کی علمی وراثت سے ان کا کوئی ناطہ نہ رہ گیا۔ صحابہ کرام سے لے کر محدثین عظام اور ائمہ کرام نیز علماء امت نے جو اصول وضوابط عطا کیا، حفاظت دین اور حفاظت سنت کے لیے جو خدمات انجام دیا اس سے بے بہرہ، لاپرواہ اور غفلت کا شکار ہے۔

حالانکہ سنت رسول کی حفاظت کے لیے جو بے مثال قربانیاں پیش کی گئیں اور جو اصول وضوابط متعین کیے گئے، جو علمی کاوشیں منظر عام پر آئیں، جو عملی خدمات ہوئیں اس کی ادیان عالم کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ جس کو دنیا کا ہر منصف تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ آج جو بھی علوم دنیا میں پائے جاتے ہیں حقیقت میں انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آج کی دنیا اسی کا خوشہ چیں ہے، یہ الگ بات ہے نام بدل کر نسبت بھی بدل لیا ہے۔ جو بھی انسان خصوصاً امت اسلامیہ کا جو بھی فرد اس کو سمجھنا چاہتا ہے بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے آباء واجداد کے علمی ذخیروں پر اقوام عالم نے قبضہ کیا اور ہم نے اس سے منہ موڑ لیا۔ یورپ کی بڑی بڑی لائبریریاں آج انھیں علوم سے مزین ہیں جن کو دیکھ کر ایک مومن کا دل تڑپ جاتا ہے۔ شاعر مشرق نے اس کی جانب یوں اشارہ کیا ہے ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی جو دیکھا ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

آج ہم نے علم کو دین و دنیا کے نام پر تقسیم کر دیا ہے۔ اپنے آپ کو مدرسوں کی چہار دیواری میں محصور کر لیا ہے۔ کچھ کتابوں کا چند ابواب پڑھا کر اس پر قناعت کیے ہوئے بیٹھے ہیں۔ سندوں پر سندیں عطا کی جاتی ہیں پھر بھی مسجدوں سے عابد ویراں، مدرسوں سے عالم ناپید ہیں۔ لیکن ہم بزعم خویش ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ فروع واقسام کی کمی نہیں، کامیابیوں کا شمار نہیں۔

مسلمانوں کی دولت کتاب وسنت کی تعلیم کے نام پر بے تحاشہ خرچ ہو رہی ہے۔ لیکن نصاب تعلیم علوم سنت سے بالکل خالی، ایک آدھ کتاب اگر اصولِ حدیث کا پڑھا دیا تو بہت ہو گیا۔ پھر بچے اندھیروں سے اجالوں میں کیسے آئیں، دین اسلام کی دفاعی کوششوں کو کہاں سے سمجھیں؟ میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان میں بڑے سے بڑے اداروں میں دفاعِ سنت سے متعلق کوئی پروگرام ہے جس کی تعلیم دی جاتی ہو۔ عللِ حدیث کی گتھیاں سلجھانے کا گُر بتایا جاتا ہو۔ صحابہ کرام اور راویانِ حدیث پر توجہ دلائی جاتی ہو، جرح وتعدیل کے دقیق اصولوں کی معرفت حاصل کرائی جاتی ہو۔ مصادرِ حدیث وعلومِ حدیث کی نوعیت اور طریقۂ استفادہ کی مشق کرائی جاتی ہو، تاریخِ سنت کی ورق گردانی ہوتی ہو۔ بعض ارباب مدارس نے کچھ توجہ ضرور کی ہے جو بالکل ناکافی ہیں۔

اپنی اس تالیف میں جس کا نام ''تاریخ تحفظِ سنت اور خدماتِ محدثین'' رکھا ہے۔ صحابہ کرام، ائمہ دین اور محدثین عظام کی ان بے مثال خدمات کی ایک جھلک پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ''مشتے از خروارے'' کا نمونہ ہے، مَیں اس میں کس حد تک کامیاب ہوں وہ تو قارئین کرام ہی بتا سکتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ انشاء اللہ کتاب کا مطالعہ کرنے سے ان کوششوں کا ایک خاکہ دماغ میں اُبھرے گا اور کچھ نہ کچھ معلومات ضرور میسر ہوگی۔ مجھ کو اپنی بے بضاعتی کا برملا اعتراف ہے۔ مستقل وقت دے کر کتاب تالیف کرنے کا موقع نہ مل سکا بلکہ وقتاً فوقتاً حسبِ فراغ معلومات اکٹھا کیے گئے ہیں اس لیے تنظیم وترتیب میں خلل، روابط میں ملل یقیناً ہوگا۔

معلومات مصادر اصلیہ وفرعیہ سے لی گئی ہیں جن کا حوالہ حاشیہ میں مذکور ہے۔ کتابوں کی طبعات کا فرق ہوسکتا ہے فتح المغیث اور نزھۃ النظر جامعہ سلفیہ بنارس کا نسخہ مستعمل ہے، مقدمہ ابن الصلاح (علوم حدیث) مکتبہ علمیہ مدینہ کا نسخہ، بخاری کے لیے شیخ محمد فواد عبدالباقی کی ترقیم کا نسخہ جو فتح الباری کے ساتھ مطبوع ہے، ابوداؤد کی روایتوں پر حکم لگانے کے لیے مجلس علمی دارالدعوۃ کا اردو ترجمہ کا نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں عموماً ترقیم والے نسخے مستعمل ہیں، الرسالۃ المستطرفہ دارالکتب العلمیہ کا نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔

کتاب ایک مقدمہ اور چار ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

پہلا باب : تحفظِ سنت کی عملی خدمات

دوسرا باب : تحفظِ سنت کی علمی خدمات

تیسرا باب : تحفظِ سنت کی دفاعی خدمات

چوتھا باب : تحفظِ سنت کی تشریحی خدمات

اہل علم قارئین سے درخواست ہے کہ اپنے تنقید وتبصرہ، علمی صلاح اور مشوروں کے عطا کرنے میں پس وپیش نہ کریں۔

اللہ رب العالمین سے دعا ہے کہ میری اس حقیر کوشش کو قبول فرما کر اسے امت اسلامیہ و برادران اسلام کے لیے مفید بنائے۔ آمین۔

والحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ علی محمدوعلی آلہ وصحبہ أجمعین۔

ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحٰق بسکوہری

۲۹ / ۲ / ۱۴۳۳ھ

موافق ۲۲ / ۱ / ۲۰۱۲ء

باب اول

تحفظِ سنت کی عملی خدمات

سنت رسول ﷺ

(معنی ومفہوم)

رسول کریم ﷺ کی سنت، آپ کا اسوہ، آپ کی سیرتِ مقدسہ، آپ کی ذاتِ گرامی ہر مسلمان کے لیے دنیا ومافیہا سے بہتر ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتو وہ اپنے ایمان میں خلل ونقص محسوس کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "لا یومن أحدکم حتی أکون أحب إلیه من والده وولده والناس أجمعین" (۱) ''تم میں کا کوئی آدمی مومن نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ، بیٹے اور سارے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔''

لہٰذا ہر مؤمن جس کا ایمان کامل اور مضبوط ہوتا ہے اس کو رسول ﷺ کی ذات گرامی سے اور آپؐ کی سنت وسیرت سے بڑی محبت اور گہرا لگاؤ ہوتا ہے، وہ سنتِ رسول ﷺ کو اپنی زندگی کا مقصد اور اپنی کامیابی وکامرانی کا ضامن سمجھتا ہے، اور سمجھنا بھی چاہیے، کیونکہ جو دل حب سنت نبوی ﷺ سے خالی ہو وہ دل حقیقت میں مردہ ہے، اور جس کا دل مردہ ہوجائے تو اس کی زندگی سے موت بہتر ہے، جس دل میں رسول ﷺ کی اور آپؐ کی سنت وسیرت کی محبت گھر کرجائے تو دوسروں کی محبت اس پر غالب بھی نہیں آسکتی۔

ہر مومن صادق، سنت نبوی پر مر مٹنے کا جذبہ رکھتا ہے، اس کا سینہ حب نبی اور حب سنت نبی سے معمور وسرشار ہوتا ہے، آپ کی اور آپ کی سنت وسیرت کی تخفیف، اور اس کی توہین برداشت نہیں کرسکتا، سنت کے راستہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ٹھوکریں مارتا ہے، اس پر عمل کرنا اور کرانا اپنے لیے باعث نجات وسعادت سمجھتا ہے، اور کیوں نہ ہو یہی تو اللہ کا حکم ہے ﴿ لقد کان لکم

---

(۱) بخاری کتاب الایمان (۱۵)، مسلم (۴۴)

فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیرا ﴾ (احزاب : ۲۱) اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں یقیناً اسوہ ونمونہ ہے، ان لوگوں کے لیے جن کو اللہ سے ملاقات کی امید اور قیامت کے دن پر ایمان ہے۔

لہٰذا آپ کی سنت پر عمل کرنا جزء ایمان ہے۔ اس کی پرواہ اسی کو ہے جو اللہ پر قیامت پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، معلوم ہوا کہ رسول ﷺ کی سنت وسیرت کی مخالفت کرنے والا دائرہ ایمان سے خارج ہوتا ہے، یہ بالکل واضح اور کھلی ہوئی بات ہے۔

آیئے سب سے پہلے سنت کا معنیٰ ومفہوم سمجھیں۔

سنت کا لغوی معنی :

سنت کا لغوی معنی ہے : راستہ اور طریقہ، خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ سُنن بھی سنت کے معنیٰ میں ہوتا ہے، علامہ جوہری فرماتے ہیں کہ : السَنن : الطریقۃ، یقال استقام فلان علی سنن واحد، أی علی طریقۃ واحدۃ (۲)

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ السنۃ : الطریقۃ ، والسنن ایضاً (۳)

علامہ ابن منظور فرماتے ہیں کہ : "السنۃ : السیرۃ حسنۃ کانت أوقبیحۃ" ''سنت طریقہ کو کہتے ہیں خواہ وہ اچھا ہو یا برا'' قرآن کریم میں مختلف مقامات پر سنت طریقہ کے معنیٰ میں مستعمل ہے، چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے : ﴿ وما منع الناس أن یؤمنوا إذ جاء ھم الھدی ویستغفروا ربھم إلا أن تاتیھم سنۃ الأولین أویاتیھم العذاب قبلا ﴾ (کہف : ۵۵) نیز ہر وہ طریقہ جس کو کوئی جاری کرتا ہے اور بعد میں آنے والا اس پر عمل کرتا ہے تو اس کے لیے بھی لفظ سنت کا استعمال ہوتا ہے، اور کہا جاتا ہے : "ھو الذی سنہ" (۴) اس نے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے۔

---

(۲) لسان العرب ۱۳/۲۲۶

(۳) النھایۃ فی غریب الحدیث ۲/۴۱۰ یعنی سنت طریقہ کو کہتے ہیں اور سُنن بھی اسی معنی میں آتا ہے۔

(۴) لسان العرب (۱۳/۲۲۵)

قرآن کریم میں اور بھی آیتیں ہیں جس میں سنت طریقہ کے معنی ہی مستعمل ہے، مثلاً ﴿قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الأرض﴾ (آل عمران : ۱۳۷) ﴿ وإن یعودوا فقد مضت سنة الأولین﴾ (انفال : ۳۸)

سنتِ رسول میں بھی یہ کلمہ طریقہ کے معنی میں مستعمل ہے چنانچہ آپؐ نے فرمایا: کہ "من سن فی الاسلام سنة حسنة فعمل بها بعد کتب له مثل أجر من عمل بها" (۵)

علامہ ابن منظور فرماتے ہیں کہ "وإذا اطلقت فی الشرع فانما یراد بهاما أمر به النبی صلی اللّٰه علیه وسلم أو نهی عنه وندب إلیه قولا و فعلا ولم ینطق به الکتاب" (۶) شریعت میں جب سنت کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد، رسول کے اوامر ونواہی اور مندوبات ہوتے ہیں جو قرآن کریم میں موجود نہ ہوں۔

علامہ ابن اثیر جزری فرماتے ہیں کہ ''حدیث رسول ﷺ میں لفظ سنت اور اس سے مشتق ہونے والے کلمات کا استعمال بکثرت ہوا ہے جس کا اصلی معنی سیرت اور طریقہ ہے، اور جب شریعت میں مطلق استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد رسول کے وہ اوامر ونواہی اور مندوبات ہوتے ہیں جو قرآن میں موجود نہیں، انہیں استعمالات میں سے یہ حدیث بھی ہے: "إنما أنسیّ لأسن" یہ بھی ممکن ہے کہ یہ "سننت الإبل" سے ماخوذ ہو، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اونٹ کی پرورش و پرداخت اچھی طرح سے کی جائے۔'' (۷)

علامہ ازہری فرماتے ہیں کہ سنت صرف سیدھے اور پسندیدہ راستہ ہی کو کہتے ہیں، اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ "فلان من أهل السنة، یعنی من أهل الطریقة المحمودة المستقیمة" (۸) فلاں اہلسنت میں سے ہے یعنی سیدھے اور قابل تعریف راستہ پر ہے۔

---

(۵) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۶/۲۲۶)

(۶) لسان العرب (۱۳/۲۲۵)

(۷) النہایۃ فی غریب الحدیث (۲/۴۰۹-۴۱۰) نیز ملاحظہ ہو لسان العرب (۱۳/۲۲۵)

(۸) تاج العروس (۹/۲۴۴)

لیکن کتاب وسنت اور عام استعمال سے جو مطلق طریقہ کے معنی میں ہے اس کی تردید ہوتی ہے "فلان من أهل السنة" سے لغوی معنی نہیں مراد ہے بلکہ شرعی مفہوم مراد ہے، جو "فلان من أهل البدعة" کا ضد ہے۔

سنت : چہرے کی صفائی اور چکناہٹ کو بھی کہا جاتا ہے نیز مطلق چہرے کے معنی میں بھی مستعمل ہے اسی طرح سے طبیعت اور عادت کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ (۹)

سنت کا عام شرعی معنی :

لفظ سنت کا ایک عام شرعی مفہوم ہے جس کی وضاحت ابھی گزر چکی ہے اور بقول ابن اثیر جزری اور ابن منظور : سنت رسول اللہ ﷺ کے اوامر ونواہی اور مندوبات کو کہا جاتا ہے، جو قرآن کریم میں موجود نہ ہوں، ادلہ شرعیہ میں کتاب وسنت اسی معنی میں مستعمل ہوتا ہے یعنی قرآن وحدیث۔ یہ سنت کا عام مفہوم ہوسکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ اس معنی میں مستعمل ہو، سنت اہل علم کے یہاں مختلف معانی میں اصطلاحی طور سے استعمال کیا گیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

سنت کا اصطلاحی معنی :

اصطلاحی اعتبار سے مختلف اصحاب علوم نے اپنے اپنے حساب سے اس کی تعریف کی ہے۔

محدثین کی تعریف :

اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال، آپ کے افعال، تقریرات، پیدائشی واخلاقی صفات، کو سنت کہا جاتا ہے۔

اس طرح سے یہ حدیث کا مترادف کلمہ ہے، لہذا محدثین کے یہاں جو معنی سنت کا ہے وہی معنی حدیث کا ہے۔

---

(۹) لسان العرب (۱۳/۲۲۶)، ترتیب القاموس المحیط (۲/۶۳۳)

شرح تعریف :

قول : سے مراد آپ کی وہ باتیں ہیں جن کو آپ نے مختلف مقامات پر حسب ضرورت فرمایا ہے جیسے "إنما الأعمال بالنیات" عمل کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ (۱۰)

"صلوا کما رأیتمونی أصلی" جیسے مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے ویسے پڑھو۔ (۱۱)

فعل : سے مراد آپ کے وہ کام ہیں جن کو آپ نے کیا خواہ وہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے یا اخلاق وکردار سے، جن کو صحابہ نے دیکھا اور دوسروں تک پہنچایا جیسے نماز، روزہ مناسک حج، بیع وشراء شادی بیاہ وغیرہ۔

تقریر : سے مراد صحابہ کے وہ اقوال وافعال ہیں جن کی اطلاع آپ ﷺ کو ہوئی، آپ ﷺ نے اس پر رضا پر دلالت کرنے والی خاموشی اختیار کی یا تبسم فرمایا، یا تائید وپسندیدگی کا اظہار فرمایا، مثلاً غزوہ قریظہ کے موقع پر آپ نے فرمایا : کہ کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں، کسی نے راستہ میں پڑھ لی، کسی نے بنو قریظہ پہنچ کر پڑھی، لیکن آپ نے کسی کو کچھ نہیں کہا بلکہ دونوں کی تحسین کی۔ (۱۲)

غزوہ ذات السلاسل کے موقع پر حضرت عمرو بن عاصؓ نے حالت جنابت میں فجر کی نماز پڑھادی، شکایت سننے پر آپ ﷺ مسکرانے لگے۔ (۱۳)

اسی طرح آپ ﷺ کے دسترخوان پر حضرت خالد نے گوہ (سوسمار) کھائی، آپ ﷺ ان کو دیکھتے رہے لیکن حرام نہیں کہا، بلکہ یہ کہا کہ میرے یہاں نہیں پایا جاتا ہے، اس لیے میں نہیں کھاتا، وغیرہ۔ (۱۴)

آپ ﷺ کی تائید وخاموشی سے اس کو وہ مقام حاصل ہوگیا گویا کہ آپ ﷺ نے کہا اور کیا ہے۔

---

(۱۰) بخاری (۱)، مسلم (۱۹۰۷) (۱۱) بخاری الاذان (۶۳۱) وغیرہ۔

(۱۲) بخاری (۹۰۴، ۳۸۹۳) مسلم (۱۷۷۰)

(۱۳) سنن ابوداؤد (۳۳۵) وسندہ صحیح (۱۴) بخاری (۵۲۱۷) مسلم (۱۹۴۵)

پیدائشی صفات : آپ ﷺ کے جسم مبارک کی خوبیاں، ساخت سے متعلق باتیں مثلاً گھنی داڑھی اور بڑے بال، درمیانہ قد والا ہونا۔

اخلاقی صفات : آپ کے کردار، اخلاق کریمانہ اور معاشرتی خوبیوں کا ذکر ہو جیسے صادق وامین، فیاض وکریم ہونا۔

فقہاء کی تعریف :

شریعت کے وہ احکامات جو رسول سے ثابت شدہ ہوں، لیکن وہ فرض وواجب نہ ہوں، گویا کہ احکام خمسہ میں سے سنت ''واجب'' کے بالمقابل ہوتا ہے۔

بعض مالکیہ کے یہاں سنت وہ ہے جس کو رسول نے لوگوں کے سامنے ظاہر کر کے اس پر مداومت کی ہو۔

اصولیین کی تعریف :

قرآن کریم کے علاوہ وہ چیزیں جن کا صدور رسول سے ہوا ہو، جو حکم شرعی کے لیے دلیل بننے کی صلاحیت رکھتی ہو، خواہ وہ قول ہو، یا فعل ہو، یا تقریر ہو۔

علماء وعظ وارشاد کی تعریف :

ہر وہ چیز جس کا ثبوت رسول سے ہو خواہ وہ قرآن ہو یا حدیث۔

ایسی صورت میں یہ بدعت کے بالمقابل ہوتی ہے۔ (۱۵)

سبب خلاف :

سنت کی تعریف میں اہل علم کے اختلاف کی اصل وجہ سنت رسول ﷺ سے ان کے مقاصد کا اختلاف ہے، جن حضرات کو سنت رسول ﷺ کی ضرورت جس حیثیت سے پیش آئی، اسی اعتبار سے انہوں نے اس کی تعریف کی۔

محدثین کا مقصد نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کے ہر ہر گوشہ کو بحیثیت قدوہ ونمونہ اجاگر کرنا تھا، لہٰذا انہوں نے اپنی تعریف میں اقوال، افعال، تقریرات، اخلاق وکردار سیرت، شمائل،

---

(۱۵) الحدیث والمحدثون ص ر ۱۰

نیز آپ کی جانب منسوب ہر چیز کو اس تعریف میں شامل کر لیا جو آپ کے بارے میں منقول ہے، خواہ اس سے کوئی حکم ماخوذ ہو یا نہ ہو۔

جب کہ فقہاء کا مقصد رسول کی ذات سے متعلق اقوال وافعال وتقریرات سے احکام شرعیہ کا استنباط تھا، لہٰذا انہوں نے اس حیثیت سے بحث کی کہ ان میں سے کون سے شرعی احکام نکلتے ہیں، اور ان میں سے کون واجب ہے کون حرام، کون مباح لہٰذا انہوں نے اس ناحیے سے سنت کی تعریف کی۔

علماء اصول کو آپ کی ذات گرامی سے بحیثیت شارع جنہوں نے مجتہدین کے لیے اصول وضوابط متعین کیا، گفتگو کی، لہٰذا انہوں نے صرف ان اقوال وافعال وتقریرات کو قابل اعتنا سمجھا جو بحیثیت ادلہ شرعیہ، احکام شرعیہ کو ثابت کرتے ہیں۔ (۱۶)

جب کہ علماء وعظ وارشاد کا مقصد شارع کے اوامر ونواہی پر توجہ دلانا تھا لہٰذا انہوں نے اس کو بدعت کے مقابلہ میں استعمال کیا۔

محدثین کی تعریف عام ہے جب کہ فقہاء واصولیین اور واعظین کی تعریف خاص ہے، ہر فن میں کسی بھی اصطلاح کو اسی اصطلاحی معنی میں رکھنا چاہیے جس کو اس فن کے علماء نے ذکر کیا ہے تاکہ خلط مبحث نہ ہو، یہاں پر سنت سے مراد محدثین کی تعریف ہے نہ کہ دیگر اہل علم کی۔

سنت کا اطلاق کبھی کبھی صحابہ کے افعال پر بھی ہوتا ہے جس کا استعمال اہل علم نے کیا ہے، خواہ وہ قرآن کے مطابق ہو یا سنت رسول کے یا صحابہ کا اجتہاد ہو، مثلاً جمع مصحف، تحریر حدیث، جمع قراآت وغیرہ، حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اسی مفہوم کی جانب اشارہ ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهديين" میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔ (۱۷)

---

(۱۶) حجیۃ خبر الواحد ص ر ۵۲، السنۃ قبل التدوین ص ر ۱۵

(۱۷) ابوداؤد، کتاب السنۃ (۴۶۰۷) ترمذی (۲۶۷۶) وقال حسن صحیح۔ مسند احمد (۴/۱۲۷) الحاکم فی المستدرک: ۱/۹۵-۹۶ وصححہ ہو والذہبی ولہ طرق)

مقام سنت

رسول اللہ ﷺ کی سنت سے مراد یہاں وہ سنت ہے جس کو محدثین نے بیان کیا ہے، محدثین کی تعریف جامع اور شامل ہے، اور یہاں اس اعتبار سے مناسب بھی ہے کہ اس میں آپ کی زندگی کے سارے گوشے شامل ہوجاتے ہیں، چونکہ آپ کی ذات مبارکہ سارے مسلمانوں کے لیے قدوہ ونمونہ ہے اس لیے کہ اللہ کا فرمان ہے ﴿لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة﴾ (احزاب : ۲۱) ''یقیناً تمہارے لیے رسول کی زندگی اسوہ ونمونہ ہے۔''

لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر گوشہ کو آپ کی زندگی سے منور کریں، پیدائش سے لے کر وفات تک ایمانی زندگی کا خاکہ یہیں سے متعین ہوتا ہے، آپ نے زندگی کے ہر گوشہ سے متعلق اسوہ ونمونہ چھوڑا ہے، اور ہدایتیں دی ہیں، عقائد وعبادات، حقوق ومعاملات ہی نہیں بلکہ معیشت، سیاست، معاشرت، ذاتی وعائلی زندگی ہر جگہ رہنمائی کی ہے۔

یہ اسوہ اس امر کا متقاضی ہے کہ آپ کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے رسول کی اطاعت وفرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر فرض قرار دیا ہے، آپ سے روگردانی کو بغاوت اور جرم قرار دیا ہے حتیٰ کہ دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے، آپ کی اطاعت وفرمانبرداری کو اللہ کی رضا کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، بغیر رسول کی اطاعت کے اللہ کی خوشنودی نہیں مل سکتی۔ ﴿قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله﴾ (آل عمران : ۳۱) کہہ دیجیے اگر حقیقت میں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو۔

آپ کی اطاعت وفرماں برداری، آپ کی سنت وسیرت کا مقام، اس کی اہمیت وحیثیت، قرآن کریم، سیرت رسول، اسوہ صحابہ، اجماع امت، تقاضائے ایمان، عقل وخرد ہر طرح سے ثابت شدہ ہے۔

لہٰذا ہر مسلمان پر اس کی عظمت ووقار اس کے مقامِ عالی کو تسلیم کرنا فرض عین ہے۔

سنت قرآن کی نگاہ میں :

اللہ رب العزت نے آخری رسول محمد رسول اللہ ﷺ پر آخری جامع کامل اور پسندیدہ شریعت نازل فرمائی، جس کو چالیس سال کی عمر میں عطا کرنا شروع کیا اور امت کو یہ حکم دیا کہ رسول کی اطاعت وفرمانبرداری کریں، اسی قرآن میں تقریباً چالیس مقامات پر مختلف انداز سے رسول کی اطاعت وپیروی کو واجب اور ضروری قرار دیا ہے، بصورت دیگر مجرم اور دائرہ اسلام سے خارج مانا ہے۔

قرآن کریم نے سنت رسول کو جو مقام دیا ہے وہ عظیم تر اور متنوع ہے۔اس میں آپ کی عطا کی ہوئی ہر چیز کو قبول کرنے کا حکم دیا ہے، کہیں رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ جوڑ کر آپ کی مخالفت کو فتنہ سے تعبیر کیا اور دردناک عذاب کی دھمکی دی ہے، تو کہیں آپ کے مقام ومنصب کو بیان کیا ہے، آپ کی سنت کو ''تعلیم کتاب'' اور ''تعلیم حکمت'' سے تعبیر کیا ہے۔کہیں آپ کے اقوال وافعال کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ قرار دیا ہے، تو کہیں شریعت کا منبع ورشد وہدایت کا مرکز بتایا ہے اور کہیں قرآن کریم کی شرح اس کی وضاحت اور بیان کا محور قرار دیا ہے۔

اب ہماری ذمہ داری ہے کہ بحیثیت مسلمان آپ کے اقوال وافعال، سنت وسیرت کے مقام کو سمجھیں اور اپنی زندگی میں اس کو برتنے کی کوشش کریں، سنت رسول کی عطر بیزی سے اپنے دل ودماغ کو معطر کریں، اپنے عقیدہ اور ایمان کی اصلاح وتجدید کرکے اس کی روشنی سے اپنی زندگی کو منور کریں، اس سلسلے کی قرآنی آیتوں کو ''سنت رسول کی دینی حیثیت'' میں ملاحظہ کریں۔

سیرت کی نگاہ میں :

جس طرح قرآن کریم نے رسول کی اطاعت اور آپ کی سنت کے ماننے کو واجب اور ضروری قرار دیا ہے، اسی طرح قرآن کی تفسیر اور بیان جو آپ نے اپنی سنت اور سیرت سے کیا ہے، اس میں بھی آپ کی اطاعت کو واجب اور ضروری قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ آپ نے فرمایا: کہ "صلوا کما رأیتمونی أصلی" جیسے مجھ کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھو ویسے تم بھی ادا کرو۔ (۱) "خذوا عنی مناسککم" مجھ سے اپنے حج کا طریقہ سیکھ لو۔ (۲) نیز آپ نے دین وشریعت کو کہہ کر بتا دیا اور کر کے دکھا دیا، ساتھ ہی ساتھ اطاعت کا حکم دیا اور نافرمانی کے انجام سے آگاہ کیا، فتنہ انکار سنت کے خدشے کا اظہار کیا، جس میں ایسے لوگوں سے براءت اور بے زاری کا اظہار بھی ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ "لا الفین أحدکم متکئا علی أریکته یاتیه الأمـــر ...... " (۳) ہرگز ہرگز میں نہ پاؤں تم میں سے کسی فرد کو اس حال میں کہ وہ اپنے گاؤ تکیہ (تخت) پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا ہو، اس کے پاس میرے اوامر میں سے کوئی حکم آئے جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے، یا جس سے منع کیا گیا ہے تو وہ یہ کہہ دے کہ میں یہ سب نہیں جانتا مجھ کو جو کتاب اللہ میں ملے گا، صرف اسی کی اتباع کروں گا۔

ایسا کہنے والا تم کو پالتو گدھا، درندے اور پنجہ والے پرندے کھلا دے گا جو حرام ہیں۔

آپ اپنے ہر خطبے میں یہ بات ذہن نشین کراتے تھے اور بار بار اس پر توجہ دیتے تھے کہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ سنتِ رسول کا ہونا ضروری ہے۔ " فإن خیر الحدیث کتاب اللّٰه وخیر الهدی هدی محمد صلی اللّٰه علیه وسلم " (۴) اسی کا مظہر ہے یعنی یقیناً بہترین بات کتاب اللہ کی ہے اور بہترین ہدایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے۔ نیز آپ نے ایک واقعہ کے پس منظر میں یہ عظیم ہدایت دی تھی کہ "فمن رغب عن سنتی فلیس منی" (۵) جو میری سنت سے اعراض کرے گا اس کا تعلق مجھ سے نہیں ہے۔ یعنی سنت رسول سے بے رغبت ہو کر اپنی سمجھ سے عمل کرنے والے کا تعلق رسول سے نہیں ہوتا ہے۔ عرباض بن ساریہؓ کی مشہور روایت ہے جس میں آپ نے انتہائی مؤثر اور پردرد خطبہ کے بعد اُمت کو جو وصیت کی تھی وہ ہر مسلمان کے

---

(۱) بخاری (۶۳۱) (۲) مسلم (۱۲۹۷)

(۳) ابوداؤد (۴۶۰۵) ترمذی (۲۶۶۳)، وقال حسن صحیح۔ مسند احمد (۱/ ۲۵۲)

(۴) صحیح مسلم (۸۶۷) (۵) بخاری (۴۷۷۶) مسلم (۱۴۰۱)

لیے نقش راہ ہے۔

آپ نے فرمایا تھا کہ "علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین" (٦) میری سنت اور خلفائے راشدین کے طریقوں کو لازم پکڑو!

نیز آپ ﷺ نے فرمایا "میں تمہارے درمیان ایسی دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں جس کو تم اگر پکڑے رہو گے، (اس کے مطابق عمل کرو گے) تو کبھی گمراہ نہ ہو گے وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔ (٧) یعنی جس طرح کتاب اللہ کا ماننا ضروری ہے اسی طرح سنت رسول کا ماننا ضروری ہے، نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "إذا نهیتکم عن شيء فاجتنبوه، وإذا أمرتکم بشيء فأتوا منه ما استطعتم" (٨) جب میں تم لوگوں کو کسی بھی چیز سے منع کروں تو فوراً رک جاؤ، اور جب کسی کام کے کرنے کا حکم دوں تو جتنا ممکن ہو اس پر عمل کرو۔ لہٰذا جب آپ ﷺ نے سنت کے انکار سے منع کیا ہے تو فوراً اس سے رک جانا چاہیے یہی مومن کا شیوہ ہے۔

صحابۂ کرام کی نگاہ میں :

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو کتاب وسنت کے اولین مخاطب، ان کے سبب نزول وسبب ورود کو سب سے بہتر جاننے والے، ان کے معنی ومفہوم کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے، جن کے ایمان کو اللہ نے معیار قرار دیا ہے، جن سے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ حدیث رسول کو اپنی زندگی میں بسایا، ہر ضروری معلومات کے لیے قرآن کے بعد اسوہ رسول پر اعتماد کیا اور اس پر عمل کیا۔

صحابہ کرامؓ کس طرح اس ترتیب کو سمجھتے تھے مندرجہ ذیل واقعہ سے واضح ہے، حضرت

---

(٦) ابوداؤد (٤٦٠٧)، ترمذی (٢٦٧٦)، وقال : حسن صحیح، ابن ماجہ (١٤٤)

(٧) حاکم (١/٩٣) حاکم نے غریب اور امام ذہبی نے لہ اصل فی الصحیح۔ نیز ابو ہریرہ سے بھی اس طرح مروی ہے جس میں یہ اضافہ ہے کہ یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر آئیں۔
امام مالک نے بلاغاً موطا میں ١/٨٩٩ پر روایت کیا ہے۔

(٨) بخاری (٧٢٨٨)، مسلم (١٣٣٧)

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب جدہ کے وراثت کا معاملہ پیش ہوا تو انہوں نے جواب دیا کہ کتاب اللہ میں تمہارا کوئی حصہ مذکور نہیں، "وما علمت لک فی سنة رسول الله شیئا" (۹) اور تمہارے لیے سنت رسول میں میرے علم کے مطابق کچھ نہیں ہے۔

اور جب بعض صحابہ نے یہ تصدیق کر دی کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جدہ کو (سدس) چھٹا حصہ دیا ہے، تو آپ نے اس کو نافذ کر دیا، اس کی خبر دینے والے مغیرہ بن شعبہ اور تصدیق کرنے والے محمد بن مسلمہ تھے۔

اور جب بعض لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انحراف کیا تو آپ نے فرمایا کہ : خدا کی قسم اگر لوگ اس رسی کو بھی دینے سے انکار کریں گے جو رسول اللہ کے زمانے میں دیتے تھے تو میں ان سے اس کے لینے کے لیے جہاد کروں گا۔ (۱۰) نیز فرمایا کہ "لست تارکا أمرا کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یعمل به" (۱۱) میں وہ کام نہیں چھوڑ سکتا جس کو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔

اللہ اللہ قربان جائیے صدیق کے دل میں سنتِ رسول کا کیا مقام تھا!

حضرت اُسامہؓ کے لشکر کے روانگی کے سلسلے میں رسول کی وفات کے بعد صحابۂ کرام نے یہ مشورہ دیا کہ حالات کی نزاکت یہ ہے کہ اُسامہ کے جھنڈے کو اُتار دیا جائے اور ان کو لشکر کشی کے لیے مدینہ سے باہر نہ جانے دیا جائے، تو صدیق اکبر کا برملا جواب تھا "ما کان لی أن أحل لواء عقده رسول الله" (۱۲) جس جھنڈے کو رسول ﷺ نے باندھا ہے میں اس جھنڈے کو ہرگز نہیں کھول سکتا۔ قحافہ کے بیٹے کو سب کچھ گوارہ ہے مگر یہ گوارہ نہیں کے رسول کا حکم کالعدم ہو جائے۔

---

(۹) مالک فی الموطا (۲/ ۵۱۳)، ترمذی فی الفرائض (۲۱۰۰)

(۱۰) بخاری (۶۸۵۵) مسلم (۳۲)

(۱۱) بخاری (۲۹۲۶) (۱۲) تاریخ دمشق ۲/ ۶۰

حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کے پاس ایک خط تحریر کیا جس سے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام کس قدر اپنی زندگی میں سنت رسول کی تلاش کرتے تھے، انہوں نے فرمایا: "اقض بما فی کتاب اللّٰہ ، فان لم یکن فبسنة رسول اللّٰہ" (۱۳) کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کرو، اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ کی سنت دیکھو۔

رجم زانی کے تعلق سے آپ (حضرت عمرؓ) نے فرمایا تھا کہ ممکن ہے جب زمانہ طویل ہو جائے (یعنی دورِ رسول سے دوری زیادہ ہو جائے) تو لوگ سنتِ رسول کو چھوڑ کر صرف کتاب اللہ کو دلیل بنائیں اور رجم کا انکار کر دیں۔ یاد رکھو اللہ کے رسول نے رجم کیا اور آپ کے بعد ہم نے رجم کیا، اگر تم اس کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ (۱۴)

نیز حضرت عمرؓ کا موقف یہ تھا کہ عورت شوہر کی دیت سے کچھ بھی حصہ نہیں پائے گی لیکن جب اشیم ضبابی کے واقعہ سے سنتِ رسول کا پتہ چلا تو فوراً رجوع کر لیا۔ (۱۵)

ایسے ہی ملک شام جاتے ہوئے مقام ''سرغ'' سے عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی مرفوع روایت سن کر واپس ہو گئے جس میں یہ ہدایت تھی کہ طاعون زدہ شہر میں نہ جاؤ۔ (۱۶)

حضرت علیؓ سنتِ رسول کے ایک مجموعہ کو ہمیشہ اپنے ساتھ تلوار کی میان میں رکھتے تھے۔ (۱۷)

نیز شراب پینے والے پر کوڑا لگانے کے سلسلے میں یہ فرمایا کہ "کل سنة وھذا أحب الی" (۱۸) یعنی چالیس یا اسّی کوڑے لگانا سب سنت ہے لیکن رسول نے چالیس کوڑے لگایا ہے اس لیے میرے نزدیک وہی محبوب ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذؓ سے جب سوال کیا تھا کہ کس بنیاد پر فیصلہ کرو گے تو

---

(۱۳) نسائی فی السنن (۲۳۱/۸)، ووکیع فی اخبار القضاء (۱۸۹/۲-۱۹۰)

(۱۴) بخاری (۶۴۴۱) (۱۵) سنن ابوداؤد (۲۹۲۷) سند صحیح ہے۔

(۱۶) صحیح بخاری (۵۳۹۷) مسلم (۲۲۱۹) (۱۷) بخاری (۱۱۱، ۲۸۸۲) مسلم (۱۳۷۰)

(۱۸) مسلم (۱۷۰۷)

انہوں نے جواب دیا تھا کہ اللہ کی کتاب سے، آپ نے کہا : " فان لم تجد قال : فبسنة رسول الله" (۱۹) اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟ انھوں نے کہا کہ سنتِ رسول سے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول وفعل سے یہ بالکل واضح ہے کہ وہ سنت رسول ﷺ پر عمل کو، کتاب اللہ پر عمل تصور کرتے تھے، ایک مرتبہ انہوں نے "لعن الله الواشمات" کی حدیث سنائی، یعنی اللہ تعالیٰ نے گودنا گودوانے والی عورت پر لعنت بھیجی ہے، اس کی اطلاع ایک خاتون خانہ ام یعقوب کو ہوئی تو انہوں نے ان پر نکیر کیا، ابن مسعودؓ نے فرمایا : کہ جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت بھیجی ہے اور وہ کتاب اللہ میں موجود ہے تو میں اس پر لعنت کیوں نہ بھیجوں، اس نے کہا کہ میں نے پورا قرآن پڑھا ہے اس میں یہ بات جو آپ کہہ رہے ہیں کہیں نہیں ہے، انہوں نے جواب دیا اگر غور سے پڑھی ہوتی تو ضرور ملتا کیا اس میں یہ موجود نہیں ﴿ وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا ﴾ (حشر : ۷) جو کچھ رسول تم کو دیں اس کو لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رُک جاؤ۔ اس نے کہا بالکل موجود ہے، انہوں نے فرمایا کہ جب اس میں یہ موجود ہے تو سن لو کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس سے منع کیا ہے (اور قرآن میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جس سے منع کریں رک جاؤ گویا یہ بھی قرآن میں موجود ہوا) (۲۰)

معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ نے سنت رسول کی یہی حقیقت اور اہمیت سمجھی تھی اور اسی کو انہوں نے اپنے شاگردوں تک منتقل کیا تھا، اس طرح پورا ماحول ومعاشرہ اس حقیقت سے آشنا تھا کہ سنت کے بغیر کوئی چارا نہیں، مزید تفصیل کے لیے دیکھیے۔ (۲۱)

---

(۱۹) سنن ابوداؤد (۳۵۹۲)، علامہ البانی نے ضعیف کہا ہے۔ روایت پر اور اہل علم کا کلام ہے لیکن معنی کی تائید موجود ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے قول میں گزر چکا۔

(۲۰) بخاری (۴۸۸۶) (۲۱) دراسات فی الحدیث النبوی (۱/۱۵-۲۰)

ائمہ دین کی نگاہ میں :

ائمہ دین کی جو حیثیت اور اُن کا جو مقام ہے وہ کسی پر مخفی نہیں۔ اللہ کا فرمان ہے

﴿وجعلنا منهم أئمة يهدون بأمرنا لما صبروا وكانوا بآياتنا يوقنون﴾ (سجدہ : ۲۴)

ائمہ دین میں ائمہ اربعہ کی شہرت ان کو تعارف سے بے نیاز کر دیتی ہے، انھوں نے ملت کی جو رہنمائی فرمائی ہے، اُن پر جو احسان کیا ہے وہ نا قابل فراموش ہے۔

سنتِ رسول کے بارے میں اُن کی ہدایتیں اور اُن کے فرمودات پر اُن کے متبعین عمل کر لیں تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُمت ان کے فرمودات پر جو بنیادی اور اصولی ہیں قطعاً توجہ نہیں دیتی۔ اپنی خواہشات پر عمل کر کے اپنی نسبت ان ائمہ کرام کی جانب کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے ہم کو جو ضابطہ دیا ہے وہ "إذا صح الحديث فهو مذهبي" ہے۔ یعنی جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی ہمارا مذہب ہے۔ (۲۲)

آپ کے اس قول سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو آپ کو تمام حدیثیں معلوم تھیں اور نہ تمام حدیثوں کی صحت کا علم تھا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ "ما من أحد إلا وهو مأخوذ من كلامه ومردود عليه إلا رسول الله صلى الله عليه وسلم" (۲۳) یعنی رسول اللہ ﷺ کے علاوہ ہر کسی کا قول قابل عمل اور قابل ترک دونوں ہو سکتا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "إذا صح الحديث فهو مذهبي" (۲۴) میرا مذہب صحیح حدیث پر عمل کرنا ہے۔ نیز فرمایا کہ اگر میرا قول حدیثِ رسول سے متعارض ہو تو میرے قول کو دیوار پر پٹک دو۔

---

(۲۲) ردالمختار (۱/۱۶۷)، ایقاظ الھمم ص/۸۹ مطبوعہ امرتسر

(۲۳) حجۃ اللہ البالغہ (۱/۱۵۷)

(۲۴) حجۃ اللہ البالغہ (۱/۱۵۷)

امام احمدؒ کا فرمان ہے کہ "نہ میری تقلید کرو نہ مالک اوراوزاعی کی نہ نخعی کی نہ کسی اور کی بلکہ احکام وہیں سے لو جہاں سے اُنھوں نے لیا ہے" یعنی کتاب وسنت سے۔ (۲۵)

یہ ائمۂ اربعہ کے فرمودات ہیں جن کو کھلے دل سے قبول کرنے کی ضرورت ہے انھوں نے سنت کے مقام اوراس کی عظمت کوواضح کر کے اپنی ذمہ داری ادا کردی ہے۔

اب ہماری اورآپ کی ذمہ داری ہے کہ ہم ان فرمودات کوبغیر کسی خارجی دباؤ کے کھلے دل سے قبول کرلیں۔

اجماع امت :

امت محمدیہ کا جوسب سے پہلا طبقہ ہے وہ صحابہ کرامؓ کا ہے، صحابہ کرامؓ کا اس امر پر اجماع تھا کہ سنت رسول پر عمل کرنا واجب اور ضروری ہے جس طرح قرآن پر عمل کرنا واجب اور ضروری ہے، کسی سے اس کے خلاف کوئی اورقول منقول نہیں، اس لیے کہ ان کو بہت اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اللہ اوراس کے رسول ﷺ کا یہی حکم ہے، لہٰذا انھوں نے سنت پر ویسے ہی عمل کیا، جیسا کہ قرآن پر کیا۔ (۲۶)

پھر صحابہ کے بعد تقریباً پوری امت کا اتفاق اس پر برقرار رہا، کسی کو اس سے سرتابی کا مجال نہ تھا، یہ الگ بات ہے کہ کچھ بدعتی فرقوں نے اثبات سنت کے طریقہ پر کلام کیا۔ (۲۷) حتیٰ کہ معتزلہ جن کے بارے میں انکار حدیث کی نسبت کی جاتی ہے بحیثیت فرقہ وجماعت ان کا بھی ترک سنت پر اتفاق نہیں تھا اگر کسی نے کچھ کہا ہے تو وہ اس کی ذاتی رائے تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری امت کا گذشتہ ادوار سے آج تک اس امر پر اتفاق ہے کہ سنت رسول ﷺ کا قبول کرنا واجب اور ضروری ہے، اوراس کو مصدر تشریعی کی حیثیت حاصل ہے۔ (۲۸)

---

(۲۵) حجۃ اللہ البالغۃ (۱/۱۵۷)

(۲۶) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے المختصر الوجیز فی علوم الحدیث عجاج خطیب ص ۳۳

(۲۷) دراسات فی الحدیث النبوی (۱/۲۰)

(۲۸) دراسات فی الحدیث النبوی (۱/۲۴)

ایمان کا تقاضہ :

عقیدہ رسالت پر ایمان لانا منجملہ ایمان کا ایک اہم رکن ہے، اس کے بغیر کوئی شخص دائرہ اسلام میں آ ہی نہیں سکتا، اللہ کا فرمان ہے : ﴿یاأیها الذین آمنوا آمنوا بالله ورسوله والکتاب الذی أنزل علی رسوله﴾ (نساء : ۱۳۶) ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اس کے رسول پر نازل کی گئی ہے، نیز فرمایا کہ : ﴿فآمنوا بالله ورسوله النبی الأمی﴾ (اعراف : ۱۵۸) اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر ایمان لاؤ۔''

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے ایمان کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے جواب میں کہا تھا کہ "أن تؤمن بالله وملائکته وکتبه ورسله" (۲۹) اللہ پر اس کے فرشتوں پر، کتابوں پر اور رسولوں پر ایمان لاؤ۔''

رسول پر ایمان لانے کا جو لازمی نتیجہ ہے وہ یہی ہے کہ رسول کی ہر بات کو خواہ وہ کتاب کی تلاوت کی شکل میں ہو، یا تعلیم کی شکل میں ہو یا حکمت کی شکل میں ہو، خواہ وہ قرآن ہو یا قرآن کا بیان ہو ہر ایک کا ماننا اور قبول کرنا ضروری ہے، ورنہ اگر آپ کی اطاعت نہ کی جائے، اور آپ کی دی ہوئی چیزوں کو قبول نہ کیا جائے تو رسول پر ایمان لانے کا کچھ مطلب ہی نہیں، جس طرح قرآن پر ایمان لانے کا تقاضہ یہ ہے کہ جو کچھ قرآن دے، اس کو قبول کیا جائے، اسی طرح رسول پر اور آپ کی رسالت پر ایمان لانے کا تقاضہ یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہیں اس کو قبول کیا جائے۔

عقل وخرد کا تقاضہ :

عقل وخرد کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ جب ہم نے رسول کو رسول تسلیم کر لیا تو ان کی دی ہوئی چیزوں کو قبول کرنا چاہیے، ورنہ رسول کو، رسول ماننے کا کوئی مطلب ہی نہیں، اور نہ قرآن کے بیان وتفسیر کا کوئی مطلب ہوا، نہ آپ کے اسوہ ونمونہ، اور آپ کے فیصلہ کا کوئی مطلب ہوگا۔

---

(۲۹) بخاری (۵۰) مسلم (۱)

خود قرآن کا اثبات سنت کے وجود اور اس کے اثبات سے منسلک ہے، ورنہ آپ ﴿ اقرأ باسم ربک الذی خلق ﴾ (علق : ۱) جو قرآن کی پہلی آیت ہے اس کو پڑھیں، اس میں کون سی دلیل ہے کہ اس کا نزول رسول پر ہوا ہے اور یہ اللہ کا حکم ہے، جب تک آپ رسول کے سابقہ حالات و واقعات اور غار حرا میں آپ کی گوشہ نشینی اور اللہ کی عبادت کا پس منظر نہ قبول کریں، رسول نے نبوت سے پہلے کی جو کیفیت بتائی ہے اس کو نہ مانیں جبریلؑ کی آمد اور آپ کا یہ کہنا کہ میں غار حراء میں محو عبادت تھا اتنے میں اللہ کا فرستادہ آیا اس نے مجھ کو بھینچا اور کہا "اقرء" میں نے کہا "ما أنا بقاری" وغیرہ پھر اس کا ذکر حضرت خدیجہؓ سے کرنا، خدیجہؓ کا ورقہ کے پاس جانا، ورقہ کی تصدیق و تائید اور آپ کو تسلی دینا۔ (۳۰)

اگر یہ سب کوئی نہ مانے پھر کہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی ہے، تو بتایئے کہ اس سے قرآن کا اثبات کیسے ممکن ہے؟

ہر ذی ہوش اتنا ضرور عقل و خرد رکھتا ہے کہ اگر وہ خارجی دباؤ سے ہٹ کر سوچے، تو ضرور حق اور ناحق واضح ہو جائے گا۔ واللہ ولی التوفیق

خلاصہ کلام یہ کہ عظمتِ سنت، کتاب وسنت، عمل صحابہ، اقوال ائمہ، اجماعِ اُمت، عقل وخرد ہر طرح سے ثابت شدہ ہے۔

اس دین وشریعت کے تعلق سے ہر ایک کا دائرہ متعین ہے اللہ نے عطا کیا، رسول نے پہنچایا اور اس کی وضاحت کر دی، اب ہماری ذمہ داری ہے کہ آپ کی اطاعت وفرمانبرداری کریں اپنے دل و دماغ کو آپ کی سنت وسیرت سے منور کریں، اور اسی کی روشنی میں اپنی زندگی سنواریں۔

---

(۳۰) صحیح بخاری (۳)

سنتِ رسول کی دینی حیثیت

شریعت کی نگاہ میں سنت رسول کو جو اصولی اور بنیادی حیثیت دی گئی ہے اس کو اگر ضوابط کے دائرے میں لایا جائے تو اس کی چار اہم حیثیتیں اُبھر کر سامنے آتی ہیں جن کو مندرجہ ذیل عناوین میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) وجوبی حیثیت

(۲) تنزیلی حیثیت

(۳) تشریعی حیثیت

(۴) تفسیری حیثیت

یہاں ان حیثیتوں کا سمجھ لینا انتہائی ضروری ہے تاکہ مقامِ سنت کی تفصیلی وضاحت ہوجائے۔

(۱) وجوبی حیثیت :

اللہ رب العالمین نے سنت رسول کو قبول کرنا، اُس کو تسلیم کرنا ہر مسلمان کے لیے فرض عین قرار دیا ہے، اس کے بغیر کوئی بھی شخص صاحب ایمان نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ﴿ وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا ﴾ (حشر : ۷) جو کچھ رسول تم کو دیں اس کو قبول کرو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ، خواہ آپ کا دینا قول سے ہو، فعل سے ہو یا سکوت و رضامندی سے ہو، سیرت و سلوک کے ذریعہ ہو، یا اخلاق و عادات کے ذریعہ ہو ہر ایک کا قبول کرنا واجب اور ضروری ہے۔

رسول نے جو فیصلہ کیا اور جس کا حکم دیا، جس سے منع کیا اس سے سرتابی درست نہیں، اس کو

من وعن بغیر چوں وچرا قبول کرنا ضروری ہے، اللہ کا فرمان ہے ﴿ وما کان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمرا أن يكون لهم الخيرة من أمرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا ﴾ (احزاب : ۳۶) ''اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ کسی معاملہ میں آ جانے کے بعد کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کے لیے کوئی اختیار باقی نہیں رہتا، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ کھلا ہوا گمراہ ہے۔''

نافرمانی اور سرکشی کی بدترین تاریکیوں میں بھٹکنے والا شخص تباہی و بربادی کے عمیق غار سے گزرتا ہوا عذاب الیم کی اتھاہ گہرائیوں میں سما جائے گا۔ ﴿ فليحذر الذين يخالفون عن أمره أن تصيبهم فتنة أو يصيبهم عذاب أليم ﴾ (نور : ۶۳) ''جو لوگ رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو اس سے ڈرنا چاہئے کہ کہیں ان کو فتنہ یا عذاب میں نہ مبتلا کر دیا جائے۔''

لہٰذا رسول (سنت رسول) کی مخالفت کرنے والوں کو آگاہ ہونا چاہیے کہ وہ کسی فتنہ یا دردناک عذاب میں مبتلا ہو کر رہیں گے، اس لیے ضروری ہے کہ رسول کی سنت کو دل و جان سے قبول کیا جائے آپ کی اطاعت کی جائے، آپ ہی کی اطاعت پر اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کا دارومدار ہے، جو شخص اطاعت سنت کو چھوڑ کر سیدھے اللہ اور قرآن سے رابطہ جوڑتا ہے، وہ اللہ تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک رسول اور آپ کی سنت کا وفادار نہیں بنتا، قرآن کی نگاہ میں نامرد غداروں میں شمار ہوتا رہے گا۔ ﴿ من يطع الرسول فقد أطاع الله ﴾ (نساء : ۸۰) ''جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی'' یعنی جس نے رسول کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

قرآن نے مومنین کی صفتِ خاص اطاعت وفرمانبرداری کو قرار دیتے ہوئے اس کو کامیابی کا راز بتایا ہے۔ ﴿إنما كان قول المومنين إذا دعوا إلى الله ورسوله ليحكم بينهم أن يقولوا سمعنا وأطعنا ﴾ (نور : ۵۱) جب مومنین کو اللہ اور اس کے رسول کی جانب فیصلہ کے لیے بلایا جاتا ہے تو وہ سنتے اور اطاعت کرتے ہیں۔

یہ اطاعت وفرمانبرداری آپ کی زندگی میں اور وفات کے بعد ہمیشہ واجب اور ضروری ہے، اللہ کا فرمان ہے ﴿ فإن تنازعتم فی شیء فردوہ إلی اللہ والرسول﴾ (نساء : ۵۹) اگر کسی معاملہ میں آپس میں اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی جانب لوٹا دو، اگر حقیقت میں اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان ہے تو، یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔

اختلاف کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول کی جانب لوٹانے ہی میں بھلائی ہے، خواہ وہ اختلاف کسی بھی قسم کا ہو، ملی ہو یا مسلکی، ذاتی ہو یا جماعتی، فروعی ہو یا بنیادی، اخلاقی ہو یا سیاسی، عقیدہ سے متعلق ہو یا احکام سے، اس اختلاف کو اگر ختم کرنا ہے تو اللہ اور رسول کے میزان عدل پر ڈال دو مسئلہ واضح اور اختلاف ختم ہو جائے گا۔ یہ حکم الٰہی ہے جو قیامت تک کے لیے ہے نہ منسوخ ہے نہ مبہم نہ مہمل ہے نہ موؤل۔

ذرا غور کیجیے کسی معاملہ کو اللہ کی طرف لوٹانے کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے، کیا اللہ کی طرف لوٹانے کا مطلب کتاب اللہ کی طرف لوٹانا نہیں؟ جی ہاں اللہ کی طرف لوٹانے کا جو مطلب ہے بالکل واضح ہے کہ اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کرو، اس طرح رسول کی عدم موجودگی میں آپ کی طرف لوٹانے کا مطلب بھی واضح ہے کہ آپ کی سنت وسیرت کی طرف رجوع کیا جائے۔ میمون بن مہران (متوفی ۱۱۷ھ) فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف لوٹانے کا مطلب اللہ کی کتاب کی طرف لوٹانا ہے، اور رسول کی طرف لوٹانے کا مطلب سنت رسول کی طرف لوٹانا ہے۔ (۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿ فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی أنفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما ﴾ (نساء : ۶۵) ''تیرے رب کی قسم! لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ آپ کو اپنے اختلافی مسائل میں فیصل نہ تسلیم کریں، پھر آپ کے فیصلہ کے قبول کرنے میں اپنے دل میں کوئی حرج نہ محسوس کریں، بلکہ اس کو مکمل طریقہ سے قبول کرلیں۔

---

(۱) جامع بیان العلم (۲/۱۹۰)

غور کرنے کا مقام ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال فرما جانے کے بعد کیا اس آیت کا حکم ختم ہوگیا، کیا قرآن کا کوئی ایسا بھی حکم ہے جو قیامت تک کے لیے نہیں، جی نہیں یہ قرآن ہمیشہ کے لیے ہے، اور اس کا حکم بھی ہمیشہ کے لیے ہے، یہاں بھی رسول کی وفات کے بعد آپ کو فیصل بنانے کا یہی مطلب ہے کہ آپ کی سنت کو فیصل اور حکم بنایا جائے۔

دنیا میں مسلمانوں کے جتنے بھی مختلف فیہ مسائل ہیں اگر ان کو حقیقت میں حل کرنا ہے تو سنت رسول کو فیصل بنانا ہی پڑے گا، اس کے فیصل بننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قیامت تک یہ بھی برقرار رہے گا، اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے، آپؐ نے فرمایا تھا کہ "إنكم سترون بعدي اختلافا كثيرا فعليكم بسنتي" (۲) "تم لوگ میرے بعد بے شمار اختلافات دیکھو گے ایسی صورت میں میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑ لینا۔"

مومن ہونے کے لیے یہ انتہائی ضروری نسخہ ہے، ورنہ انسان لاکھ مسلمان ہونے کا دعوی کرے اس کا لیبل لگائے پھرے، کاغذات پر اپنا مذہب مسلمان تحریر کرائے اور جو بھی جتن ممکن ہو کر ڈالے، وہ اللہ کی نگاہ میں مومن نہیں ہوسکتا، جو رسول کو اپنے اختلافی معاملات میں آپ کی حیات میں فیصل نہیں مانتا اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی سنت وسیرت کو فیصل نہیں مانتا، جو شخص رب کے رسول کو آپ کا مقام نہیں دیتا اللہ کے یہاں اس کا کوئی مقام نہیں۔

لہٰذا اب جب کہ رسول موجود نہیں یہ مقام سنت رسول کا ہے، سنت رسول نے جس معاملہ میں جو فیصلہ کیا ہے وہی قابل قبول ہے، جس کا قبول کرنا ہر فرد پر ضروری ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے: ﴿إنا أنزلنا إليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما أراك الله﴾ (نساء: ۱۰۵) "اے رسول! ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے حق کے ساتھ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اپنے صوابدید کے مطابق جو اللہ نے آپ کی رہنمائی کی ہے، فیصلہ کریں" رسول اللہ ﷺ کے سارے فیصلے جو "بما أراك الله" کی بنیاد پر کیے گئے ہیں ان کا

(۲) ابوداؤد (۴۶۰۷)، ترمذی (۲۶۷۶) وقال: حسن صحیح

ماننا ضروری ہے، رسول کے قضایا اور فیصلے سنت رسول کا ایک گوشہ ہیں، اگر ایک گوشہ کو چھوڑنے کی اجازت نہیں تو مکمل سنت کو چھوڑنے کی اجازت کہاں سے آئی؟

نیز آپ نے فرمایا کہ : کل أمة یدخلون الجنة ألا من أبی قیل ومن أبی یارسول اللہ ؟ قال : "من أطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقد أبی" (۳) میری امت کا ہر فرد جنت میں جائے گا سوائے اس کے جس نے انکار کیا، کہا گیا یا رسول اللہ کس نے انکار کیا؟ آپ نے فرمایا "جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے نافرمانی کی تو (سمجھو کہ اس نے عملاً) انکار کیا۔"

نیز یہ بھی فرمایا کہ : خبردار بہت ممکن ہے کہ کوئی آسودہ شخص اپنی مسند پر بیٹھے بیٹھے یہ کہے کہ صرف قرآن کو لو، اس میں جو حلال ہے اس کو حلال اور جو حرام ہے اس کو حرام سمجھو، یاد رکھو جس کو رسول نے حرام کیا ہے وہ اللہ کی حرام کردہ ہے۔ تمھارے لیے پالتو گدھا، ذی ناب درندے، معاھد کی گری پڑی چیز حرام ہے۔ (۴)

معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی روشنی میں سنت رسول کا ماننا انتہائی ضروری ہے اس کے بغیر کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا۔ سنت کے مقام کو واضح کرنے والی آیتیں، حدیثیں، عمل صحابہ، اجماع امت وغیرہ سب سنت رسول کی وجوبی حیثیت پر شاہد عدل ہیں۔

(۲) تنزیلی حیثیت :

سنت رسول ﷺ کی ایک اہم حیثیت یہ ہے کہ یہ بھی اللہ کی جانب سے نازل شدہ ہے جس طرح سے قرآن کریم وحی الٰہی ہے اسی طرح سے سنت رسول ﷺ بھی وحی الٰہی ہے، جس کا ثبوت قرآن کریم میں موجود ہے۔

---

(۳) صحیح بخاری (۶۸۵۱)

(۴) سنن ابوداؤد (۴۶۰۴) بسند صحیح. سنن ترمذی (۲۶۶۴) وقال : حسن غریب من هذا الوجه۔

وحی کا لغوی معنیٰ : چپکے سے خبر دینا، اسی وجہ سے اس کو الہام بھی کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ اشارہ کرنا، کتابت، پیغام رسانی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ (۵)

وحی کا شرعی معنیٰ : اللہ تعالیٰ کا انبیاء کو خفیہ طریقے سے شریعت کی خبر دینا، جس سے قطعی علم حاصل ہو کہ وہ منزل من اللہ ہے۔ (۶)

وحی موحی الیہ (وحی کی گئی چیز) کو بھی کہا جاتا ہے، اس اعتبار سے وحی کی دو قسمیں ہیں۔

وحی متلو، جس کو وحی جلی کہا جاتا ہے، جو معجز (عاجز کرنے والا) اور مؤلف ہوتا ہے اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔

وحی غیر متلو، جس کو وحی خفی کہا جاتا ہے، جو مروی اور غیر مولف ہوتا ہے اس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔

قرآن کریم وحی جلی اور سنت رسول ﷺ وحی خفی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ﴿ إنا أوحينا إليك كما أوحينا إلى نوح والنبيين من بعده ﴾ (نساء : ۱۶۲) ''ہم نے آپ کی جانب وحی کی جیسے کہ ہم نے نوح اور ان کے بعد اور دیگر انبیاء کی جانب وحی کی''۔

اللہ تعالیٰ کا انبیاء کی جانب وحی کرنا بطور کتاب بھی ہوا ہے اور بغیر کتاب کے بھی ہوا، مثلاً حضرت موسیٰؑ کو پیغمبر بنا دیا گیا، فرعون کے پاس تبلیغ کے لیے بھیجا بھی گیا، معجزے دیا اور مقابلے بھی ہوئے، یہ سب وحی غیر متلو کے حکم پر ہوا تھا۔ اس کے بعد ''توریت'' طویل وقفہ بلکہ فرعون کی ہلاکت کے بعد دی گئی، ایسے ہی آپ پر بھی وحی کا نزول دونوں طرح سے ہوا ہے جس کو صحابۂ کرام نے بارہا مشاہدہ کیا، وحی متلو اور غیر متلو دونوں کے نزول کو دیکھا۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ سخت سردی کے موسم میں بھی نزول وحی کے وقت آپ کی پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگتا تھا۔ (۷)

---

(۵) لسان العرب (۱۵/۳۸۱)، النہایۃ فی غریب الحدیث (۵/ ۱۶۳)

(۶) الحدیث والمحدثون ص/ ۱۲

(۷) بخاری (۳۰۴۳) ، مسلم (۲۳۳۳)

ایک صحابی جن کا نام یعلیٰ بن امیہ تھا اُن کی خواہش تھی کہ نزول وحی کی حالت میں آپ کو دیکھیں، چنانچہ اُن کو یہ موقع مل گیا اور انھوں نے اس کا مشاہدہ کیا۔ (۸)

حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ : ایک بار آپ منبر پر خطبہ دے رہے تھے ہم نے دیکھا آپ پر نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جب وہ سلسلہ ختم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ " لا یاتی الخیر بالشر " (۹)

جو آسمانی کتابیں ہیں وہ وحی متلو اور جو احکامات الٰہی کتاب کے علاوہ ہوئی ہیں وہ وحی غیر متلو ہیں۔

وحی کی قسمیں :

وحی کے نزول کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں ان میں سے آٹھ شکل کا ذکر حافظ ابن قیمؒ نے کیا ہے۔ اس کی مشہور قسمیں یہ ہیں :

سچے خواب کے ذریعہ اطلاع دینا (جو انبیاء کا خواب ہوتا ہے)

دل میں بات ڈال دینا (جس کو الہام کہا جاتا ہے)

فرشتہ کے ذریعہ خبر دینا (خواہ وہ اصل شکل میں آئے یا انسانی شکل میں)

بغیر کسی واسطہ کے خبر دینا و گفتگو کرنا۔

گھنٹی کے جھنجھناہٹ کی طرح آواز آنا۔ (۱۰)

وحی کی پہلی قسم (قرآن کریم) میں الفاظ کا نزول ہوا ہے، دوسری قسم (سنت) میں معانی کا نزول ہوا ہے جس کو رسول نے اقوال وافعال سے واضح کر دیا ہے۔

دوسری قسم کی وحی کا ثبوت قرآن کریم میں صرف موجود ہی نہیں بلکہ سنت رسول کے منزل من اللہ اور وحی ہونے کا اقرار اور اعلان بھی ہے، آپ کے اقوال اور آپ کے افعال دونوں اللہ کی

---

(۸) بخاری (۱۴۶۳) ، مسلم (۱۱۸۰)

(۹) بخاری (۱۳۹۶) ، مسلم (۱۰۵۲)

(۱۰) زادالمعاد (۷۸/۱-۸۰) ، الحدیث والمحدثون (۱۲-۱۳)

طرف سے نازل کردہ وحی ہوتے ہیں، اللہ کا ارشاد ہے : ﴿ وما ينطق عن الهوىٰ إن هو إلا وحى يوحى ﴾ ''آپ اپنی خواہش سے (کچھ) نہیں بولتے، وہ تو (آپ کی باتیں) وحی ہیں جو اللہ کی طرف سے وحی کی گئی ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے : ﴿ إن اتبع إلا مايوحى إلىّ ﴾ (انعام : ۵۰) ''میں نہیں پیروی کرتا ہوں مگر اس چیز کی جو میری طرف وحی کی گئی ہے''۔

معلوم ہوا آپ کی باتیں اور سارے اعمال جو آپ سے صادر ہوتے ہیں وہ سب اللہ کے حکم اس کی مرضی اور اطلاع سے ہوتے ہیں۔

سنت رسول کے اللہ کی جانب سے منزل ہونے کی اور بہت سی دلیلیں قرآن کریم میں موجود ہیں، مثلاً اللہ کا فرمان ہے کہ ﴿وما جعلنا القبلة التى كنت عليها إلا لنعلم من يتبع الرسول ممن ينقلب على عقبيه﴾ (البقرہ : ۱۴۳) ''وہ قبلہ جس پر آپ تھے اس کو ہم نے اس لیے بنایا تھا تاکہ یہ جان لیں کون رسول کی بات مانتا ہے اور کون پھر جاتا ہے''۔

معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ کے علاوہ مسلمانوں کا کوئی اور قبلہ تھا جس سے رخ پھیر کر ادھر کیا گیا جو نص قرآن سے ثابت ہے، ﴿ قد نرى تقلب وجهک فى السماء فلنولينک قبلة ترضاها فول وجهک شطر المسجد الحرام ﴾ (بقرہ : ۱۴۴) ''آپ کے چہرے کو آسمان کی طرف بار بار اٹھنے کو ہم دیکھ رہے ہیں ہم آپ کا قبلہ بدل کر وہ کر دیں گے جو آپ کو پسند ہے لہٰذا اپنا چہرہ مسجد حرام کی جانب کرو''۔

پہلی آیت میں لفظ "جعلنا" (یعنی ہم نے کیا) بتاتا ہے کہ سابقہ قبلہ بھی اللہ کے حکم سے تھا جب کہ اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے بلکہ سنت رسول میں ہے، یہ سابقہ قبلہ کی طرف رخ کرنے کی اطلاع جو آپ کو دی گئی وہ قرآن کے علاوہ کسی دوسری وحی کے ذریعہ تھی اور وہی سنت رسول ہے، چنانچہ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے، ۱۶، ۱۷ مہینے تک ایسے ہی رہا، پھر اس کے بدلنے کا حکم آیا اور

قبلہ خانہ کعبہ کی طرف ہو گیا۔ (۱۱)

دوسری آیت میں اللہ نے فرمایا : ﴿ وما قطعتم من لينة أو تركتموها قائمة على أصولها فبإذن الله﴾ (الحشر : ۵) ''جو ہرے درخت تم نے کاٹا یا اپنی جگہ پر کھڑا رکھا سب اللہ کی اجازت سے ہوا ہے۔''

جب کہ اللہ کی یہ اجازت قرآن میں کہیں موجود نہیں۔

نیز فرمایا کہ : ﴿ أحل لكم ليلة الصيام الرفث إلى نسائكم ﴾ (بقرہ : ۱۸۷) تمہارے لیے رمضان کی راتوں کو عورتوں کے پاس جانا (ہم بستری کرنا) حلال کر دیا گیا۔

معلوم یہ ہوا کہ اس سے پہلے حرمت کا حکم تھا، اور یہ کام کرنا گناہ تھا جیسا کہ (عفا عنکم) سے معلوم ہوتا ہے یعنی تم کو معاف کر دیا، حالانکہ قرآن میں کوئی ایسا حکم اس سلسلہ میں موجود نہیں۔

نیز فرمایا کہ : ﴿ إذ يعدكم الله إحدى الطائفتين أنها لكم ﴾ (انفال : ۷) ''جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک (تجارتی قافلہ یا لشکر کفار سے جہاد) تمہارے لیے ہے، حالانکہ یہ وعدہ قرآن میں کہیں موجود نہیں۔''

معلوم یہ ہوا کہ قرآن کے علاوہ وحی کا کوئی اور ذریعہ بھی تھا، جس سے یہ خبر مسلمانوں کو دی گئی، اور یہ ساری خبریں حدیث رسول ہیں، لہٰذا حدیث رسول کا منزل من اللہ اور وحی کا ہونا ثابت ہو گیا۔

اس وحی کردہ امر میں اگر رسول کوئی چیز عملاً یا قولاً ملا دیتے، جو وحی کردہ نہیں ہے تو اللہ رب العزت کی دھمکی کے مطابق آپ کی شہ رگ کاٹ دی جاتی، اور آپ کی سخت گرفت کی جاتی ﴿ لو تقول علينا بعض الأقاويل لأخذنا منه باليمين، ثم لقطعنا منه الوتين ﴾ (الحاقہ : ۴۶) ''اگر یہ رسول ہمارے اوپر کوئی بات گھڑ لیتے تو ان کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیتا پھر ان کی شہ رگ کو کاٹ دیتا۔''

---

(۱۱) بخاری (۳۹۰)، مسلم (۵۲۵)

آپ کی گرفت نہ ہونا اس پر دلیل ہے کہ ساری باتیں جو اللہ کی طرف سے آپ کو دی گئی ہیں سب اصلی شکل میں امت تک پہنچ گئی ہیں۔

واضح رہے کہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو کامل شریعت عطا کی تھی جس کا خاتمہ بالخیر ﴿الیوم أکملت لکم دینکم و أتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا﴾ (المائدہ : ۳) ''پر ہوا، اللہ کے رسول ﷺ نے پوری اور مکمل شریعت امت تک پہنچا دی، اور اس آیت کے نازل ہونے کے دوسرے ہی دن آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر موجود جملہ صحابہ کرام سے یہ اقرار لیا کہ ''ألا هل بلغت'' کیا میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟ سارے لوگوں نے بیک زبان بآواز بلند یہ اقرار کیا کہ جی ہاں آپ نے پہنچا دیا، آپؐ نے فرمایا کہ ''اللهم اشهد'' اے اللہ! تو بھی گواہ رہنا کہ میں نے پہنچا دیا اور ان لوگوں نے اس کا اقرار کیا۔'' (۱۲)

اکمال شریعت اور ابلاغِ امت تک اس دھمکی پر عمل درآمد نہیں ہوا معلوم ہوا کہ یہ کامل دین وشریعت ٹھیک اسی شکل میں ہے جس شکل میں اللہ نے عطا کیا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جن طریقوں کی رہنمائی رسول پاک نے کی ہے ان کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، تو وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے کیا ہے، اس کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کو اس آیت میں دی ہے: ﴿ وإنک لتهدی إلٰی صراط مستقیم صراط اللّٰه ﴾ (شوریٰ : ۵۲-۵۳) ''آپ سیدھے راستہ کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں جو اللہ کا راستہ ہے۔'' (۱۳)

یہی وہ حکمت ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں وارد ہے اور جس کا نزول رسول پر ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : ﴿ واذکروا نعمة اللّٰه علیکم وما أنزل علیکم من الکتاب والحکمة یعظکم به ﴾ (بقرہ : ۲۳۱) ''یاد کرو اللہ کی نعمت کو اپنے اوپر اور جو اللہ نے تمہارے اوپر کتاب اور حکمت میں سے نازل کیا ہے اس سے تم کو نصیحت کرتا ہے''۔

---

(۱۲) بخاری (۱۷۴۱) (۱۳) الرسالہ ص ر ۸۸

معلوم ہوا کہ کتاب اور حکمت دونوں کا نزول اللہ کی طرف سے ہوا ہے جو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور دونوں کا مقصد نصیحت اور خیر خواہی ہے، نیز اللہ کا ارشاد ہے : ﴿ لقد منّ الله علی المومنین إذ بعث فیهم رسولا من أنفسهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة ﴾ (آل عمران : ۱۶۴) ''یقیناً اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے، جب ان میں انہیں میں سے رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے اور ان کا تزکیہ کرتے اور ان کو کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیتے۔''

یہ حکمت قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز ہے جیسا کہ جمہور اہل علم کا خیال ہے اور اسی کو بلفظ دیگر سنت اور حدیث کہا جاتا ہے۔ (۱۴)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسے اہل علم سے سنا ہے جو میری نگاہ میں پسندیدہ ہیں، وہ فرماتے تھے کہ حکمت سے مراد سنت رسول ہے، ان کی بات قرین قیاس ہے۔ (۱۵)

نیز فرماتے ہیں کہ قطعی طور سے حکمت سے مراد سنت رسول ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کتاب پر عطف کیا ہے جو مغایرت کو چاہتا ہے، یہ سنت کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ اس کو بطور احسان ذکر کیا ہے کہ اللہ نے اس کی تعلیم دی۔ (اور قرآن کے علاوہ آپ نے جس چیز کی تعلیم دی ہے وہ سنت رسول ہے)

خود آپ کا فرمان ہے: "ألا إنی أوتیت الکتاب ومثله معه" ''مجھ کو کتاب دی گئی ہے اور اسی کے ہم مثل اس کے ساتھ۔'' (۱۶)

اس سے یہ واضح ہے کہ جب کتاب دینے والا اللہ ہے تو مثله معه یعنی اس کے ہمراہ اسی کے مانند کا دینے والا بھی اللہ ہی ہوگا، اور جب کتاب وحی کی شکل میں دی گئی تو مثله معه بھی وحی کی شکل میں ہوگی خواہ وہ وحی بذریعہ فرشتہ ہو یا وحی والہام ہو یا کسی اور ذریعے سے ہو۔

---

(۱۴) الجامع لأحکام القرآن (۱۳۱/۲) (۱۵) الرسالہ ص ۷۸

(۱۶) ابوداؤد (۴۶۰۴) الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان (۱۲) مسند احمد (۱۳۰/۴)

آپ نے فرمایا کہ : "ألا إنی واللہ قد أمرت ووعظت ونھیت عن أشیاء أنھا لمثل ھذا القرآن" ''ہوشیار ہوجاؤ یقیناً میں نے کچھ باتوں کا حکم دیا، نصیحت کی، کچھ چیزوں سے منع کیا یہ سب قرآن کے مانند ہیں۔'' (۱۷)

لہٰذا جس طرح سے قرآن کریم اللہ کی جانب سے وحی کردہ ہے، اسی طرح سے سنت رسول ﷺ بھی اللہ کی جانب سے وحی کردہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں کے طریقۂ وحی میں فرق ہے۔

قرآن وسنت میں فرق :

قرآن اللہ کا کلام ہے جس کو حالت بیداری میں نازل کیا گیا ہے، یہ کلمات بعینہ وہی ہیں جو لوح محفوظ میں ہیں، وہی الفاظ نازل ہوئے ہیں۔ جب کہ حدیث رسول، اللہ کے کلمات نہیں بلکہ جبرئیل علیہ السلام یا رسول ﷺ کے کلمات ہیں۔

قرآن کریم کو کسی مترادف کلمہ سے بدلنا یا روایت بالمعنی کرنا درست نہیں، جب کہ حدیث رسول میں اس طرح کرنا کچھ شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔

قرآن اللہ کا کلام ہے جو معجزہ اور چیلنج ہے، جبکہ حدیث رسول معجزہ اور چیلنج نہیں، قرآن متواتر طرق سے ثابت ہے، حدیث رسول کچھ متواتر اور زیادہ تر خبر آحاد ہیں۔

قرآن کی ہر آیت سے نماز ادا کی جاسکتی ہے، ہر حدیث سے ادا نہیں کی جاسکتی۔

قرآن کو وحی جلی اور وحی متلو اور سنت کو وحی خفی اور غیر متلو کہا جاتا ہے۔

وحی جلی کا مطلب یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ انہیں کلمات کو نازل کیا گیا ہے جو اللہ نے قرآن کی شکل میں دیا۔

وحی خفی کا مطلب یہ ہے کہ وحی کی جو دیگر صورتیں ہیں مثلاً خواب، الہام وغیرہ وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

---

(۱۷) ابوداؤد (۴۶۰۵) سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ (۸۸۲)

سنت کو وحی خفی رکھنے میں اللہ کی بہت بڑی حکمت ہے، اور بندوں پر بہت بڑا احسان ہے ورنہ اگر سنت کو بھی قرآن کی طرح لفظ بلفظ ادا کرنا ضروری ہوتا تو امت بڑی مشقت میں پڑ جاتی، لہٰذا آسانی کرتے ہوئے اس کے مفہوم کی ادائیگی کو مطلوب قرار دیا گیا، تعبیر کسی بھی لفظ سے ہو بشرطیکہ مفہوم میں کوئی خلل نہ پڑے، اسی کو روایت بالمعنیٰ کہا جاتا ہے جس کے لیے شرط یہ ہے :

روایت بالمعنیٰ کرنے والا الفاظ کے مدلولات کو، اور جس سے معنی میں تبدیلی ہو جاتی ہے اس کو اچھی طرح جانتا ہو، پھر بھی بہتر یہ ہے کہ روایت کو اسی کے لفظوں میں ذکر کیا جائے ۔ (۱۸)

(۳) تشریعی حیثیت :

جناب محمد ﷺ سے پہلے جو انبیاء ورسل گذرے ہیں ان میں ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے کتاب نہیں دی تھی جیسا کہ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، بغیر کتاب دیے ہوئے ان تک اپنا پیغام پہنچایا، ان پیغامات کو وہی حیثیت حاصل تھی جو صاحب کتاب نبی کی کتاب کو حاصل تھی، معلوم ہوا کہ کتاب کے علاوہ جو چیزیں اللہ کی طرف سے انبیاء کو دی گئیں انہیں پر ان کی شریعت کا دارومدار تھا، ان چیزوں کو تشریعی مقام حاصل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی اس سے قبل ہی فرعون کی طرف دعوت کے لیے آپ کو بھیجا گیا، ہر طرح کے مناظرے ہوئے پھر فرعون غرق آب ہوا، ان سب کے خاتمہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آخر میں موسیٰ علیہ السلام کو توریت دیا، توریت دیے جانے سے پہلے جو کچھ ہوا وہ سب موسیٰ علیہ السلام کی شریعت تھی، معلوم ہوا کہ کتاب کے علاوہ دوسرے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ جو نازل کرتا ہے وہ شریعت ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو کتاب (قرآن) بھی دیا گیا اور کتاب کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی شریعت عطا کی گئی، بحیثیت تشریع ان کو وہی مقام حاصل ہے جو کتاب اللہ کو حاصل ہے۔

قرآن کریم میں یہ حکم ہے کہ : ﴿ وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه

---

(۱۸) مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۹۱

فانتهوا﴾ (حشر : ۷) ''جو کچھ رسول تم کو دیں اس کو قبول کرو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔'' اس اعطاء رسول میں صرف قرآن شامل نہیں بلکہ دیگر ذرائع (وحی خفی) سے جو چیزیں آپ کو دی گئی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں، ایسے ہی اپنے اجتہاد سے جو کچھ آپ نے دیا جس کو اللہ نے باقی رکھا اس کا بھی حکم وہی ہے : ﴿إنا أنزلنا إليک الکتاب بالحق لتحکم بين الناس بما أراک الله﴾ (نساء : ۱۰۵)

اللہ کا ارشاد ہے : ﴿الذين يتبعون الرسول النبي الأمي الذي يجدونه مکتوبا عندهم في التوراة والانجيل يأمرهم بالمعروف وينهاهم عن المنکر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث﴾ (اعراف : ۱۵۷) ''جو لوگ رسول امی کی اتباع کرتے ہیں وہ ان کے بارے میں تورات وانجیل میں یہ تحریر پاتے ہیں کہ وہ لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، اور طیبات کو حلال کرتے ہیں اور خبائث کو حرام کرتے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ جب رسول کو اللہ کی طرف سے یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ حلال وحرام کی تعیین کریں اور لوگوں کو طیبات اور خبائث میں فرق بتلائیں، تو رسول نے جو تحلیل وتحریم کی اور خبائث وطیبات کی جو وضاحت کی بحیثیت شریعت اس کا لینا اور اس پر عمل کرنا ہر مسلمان کے لیے واجب اور ضروری ہے، لہٰذا آپ کی سنت کو تشریعی حیثیت حاصل ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے : "أوتيت الکتاب ومثله معه" (۱۹) ''مجھ کو کتاب دی گئی اور اسی کی مانند اس کے ساتھ۔''

غور کرنے کا مقام ہے کہ قرآن کے مانند اس کے ساتھ آپ کو کیا دیا گیا، سنت کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں جو قرآن کے مانند ہو، بار بار کتاب کے ساتھ حکمت کے نام سے اس کا تذکرہ قرآن کریم میں کیا گیا ہے، یہ مثلیت اگرچہ من کل الوجوہ نہیں بلکہ مختلف اعتبار سے فرق ہے لیکن بحیثیت تشریع اس کے ہم مثل ہے۔

---

(۱۹) سنن ابوداود (۴۶۰۴)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول کی جو ذمہ داری بتائی ہے ان میں سے یہ بھی ہے کہ : ﴿ویعلمهم الكتاب والحكمة﴾ کہ آپ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماننا ہر مسلمان پر فرض ہے، خواہ وہ بشکل کتاب (قرآن) ہو، یا بہ شکل (حکمت) سنت ہو۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر قرآن اور رسول کی اتباع واجب قرار دیا ہے، اس سے اس امر کی تعیین ہو جاتی ہے کہ : ﴿ویعلمهم الكتاب والحكمة﴾ میں حکمت سے مراد وہ سارے احکام واقوال ہیں جو آپ کی ذات گرامی سے بحیثیت شریعت صادر ہوئے ہیں۔ (۲۰)

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ : "الا إني والله قد أمرت ووعظت ونهيت عن أشياء انهالمثل هذا القرآن أو أكثر" (۲۱) ''خبردار، قسم ہے اللہ کی! میں نے حکم دیا، میں نے نصیحت کی، اور میں نے بہت سی چیزوں سے منع کیا یہ ساری چیزیں اس قرآن کی مانند ہیں یا اس سے زیادہ۔

مصدر تشریع کے حساب سے اگر دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ جملہ اہل علم نے کتاب وسنت کو بالاتفاق مصدر شریعت قرار دیا ہے، اس ترتیب میں انہوں نے قرآن کو پہلا اور سنت کو دوسرا مقام دیا ہے جو اس کی اہمیت اور فضیلت کے اعتبار سے ہے، حالانکہ ثبوت مسائل کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو نصوص سنت قرآن سے آگے ہوتے ہیں اور سنت ہی قرآن کی وضاحت کرتی ہے۔

مثال کے طور پر نماز کے لیے طہارت کا ہونا شرط ہے یہ چیز نماز کی فرضیت کے ساتھ ہی بتادی گئی تھی، اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا اس پر عمل رہا اور بے شمار طہارت کے مسائل وضو کے مسائل بتائے گئے، پھر ۶ھ میں سورہ مائدہ کا نزول ہوا، تقریباً سات سال بعد اللہ تعالیٰ

---

(۲۰) السنۃ ومکانتہا ص ر ۵۱

(۲۱) ابوداؤد (۳۰۵۰) سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ (۸۸۲)

نے قرآن میں فرائض وضو کا ذکر کیا، ایسے ہی بہت سارے مسائل ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ثبوت مسائل کے لحاظ سے سنت قرآن پر مقدم ہے، نیز سنت کے بغیر قرآن کا سمجھنا ممکن نہیں جس کا ذکر آ رہا ہے۔

علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ : "واعلم أنه قد اتفق من يعتدبه من أهل العلم على أن السنة المطهرة مستقلة بتشريع الأحكام وأنها كالقرآن في تحليل الحلال وتحريم الحرام" "جان لو کہ جن اہل علم کا اعتبار کیا جاتا ہے ان کا اس پر اتفاق ہے کہ سنت مطہرہ احکام کو مشروع کرنے میں مستقل حیثیت رکھتی ہے، اور یہ کہ وہ حلت وحرمت کے بیان کرنے میں قرآن کی مانند ہے۔" (۲۲)

اسی معنیٰ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے امام یحییٰ بن ابی کثیر فرماتے ہیں : "السنة قاضية على الكتاب وليس الكتاب قاضيا على السنة" سنت کتاب پر فیصل ہے، کتاب سنت پر فیصل نہیں۔

امام احمد اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ " إن السنة تفسر الكتاب وتبينه" (۲۳) سنت کتاب اللہ کی تفسیر اور وضاحت کرتی ہے۔

ایک صحابی نے آپ سے سوال کیا کہ کیا حج ہر سال کرنا ہے؟ آپؐ نے فرمایا : کہ نہیں، زندگی میں ایک بار کرنا ہے، آگے فرمایا : "لو قلت نعم لوجبت" (۲۴)

اگر ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا واجب ہوتا۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تشریع کا پاور دے رکھا تھا۔

نیز پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ سنت رسول، اللہ کی جانب سے وحی کردہ شریعت ہے، جس طرح قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تاکہ اس کے احکامات اوامر ونواہی کو بطور شریعت تسلیم

---

(۲۲) ارشاد الفحول ص ر ۳۱ (۲۳) جامع بیان العلم (۱۹۱/۲)

(۲۴) مسلم (۱۳۳۷)

کیا جائے اسی طرح سے سنت رسول بھی اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے تاکہ اس کے احکامات اوامر ونواہی کو بطور شریعت تسلیم کیا جائے، ورنہ پھر اس کے وحی کرنے اور نازل کرنے سے کیا فائدہ؟

(۴) سنت کی بیانی حیثیت :

قرآن کریم رشد وہدایت کا منبع ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو سارے انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے، اس کا نزول جس ماحول اور جس قوم میں ہوا تھا وہ فصاحت وبلاغت کا ماحول تھا، قوم عرب اپنے سامنے پوری دنیا والوں کو گونگا سمجھتے تھے، عقل وخرد فہم وفراست میں بھی وہ بے مثال تھے، ان کی تعریف قرآن نے یوں کی ہے : ﴿الله أعلم حيث يجعل رسالته﴾ (انعام : ۱۲۴) ''اللہ کو خوب معلوم ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں بھیجتا ہے'' نیز یہ فرمایا کہ ﴿إنا جعلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون﴾ (زخرف : ۳) ''ہم نے اس کو عربی زبان میں کردیا ہے تاکہ یہ لوگ اس کو سمجھ سکیں'' معلوم ہوا کہ عربی داں ہی قرآن کو سمجھ سکتا ہے، یا بالفظ دیگر قرآن سمجھنے کیلیے عربی دانی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کے سمجھنے کے تعلق سے چند باتیں بتائی ہیں :

ایک تو یہ کہ ﴿وما يعلم تاويله إلا الله﴾ (آل عمران : ۳) قرآن نے جن کو متشابہات کہا ہے یہ اس کے بارے میں وضاحت ہے کہ اللہ کے علاوہ اس کا علم کسی کو نہیں، جو اہل علم ہیں وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ قرآن کی کچھ باتیں ایسی ہیں جن پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لانا ضروری ہے اور یہ کہ اس کا صحیح معنی ومفہوم اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم، لہٰذا اس کو معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔

دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ ﴿وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم﴾ (النحل : ۱۶) ہم نے آپ پر ذکر نازل کیا ہے تاکہ آپ اس کی وضاحت کردیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن کریم وضاحت کا طالب ہے بغیر وضاحت کے اس کا مقصد سمجھا نہیں جا سکتا، اور اس کی ذمہ داری صرف رسول کو دی گئی ہے، وہی اس کی وضاحت کریں گے۔''

تیسری بات یہ بتائی گئی کہ ﴿ تلک الأمثال نضربها للناس وما يعقلها الا العالمون ﴾ (العنکبوت : ۲۹) ''یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں (تاکہ لوگ سمجھیں) لیکن صرف اہل علم ہی اس کو سمجھتے ہیں۔'' اس سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا خاص طبقہ ہی اس کو سمجھ سکتا ہے۔

چوتھی بات یہ کہی گئی کہ ﴿ ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر ﴾ (قمر : ۵۴) ''ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟ اس سے معلوم ہوا کہ ہر کس و ناکس کے لیے قرآن آسان کر دیا گیا ہے بشرطیکہ وہ اس کو چاہے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مضمون کے اعتبار سے قرآن کی دو بنیادی قسمیں ہیں پہلی قسم عبر و مواعظ کی ہے جس میں عالم کی حقیقت انبیاء کے واقعات، سابقہ امتوں کی تاریخ، عقلی دلائل وغیرہ شامل ہیں، یہ ہر ایک صاحب زبان کے لیے واضح ہے۔

دوسری قسم تشریع دین ہے جس میں عقائد و احکام سے متعلق باتیں ہیں اس میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اہل علم کے لیے تو واضح ہیں لیکن سب کے لیے نہیں مثلاً ﴿ إن الصلاة كانت على المؤمنين كتابا موقوتا ﴾ (نساء : ۱۰۳) ﴿ خذ من أموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها ﴾ (توبہ : ۱۰۳) ﴿ كتب عليكم الصيام ﴾ (بقرہ : ۱۸۳) ﴿ ولله على الناس حج البيت ﴾ (آل عمران : ۹۷) ان کا مفہوم اہل علم کے لیے واضح ہے پڑھتے ہی وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نماز، زکوۃ، صیام، اور حج کو واجب قرار دیا ہے، ان آیتوں سے اس کے وجوب کا حکم واضح ہے۔

اسی دوسرے موضوع میں ایمانیات اور احکامات کی کچھ ایسی باتیں ہیں جس میں بنیادی باتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اس اشارے سے کیا مطلوب ہے اور کیسے مطلوب ہے وہ کسی کے لیے واضح نہیں، اس کی وضاحت کی ذمہ داری رسول پر ڈالی گئی ہے، مثلاً نماز، زکاۃ، صیام اور حج وغیرہ جو مسلمانوں پر فرض ہیں اس کی کیفیت شرائط، اوقات اور تفصیلات یہ قرآن میں قطعاً واضح نہیں بالکل مبہم ہے، ان ساری چیزوں کی وضاحت رسول کے ذمہ کی گئی ہے۔ پھر اس میں زبان کی جملہ باریکیاں استعارہ، کنایہ، مطلق، مقید، عام، خاص وغیرہ کی پیچیدگیاں بھی ہیں جس کو اہل علم سمجھتے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کے حکم سے اس کے کتاب کی تفسیر اور تشریح کی جس پر اللہ کی نگرانی تھی، اس کی نگرانی میں آپ نے اپنے اقوال، افعال، تقریرات اور سیرت سے اس کی وضاحت فرمائی ہے یہاں تک کہ اپنے آپ کو قرآن کی روشنی میں ڈھال لیا، چنانچہ جب حضرت عائشہؓ سے آپ کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "فان خلق نبی اللہ ﷺ کان القرآن" یعنی قرآن میں جو رشد وہدایت ہے آپ کی زندگی اسی کے مطابق تھی۔ (۲۵)

نیز فرماتی ہیں کہ جب قرآن کریم کی آیت ﴿ فسبح بحمد ربک واستغفرہ ﴾ (نصر : ۳) نازل ہوئی یعنی اللہ کی پاکی بیان کیجیے اور اس سے استغفار کیجیے تو آپ بکثرت "سبحانک ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی" کہنے لگے، رکوع اور سجود میں یہ دعا آپ بکثرت پڑھنے لگے اس لیے کہ آپ "کان یتأول القرآن" قرآن کریم پر عمل کرتے تھے۔ (۲۶)

بہر حال آپ نے اپنی ذمہ داری بحسن وخوبی ادا کردی، صحابہ کرام نے آپ کی تفسیر اور وضاحت کو آپ کی زبان مبارک سے سنا، کرتے ہوئے دیکھا اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور اپنے شاگردوں تک پہنچا دیا۔ اب اس بیان کو تسلیم کرنا اور اس کو ماننا ہر مسلمان کے لیے فرض عین ہے۔

---

(۲۵) مسلم (۷۴۶)   (۲۶) بخاری (۸۱۷) تفسیر (۴۹۶۷-۴۹۶۸)

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں : ''رسول کی طرف سے جو بیان وارد ہے اس کا قبول کرنا امت پر واجب ہے، اس لیے کہ اللہ نے جس کا حکم دیا ہے یہ اس کی تفصیل ہے، جس کی تفصیل بیان کی گئی ہے (قرآن کریم) جس طرح اس کا ماننا واجب اور ضروری ہے اسی طرح جو تفصیل بیان کی گئی ہے (سنت رسول) اس کا ماننا بھی ضروری ہے، اللہ نے اپنے اور رسول کی اطاعت کا جو حکم دیا ہے، رسول کا ہر حکم اسی اطاعت کا بیان اور اس کی تفصیل ہے لہٰذا دونوں میں کوئی فرق نہیں، ہر ایک کا قبول کرنا ضروری ہے۔ (۲۷)

سلف امت کا یہی اعتقاد تھا وہ اس سے سر مو انحراف نہیں کرتے تھے، چنانچہ ایک شخص نے حضرت عمران بن حصینؓ سے بہت ساری چیزوں کے بارے میں سوال کیا اور جواب صرف قرآن کی روشنی میں طلب کیا، انہوں نے کہا کہ تم احمق ہو، کیا تم روزہ، نماز، حج، زکاۃ کے مسائل اور اس کی تفصیل قرآن میں پاتے ہو، یقیناً اللہ کی کتاب نے ان سب کو مبہم رکھا ہے اور سنت رسول نے اس کی وضاحت کی ہے۔ (۲۸)

حسان بن عطیہ کہتے ہیں کہ : رسول پر جب وحی کا نزول ہوتا تھا تو حضرت جبرئیل سنت لے کر حاضر ہوتے تھے جو اس وحی کی تفسیر کرتی تھی۔ (۲۹)

امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ : "الكتاب أحوج إلى السنة من السنة إلى الكتاب" ''سنت کا قرآن کی طرف محتاج ہونے کی نسبت قرآن سنت کی زیادہ محتاج ہے۔ (۳۰)

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ : اس کا مطلب یہ ہے کہ سنت رسول کتاب اللہ کی تفسیر اور توضیح بیان کرتی ہے۔ (۳۱)

اللہ تعالیٰ نے رسول کو مبلغ اور معلم بنایا ہے اللہ کا ارشاد ہے : ﴿يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة﴾ (آل عمران : ۱۶۴، جمعہ : ۲) نیز فرمایا کہ

---

(۲۷) اعلام الموقعین (۲/۳۱۴) (۲۸) جامع بیان العلم (۲/۱۹۱)

(۲۹) مصدر سابق (۳۰) جامع بیان العلم (۲/۱۹۱) (۳۱) مصدر سابق (۲/۱۹۲)

﴿یا أیها الرسول بلغ ما أنزل إلیک من ربک وإن لم تفعل فما بلغت رسالته﴾ (مائدہ : ٦٧) تبلیغ بغیر وضاحت کے، اور تعلیم بغیر بیان کے بے معنی اور بے مقصد ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے بیان کی مختلف شکلیں ہیں جس کی تفصیل آرہی ہے، قبل ازیں ایک اختلافی نظریے کو سمجھ لینا مناسب ہے، قرآن کریم میں کچھ چیزیں مبہم ہیں، کچھ مطلق اور عام ہیں اس ابہام کو رسول نے بیان کردیا یا مطلق کو مقید اور عام کو خاص کردیا، ان صورتوں میں، یا اس سے مشابہ جو صورتیں ہیں ان میں سنت رسول کا بیان ہونا واضح ہے، لیکن ایک شکل یہ بھی ہے کہ سنت میں بہت سارے ایسے بھی مسائل ہیں جن کا ذکر بظاہر قرآن میں نہیں، تو اس کا حکم کیا ہے، کیا اس کو تفسیر سمجھا جائے یا قرآن کے کسی قاعدے میں شامل ہے۔

ایک نظریہ ہے کہ یہ زاید ہے لیکن بحیثیت بیان ہے جس کو بیان اضافی کہا جاتا ہے دوسرا نظریہ یہ ہے کہ سنت میں کوئی چیز ایسی نہیں جو قرآن پر اضافہ ہو بلکہ آپ کی ہر بات اور آپ کا ہر فعل قرآن کے کسی نہ کسی ضابطہ میں شامل ہے مثلاً آپ کی اطاعت سے متعلق جو آیتیں ہیں، یا آپ کی جو حیثیت قرآن نے بحیثیت مفسر قرآن بیان کی ہے یا آپ کے اقوال وافعال کو وحی الٰہی قرار دیا گیا ہے، آپ کی ساری باتیں انہیں ضابطوں کے ماتحت ہیں۔

لیکن یہ اختلاف بالکل لفظی ہے نتیجہ دونوں کے یہاں ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا قبول کرنا ہر شخص کے لیے ضروری ہے اس کے بغیر چارا نہیں۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ "فما کان منها زائدا علی أصل القرآن فهو تشریع مبتدأ من النبی ﷺ تجب طاعته فیه ولا تحل معصیته"

یعنی سنت میں جو قرآن سے زائد چیزیں موجود ہیں تو وہ بھی شریعت ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے صادر ہوئی ہیں، اس میں قرآن کی مخالفت نہیں بلکہ اطاعت رسول کا جو حکم قرآن میں موجود ہے، اس کی تعمیل ہے، اگر یہاں آپ کی اطاعت نہ کی جائے تو پھر اطاعت کا کوئی فائدہ نہیں۔ (۳۲)

---

(۳۲) اعلام الموقعین (۲/ ۳۰۷-۳۰۸)

اس لیے کہ جو چیزیں قرآن میں موجود ہیں اس میں رسول کی اطاعت کا اظہار نہیں ہوتا، اصل اطاعت کا اظہار تو انہیں چیزوں میں ہوتا ہے جو اس میں موجود نہیں، جو چیز قرآن میں موجود ہے اس کو مان لینا وہ تو قرآن کی اطاعت (اللہ کی اطاعت) ہوئی۔

بیان کی قسمیں :

(۱) تاکیدی بیان : اس بیان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن میں کوئی حکم موجود ہے، بعینہ وہی حکم سنت میں بھی بلفظ دیگر وارد ہے، اس طرح کتاب وسنت دونوں ایک دوسرے کے موافق ہوتے ہیں، سنت کا یہ حکم تذکیر وتاکید کے لیے ہوتا ہے، مثال کے طور پر قرآن میں یہ حکم موجود ہے کہ ﴿ لا تقتلوا النفس التي حرم الله إلا بالحق﴾ (انعام : ۱۵۱) ''جس جان کو اللہ نے حرام کردیا ہے اس کو ناحق مت مارو'' اسی مفہوم میں رسول کی سنت اس طرح وارد ہے : "فإن دماء كم وأعراضكم عليكم حرام" ''تمہارا خون اور تمہاری عزت تمہارے اوپر حرام ہے، یعنی کسی مسلمان کا ناحق خون کرنا اور اس کی بے عزتی کرنا حرام ہے۔ (۴۳)

اس طرح قرآن میں عورتوں کے تعلق سے یہ حکم وارد ہے کہ ﴿ وعاشروهن بالمعروف ﴾ (نساء : ۴) عورتوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو، سنت میں اس کی تاکید ان الفاظ سے کی گئی ہے، "اتقوا الله في النساء فانكم أخذتموهن بأمان الله" ''عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، تم نے ان کو اللہ کے امن کے ساتھ لیا ہے، اور ان کی شرم گاہ کو اللہ کے کلمہ سے حلال کیا ہے۔'' (۴۴)

(۲) وضاحتی بیان : اس بیان کی کیفیت یہ ہے کہ قرآن میں بہت سارے مسائل واحکام مجملاً موجود ہیں، اور وہ مطلوب بھی ہیں لیکن کس طرح اور کس کیفیت میں مطلوب ہیں یہ قرآن میں موجود نہیں، سنت رسول اس کے اجمال کی وضاحت کرتی ہے مثلاً قرآن میں ہے

---

(۴۳) بخاری (۶۷) مسلم (۱۶۷۹) (۴۴) مسلم (۱۲۱۸)

﴿وأقيموا الصلاة﴾ نماز ادا کرو، لیکن اس میں نماز کی تفصیل اوقات، رکعات اور کیفیات موجود نہیں، ساری تفصیل اور جزئیات کو اللہ کے رسول ﷺ نے کر کے بتایا اور فرمایا کہ "صلوا كما رأيتموني أصلي" نماز ویسے ادا کرو جیسے مجھ کو دیکھا ہے۔ (۳۵) اسی طرح سے زکاۃ، صیام، حج وغیرہ کے مسائل کا معاملہ ہے۔

(۳) تقییدی بیان : اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ قرآن میں کوئی چیز مطلق وارد ہے، سنت رسول اس مطلق کی تعیین کرتے ہوئے اس کو مقید کر دیتا ہے مثلاً قرآن میں ہے کہ ﴿فامسحوا بوجوهكم وأيديكم منه﴾ (المائدہ : ٦) یہ آیت تیمّم کے بارے میں ہے جس میں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ "اپنے چہرے اور ہاتھ پر مٹی سے مسح کرو" یہاں پر لفظ "ید" مطلق ہے جب کہ اس کا اطلاق کفین پر بھی ہوتا ہے، مرفقین تک پر ہوتا ہے اور انگلیوں سے لے کر کندھے تک پر ہوتا ہے، تیمّم میں ہاتھ پر کہاں تک مسح کیا جائے گا یہ سنت میں بتایا گیا ہے کہ ید سے مراد یہاں کفین ہیں، چنانچہ آپ نے حضرت عمار کو تیمّم کا طریقہ اسی طرح بتایا ہے "فضرب النبی ﷺ بكفيه الأرض ونفخ فيها ثم مسح بهما وجهه وكفيه" (۳٦)

ایسے ہی ﴿السارق والسارقة فاقطعوا أيديهما﴾ (المائدہ : ۳۸) کا بھی معاملہ ہے، جس میں سرقہ اور ید دونوں مطلق ہیں سنت نے اس کو مقید کر دیا اور بتایا کہ سرقہ کا ایک نصاب ہے جب اس نصاب تک کا سامان محفوظ مقام سے لیا جائے گا تب ہی اس پر "سرقہ" چوری کا اطلاق ہوگا، اور ید کی تعیین ہتھیلی سے کی گئی ہے "تقطع اليد في ربع دينار فصاعدا" (۳۷) ایک دینار کی چوتھائی یا اس سے زیادہ چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اس سے کم چوری کرنے پر نہیں کاٹا جائے گا، نیز آپ نے چور کا ہاتھ کبھی کندھے یا کہنی سے نہیں کاٹا بلکہ ہمیشہ ہتھیلی ہی سے کاٹا ہے، اور پہلی مرتبہ چوری کرنے پر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی اور پھر دوسری مرتبہ چوری کرنے پر داھنے ہاتھ کی ہتھیلی کاٹنے کا حکم دیا۔

---

(۳۵) بخاری (٦۳١)　　(۳٦) بخاری (۳۳۸)

(۳۷) بخاری (٦۷۸۹)، مسلم (١٦۸۴)

(۴) **تخصیصی بیان** : اس بیان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن میں کوئی لفظ ایسا وارد ہے جو مختلف معانی پر دلالت کرتا ہے یا کوئی حکم ایسا ہے جو عموم پر دلالت کرتا ہے سنت رسول اس کے معنی کی تعیین اور عموم کی تخصیص کرتی ہیں، مثلاً قرآن میں جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿الذین آمنوا ولم یلبسوا إیمانهم بظلم﴾ (انعام : ٦) ''جو لوگ ایمان لائے، اور اپنے ایمان کو ظلم سے خلط ملط نہیں کیا'' تو صحابہ کرام کو بڑی دقت ہوئی اور انہوں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم میں کون ایسا ہے جس نے ظلم نہ کیا ہو، آپ نے فرمایا : یہاں ظلم سے مراد شرک ہے عام معنی نہیں مراد ہے۔ (۳۸)

اسی طرح قرآن میں آیت میراث ﴿یوصیکم الله فی أولادکم للذکر مثل حظ الأنثیین﴾ (نساء : ۱۱) کے ذریعہ ہر میت کے مال میں وراثت جاری کرنے کا حکم دیا گیا، لیکن سنت رسول نے یہ بتایا کہ اس میں کچھ لوگ شامل نہیں ان میں سے ان کو خاص کر لیا گیا ہے مثلاً انبیاء جن کے متروکہ مال میں وراثت نہیں چلتی، آپ نے فرمایا کہ : ''نحن معشر الأنبیا لا نورث ماترکناه صدقة'' ''ہم انبیاء کی جماعت کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو مال ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ (۳۹)

اسی طرح آپؐ نے فرمایا : کہ کوئی مسلمان کسی کافر کا کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔ (۴۰) نیز قاتل کو میراث میں حصہ نہیں مل سکتا۔ (موطاء مالک) آپ کی ان ساری سنتوں نے قرآن کے عموم کو خاص کر دیا۔

(۵) **اشکالی بیان** : اس بیان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن میں کوئی ایسا کلمہ یا ایسی بات وارد ہوگئی جس کے سمجھنے میں غلط فہمی ہوتی ہے اور اس کا سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے، سنت اس اشکال کو ختم کر دیتی ہے مثلاً قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿حتی یتبین لکم الخیط

---

(۳۸) بخاری (۳۴۲۹)

(۳۹) بخاری (۳۰۹۳)، مسلم (۱۷۵۷) (۴۰) بخاری (۶۷۶۴)

الأبیض من الخیط الأسود من الفجر ﴾ (بقرہ : ۱۸۷) ''کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے واضح ہو جائے'' تو بعض صحابہ کو اس کے سمجھنے میں غلطی ہوئی تو آپ نے اس کی وضاحت کی اور فرمایا کہ اس سے مراد صبح کی سفیدی اور رات کی تاریکی ہے۔'' (۴۱)

(۶) ابہامی بیان : اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی بات بتائی گئی ہو جو مبہم ہو مثلاً اللہ کا یہ کہنا کہ ﴿ ولدینا مزید ﴾ (ق : ۳۵) اور ہماری طرف سے کچھ اور چیزیں ہیں'' یہاں ''مزید'' کا لفظ مبہم ہے، اسی طرح سے اللہ کا یہ فرمان ﴿ للذین أحسنوا الحسنی وزیادۃ ﴾ (یونس : ۲۶) ''جنہوں نے اچھا کام کیا ان کے لیے اچھا بدلہ ہوگا اور کچھ زائد چیز ہوگی'' یہاں مزید اور زیادہ دونوں کا مفہوم مبہم ہے، سنت رسول نے اس کی وضاحت فرمائی ہے اور بتایا کہ اس سے مراد قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ نیز ﴿ منھا أربعۃ حرم فلا تظلموا فیھن أنفسکم ﴾ اس کا بیان حدیث ابی بکرہ میں ہے، جو حجۃ الوداع کے خطبہ میں مذکور ہے۔

(۷) الحاقی بیان : اس بیان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم دو مختلف چیزوں کا حکم بیان کرتا ہے، ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں ہیں جو ان دونوں کے مشابہ ہیں لیکن اس کا حکم قرآن میں نہیں ہے، سنت رسول کسی مشابہت کی وجہ سے ان چیزوں کو بھی قرآن کے منصوص حکم کے ساتھ ملحق کر دیتی ہے، مثلاً قرآن میں ہے ﴿ أحل لکم الطیبات ﴾ (مائدہ : ۴) ''تمہارے لیے طیبات حلال ہیں اور اس کے مقابلہ میں خبیثات حرام ہیں''، جن چیزوں کا طیب اور خبیث ہونا واضح ہے ان کا حکم بھی واضح ہے، لیکن جن کی نوعیت واضح نہیں مثلاً "أکل کل ذی ناب من السباع وأکل کل ذی مخلب من الطیر" (۴۲) ہر ناب والے درندے اور پنجہ سے کھانے والے پرندے، اسی طرح سے ''پالتو گدھوں کا گوشت'' تو سنت نے ان کا حکم بتا

---

(۴۱) بخاری (۱۹۱۶ ، ۴۵۱۰)　　　(۴۲) ابوداؤد (۴۶۰۵)

کر کے ان کی نوعیت واضح کردی، اور یہ پتہ چل گیا کہ پنجہ والے پرندے اور ہڈی توڑنے والے درندے، اور پالتو گدھا خبیث میں شامل ہے اس لیے کہ اس میں مادہ ضرر یا مادہ نجاست پائی جاتی ہے، اس کے مقابلہ میں گھوڑے کا گوشت، گوہ، خرگوش، سرخاب کے کھانے کو جائز قرار دے کر یہ بتا یا دیا کہ یہ طیبات میں شامل ہیں۔ (۴۳)

ایسے ہی طیبات میں سے مذبوح جانوروں کو حلال، اور مردار کو حرام قرار دیا، لیکن وہ بچہ جو مذبوح جانور کے پیٹ سے نکلتا ہے اس کا کیا حکم ہے یہ واضح نہیں، سنت نے "ذكاة الجنين ذكاة أمه" (۴۴) کہہ کر واضح کر دیا کہ جس جانور کو ذبح کر دیا گیا تو اس کے سارے اعضاء کا حکم مذبوح کا ہوگا جنین جب تک ماں کے پیٹ میں ہے، اس کے عضو کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا وہ بھی حکماً مذبوح ہے "كلوه إن شئتم" جس کی مرضی ہو کھائے۔

(۸) قیاسی بیان : اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن نے کسی چیز کا حکم کسی سبب (علت) کی وجہ سے بیان کر دیا گیا ہے، وہی علت دوسری چیزوں میں موجود ہے لیکن اس کا واضح حکم قرآن میں نہیں، سنت رسول اس علت پر قیاس کرے دوسری چیزوں کا حکم واضح کر دیتی ہے مثلاً ﴿ وأن تجمعوا بين الأختين ﴾ (نساء : ۲۳) "نکاح میں دو بہنوں کو اکٹھا کرنا حرام ہے" اس کے علاوہ دیگر محرمات کو ذکر کر کے فرمایا کہ ﴿ وأحل لكم ما وراء ذلكم ﴾ (نساء : ۲۴) اس کے علاوہ دیگر رشتے حلال ہیں، لیکن سنت رسول نے "لڑکی اور پھوپھی کو، اسی طرح سے لڑکی اور اس کی خالہ کو ایک شخص کے نکاح میں یکجا رکھنا ناجائز قرار دے دیا ہے۔" (۴۵)

اس لیے کہ جو علت دو بہنوں کے اکٹھا رکھنے میں ہے، وہی علت ان قرابت داروں میں بھی ہے، اور وہ قطع رحمی کا اندیشہ ہے۔ (۴۶)

---

(۴۳) السنۃ ومکانتہا (۳۸۹) (۴۴) ابوداؤد (۲۸۲۷) ترمذی (۱۴۷۶) صحیح

(۴۵) بخاری (۵۱۰۹) (۴۶) السنۃ ومکانتہا (۳۹۰)

ایسے ہی رضاعی رشتوں میں سے ماں اور بہن کو قرآن نے حرام کر دیا، سنت رسول نے حسبی رشتوں پر قیاس کر کے (قرابت داری کی وجہ سے) ان سارے رشتوں کو حرام کر دیا جو خاندانی رشتوں میں ناجائز ہے اور فرمایا کہ "الرضاعة تحرم ما تحرم الولادة" (۴۷) نسب میں جو رشتے حرام ہیں، رضاعت میں وہ سارے رشتے حرام ہیں۔"

(۹) اصولی بیان : کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں مختلف جزئیات مذکور ہوتے ہیں اور ان کا حکم بھی مذکورہ ہوتا ہے، سنت رسول ان سارے جزئیات کو اکٹھا کر کے ایک کلی اصول میں جمع کر دیتی ہے، مثلاً نقصان نہ پہنچانے کے تعلق سے قرآن نے مختلف جگہوں پر ہدایت کی اور فرمایا کہ : ﴿لا تمسکوهن ضرارا﴾ (بقرہ : ۲۳۱) ﴿ولا تضاروهن﴾ (طلاق : ٦) ﴿ولا تضار والدة بولدها﴾ (بقرہ : ۲۳۳) وغیرہ، اس طرح کے جزئیات کو سنت نے یکجا کر کے فرمایا : "لا ضرر ولا ضرار" (۴۸)

اسی طرح سے وہ ساری آیتیں جو اخلاص پر دلالت کرتی ہیں ان کو سنت نے ایک قاعدہ کلیہ ﴿إنما الأعمال بالنیات﴾ میں شامل کر دیا۔ (۴۹)

(۱۰) اضافی بیان : اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ سنت میں ایسی چیزیں مذکور ہوتی ہیں جس سے قرآن کریم نے سکوت اختیار کیا ہے، مثبت ومنفی کسی صورت کا کوئی پتہ نہیں چلتا، لیکن وہ حکم سنت میں موجود ہوتا ہے، مثلاً شفعہ اور اس کے احکام، شادی شدہ زنا کار کا رجم کرنا، غیر شادی شدہ زنا کار کا شہر بدر کرنا، دادی کی وراثت، وغیرہ بہت سارے ایسے مسائل ہیں جو سنت میں موجود ہیں لیکن قرآن میں نہیں ہیں، یہ اضافہ رسول نے بحیثیت مفسر قرآن کیا ہے۔

بعض اہل علم اس اضافی بیان کو بھی کسی نہ کسی اصول کے تابع مانتے ہیں، ان کا یہ خیال ہے کہ سنت رسول میں کوئی ایسی چیز نہیں جو قرآن کے دائرے سے خارج ہو، بلکہ اس کا ہر حکم

---

(۴۷) بخاری (۵۰۹۹) (۴۸) صحیح الجامع الصغیر (۲/۱۲۵۰)

(۴۹) بخاری (۱)، علوم حدیث ص (۹۳)

قرآن کے عام ضوابط میں شامل ہے، مثلاً اللہ کا فرمان ہے کہ رسول کی اطاعت کرو، اب اگر رسول نے ایسی چیز بتائی جو بظاہر قرآن میں نہیں ہے تو وہ اس اطاعت کے ماتحت آئے گا، اسی طرح قرآن میں ہے کہ جو کچھ رسول دیں اس کو لے لو، نیز یہ بھی ہے کہ رسول کی ذمہ داری ہے کہ حلال وحرام کی وضاحت اور قرآن کی تفسیر کریں، لہٰذا جتنی زائد چیزیں نظر آتی ہیں وہ اس میں شامل ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے اہل علم اس کو اضافہ کا نام دیتے ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ رسول نے بحیثیت مفسر قرآن یہ کام کیا ہے اور رسول کی تفسیر اللہ کی نگرانی میں ہوئی ہے، لہٰذا اس تفسیری اضافہ کو قبول کرنا ضروری ہے۔

فریقین کا اس کی تعبیر میں جو بھی اختلاف ہو لیکن اس پر اتفاق ہے اس کا قبول کرنا واجب اور ضروری ہے خواہ وہ بیان اضافی ہو یا بیان شمولی۔

(۱۱) **تنسیخی بیان :** اس بیان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں کوئی حکم موجود تھا، لیکن سنت نے اس کو منسوخ کر دیا، مثلاً ﴿ كتب عليكم إذا حضر أحدكم الموت الوصية ﴾ (بقرہ : ۱۸۰) ''یعنی موت کے وقت وصیت ہر شخص پر واجب ہے'' وصیت کے اس عام حکم کو ورثاء کے حق میں حدیث رسول "لا وصية لوارث" (۵۰) نے منسوخ کر دیا۔

ایسی ہی قرآن کی یہ آیت ﴿والـلاتـي ياتين الفاحشة من نساء كم فامسكوهن في البيوت حتى يتوفاهن الموت أو يجعل الله لهن سبيلا﴾ (نساء : ۱۵) ''بدکاری کرنے والی عورتوں کو موت تک گھروں میں بند رکھو، یا اللہ کوئی راستہ پیدا کر دے، اس کو حدیث رسول "البكر بالبكر جلد مأة وتغريب عام" (۵۱) نے منسوخ کر دیا، اور یہ حکم دیا کہ غیر شادی شدہ کو سو کوڑے لگاؤ اور ایک سال کے لیے شہر بدر کر دو۔

---

(۵۰) ترمذی (۲۱۲۱) وقال : حسن صحیح (۴۳۴/۳)
(۵۱) مسلم (۱۶۹۰)

یہ ان اہل علم کے خیال کے مطابق ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سنت رسول کے ذریعہ قرآن کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔

کسی بھی حکم کی جو مدت ہوتی ہے نسخ کے ذریعے انتہا کو بیان کیا جاتا ہے، اس لیے اس کو بیان تبدیل بھی کہا جاتا ہے، بیان کی جتنی بھی قسمیں اور کیفیتیں ہیں ماننا اور اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے یہ سب قرآن کی تفسیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (۵۲)

☆☆☆

(۵۲) اعلام الموقعین (۲/۱۴)، جامع بیان بیان العلم (۲/۹۰) الحدیث والمحدثون ص/۳۷ خبر الواحد وحجیتہ ص/۶۳

عملی خدمات

کسی بھی مورخ کا قلم جب بھی صحابہ وتابعین اور ائمہ محدثین کی خدمات حدیث کے بیان پر اٹھتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران وششدرہ جاتا ہے کہ وہ قوم جو ''دورجاہلیت'' کی پیداوار تھی، جو دنیا میں اپنی پہچان، گنوار، غیر مہذب اور غیر متمدن قوم کے طور پر رکھتی تھی، جو بت پرستی، آبا پرستی اور نفس پرستی کی خوگر تھی، جس کی ساری توانائی اور قوت خودسری اور خود پسندی پر صرف ہورہی تھی، اس قوم نے ایسا کارنامہ کیونکر انجام دیا جو دنیا والوں کے لیے رہنما اصول بن گئے۔

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ان کی خوبیوں اور خداداد صلاحیتوں کو دیکھنا پڑے گا جو قوم عرب کو اللہ نے عطا کیا تھا، ان کی جرأت وشجاعت، ہمت وبے باکی، غیرت وخودداری، ضیافت ومہمان نوازی مشہور تھی وہ قول وقرار کے پکے اور زبان کے دھنی تھے، اس کے ساتھ ساتھ قدرت نے ان کو بے مثال قوت حافظہ اور فہم وفراست عطا کیا تھا، غالباً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری پسندیدہ اور کامل شریعت کو نازل کرنے کے لیے اسی قوم کو منتخب کیا، اور ان کی تعریف ﴿اللّٰہ أعلم حیث یجعل رسالتہ﴾ (انعام : ۱۲۴) سے کی یعنی جہاں اللہ تعالیٰ اپنی رسالت کو نازل کرتا ہے وہ اس کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہے۔

رسول رحمت کی تعلیم وتربیت نے ان میں چار چاند لگا دیا، تاریخ شاہد ہے کہ پندرہ سو سال قبل کے جزیرۂ عرب میں چند سالوں کے اندر جو تبدیلی رونما ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی، واقعہ یہ ہے کہ جب اس قوم نے دین حق کو مان لیا تو ساری چیزیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوگئیں، ظلم وزیادتی کا آسمان ٹوٹ پڑا، لیکن استقامت کا پہاڑ بن کر ثابت قدم رہے، وہ قدیم جرأت وحوصلہ، ہمت وشجاعت، غیرت وحمیت جو کبھی بے مقصد ہوا کرتی تھی اب وہ دین اسلام کی نشر واشاعت اور

اس کی حفاظت میں لگ گئی اور وہ ساری توانائیاں جو کفر وشرک پر خرچ ہوتی تھیں اب توحید اور ایمان کی حفاظت پر خرچ ہونے لگیں، رسول کی باتوں کو سننے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔

آپ کے ان خصوصی شاگردوں کو صحابۂ کرام کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، اور ان کے شاگردوں کو ﴿ والذین اتبعوھم باحسان ﴾ (توبہ : ۱۰۰) کا شرف ملا، پھر ان کے شاگردوں کی باری آئی جن کو 'ثم الذین یلونھم' سے نوازا گیا۔

یہ وہ قدوسی نفوس ہیں جنہوں نے ہر طرح سے دین کی حفاظت کی، اور اس کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے، اور کیوں نہ ہوں، یہ وہ پاسداران علوم نبوی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ﴿ إنا نحن نزلنا الذکر وإنا لہ لحافظون ﴾ (حجر : ۹) کے پس منظر میں وجود بخشا، یعنی ''اس ذکر کو ہم نے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں'' یہی وجہ ہے کہ صحابہ وتابعین اور ائمہ محدثین کی جماعت نے دین کو محفوظ رکھنے کی جو کوششیں کیں اور جو ذرائع اور طریقے استعمال کیے وہ انتہائی معیاری بشری تقاضوں کو پورا کرنے والی اور بے مثال تھیں۔

حدیث رسول کی حفاظت کے لیے جن ذرائع کا استعمال کیا گیا وہ مختلف قسم کے ہیں ان میں سے چند اہم ذریعے یہ ہیں :

(۱) تلاش وجستجو :

حفاظت سنت کے پہلے مرحلہ میں ان بزرگان دین نے حصول سنت اور اس کی معرفت کی کوشش کی یہ رسول ﷺ کی باتوں کو انتہائی غور سے سنتے تھے، آپ کی مجلسوں میں ہمہ تن گوش ہوتے تھے، دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، آپ کی مجلسوں کی صفت حضرت انسؓ نے اسی طرح بیان کی ہے۔

ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی سعادت اور کامیابی نیز نجات کا دارومدار سنت رسول پر ہے ﴿لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ﴾ (الاحزاب : ۲۱) ''تمہارے لیے

رسول کی زندگی بہتر نمونہ ہے'' پر کامل یقین تھا، اسی لیے وہ آپ کے اسوہ کے خوگر رہتے تھے "نضر اللہ امرء اسمع مقالتی فحفظھا ......" (۱) کی بشارت بھی سب سے پہلے انہیں کو دی گئی تھی، ''یعنی اللہ ایسے شخص کے چہرے کو تروتازہ بنائے جو میری باتوں کو سنتا ہے اور اس کو اچھی طرح سے محفوظ کر کے دوسروں تک پہنچا دیتا ہے۔'' "احفظوھن واخبروا بھن من وراء کم" (۲) کا حکم انہیں کے سامنے دیا گیا تھا، جب اللہ کے رسول ﷺ نے وفد عبدالقیس کو دین کی باتیں بتانے کے بعد یہ کہا تھا کہ ان باتوں کو یاد کر لو اور جو تمہارے پیچھے ہیں ان تک پہنچا دو، ان سارے اسباب کی وجہ سے صحابہ کرام حدیث رسول کو تن من دھن سے معلوم کرتے تھے۔

اس کام کے لیے ایک خصوصی دستہ بھی تیار کیا گیا تھا جن کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی جن کو عرف عام میں ''اصحاب صفہ'' کہا جاتا ہے جن کی یہ ذمہ داری تھی کہ رسول ﷺ کی باتوں کو سنیں آپ کے اعمال کو دیکھیں اور اس کو یاد رکھیں، طالبان علوم نبوت کا یہی وہ پہلا ہراول دستہ تھا جنہوں نے اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔

انہیں میں سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو سنت رسول کے سب سے بڑے متلاشی اور محافظ تھے وہ فرماتے ہیں کہ جب دیگر صحابہ کرام اپنے کاروبار میں لگ جاتے تھے تو اس وقت بھی میں رسول کے اردگرد لگا رہتا تھا "کنت الزم رسول اللہ ﷺ علی ملء بطنی وکنت أکثر مجالسة لرسول اللہ ﷺ احضر إذا غابوا، واحفظ إذا نسوا" (۳) وہ مزید فرماتے ہیں کہ ''میں غریب آدمی تھا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پیٹ بھر کھانے پہ لگا رہتا تھا، میں آپ کی مجلس میں اس وقت حاضر رہتا تھا جب کہ لوگ غائب رہتے تھے اور میں آپ کی باتوں کو یاد رکھتا تھا جب لوگ بھلا دیتے تھے'' یہی وجہ ہے کہ آپ کے پاس حدیث رسول کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود تھا۔

---

(۱) مسند احمد (۸۲،۸۰/۲) متواتر ہے، استاد گرامی عبدالمحسن عباد کی مکمل کتاب اس موضوع پر مطبوع ہے۔
(۲) بخاری (۵۳) مسلم (۱۷)
(۳) مسند احمد (۲۴۰/۲)، سیر أعلام النبلاء (۵۹۰/۲)

انہیں میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے حدیث رسول کی معرفت کے لیے باری لگا رکھی تھی چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے ایک انصاری پڑوسی نے آپس میں باری لگائی تھی، ایک دن وہ رسول ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور دوسرے دن میں حاضر ہوتا تھا، جو باتیں آپ کی مجلس میں ہوتی تھیں وہ مجھ کو اپنی باری کے دن آکر بتاتے تھے اور میں ان کو اپنی باری کے دن جا کر بتاتا تھا۔ (۴)

بہت سارے وفود آپ کے پاس آپ کی باتیں معلوم کرنے کے لیے آتے تھے، چنانچہ وفد عبدالقیس آپ کے پاس آیا اور انہوں نے آپ سے درخواست کیا کہ "فمرنا بأمر نعمل به" آپ ہم کو ضروری باتیں بتایئے جس پر ہم عمل کریں اور دوسروں کو اس کی دعوت دیں، چنانچہ آپ نے ان کو بتایا۔ (۵)

مالک بن حویرث فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے ہم سب نوجوان تھے تقریباً بیس رات تک یہاں قیام کیا (اس قیام کا مقصد تفریح کرنا نہیں تھا بلکہ حصول تعلیم تھا جیسا کہ حدیث کے ایک جملے سے پتہ چلتا ہے) جب ہم کو گھر جانے کا شوق پیدا ہوا تو آپؐ نے کہا کہ "ارجعوا إلى أهليكم فأقيموا فيهم وعلموهم ومروهم" (٦) گھر واپس جاؤ وہاں رہو اور ان کو تعلیم دو (یعنی وہ تعلیم جو رسول ﷺ سے حاصل کیا ہے) اور ان کو احکامات کی پابندی کا حکم دو۔

حضرت جابرؓ نے ایک حدیث کی تلاش کے لیے ملک شام کا سفر کیا جو مدینہ منورہ سے ایک مہینے کی مسافت پر تھا، ان کو یہ پتہ چلا کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث عبداللہ بن اُنیسؓ انصاری کے پاس ہے۔ جس کو وہ بذاتِ خود رسول سے نہ سن سکے تھے، چنانچہ اُس کے لیے انھوں نے سواری تیار کیا اور ایک مہینے کا سفر کر کے ملک شام پہنچے، عبداللہ ابن اُنیسؓ سے ملاقات کی اور

---

(۴) بخاری (۸۹)

(۵) بخاری (۵۳)، مسلم (۱۷)

(٦) بخاری (٦٣١)، مسلم (٦٧٤)

اُن سے یہ حدیث سنی جس میں ظلم وزیادتی کرنے والوں کا انجام بتایا گیا تھا۔ (۷)

اسی طرح سے ابوایوب انصاریؓ نے ایک حدیث کو معلوم کرنے کے لیے حضرت عقبہ بن عامرؓ کے پاس سفر کر کے مصر گئے، جب وہاں پہنچے تو حال چال معلوم کرنے کے بعد اُن سے آنے کا مقصد پوچھا، انھوں نے کہا کہ ایک حدیث رسول ہے جس کو میرے اور آپ کے علاوہ کسی نے نہیں سنا ہے وہ روایت ''سترِ مومن'' سے متعلق ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ نے اُس روایت کو رسول سے سننے کی تصدیق کی حضرت ابوایوبؓ نے اطمینان ظاہر کیا اور وہاں سے فوراً واپس بھی ہو گئے، باوجود اصرار کے وہاں نہیں ٹھہرے۔ (۸)

انہیں کے نقش قدم پر تابعین عظام اور دیگر محدثین نے عمل کیا انہوں نے اپنی پوری زندگی کو حفاظت حدیث کے لیے وقف کر رکھا تھا، اس سلسلہ میں انہوں نے جو قربانیاں پیش کی ہیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں، ہر ایک کی زندگی میں کچھ نہ کچھ ایسے واقعات ملتے ہیں جن کو سن کر انسان انگشت بدنداں ہو جاتا ہے۔

سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ ایک ایک حدیث کی تلاش میں میں رات و دن چلتا رہتا تھا۔ (۹)

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ حصول حدیث کی خاطر گھر گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے، مجلس میں رہتے یا منفرد کہیں کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے، بوڑھا بوڑھی، جوان، ادھیڑ، جس کے پاس بھی علم ملتا ان سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ (۱۰)

امام شعبی نے ایک روایت بیان کی اس کے بعد اپنے شاگردوں سے کہا کہ : لوگھر بیٹھے

---

(۷) مسند احمد (۳/۴۹۵)، الأدب المفرد (۹۷۰) وذکرہ البخاری تعلیقاً بصیغۃ جزم۔

(۸) مسند احمد ۴/۱۵۳، مسند الحمیدی (۳۸۴)، مجمع الزوائد ۱/۱۳۴، شیخ نورالدین عتر فرماتے ہیں کہ "له طرق يرتقي بها إلى درجة الحسن" الرحلۃ فی طلب الحدیث ص/۱۲۰ حاشیہ

(۹) فتح الباری (۱/۱۷۵)

(۱۰) تہذیب التہذیب (۹/۴۴۹)

مفت میں یہ روایت تم کو دیتا ہوں، اس طرح کی روایت کے لیے یہاں سے (یعنی کوفہ سے) مدینہ تک سفر کرنا پڑتا تھا۔ (۱۱)

کثیر بن قیس فرماتے ہیں کہ میں ابوالدرداء کے پاس دمشق کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ میں آپ کے پاس مدینۃ الرسول سے آرہا ہوں، ایک حدیث حاصل کرنے کے لیے جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ اللہ کے رسول ﷺ سے اس کو بیان کرتے ہیں، ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ واقعی اور کوئی مقصد نہیں؟ انہوں نے کہا اور کوئی مقصد نہیں، اس پر انہوں نے علم حاصل کرنے کی فضیلت کے بارے میں حدیث سنائی۔ (۱۲)

اس طرح کے واقعات کو اگر قلمبند کیا جائے تو دفتر کا دفتر بھر جائے گا کوئی بھی محدث ایسا نہیں جس نے طلب حدیث میں کوتاہی کی ہو اس کے لیے وہ ایسی مشقتیں برداشت کرتے تھے جس کی مثال نہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طلب میں زندگی گزار دی اور چالیس سال تک خشک روٹی پر گزارا کیا، امام ابوحاتم رازی نے سفر علم میں اپنے جسم کے کپڑے کو بیچ دیا تھا، کئی کئی دن تک فاقہ کشی کرنی پڑتی لیکن طلب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ (۱۳)

آپ جب پہلی مرتبہ گھر سے نکلے تو تقریباً سات سال تک مسلسل سفر کرتے رہے، وہ فرماتے ہیں کہ اپنے سفر کی مقدار کو میں شمار کرنے لگا جب وہ پانچ ہزار میل سے زیادہ ہوگئی تو شمار کرنا بند کر دیا۔ (۱۴)

نیز فرماتے ہیں کہ کوفہ سے بغداد، مکہ سے مدینہ میں کتنی بار گیا اب یاد بھی نہ رہا، بحرین سے مصر، مصر سے رملہ، رملہ سے بیت المقدس، عسقلان سے طبریہ، وہاں سے دمشق، دمشق سے حمص،

---

(۱۱) صحیح بخاری (۹۳)

(۱۲) ابوداؤد (۳۶۴۱)، ترمذی (۲۶۸۳)، سنن ابن ماجہ (۲۲۳)، سند پر کلام ہے لیکن مختلف متابعات وشواہد کی وجہ سے قوی ہو جاتی ہے۔ الرحلہ ص ۷۹ حاشیہ

(۱۳) الجرح والتعدیل (۱/ ۳۶۴) (۱۴) الجرح والتعدیل مقدمہ (۱/ ۳۵۹)

وہاں سے انطا کیہ، انطا کیہ سے طرطوس، طرطوس سے حمص، وہاں سے بیسان پھر رقہ ہوتے ہوئے بغداد کا سفر کیا۔

اس طرح سے ان جیالوں نے پیدل چل کر کے بے سروسامانی کے عالم میں حدیثِ رسول کو پڑھنے اور جمع کرنے کا ایک ریکارڈ بنا دیا۔

اپنے ایک سفر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں اور ایک نیسا پوری ساتھی اور ابوزھیر مروزی مدینہ سے مصر کے لیے نکلے اتفاقاً کشتی کا راستہ بدل گیا پھر کئی ماہ سمندر میں بھٹکتے رہے، زندگی اجیرن ہو چکی تھی، توشہ ختم ہو گیا، بالآخر کشتی ساحل تک پہنچی، اب خشکی پر چلنے کی طاقت بھی باقی نہ رہی، کسی صورت سے کچھ آگے بڑھے، نیسا پوری ساتھی بے ہوش ہو کر گر گئے، نہ ان کو اُٹھانے کی کوئی طاقت نہ کھانے کی کوئی چیز، بالآخر وہیں اُسی حالت میں چھوڑ کر دیگر دونوں ساتھی آگے بڑھے (یہ سوچ کر کہ ان کی یہیں وفات ہو جائے گی کوئی قافلہ گزرے گا تو دفن کر دے گا) آگے چل کر وہ (ابوحاتم رازی) خود بیہوش ہو کر گر گئے، تیسرے ساتھی ان کو چھوڑ کر کسی قافلہ کی آس میں آگے بڑھے اس یقین کے ساتھ کہ یہی صحرا اُن کی آخری آرامگاہ ہے، کچھ دور پر ایک قافلہ نظر آیا کپڑا نکال کر ادھر اشارہ کرتے رہے، وہ لوگ سمجھ گئے کہ مدد کے لیے بلایا جا رہا ہے، وہ لوگ آئے پانی پلایا پھر ابوحاتم کی مدد کے لیے اس راستے پر ان کو بھیجا، وہ بیہوش تھے تھوڑا تھوڑا پانی پلایا کچھ دیر کے بعد اُن کو ہوش آ گیا پھر پہلے ساتھی کے پاس اُن کو بھیجا اس طرح ان کو بھی مدد مل گئی اور زندگی بچ گئی۔ (۱۵)

ابوطاہر احمد بن محمود نے مشرق سے مغرب تک کا چار مرتبہ سفر کیا۔ (۱۶)

حافظ ابن بندہ محمد ابن اسحاق نے چالیس سال طلب علم میں گزار دیا، جب واپس آئے تو بڑھاپے کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ (۱۷)

---

(۱۵) مقدمہ جرح التعدیل ص ر ۳۶۴-۳۶۶

(۱۶) الرحلہ فی طلب الحدیث ص ر ۲۱۰

(۱۷) تذکرہ الحفاظ ص ر ۱۰۳۲، میزان الاعتدال ۳ر ۴۷۹

یعقوب بن سفیان فسوی نے تیس سال تک طلب علم میں زندگی گذاری۔ (۱۸)

ان ائمہ نے اپنی زندگی خدمتِ حدیث کے لیے وقف کر دیا تھا۔جن میں اصحاب کتب ستہ اور اُن کے اساتذہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ابن ابی حاتم اپنے سفرعلم کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''مصر میں قیام کیے ہوئے سات مہینہ گذر چکے تھے، اس درمیان کوئی شوربہ دار سالن استعمال نہ کرسکا، دن بھر حدیث کو مشائخ سے پڑھتا اور رات بھر اس کو لکھتا، ایک دن ایک استاذ کے پاس گیا وہ بیمار تھے لہٰذا واپس آ گیا راستہ میں ایک مچھلی بک رہی تھی اس کو خرید لیا لیکن جب رہائش گاہ پر پہنچا تو دوسرے شیخ کے درس کا وقت ہوگیا، لہٰذا مچھلی کو رکھ کر حدیث پڑھنے چلا گیا، تین دن تک مچھلی پڑی رہ گئی اس کے کھانے پکانے کے لیے وقت نہ نکل سکا، اور شوربہ دار سالن کھانے کی خواہش مکمل نہ ہوسکی، اورانہوں نے مچھلی بلا پکائے کھالی اورفرمایا : "لا يستطاع العلم براحة الجسد" (۱۹) جسم کو آرام پہنچا کر علم نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ یہ وہ نادر نمونے ہیں جو صحابہ، تابعین اور محدثین کرام نے علم حدیث حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، انہیں کی طرف علامہ حالی نے یوں اشارہ کیا ہے۔

سنا خازنِ علمِ دیں جس بشر کو
لیا اس سے جاکر خبر اور اثر کو
اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو
اسی شوق میں طے کیا بحروبر کو

(۲) تحقیق وتدقیق :

صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اکرم ﷺ کی باتوں کو یا خود سنتے تھے یا تو اپنے کسی ساتھی کے واسطے سے سنتے تھے، جن پر ان کا مکمل یقین واعتماد ہوتا تھا، نورِ نبوت سے منور ہونے

---

(۱۸) الرحلۃ فی طلب الحدیث ص/۲۰۶

(۱۹) سیر أعلام النبلاء (۲۶۶/۱۳)

والے ان حضرات کا ماحول ومعاشرہ صدق وصفا، امانت ودیانت کا معاشرہ تھا، کذب بیانی، دھوکہ دہی سے پاک تھا، راست گفتاری، صداقت گوئی ان کی عادت تھی۔ حضرت انس فرماتے ہیں:
بخدا ہم نہ جھوٹ بولتے تھے اور نہ جانتے تھے کہ جھوٹ کیا ہے۔ (۲۰)

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے بعد خلفاء کے دور میں حالات میں تبدیلی آگئی اور حدیث رسول میں بے احتیاطی کے نمونے ملنے لگے تو صحابہ کرام نے ﴿یا أیھا الذین آمنوا إن جاء کم فاسق بنبإ فتبینوا﴾ (حجرات: ۶) ''اے مسلمانو! جب تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کی حقیقت معلوم کرلو۔'' کے اصول پر عمل کیا اور حدیث رسول کی تحقیق شروع کردی۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ''کنا إذا سمعنا قال رسول اللہ ﷺ...'' (۲۱) کہ جب ہم صدائے قال رسول اللہ ﷺ سنتے تھے تو ہماری نگاہیں بیساختہ ان کی طرف اٹھ جاتی تھیں اور ہم ہمہ تن گوش ہوجاتے تھے لیکن جب لوگوں نے رطب ویابس بیان کرنا شروع کردیا تو ہم نے ان کی باتوں کو چھوڑ دیا، صرف وہی بات قبول کرتے تھے جس کو ہم پہلے سے جانتے تھے۔

نیز وہ فرماتے ہیں کہ ''کنا نحدث رسول اللہ ﷺ إذ لم یکن یکذب علیه ......'' (۲۲) ہم رسول اللہ کی جانب حدیثوں کی نسبت کرتے تھے جب دروغ گوئی کا ظہور نہیں ہوا تھا لیکن جب لوگوں نے اونچ نیچ (اچھا برا) سب بیان کرنا شروع کردیا تو ہم نے رسول کی جانب نسبت بھی ترک کردی۔ (۲۳)

یہی نہیں بلکہ اسی تحقیق وتدقیق کے لیے بعض صحابۂ کرام کی بیان کردہ روایتوں پر بھی شہادت طلب کی گئی تاکہ لوگ حدیثِ رسول کے بیان کرنے میں احتیاط کریں اور بغیر تحقیق

---

(۲۰) الکامل فی ضعفاء الرجال (۱/۱۶۶)
(۲۱) مسلم (۱/۸۱)
(۲۲) مصدر سابق
(۲۳) مسلم (۱/۸۱)

وثبوتِ کاملہ کے حدیث نہ بیان کریں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک خاتون نے وراثت میں دادی کا حصہ ان سے طلب کیا، انہوں نے کہا کہ میرے پاس اس سلسلہ میں کوئی علم نہیں اور نہ ہی کتاب اللہ میں اس کا ذکر ہے، صحابیٔ رسول مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ میرے پاس اس کا علم ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دادی کو میراث میں سے چھٹا حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ کیا تمہارے علاوہ اور کوئی ہے جس نے یہ حدیث اللہ کے رسول سے سنی ہے، ایک دوسرے صحابی جنہوں نے سنا تھا اور جن کا نام محمد بن مسلمہ تھا انہوں نے یہ شہادت دی کہ میں نے بھی سنا ہے، تب حضرت ابوبکرؓ نے دادی کا حصہ جاری کیا۔'' (۲۴)

بقول امام ذہبی تحقیق وتدقیق کی یہ پہلی بنیاد تھی جس کو حضرت ابوبکر نے رکھا تھا۔ (۲۵)

ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعری حضرت عمر فاروق سے ملنے ان کے گھر گئے، انہوں نے تین بار آواز دی، جب ان کو کوئی جواب نہ ملا تو واپس ہونے لگے، اتنے میں حضرت عمر فاروق باہر آگئے، دیکھا کہ یہ واپس جارہے ہیں، ان کو بلایا اور پوچھا واپس کیوں ہوگئے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول نے فرمایا ہے کہ : "إذا استاذن أحدكم ثلاثاً فلم يوذن له فليرجع" جب تم میں سے کوئی شخص کسی کے یہاں تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اس کو (جواب نہ ملے) اجازت نہ ملے تو واپس چلا جائے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ جاؤ اور اپنی اس بات پر گواہی پیش کرو۔ (کہ رسول نے کہا ہے) وہ پریشان ہوکر واپس گئے، صحابہ کی ایک جماعت سے ملاقات کی اور یہ واقعہ بیان کیا، ان لوگوں میں سے ہر ایک نے بتایا کہ یہ حدیث انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔ لیکن شہادت دینے کے لیے اس میں وہ جائے گا جو عمر میں سب سے کمسن ہے، چنانچہ حضرت ابوسعید خدری جو عمر میں سب سے کم تھے وہ گئے اور انہوں نے شہادت دی کہ رسول کا اسی طرح حکم ہے۔ (۲۶)

---

(۲۴) موطا امام مالک (۲/۵۱۳) معرفۃ علوم الحدیث ص/۱۵

(۲۵) تذکرۃ الحفاظ (۱/۳)

(۲۶) بخاری مع الفتح (۱۱/۲۷-۲۶)

پھر حضرت عمر نے یہ وضاحت کی کہ شہادت طلب کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ پر بھروسہ نہیں لیکن چونکہ معاملہ حدیث رسول کا ہے اس لیے احتیاط اور تحقیق ضروری ہے۔ (۲۷)

اسی طرح ایک دوسرے واقعہ میں انہوں نے فرمایا کہ : " أما أني لم اتهمك ولكني أحببت أن اتثبت" (۲۸) میں تم کو متہم نہیں سمجھتا لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ تحقیق کرلوں۔

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ "حدیث رسول کی بابت تحقیق وجستجو کا یہ پہلا قدم ہے جس کو حضرت عمر اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما نے انجام دیا۔" (۲۹)

یہ وہ رہنما اصول ہیں جو صحابہ کرام نے امت کو دیا ہے اور اسی معیار پر حدیث رسول کی حفاظت کی، انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تابعین کرام اور محدثین عظام نے بھی تحقیق وجستجو کو اپنا شعار بنایا۔

حضرت سعید بن المسیب (متوفی ۹۳ھ) ابوالعالیہ ریاحی (متوفی ۹۰ھ) امام شعبی (متوفی ۱۰۳ھ) امام زہری (متوفی ۱۲۴ھ) اور دیگر محدثین کے حالات اس پر شاہد ہیں۔ ہر محدث کی زندگی میں تحقیق حدیث ایک روشن باب ہے جب تک ان کو مکمل اعتماد ویقین کامل نہ ہو جاتا وہ کسی روایت کو قبول نہ کرتے، معمولی شبہہ کی بنیاد پر بھی روایتیں رد کردیتے تھے۔

ابولعالیہ ریاحی فرماتے ہیں کہ : ہم بصرہ میں اصحابِ رسول کے حوالہ سے حدیثیں سنتے تھے لیکن اس پر قناعت نہ کرتے ہوئے بذاتِ خود مدینہ جاکر اُن سے سنتے تھے۔ (۳۰)

ربیع بن خثیم (متوفی ۶۰ھ) فرماتے ہیں کہ میں نے امام شعبی سے یہ حدیث بیان کیا کہ :

" من قال لاإله إلا الله وحده لاه شريک له ، له الملک وله الحمد وهو علیٰ كل

---

(۲۷) موطا امام مالک (۲/ ۹۶۴) الرسالہ امام شافعی (ص ۴۳۵)

(۲۸) تذکرۃ الحفاظ (۱/ ۸)

(۲۹) المجروحین (۱/ ۳۸)

(۳۰) سنن دارمی (۱/ ۱۱۴)

شیٔ قدیر عشر مرات، کان له کعتق رقبة" تو امام شعبی نے مجھ سے کہا کہ یہ حدیث تم نے کس سے سنی ہے؟ انھوں نے کہا کہ عمرو بن میمون اودی سے، چنانچہ انھوں نے عمرو بن میمون سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا کہ یہ حدیث آپ سے کس نے بیان کی ہے؟ انہوں کہا کہ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ نے، پھر وہ ابن ابی لیلیٰ کے پاس گئے اور ان سے سوال کیا کہ یہ حدیث آپ سے کس نے بیان کی ہے؟ انہوں کہا کہ صحابی رسول ابوایوب انصاریؓ نے۔ (۳۱)

امام شعبہ (متوفی ۱۶۰ھ) نے تحقیق کا جو نمونہ پیش کیا وہ قابل رشک ہے، ان کا واقعہ ہے کہ انہوں نے نصر بن حماد بجلی سے ایک حدیث پڑھتے ہوئے سنی جس کی سند انہوں نے یوں بیان کی، عن اسرائیل، عن ابی إسحاق، عن عبدالله بن عطاء، عن عقبه بن عامر، تو امام شعبہ نے ان کو ایک تھپڑ مار دیا، وہ ایک کنارے بیٹھ کر رونے لگے، تھوڑی دیر کے بعد امام شعبہ کی نظر ان پر پڑی تو آپ نے ان سے پوچھا کہ کیوں رو رہے ہو؟ ابن ادریس جو وہاں موجود تھے انہوں نے کہا کہ آپ کی زیادتی کی وجہ سے، امام شعبہ نے کہا کہ آپ خود ہی دیکھئے کہ یہ کس طرح سے سند بیان کر رہے ہیں عبداللہ بن عطاء اور عقبہ بن عامر میں بہت فاصلہ ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ عبداللہ بن عطا عقبہ سے روایت کریں؟ پھر انہوں نے اس کی وضاحت کی جس کا خلاصہ یہ ہے :

امام شعبہ نے خود ابو اسحاق سے اس سند کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے وہی سند ذکر کی، چنانچہ انہوں نے اس کی تحقیق کرنی چاہی اس لیے کہ سند میں انقطاع کا شبہ تھا اس کے لیے عبداللہ بن عطاء سے ملاقات کرنے کی ضرورت تھی، امام شعبہ اس وقت بصرہ میں تھے، پتہ لگانے پر یہ معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عطاء مکہ میں ہیں، چنانچہ وہ بصرہ سے مکہ کے لیے روانہ ہو گئے (جبکہ سفر کافی طویل اور تکلیف دہ تھا) اور وہاں ان سے ملاقات کی، ان سے سوال کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ یہ روایت انہوں نے سعد بن ابراہیم سے سنی ہے اور وہ مدینہ میں رہتے ہیں۔ چنانچہ امام شعبہ مدینہ آئے، وہاں پہنچنے پر یہ معلوم ہوا کہ اس حدیث کا بیان کرنے والا راوی بصرہ ہی کا ہے اور وہ

---

(۳۱) بخاری (۲۰۱/۱۱)، المحدث الفاصل (ص۲۰۸)، التمہید (۵۵/۱)

زیاد بن مخراق ہیں، پھر وہ مدینہ سے بصرہ واپس آئے اور زیاد بن مخراق سے معلومات چاہی، انہوں نے کہا کہ یہ روایت میں نے شہر بن حوشب سے سنی ہے، انہوں نے ابو ریحانہ کے واسطہ سے عقبہ بن حارث سے سنی ہے۔

شہر بن حوشب کا نام آتے ہی بے حد افسوس کا اظہار کیا، اس لیے کہ وہ ناقابل قبول راوی تھے، جس کی بنیاد پر روایت ضعیف ٹھہری، امام شعبہ فرماتے ہیں کہ اس نے مجھ کو پریشان کر ڈالا، اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو میرے لیے اہل وعیال واسباب سے زیادہ محبوب ہوتی۔ (۳۲)

اندازہ لگائیے کہ محدثین عظام نے حدیث رسول کی حفاظت اور اس کی تحقیق کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، یہ تحقیق کی وہ نادر مثالیں ہیں جن سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ حدیث رسول کی خدمت کس طرح سے کی گئی۔

جو لوگ حدیث رسول کی صحت کے بارے میں شکوک وشبہات رکھتے ہیں ان کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچنا چاہئے کہ تحقیق وتدقیق کا یہ اعلیٰ معیار جو محدثین نے قائم کیا ہے اگر یہ قابل قبول نہیں تو دنیا میں کس پر اعتماد کیا جائے؟ صحت وصداقت کے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟؟

(۳) حفظ حدیث :

اللہ تعالیٰ نے قوم عرب کو جس عظیم قوت حافظہ سے نوازا تھا، ذہنی وجسمانی صلاحیت عطا کی تھی، اس کی مثال دوسری قوموں میں نہیں ملتی ہے، انتہائی مشکل چیزوں کا یاد رکھنا ان کے لیے بازیچۂ اطفال تھا، قوم عرب کے طویل اور پرپیچ حسب ونسب کا یاد رکھنا ان کے لیے مشکل کام نہ تھا، بڑے بڑے عربی قصیدے جس کو وہ ایک مرتبہ سن لیتے تھے فوراً ذہن نشین ہوجاتا تھا، دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ (۳۳) کسی چیز کو یاد رکھنے کے لیے لکھنا باعث عار سمجھتے تھے۔

ایمان قبول کرنے کے بعد یہ خداداد صلاحیت انہوں نے دین وشریعت کی حفاظت کے لیے استعمال کی، اس فطری قوت کے ساتھ ساتھ کچھ روحانی اسباب بھی تھے جس کی بنیاد پر حدیث

---

(۳۲) حلیۃ الاولیاء (۷/۱۴۸-۱۴۹)

(۳۳) جامع بیان العلم (۱/۶۹)

رسول ﷺ کو یاد کرنے اور محفوظ کرنے کا اہتمام خصوصیت کے ساتھ کیا گیا مثلاً :

۱- وہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپ کی اہمیت اور رسالت کے مقام کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ رسول کی اطاعت وفرمانبرداری واجب اور ضروری ہے، آپ کی اطاعت کو وہ باعث نجات اور سمع وطاعت کو زندگی کا مقصد سمجھتے تھے ﴿یاأیها الذین آمنوا أطیعوا اللہ وأطیعوا الرسول﴾ (نساء : ۵۵۶) ''اے مسلمانوں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو'' اور ﴿إنما کان قول المؤمنین إذا دعوا إلی اللہ ورسوله لیحکم بینهم أن یقولوا سمعنا وأطعنا﴾ (النور : ۵۱) ''جب مومنین کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب فیصلہ کے لیے بلایا جاتا ہے تو وہ فوراً کہتے ہیں کہ ہم سننے اور اطاعت کے لیے تیار ہیں'' یعنی اس کے معنی ومفہوم پر بغیر کسی خارجی دباؤ کے عمل کرتے تھے۔

۲- ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کی باتیں منزل من اللہ ہیں ﴿وما ینطق عن الهوی إن هو إلا وحی یوحی﴾ (النجم : ۳) آپ اپنی خواہش سے بولتے بھی نہیں جو کچھ بولتے ہیں وہ وحی الٰہی ہے۔

۳- ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کا ہر عمل اللہ کے حکم اور اس کی نگرانی میں ہوتا تھا ﴿إن أتبع إلا ما یوحی إلی﴾ (انعام : ۵۰) میں تو بس انہیں چیزوں پر عمل کرتا ہوں جس کی وحی میری جانب کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حکم الٰہی ﴿لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوة حسنة﴾ (الاحزاب : ۲۱) بھی موجود تھا کہ ''تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی اسوہ اور نمونہ ہے'' اس کو اسوہ اور نمونہ بنانے کے لیے اس کی معرفت ضروری تھی ان سارے مقاصد کے حصول کے لیے آپ کی باتوں اور آپ کے افعال کو یاد رکھنا اور محفوظ رکھنا ایک منطقی اور بدیہی بات ہے۔

۴- ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ دین کو محفوظ رکھنا سب سے پہلے ان کی ذمہ داری ہے کیونکہ کتاب وسنت کے اولین مخاطب وہی تھے نیز وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس دین کو قیامت تک باقی رہنا ہے لہٰذا اس کی حفاظت ضروری ہے۔

۵۔ مزید یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنی باتوں کو یاد رکھنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کی تلقین کرتے رہتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے وفد عبدالقیس کو دین کی باتیں بتانے کے بعد جو حکم دیا تھا وہ ان کے سامنے تھا "احفظوهن وأخبروبهن من وراء کم" (۳۴) ''ان کو یاد کرلو اور غیر موجود لوگوں کو بتادو'' نیز یہ حکم بھی آپؐ نے ان کو دیا تھا کہ "فليبلغ الشاهد منكم الغائب" (۳۵) ''موجود لوگوں کو چاہیے کہ غیر موجود تک پہنچادیں''، یہ حکم آپ نے ایک طویل خطبہ دینے کے بعد دیا تھا۔

۶۔ آپ نے ان کو یہ بشارت بھی سنائی تھی کہ جو شخص رسول ﷺ کی باتوں کو یاد رکھے گا اور اس کو دوسروں تک پہنچائے گا اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو بارونق بنائے گا "نضر الله امرءا سمع مقالتي فحفظها ووعاهاثم أداها إلى من لم يسمعها" (۳۶)

نیز آپ نے فرمایا "تسمعون ويسمع منكم ويسمع عمن سمع منكم" (۳۷) تم مجھ سے سنتے ہو پھر تم سے سنا جائے گا، اور ان لوگوں سے بھی جنھوں نے تم سے سنا ہے۔ ان سارے اسباب کی بنیاد پر وہ آپ کی حدیثوں کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، اس کے لیے وہ آپ کی باتوں کو بہت غور سے سنتے تھے، آپ کے کاموں پر گہری نظر رکھتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم کسی سے قال رسول اللہ کہتے ہوئے سنتے تو ہماری نگاہیں بے ساختہ اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں اور ہم ہمہ تن گوش ہوجاتے تھے۔ (۳۸)

اندازہ لگائیے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی باتیں بتانے والے کی طرف اس قدر متوجہ ہوتے تھے تو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سننے کے لیے وہ کس قدر تڑپ اور جذبہ رکھتے

---

(۳۴) بخاری (۵۳)، مسلم (۱۷)

(۳۵) بخاری (۱۷۴۱)، مسلم (۱۶۷۹)

(۳۶) الاحسان (۱/۱۵۳)

(۳۷) الاحسان (۶۲)، المستدرک (۱/۹۵) سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ (۴/۲۹۰)

(۳۸) مقدمہ مسلم (۱/۸۱-۸۲)

رہے ہوں گے، بعض صحابہ نے آپ کی مجلسوں کی جو تصویر کشی کی ہے وہ اس پر واضح ثبوت ہے "كأن على روسهم الطير" (۳۹) یعنی اس سکون اور وقار سے لوگ آپ کی مجلس میں بیٹھتے تھے جیسے کہ سروں پر پرندہ بیٹھا ہو۔

۷ـ ان روحانی اور فطری اسباب نے ان کے معیار حفظ کو دوبالا کر دیا تھا۔

مزید یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ابتدائی دور میں حدیثوں کو قرآن کے ساتھ لکھنے کی جو ممانعت کی تھی یا وقتی طور پر جو عام ممانعت تھی اس کی وجہ بعض علماء کی نگاہ میں یہ تھی تا کہ حدیث رسول ﷺ کو اچھی طرح سے یاد کیا جائے، چنانچہ ممانعت کے ذکر کے بعد علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ "أراد به حفظ السنن دون الاتكال على كتبتها وترك حفظها" (۴۰) یعنی اُن کا مقصد یہ تھا کہ لوگ حدیثیں یاد کریں صرف لکھنے پر بھروسہ نہ کریں۔

صحابہ کرام اور محدثین عظام کے حفظ اور ان کی یادداشت کا نمونہ دیکھنا ہو تو اسلامی تاریخ کا روشن باب آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے جو آپ کو دعوت مطالعہ دے رہا ہے، بر سبیل مثال اس واقعہ پر غور کریں۔ صنعاء کا رہنے والا ایک شخص جس کا نام عبید بن عمیر تھا حضرت ابن عمرؓ کے پاس آیا اور یہ حدیث سنائی "مثل المنافق كشاة بين ربيضتين" تو عبداللہ بن عمرؓ جنہوں نے خود یہ روایت رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی انہوں نے فرمایا کہ اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے اس طرح نہیں بلکہ یوں ارشاد فرمایا ہے "مثل المنافق كشاة بين غنمين" (۴۱)

جب کہ دونوں روایتوں کے صرف الفاظ میں فرق ہے، معنیٰ کے ادا کرنے میں کوئی فرق نہیں، روایت بالمعنیٰ کرنا درست ہے کیوں کہ ربیض کے معنی غنم کے ہوتے ہیں جو معنی ربیضتین کا ہے وہی معنی غنمین کا ہے، علامہ ابن اثیرؒ فرماتے ہیں کہ "الربيض الغنم نفسها" (۴۲)

---

(۳۹) بخاری (۲۸۴۱)، المستدرک (۱/۱۲۰، ۱۲۱)، السنن الکبریٰ (۹/ ۳۴۳)

(۴۰) الاحسان (۱/ ۱۴۲)

(۴۱) مسند احمد (۲/ ۱۳۲) الکفایہ ص/ ۱۷۳

(۴۲) النہایۃ (۲/ ۱۸۵)

کہ ربیض غنم ہی ہے، لیکن اس کے باوجود حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حدیث کی تصحیح فرمائی اور جو لفظ رسول کی زبان مبارک سے سنا تھا اسی لفظ کو یاد کرنے اور بیان کرنے کی تلقین کی۔

ایسے ہی ایک شخص کو عبداللہ بن عمرؓ نے "بني الاسلام علي خمس" والی روایت سنائی جس میں یہ تھا "وأقام الصلاة وإيتاء الزكاة وصيام رمضان والحج" حدیث کو دہراتے وقت انہوں نے کہا کہ "إيتاء الزكاة والحج وصيام رمضان" حضرت ابن عمرؓ نے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ ایسے نہیں اللہ کے رسول ﷺ سے میں نے اس طرح سنا ہے "إيتاء الزكاة وصيام رمضان والحج" (۴۳)

یہی عبداللہ بن عمر حضرت ابو ہریرہ کے بارے میں یہ شہادت دیتے ہیں کہ "كان يحفظ على المسلمين حديث النبي ﷺ" (۴۴)

کہ وہ مسلمانوں کے لیے حدیث رسول ﷺ یاد کرتے تھے۔

یقیناً انہوں نے حدیث رسول ﷺ کے یاد کرنے کا حق ادا کیا اور صحابہ کرامؓ میں سب سے بڑے حافظ حدیث ٹھہرے، آپ نے مسند بقی بن مخلد کے تعداد کے مطابق (۵۳۷۴) روایتیں بیان کی ہیں۔

ہشام بن عامر رضی اللہ عنہ اپنے پڑوسیوں سے کہتے تھے کہ آپ لوگ دور دراز سفر کر کے دوسروں سے حدیث سننے جاتے ہیں وہ لوگ مجھ سے زیادہ آپ کی مجلس میں حاضر نہیں رہتے تھے اور نہ مجھ سے بہتر حدیثیں یاد کرتے تھے۔ (۴۵)

یہ جذبہ مسابقت کی تعبیر ہے جو حدیث یاد کرنے کے لیے صحابہ کرام میں موجزن تھا۔

حضرت ابوھریرہؓ کے حفظ حدیث کا ایک نمونہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مروان بن حکم نے آپ سے کچھ حدیثوں کے سنانے کی درخواست کی، اور پردے کے پیچھے اپنے کاتب کو بیٹھا دیا، آپ

---

(۴۳) مسلم (۱/۴۵)، الکفایہ (۱۷٦)

(۴۴) سیر أعلام النبلاء (۲/۴۲۵)

(۴۵) مسند احمد (۴/۱۲)

حدیث سنا کر کے چلے گئے، جب ایک سال کی مدت گزر گئی، تو مروان نے دوبارہ ان سے انھیں حدیثوں کے سنانے کی درخواست کی جب وہ آئے تو پھر اس نے اپنے کاتب کو اسی رجسٹر کے ساتھ بیٹھا دیا جس میں گزشتہ سال کی بیان کی ہوئی روایتیں موجود تھیں، حضرت ابو ہریرہ نے ان ساری روایتوں کو دوبارہ برجستہ سنا دیا جس کو پچھلے سال سنایا تھا۔ مشاہدہ کرنے والوں کا بیان ہے کہ "فما زاد ولا نقص ولا قدم ولا أخر" (۴۶) حدیث رسول کے کسی لفظ میں نہ کوئی کمی ہوئی نہ اضافہ، نہ تقدیم نہ تاخیر۔

کچھ صحابہ کرام ایسے تھے جو خاص موضوع کی روایتوں کو بہت اچھی طرح یاد رکھتے تھے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فتنوں کی روایتوں کے بارے میں متخصص سمجھے جاتے تھے، چنانچہ جب حضرت عمر نے پوچھا کہ فتنوں کے متعلق سب سے اچھی حدیثیں کس کو یاد ہیں تو حضرت حذیفہ نے کہا کہ مجھ کو ویسے ہی یاد ہیں جیسے رسول ﷺ نے بیان فرمائی ہیں۔ (۴۷)

حضرت جابرؓ حج کے مسائل میں مہارت رکھتے تھے، حضرت زیدؓ فرائض میں، عمرو بن حزمؓ صدقات میں، حضرت علیؓ قضا میں، ابی بن کعب قرأت قرآن میں۔

دیگر صحابہ کرام حدیث رسول کے یاد کرنے میں پیچھے نہ تھے وہ خود یاد کرتے تھے اور دوسروں کو یاد کرنے کی ہدایت دیتے تھے، حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ "کنا نحفظ الحديث والحديث يحفظ عن رسو ل الله" (۴۸) ہم لوگ حدیث یاد کرتے تھے کیونکہ حدیث رسول یاد کرنے کی چیز ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری نے اپنے صاحب زادے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "احفظ كما حفظنا عن رسول الله" (۴۹)

---

(۴۶) البدایہ والنہایہ (۱۰۶/۸)، سیر اعلام النبلا (۵۹۸/۲)

(۴۷) بخاری (۵۲۵)

(۴۸) مسلم (۸۱/۱ مع النووی)

(۴۹) صحیح جامع بیان العلم ص/۹۷

حضرت ابوسعید فرماتے ہیں کہ جیسے ہم نے رسول ﷺ سے یاد کیا ویسے تم بھی یاد کرو۔ (۵۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود الفاظ حدیث کو ضبط کرنے میں انتہائی سختی برتتے تھے، وہ اس پر اپنے شاگردوں کو تنبیہ کرتے رہتے تھے۔ (۵۱)

بلکہ وہ سارے صحابہ کرام اس دور میں جس میں وہ حدیث لکھنے کو ناپسند سمجھتے تھے وہ یاد کرنے ہی پر زیادہ زور دیتے تھے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلے لوگ حدیث لکھتے نہیں تھے بلکہ یاد کرتے تھے اگر کوئی کچھ لکھتا تھا تو وہ یاد کرنے کے لیے لکھتا تھا پھر مٹا دیتا تھا۔ (۵۲)

بہر حال صحابہ کرام نے رسول کے اقوال وافعال کا حق ادا کیا اور اس کو ہر طرح سے محفوظ کرنے کا انتظام کیا جس میں یادداشت کو سبقت حاصل ہے اور اسی پر ان کا اعتماد تھا۔

صحابہ کرام کے شاگردان عظام بھی اس مسئلہ میں پیچھے نہ رہے بلکہ حدیث رسول یاد کرنے کا اہتمام کیا، اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کے بعد میں آنے والوں کی قوت حافظہ کی تعریف کی تھی جو ان کے لیے ایک معجزانہ بشارت تھی وہ پوری ہوئی، آپ نے فرمایا کہ " ألا فليبلغ الشاهد منكم الغائب فرب مبلغ أوعى له من سامع" (۵۳) خبردار ہو جایئے! جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ غیر موجود لوگوں تک ہماری بات پہنچا دیں۔ بہت سے ایسے لوگ جن کو ہماری باتیں پہنچائی جائیں گی وہ اس کو مجھ سے سننے والوں کے مقابلہ میں زیادہ یاد کرنے والے ہوں گے۔

چنانچہ دور صحابہ کے بعد تابعین اور محدثین پر یہ بشارت صادق آئی اور انہوں نے حدیث رسول کی یادداشت کا ریکارڈ قائم کر دیا، یہ اس امت پر اللہ کا بڑا کرم اور احسان تھا غالباً یہ اس وعدے کا نتیجہ تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔

---

(۵۰) سنن دارمی (۱/۱۰۰) ، صحیح جامع بیان العلم ص/۶۷

(۵۱) تذکرۃ الحفاظ (۱/۱۳-۱۴) (۵۲) صحیح جامع بیان العلم ص/۶۷

(۵۳) بخاری (۲/۳۷۵، ۱۷۴۱)

ان قدوسی نفوس کے حالات وواقعات کا مطالعہ کرنے سے حفظ حدیث کا عجیب وغریب منظر سامنے نظر آتا ہے۔

امام قتادہ سدوسی (متوفی ۱۱۷ھ) امام زہری متوفی (۱۲۴ھ) امام سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) امام ابوزرعہ رازی متوفی ۲۶۴ھ) جب بازاروں میں نکلتے تھے تو کان بند کر لیتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نازیبا کلمات سماعت میں آجائیں اور پھر وہ ذہن سے نہ نکلیں، اس لیے کہ وہ جو سنتے تھے ہمیشہ کے لیے یاد ہو جاتی تھیں۔ (۵۴)

قتادہ سدوسی فرماتے ہیں کہ جو بھی چیز میری سماعت سے گزرتی ہے دل فوراً محفوظ کر لیتا ہے۔ (۵۵)

امام شافعی کی قوت حافظہ کے بیشمار واقعات ہیں انہوں نے موطا جیسی کتاب کو جس میں احادیث رسول کے علاوہ آثار واقوال اور بلاغات مالک وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں صرف تین دن میں یاد کر لیا تھا۔ (۵۶)

امام اہل سنت وجماعت امام احمد بن حنبل کی کتابیں بارہ اونٹوں کی بوجھ تھیں جو ساری کی ساری ان کو برزبان یاد تھیں۔ (۵۷)

امام ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں کہ پچاس سال قبل حدیث کی جو کتاب پڑھی تھی جس کو دوبارہ پڑھنے کا موقع بھی نہ مل سکا لیکن کون حدیث کس صفحہ اور کس سطر میں ہے مجھ کو آج تک یاد ہے۔ (۵۸) نیز وہ فرماتے تھے کہ مجھ کو دو لاکھ حدیثیں اس طرح سے یاد ہیں جس طرح کسی کو قل ھو اللہ احد یاد رہتا ہے۔ (۵۹)

---

(۵۴) تاریخ بغداد (۱۰/۳۳۲)، سیر اعلام النبلاء (۷/۲۷۲)، شذرات الذھب (۱/۱۵۴)، البدر المنیر (۱/۲۵۵)، جامع بیان العلم (۱/۶۹)

(۵۵) البدر المنیر (۱/۲۵۵) (۵۶) البدر المنیر (۱/۲۲۱)

(۵۷) مصدر سابق (۵۸) تاریخ بغداد (۷/۳۳۲)، تہذیب التہذیب (۷/۳۳)

(۵۹) سیر اعلام النبلاء (۱۳/۶۸)

امام اسحاق بن راہویہ نے ایک مرتبہ ۱۱ ہزار حدیثیں اپنے حافظے سے بیان کیا، پھر جب اس کو دوبارہ سنایا تو "فما زادو لا نقص حرفا" (۶۰)

سبحان اللہ! قربان جایئے اس قوت حافظہ پر جو اللہ تعالیٰ نے محافظین سنت کو عطا کیا تھا۔

ذرا بخاری رحمہ اللہ کے قوت حافظہ کا اندازہ کرنے کے لئے بغداد میں رونما ہونے والے بے مثال واقعہ کو بھی دیکھ لیجیے جو تاریخ بغداد میں (۲/۲) پر تفصیل سے موجود ہے، حافظ ابن حجر اس واقعہ کو تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں "هنا يخضع للبخاری ......" (۶۱) یہاں امام بخاری کے سامنے سر تسلیم خم ہو جاتا ہے۔

صحابۂ کرام کے شاگردوں کے ضبط حدیث کا ایک نمونہ بھی دیکھتے چلیں:

حضرت عائشہ کے شاگرد اسود نے حضرت عائشہ کے واسطہ سے ایک روایت بیان کی جو اس طرح سے ہے۔ "إن النبی ﷺ كان إذا قام من الليل فدخل إلى أهله فالم بهم، ثم اضطجع (ولم تقل نام) فاذا جاء المؤذن وثب (ولم تقل قام) ثم أفاض على نفسه (ولم تقل اغتسل)" (۶۲)

اسود کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے اس طرح سے روایت سنائی کہ اللہ کے رسول رات کو بیدار ہوتے تھے تو اپنے اہل کے پاس آتے پھر سو جاتے (انہوں نے یہاں 'اضطجع' کا لفظ استعمال کیا ہے نہ کہ 'نام' کا جب کہ دونوں کا معنی ایک ہے) پھر جب موذن اذان دیتا تو اٹھ جاتے (یہاں 'وثب' کا لفظ استعمال کیا نہ کہ 'قام' کا) پھر اپنے اوپر پانی ڈالتے یعنی غسل کرتے (یہاں پر 'أفاض على نفسه' کا لفظ استعمال کیا ہے نہ کہ 'اغتسل' کا) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس دقت اور باریکی سے حدیثوں کو یاد کیا جاتا تھا۔

(۳) مذاکرۂ حدیث:

حدیث کو یاد رکھنے کے لیے صحابہ و تابعین نے مذاکرہ علمیہ کا بڑا اہتمام کیا، جس میں پڑھی

(۶۰) البدر المنیر (۱/۲۲۳) (۶۱) ھدی الساری ص/۴۸۶ (۶۲) الکفایہ ص/۱۷۴

ہوئی حدیثوں کو یاد کیا جاتا، اس کی تکرار کرائی جاتی، اس کو دہرایا جاتا اس کے ذریعہ وہ اسے اتنا مضبوط یاد کر لیتے کہ وہ اچھی طرح سے دل ودماغ میں پیوست ہو جاتا تھا، اس کے لیے جو طریقہ انہوں نے اپنایا وہ فنائی الحدیث کے اعلیٰ نمونے ہیں، اس کو سن کر آج کا انسان یقین نہیں کر سکتا۔

حدیث کو پختہ یاد کرنے کے لیے وہ دوسروں کو سنانے کی کوشش کرتے تھے، اگرچہ وہ اس کا اہل نہ ہو، حتیٰ کہ اگر کوئی نہیں ملتا تو راستوں میں کھڑے فقراء ومساکین کو سناتے تھے، ورنہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو سناتے تھے، حتی کہ جانوروں کے سامنے پڑھنے اور سنانے کے نادر واقعات بھی ہیں۔

چنانچہ اسماعیل بن رجاء بچوں کو جمع کر کے ان کو حدیثیں سناتے تھے تاکہ اچھی طرح یاد ہو جائے۔ (٦٣)

یہی حال عطاء خراسانی کا تھا جو اگر کسی کو نہیں پاتے تو فقراء ومساکین کو سناتے تھے۔ (٦٤)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ہوتے تو آپ کی باتیں سنتے اور جب مجلس ختم ہو جاتی تو ہم سب اس کو دہراتے تھے اور ایک دوسرے کو سناتے تھے یہاں تک کہ وہ ذہن میں پیوست ہو جاتی تھی۔ (٦٥)

نیز فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی ہم ساٹھ افراد ہوتے تھے باری باری سارے لوگ ان حدیثوں کو سناتے تھے، پھر جب منتشر ہوتے تو وہ حدیثیں ہمارے ذہنوں میں پورح طرح بس جاتی تھیں۔ (٦٦)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس طرح ہم حدیث رسول اللہ ﷺ سے سن کر یاد کرتے تھے تم بھی اسی طرح یاد کرو، اور باہم مذاکرہ وتکرار کرتے رہو اس سے حدیثیں

---

(٦٣) سنن الدارمی (١/١٢٠)، جامع بیان العلم (١/١١١) (٦٤) طبقات ابن سعد (٦/٢٢٢)
(٦٥) الجامع لأخلاق الراوی ص ر ١٦٩ (٦٦) مجمع الزوائد (١/١٦١)

یاد رہتی ہیں۔ (٦٧)

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں کو تکرار اور مذاکرہ کی تلقین کرتے تھے۔ (٦٨)

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی اپنے شاگردوں کو نصیحت کرتے تھے، اور ان کے شاگردوں کا بھی یہی طریقہ رہا۔ (٦٩)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "تذاکروا الحدیث فإن حیاته مذاکرته" حدیث کو دہراتے رہو اس کا دہرانا اس کو زندہ رکھنا ہے۔

علقمہ سے بھی اس طرح کی بات منقول ہے۔ (٧٠)

ابراہیم نخعی اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ "من سره أن یحفظ الحدیث فلیحدث ولو أن تحدث به من لا یشتهیه" (٧١) ''جس کو حفظ حدیث سے دلچسپی ہے تو وہ اس کو دوسروں سے بیان کرے اگرچہ سننے والا اس کا خواہش مند نہ ہو۔

امام زہری فرماتے ہیں کہ علم کے لیے سب سے نقصان دہ چیز بھول جانا اور مذاکرہ کو چھوڑ دینا ہے۔ (٧٢)

اس قسم کے بے شمار اقوال وواقعات ہیں جو قابل شمار نہیں۔ (٧٣)

مذاکرہ علمیہ کا اہتمام محدثین کے یہاں اس قدر پایا جاتا تھا کہ انہوں نے اس کے آداب اور طور طریقہ بتانے کے لیے بحیثیت فن کتابیں تالیف کی ہیں، جن میں مذاکرہ کے آداب بہت اچھی طرح بیان کیے گئے ہیں۔ بطور مثال دیکھیے۔ (تذکرة السامع والمتکلم لابن جماعة)

---

(٦٧) طبرانی فی الاوسط وفی المجمع (١٦١/١)، ورجالہ رجال الصحیح، نیز دیکھیے سنن الدارمی (١١٩/١)

(٦٨) المحدث الفاصل ص/ ٥٤٥ (٦٩) جامع البیان ص/ ١٠٨/١

(٧٠) معرفۃ علوم الحدیث (١٤١) (٧١) مقدمہ ابن الصلاح ص/ ٢٢٨

(٧٢) سنن الدارمی (١٢١/١)، الفقیہ والمتفقہ (١٢٨/٢)

(٧٣) تفصیل کے لیے دیکھیے سنن دارمی (١١٩/١)، جامع بیان العلم (١٠٨/١)، الفقیہ والمتفقہ (١٢٨/٢)، الجامع لاخلاق الراوی ص/ ١٦٨، المحدث الفاصل ص/ ٥٤٥، مجمع الزوائد (١٦١/١)

اس علمی مذاکرہ ہی کا نتیجہ تھا کہ اس زمانے میں مسجدیں صدائے قال اللہ وقال الرسول سے گونج رہی تھیں، طلبہ کی بڑی بڑی تعداد ان میں درس حدیث لیتے اور مذاکرہ وتکرار کرتے، آج علم حدیث کی جو روشنی پھیل رہی ہے انہیں مجلسوں کی دین ہے، ہر طرف مسجدوں میں علمی حلقے نظر آتے تھے، اور طالبان علوم نبوت علم حدیث سے سیراب ہوتے تھے۔

چنانچہ جامع دمشق میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی مجلس لگتی تھی تو اس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ شریک ہوتے تھے۔ (۷۴)

اموی خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں مسجد حرام طالبان علوم نبوت سے کھچا کھچ بھری رہتی تھی، ایک مرتبہ اس خوشنما منظر اور علمی حلقوں کو دیکھ کر خلیفہ نے اپنی فرحت کا اظہار کیا اور پوچھا کہ یہ کن لوگوں کی مجلس ہے، لوگوں نے بتایا کہ عطاء بن ابی رباح، سعید بن جبیر، میمون بن مہران، مکحول شامی، مجاہد بن جبر وغیرہ کی مجلسیں ہیں۔ (۷۵) حدیثِ رسول پڑھنے پڑھانے کا اس قدر رواج ہوا کہ اسی کو علم کہا جانے لگا۔ جنھوں نے علم کے حصول کی بات کی تو انھوں نے اس سے مراد حدیثِ رسول ہی لیا۔

اس طرح سے سلف صالحین نے حدیث رسول کو یاد کیا اس پر عمل کیا اور دوسروں تک پہنچا دیا، شریعت کی حفاظت کا سارا دارومدار اسی حافظہ پر تھا، خواہ وہ قرآن ہو یا حدیث رسول، جن لوگوں کو حدیث رسول میں شکوک وشبہات محض اس بنیاد پر ہیں کہ وہ قرآن کی طرح تحریر نہیں کی گئی ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب قرآن کی پہلی وحی نازل ہوئی تو اس وقت وہاں کوئی کاتب وحی موجود نہ تھا، وہاں بھی انسانی دماغ وحافظہ ہی تھا، اس کے نزول کی اطلاع جب آپ نے اپنے مخصوص دوستوں کو دی تو کیا اس کو فوراً تحریر بھی کرایا اس پر واضح دلیل کی ضرورت ہے، ایسا لگتا ہے کہ کتابت وحی کا انتظام ابتدائی دور میں نہیں تھا اس کی بھی حفاظت کا دارومدار حافظہ پر تھا، کاتبین وحی میں سب سے اہم شخصیت حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی ہے جو مدینہ کے باشندے تھے۔

یہ بھی بالکل واضح ہے کہ ہر ایک کے پاس قرآن کے تحریر کردہ اوراق نہ تھے اور نہ اس کے

---

(۷۴) اصول حدیث علومہ ومصطلحہ ڈاکٹر عجاج ص ر ۱۰۲ (۷۵) اصول حدیث در عجاج خطیب ص ر ۱۰۲

مختلف نسخے رسول ﷺ نے تیار کرائے، جو بھی تحریریں تھیں وہ متفرق تھیں وہ بھی مختلف افراد کے پاس تھیں یہی وجہ ہے کہ جمع قرآن کے وقت کافی محنت اور جستجو کر کے ان اوراق کو تلاش کیا گیا تھا، قرآن کی بعض آتیں تلاش بسیار کے بعد تحریری شکل میں دستیاب ہوئیں۔ (۷٦)

البتہ اس کے یاد کرنے والے افراد بے شمار تھے جن کو اس زمانے میں ''قراء'' کہا جاتا تھا، جمع قرآن کی اصل وجہ جو حضرت ابوبکر صدیق کے زمانے میں ہوئی تھی اس میں حضرت عمر نے یہ کہا تھا کہ ''حفاظ کرام بکثرت جنگوں میں شہید ہو رہے ہیں مجھ کو خطرہ ہے کہ کہیں حفاظ کے ختم ہونے سے قرآن ضائع نہ ہو جائے لہٰذا اس کو جمع کرنا چاہیے اور اسی بنیاد پر اس کو جمع کیا گیا۔'' (۷۷)

صحابہ کرام قرآن کریم کو سن کر یاد کرتے تھے اور اپنے حافظہ سے دوسروں کو یاد کراتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک صحابی کا نکاح ایک عورت سے آپ ﷺ نے اس بنیاد پر کیا کہ ان کو قرآن زبانی یاد تھا، آپ نے کہا کہ اس عورت کو یاد کرادو یہی مہر ہے، آپ نے ان سے پوچھا "أتقرء هن عن ظهر قلبک قال نعم قال اذهب فقد ملکتکها بما معک من القرآن" (۷۸)

غور کیجیے آپ نے قرآن کی تحریر یا اس کا نسخہ ان سے نہیں دریافت کیا بلکہ ان کے حافظہ پر اعتماد کیا اور اسی حافظہ سے دوسرے کو یاد کرانے کے لیے کہا۔

یہ بھی بالکل واضح ہے کہ قرآن کریم کے اتنے نسخے نہیں تھے جتنے افراد پائے جاتے تھے، سوال یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن ایک دوسرے کو کیسے پڑھاتے اور پڑھتے تھے کیا اس کا سارا دارومدار حافظہ پر نہیں؟ وہ قوم جو پڑھنا نہیں جانتی تھی وہ نسخوں کو کس طرح پڑھ کر یاد کرتی تھی، جواب واضح ہے کہ اس کا سارا دارومدار حافظہ پر تھا جو قوم عرب کا طرۂ امتیاز ہے۔

یہی وہ قوت یادداشت ہے جس پر سنت کو محفوظ رکھنے کے لیے اعتماد کیا گیا، پھر سنتِ رسول کے قابل قبول ہونے میں کیا مانع ہے؟

بریں عقل و دانش بباید گریست

---

(۷٦) صحیح بخاری باب فضائل القرآن (۴۹۸٦) (۷۷) مصدر سابق (۷۸) بخاری (۵۰۳۰)

(۵) عمل بر حدیث :

حدیث رسول ﷺ کی حفاظت میں تعامل کا بہت بڑا دخل ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اقوال وافعال سیرت وکردار سے شریعت کی وضاحت فرمادی اور اللہ تعالیٰ نے رسول کی اتباع کو واجب اور آپ کے کردار کو مسلمانوں کے لئے اسوہ اور نمونہ بنایا ﴿لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ أسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللّٰہ والیوم الآخر﴾ (الاحزاب : ۲۱)

''رسول اللہ ﷺ کی سیرت وکردار میں ان لوگوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہے جن کو اللہ سے امید ہے اور قیامت پر جن کا ایمان ہے۔''

شریعت نے اعمال وکردار کو اتنا اہم قرار دیا ہے کہ اس کو ایمان کے ساتھ جوڑ دیا ہے، قرآن میں کتنے مقامات پر ﴿الذین آمنوا وعملوا الصالحات﴾ کہہ کر دونوں کی قربت کو واضح کیا گیا ہے، قیامت کے دن جزا وسزا کے لیے اعمال کو میزان قرار دیا ہے، اور اہل علم نے عمل کو قرآن اور سنت کی روشنی میں ایمان کا جزء قرار دیا ہے، جس کے عدم سے ایمان میں کمی لازم آتی ہے۔

نیز عمل کا جو اثر انسانی دل ودماغ پر ہوتا ہے وہ قول کا نہیں ہوتا، صلح حدیبیہ کے موقع پر جب اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو قربانی کرنے کا حکم دیا اور بال کٹانے اور حلق کرنے کی بات کی، تو سب خاموش رہے، لیکن جیسے ہی آپ نے اپنا حلق کرایا اور قربانی کی تو سارے لوگ اس عمل کے انجام دینے پر ٹوٹ پڑے۔ (۷۹)

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنے اعمال وعبادات پر نظر رکھنے کی تاکید کی تھی، اور اسی طرح کرنے کا حکم دیا جیسے رسول ﷺ کو کرتے ہوئے دیکھیں "صلوا کما رأیتمونی أصلی" (۸۰) نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھ کو پڑھتے ہوئے دیکھو۔'' "خذوا عنی مناسککم" (۸۰م) مجھ سے اپنا طریقہ حج سیکھ لو، بہت سارے مقامات پر اللہ کے رسول ﷺ نے صرف عمل کے ذریعہ مسائل اور احکام کو ذہن نشین کرایا،

---

(۷۹) السیرۃ النبویۃ لابن هشام (۳۱۹/۲) (۸۰) بخاری (۶۳۱) (۸۰م) مسلم (۱۲۹۷)

چنانچہ حضرت بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے نماز کے اوقات کے بارے میں سوال کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: "أقم معنا" ہمارے ساتھ قیام کرو، چنانچہ دو دن تک وہ وہاں رہے، آپ ﷺ نے پہلے دن اول وقت میں اور دوسرے دن آخری وقت میں پانچوں نمازوں کو ادا کیا دو دن گزرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: "أين السائل عن مواقيت الصلاة" نماز کے اوقات پوچھنے والا کہاں ہے؟ انھوں نے کہا اللہ کے رسول ﷺ میں حاضر ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: "مواقيت الصلاة كما بين هذين" ان دونوں اوقات (یعنی اول وقت اور آخری وقت) کے درمیان سب نماز کے اوقات ہیں۔ (۸۱)

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے لاعلمی میں جس طرح تیمم کیا تھا جب اس کو آپ کے سامنے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "إنما كان يكفيك هكذا وضرب بيديه الأرض ......" (۸۲)

''تمہارے لیے بس اتنا کافی تھا اور آپ نے زمین پر اپنے دونوں ہاتھ مارے پھر دونوں ہتھیلیوں کو ایک دوسرے پر پھیرا اس کے بعد چہرے پر دونوں ہاتھوں کو پھیرا اس طرح تیمم کا طریقہ عمل کر کے آپ ﷺ نے ان کو بتایا۔''

ایسی مثال صرف دینی مسائل و احکامات کے ساتھ مختص نہ تھی بلکہ دیگر امور میں بھی یہ نمونہ آپ نے پیش کیا، چنانچہ ایک مرتبہ آپ کا گزر ایک غلام کے پاس سے ہوا جو بکری کی کھال اتار رہا تھا لیکن جس سلیقہ سے کرنا چاہیے نہیں کر رہا تھا، آپ نے اس سے کہا ہٹ جاؤ، اس کے بعد آپ نے عملاً اس کی کھال اتار کر بتایا کہ اس طرح سے کھال اتاری جاتی ہے۔ (۸۳)

عمل کے ذریعہ جس طرح بات ذہن نشین ہو جاتی ہے وہ قول کے ذریعہ نہیں ہوتی،

---

(۸۱) مسلم (۶۱۳)، ترمذی (۱۰۲) (۸۲) بخاری (۳۳۸)

(۸۳) ابوداؤد (۱۸۵)، ابن ماجہ (۳۱۷۹) صحیح

قول قاعدہ اور تھیوری کی حیثیت رکھتا ہے اور فعل تجربہ اور پریکٹیکل کی حیثیت رکھتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شریعت پر عمل کرنے میں بھرپور توجہ دیتے، وہ سراپا کردار تھے، وہ شریعت کو محض عمل کرنے اور کرانے کے لئے ہی معلوم کرتے تھے، اور اپنے شاگردوں کو عمل کی تعلیم دیتے تھے۔

ابوحیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ وضو کیا، وضو سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ "أحببت أن أريكم كيف كان طهور رسول الله ﷺ" (۸۴) مجھ کو اچھا لگا کہ تم لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کا طریقہ وضو بتادوں۔

ابوسلمہ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی بھانجہ) فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھائی ان کے پاس گئے ان کے بھائی نے رسول اللہ ﷺ کا طریقہ غسل معلوم کرنا چاہا، تو انہوں نے غسل کر کے طریقہ بتادیا۔ (۸۵)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا اس حال میں کہ ہم جاہل تھے، سو اب ہم ویسے ہی کرتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (۸۶)

ابوعبدالرحمٰن سلمی فرماتے ہیں کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ جو قارئین قرآن تھے انہوں نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ یہ لوگ اللہ کے رسول ﷺ سے دس آیتیں پڑھتے تھے، اس سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے یہاں تک کہ اس میں جو احکام ہیں اس کو اچھی طرح سے سمجھ لیں اور اس پر عمل کریں اس طرح سے انہوں نے علم و عمل دونوں بیک وقت سیکھا۔ (۸۷)

---

(۸۴) ترمذی (۴۸) وقال حسن صحیح (۸۵) بخاری (۲۵۱)

(۸۶) نسائی (۳/۱۱۷) ابن ماجہ (۱۰۶۶) مسند احمد (۲/۹۴) شیخ احمد شاکر نے فرمایا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ تعلیق المسند (۸/۵۳)

(۸۷) اصول الحدیث علمہ و مصطلحہ ص/۶۰

عمل کا یہ جذبہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد ان کے شاگردوں اور دیگر ائمہ محدثین میں بھرپور طرح سے پایا جاتا تھا۔

عمرو بن قیس ملائی فرماتے ہیں کہ جب تم کو کوئی چیز ملے تو اس پر عمل کرلو خواہ ایک بار ہی کیوں نہ ہو، تم صاحب خیر ہو جاؤ گے۔ (۸۸)

امام وکیع بن جراح فرماتے ہیں کہ اگر حدیث رسول کو محفوظ رکھنا ہے، تو اس پر عمل کرو۔ (۸۹)

اس طرح ان بزرگوں نے اپنے شاگردوں کو یہ پیغام دیا کہ حدیث محفوظ رکھنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، اور اس کو انہوں نے بہت اچھے طریقے سے استعمال کیا۔

یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کا ماحول ومعاشرہ صاف ستھرا اسلامی معاشرہ تھا، جس میں انہوں نے نسلاً بعد نسل حدیث رسول کی عملی تشریح پیش کی، انہوں نے اپنی زندگی کو سنت رسول کی روشنی میں ڈھال لیا، انہیں کے اخلاق وعادات ماحول اور معاشرہ کو دیکھ کر کتنے لوگوں نے ایمان قبول کیا۔

عمل کا یہ تسلسل اتنا معتبر سمجھا گیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عمل اہل مدینہ کو بطور دلیل قبول کرلیا۔

(۶) تبلیغ حدیث :

حدیث رسول کی حفاظت کرنے میں نشر واشاعت اور تبلیغ کا بڑا اہم حصہ رہا ہے، جس کو صحابہ وتابعین، محدثین اور ائمہ دین نے بھرپور طریقہ سے استعمال کیا، ہر شخص جہاں جاتا وہ چلتا پھرتا ایک مدرسہ ہوتا، اپنی تبلیغ کی ذمہ داری بہت اچھی طرح سے ادا کرتا تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ طبقہ اہل علم پر اس کی ذمہ داری ڈالی ہے، اللہ کا فرمان ہے ﴿ فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم لعلهم

---

(۸۸) مقدمہ ابن الصلاح ص ر ۲۲۳، اختصار علوم الحدیث لابن کثیر ص ر ۱۰۷ (۸۹) مصدر سابق

یحذرون﴾ (توبہ : ۱۲۲) ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر جماعت میں سے کچھ لوگ دین کی سمجھ حاصل کرنے کے لیے نکلیں، جب قوم کی طرف واپس لوٹیں تو ان کو ڈرائیں تاکہ وہ برے کاموں سے بچیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے یہی حکم وفد عبدالقیس کے لوگوں کو بھی دیا تھا اور فرمایا تھا کہ "أخبروبهن من وراء كم" (۹۰) ''کہ ان باتوں کو پیچھے والے لوگوں کو جاکر بتادینا۔'' نیز حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے بڑے اہتمام سے وہاں موجود افراد سے یہ خطاب فرمایا تھا کہ "ألا ليبلغ الشاهد منكم الغائب" (۹۱) ''جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ہماری باتوں کو غیر موجود لوگوں تک پہنچادیں۔'' نیز آپ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ اگر دین کی معمولی بات بھی معلوم ہو تو انجان لوگوں تک اس کو پہنچادیں "بلغوا عني ولو آية" (۹۲) میں یہی حکم دیا گیا ہے۔

آپ نے ان تمام لوگوں کے لیے دعا فرمائی ہے جو آپ کی باتوں کو یاد کر کے دوسروں تک پہنچاتے ہیں "نضر الله امرءاً سمع مقالتي فحفظها و وعاها ثم أداها لمن لم يسمعها" (۹۳)

اس کے مقابلہ میں جو لوگ کتمان علم کرتے ہیں ان کی بڑی فضیحت بیان کی گئی ہے اور ان کو وعید شدید، لعنت وغضب کا مستحق قرار دیا گیا ہے، یہی حکم ہر اس شخص کا بھی ہے جس کو صحیح سنت رسول ﷺ معلوم ہو لیکن پھر بھی اس کے برخلاف لوگوں کو فتویٰ دیتا پھرے، اللہ کا فرمان ہے :

﴿إن الذين يكتمون ما أنزلنا من البينات والهدى من بعد ما بيناه للناس في الكتاب أولئك يلعنهم الله ويلعنهم اللاعنون﴾ (بقرہ : ۱۵۹) ''جو لوگ ہماری نازل کردہ وضاحتوں اور ہدایتوں کو چھپاتے ہیں جب کہ ہم نے اس کو کتاب میں واضح کردیا وہ ایسے لوگ ہیں جن پر اللہ کی اور دیگر لعنت کرنے والوں کی لعنت ہوتی ہے۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جو بکثرت لوگوں تک حدیثیں پہنچاتے تھے، کچھ لوگوں کو اس

---

(۹۰) بخاری (۵۳) (۹۱) بخاری (۱۰۵) (۹۲) بخاری (۳۴۶۱)

(۹۳) مسند احمد (۲/۸۰۰)، سنن دارمی (۱/۶۵)، مستدرک (۱/۸۷) معنیً متواتر ہے۔

کثرت پر اعتراض ہوا تو آپ نے اسی آیت کریمہ سے استدلال کیا اور کہا کہ یہ ہماری مجبوری ہے جو حدیثیں مجھ کو معلوم ہیں اگر اس کو نہ بیان کروں تو اس آیت کا خوف لگا رہتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "ولو لاآیتان من کتاب اللّٰہ ما حدثت حدیثا" (۹۴)

اگر قرآن کی دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث نہیں بیان کرتا، پھر آپ نے آیت پڑھ کر سنائی، وہ آیتیں یہ ہیں ﴿إن الذین یکتمون ما أنزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بینٰہ للناس فی الکتاب أولٰئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللّٰعنون إلا الذین تابوا وأصلحوا وبینوا فاولٰئک أتوب علیھم وأنا التواب الرحیم﴾ (بقرۃ : ۱۵۹-۱۶۰)

"جو لوگ ہماری اتاری ہوئی دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم اسے اپنی کتاب میں لوگوں کے لیے بیان کر چکے ہیں ان لوگوں پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے، مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں اور بیان کردیں تو میں ان کی توبہ قبول کرلیتا ہوں اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم وکرم کرنے والا ہوں۔"

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور علماء دین نے اس سلسلہ میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "لو وضعتم الصمصامة علی ھذہ وأشار إلی قفاہ ثم ظننت انی انفذ کلمة سمعت من رسول اللہ ﷺ قبل أن تجیزوا علی لأ نفذتھا" (۹۵)

"اگر مجھ کو یہ امید ہو کہ تلوار کے چلنے سے پہلے میں رسول ﷺ کی ایک بات بھی جو آپ سے سنا ہے پہنچا سکتا ہوں تو ضرور اس کو کہہ کر رہوں گا۔"

علامہ عسکری نے حضرت عبداللہ بن خباب کے قتل کا واقعہ ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے خوارج کو ایک حدیثِ رسول سنا ہی ڈالی، جس میں ان کے طریقوں پر ضرب کاری تھا، فتنوں کا ذکر کرنے پر رسول نے یہ فرمایا تھا کہ "القاعد فیھا خیر من القائم والقائم فیھا خیر من

---

(۹۴) بخاری (۱۱۸) (۹۵) بخاری معلقاً (۱/۱۶۰) مع الفتح

السماشي، والماشي خيرمن الساعي فكن عبدالله المقتول ولا تكن عبدالله القاتل"
خوارج نے کہا کیا تمھارے باپ نے رسول سے یہ روایت سنی ہے؟ اُنھوں نے کہا جی ہاں! چنانچہ وہ اُن کو دریا کے کنارے لے گئے اور قتل کر دیا۔ (۹۶) حالانکہ وہ یہ جانتے تھے ان کے سامنے اس روایت کے ذکر کرنے کا مطلب جان سے ہاتھ دھونا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کس طرح انجام سے بے پرواہ ہوکر ہر قسم کے خطرات کو دین کی نشر و اشاعت میں اٹھانے کے لیے تیار رہتے تھے۔

صحابیِ رسول حضرت ابوشریح خزاعی رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی گوش گزار کر لیں، جب مدینہ کے گورنر عمرو بن سعید بن عاص عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مکہ پر فوج کشی کرنے جا رہے تھے تو انہوں نے اس موقع پر جب کہ لوگ حکام کے خوف سے زبان نہیں کھولتے، فرمایا تھا کہ
"ائذن لی أیها الأمیر أحدثک قولا قام به النبی ﷺ الغد من یوم الفتح سمعته أذنای و وعاه قلبی وأبصرته عینای حین تکلم به ...... الخ (۹۷)

امیر محترم! میں آپ سے ایک بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں جس کو رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے دن فرمایا تھا، اس منظر کو میری نگاہوں نے دیکھا، میرے کانوں نے سنا، میرے دل و دماغ نے اس کو محفوظ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: مکہ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ نے حرم قرار دیا ہے کسی انسان نے نہیں کیا ہے، یہاں لڑائی کرنا، اس پر فوج کشی کرنا، یہاں کے درختوں کو کاٹنا ناجائز اور حرام ہے، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ : اگر کوئی شخص مکہ پر فوج کشی کرنے کے لیے میرے عمل سے استدلال کرے تو اس کو بتا دو کہ اللہ نے رسول کے لیے چند گھنٹوں (ظہر سے عصر تک) کے لیے فوج کشی کی اجازت دی تھی، دنیا میں اب اور کسی کو اجازت نہیں، اب اس کی حرمت ویسے ہی ہے جیسے پہلے تھی۔

ایسے ہی واقعہ حرہ کے موقع پر جب مدینہ کے بہت سے لوگوں نے یزید بن معاویہ کی

---

(۹۶) تصحیفات المحدثین ق ۴۲۶/۲ (۹۷) بخاری (۱۰۴)، مسلم (۱۳۵۴)

اطاعت سے سرتابی کی اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عبداللہ بن مطیع کے پاس گئے انہوں نے آپ کے لیے تکیہ لگوایا، اس وقت جب لوگوں کا عام مزاج نافرنی اور بیعت توڑنے کا ہو چکا تھا، اس کے خلاف کوئی کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتا، ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا ہوں بلکہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے ایک حدیث سنی ہے اس کو بتانے آیا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''جو شخص امیر کی اطاعت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے، وہ جب قیامت کے دن اللہ سے ملاقات کرے گا تو اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی، اور جو شخص کسی امیر پر بیعت کے بغیر وفات پاتا ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔'' (۹۸)

یہی اسلوب اور طریقہ سلف صالحین کا تھا، جنہوں نے حدیث رسول کی نشر واشاعت کے لیے انتہائی جرأت و بے باکی سے کام لیا، بلا کسی خوف و جھجک حدیث رسول کو لوگوں تک پہنچایا، انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا کے کونے کونے میں دین کی باتیں پہنچ چکی ہیں، اس طرح یہ علم محفوظ طریقے سے منتشر ہوتا رہا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنا سرکاری فرمان جو علماء کے لیے جاری کیا تھا اس میں یہ کہا تھا "ولیفشوا العلم ولیجلسوا لها، حتی یعلم من لا یعلم فان العلم لا یهلک حتی یکون سرا" (۹۹)

اہل علم کو چاہیے کہ وہ علم کو پھیلائیں، اس کے لئے مجلسیں قائم کریں تاکہ وہ شخص جو نہیں جانتا وہ بھی جان لے کیونکہ علم اس وقت تک نہیں ختم ہوگا جب تک اس کو راز نہ بنالیا جائے۔

صحابہ، محدثین، اور علماء امت کا یہ اسلوب روز روشن کی طرح عیاں ہے، اس کار خیر کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا، سفر وحضر، درس وتدریس، وعظ ونصیحت اور علمی حلقوں کے واسطے سے انہوں نے یہ کام بخوبی انجام دیا، اس طرح نشر واشاعت کے ذریعہ حدیث رسول کو محفوظ کر دیا۔

---

(۹۸) بخاری (۶۶۴۵)، مسلم (۱۸۴۸)   (۹۹) بخاری (۱/ ۱۹۴) مع الفتح

۷ - حفاظت حدیث کی کچھ اور تدبیریں

(ا) روایت کو پڑھنے پڑھانے میں احتیاط :

محدثین نے حدیث کو پڑھنے پڑھانے، املا کرانے، نسخ کرنے اور تحریر کرنے کے اصول وضابطے بنائے ہیں اور اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، پڑھنے اور پڑھانے کو ''تحمل اور ادا'' کہا جاتا ہے، اس کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں سب کی وضاحت کی ہے، اور اس کے بیان کے لیے خاص صیغہ متعین کر دیا ہے تاکہ سنتے ہی یہ پتہ چل جائے کہ وہ حدیث جس کو محدث یا راوی بیان کر رہا ہے اس کے درس کی نوعیت کیا تھی، تنہا پڑھا ہے یا جماعت کے ساتھ پڑھا، خود اس نے پڑھا، یا اس کے کسی ساتھی نے پڑھا اور اس نے سنا، یا اس کے استاذ نے پڑھا اور اس نے سنا، سنتے وقت تنہا تھا یا اس کے ساتھ کوئی اور تھا، استاذ کے روبرو بیٹھ کے سنا یا پردے یا کسی اوٹ کے پیچھے سے سنا، استاذ نے درس کے ارادہ سے پڑھایا تھا یا بات چیت اور مذاکرہ کرتے ہوئے حدیث سنائی، یا فتویٰ پر استدلال کیا تھا، ان سب کے لیے الگ الگ لفظ استعمال کیا ہے : مثلاً سمعت، حدثنی، حدثنا، أخبرنی، أخبرنا، أنبانا، قری علیه و أنا اسمع، قال له فلان، عن فلان وغیرہ۔

اگر استاد سے پڑھے بغیر ان کی کتاب سے پڑھ لیا یا ان کی کتاب مل گئی، یا استاذ نے حدیث پڑھانے کی یا اپنی کتاب اور مسموعات روایت کرنے کی اجازت دی، جس کو اجازہ، وجادہ، مناولہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔

جس کتاب سے پڑھا ہے وہ استاد کی کتاب تھی یا اس سے منقول کوئی نسخہ تھا، یہ نسخہ مقابل شدہ تھا یا نہیں وغیرہ اصول وضوابط ہیں جن کا لحاظ محدثین نے درس وتدریس، تصنیف وتالیف میں کیا ہے، سندوں کے درمیان جو صیغہ ادا ہیں وہ انہیں کیفیات پر غماز ہیں کوئی بھی مستند کتاب

دیکھیں گے تو سب سے پہلے یہی صیغہ ادا ہی ملے گا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے بہت سی حدیثوں کو جس کو مجلس درس میں نہیں سنا بلکہ مذاکرہ میں سنا ہے اس کو "حدثنا" کے بجائے "قال لی یا قال لنا فلان" سے تعبیر کیا ہے، اس طرح کی مختلف مثالیں کتاب میں موجود ہیں، "حدیث معازف" کو اسی طرح بیان کیا ہے "قال لی هشام بن عمار" اور پھر آگے کی سند و متن ذکر کیا ہے۔ (۱۰۰)

امام ابوداؤد نے حارث بن مسکین سے روایت پردے کے پیچھے سے سنا تھا اس کی وضاحت کے لیے وہ فرماتے تھے: "قری علیه وأنا اسمع"

ایسے ہی امام نسائی نے کہا جب ان کے استاد حارث بن مسکین کسی بنا پر ان سے ناراض ہو گئے تو اپنے درس میں آنے پر پابندی لگا دی، انہوں نے ایسی جگہ بیٹھ کر سنا کہ حارث بن مسکین ان کو نہیں دیکھ سکتے تھے، اس کے لیے امام نسائی نے "عن الحارث بن مسکین قرأة علیه وأنا أسمع" کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ (۱۰۱)

خطیب بغدادی کے استاد نے ان سے ایک روایت یوں بیان کیا "سمعت حین التحدیث عن أبی القاسم" خطیب بغدادی نے ان سے سوال کیا کہ آپ صراحت کے ساتھ "سمعت أبا القاسم" کیوں نہیں کہتے، انہوں نے جواب دیا کہ میرے استاذ حدیث کے پڑھانے میں بہت شدید تھے ہر ایک کو مجلس میں نہیں بیٹھنے دیتے تھے جس کو اس کے لائق سمجھتے تھے اسی کو اجازت شرکت دیتے تھے، چونکہ مجھ کو درس میں شرکت کی اجازت نہیں تھی اس لیے چھپ کر سنتا تھا لہذا صراحت کے ساتھ یہ صیغہ نہیں استعمال کرتا کیونکہ میرے استاد نے مجھ کو یہ روایت مجھے پڑھانے کے ارادہ سے نہیں بیان کیا ہے۔ (۱۰۲)

---

(۱۰۰) بخاری (۵۲۶۸)

(۱۰۱) فتح المغیث (۲/۱۶۱) نیز ملاحظہ ہو صیانۃ الحدیث للشیخ عبدالرؤف الرحمانی ص ۱۳۷

(۱۰۲) فتح المغیث (۲/۱۶۰)

یہ وہ دقیق سے دقیق تر اصول وضابطے تھے جن کو محدثین عظام نے حدیث کے پڑھنے اور پڑھانے کے لیے استعمال کیا ہے، جس کا مقصد حدیث رسول کو اچھی طرح سے محفوظ کرنا اور ہر قسم کے شکوک وشبہات سے اس کو بالاتر رکھنا تھا، احتیاط اور تعلیم حدیث کے یہ وہ اصول ضابطے تھے جس کو دنیا نے نہ تو اس سے پہلے سنا تھا اور نہ جانتی تھی اور نہ ہی استعمال کیا تھا۔

(۲) صرف (لفظ مسموع) سنے ہوئے لفظ کی روایت :

صحابہ کرام کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ سے جو لفظ سنا ہے اسی لفظ کو بیان کریں، روایت بالمعنی نہ کریں، ابوجعفر محمد بن علی فرماتے ہیں کہ : " لم یکن من أصحاب رسول ﷺ أحد إذا سمع من رسول الله ﷺ لا یزید فیه ولا ینقص ولا ولا" صحابہ کرام جب رسول اللہ ﷺ سے کچھ سنتے تھے تو کبھی بھی اس میں کمی وزیادتی نہیں کرتے تھے، جو سنتے تھے وہی بیان کرتے تھے۔ (۱۰۳)

اسی طرح محدثین عظام کی بھی یہی کوشش رہتی تھی کہ اپنے استاذ سے سنے ہوئے الفاظ ہی کو بیان کریں حالانکہ جمہور محدثین کے یہاں روایت بالمعنی بعض شروط کے ساتھ تو جائز ہے جس پر بعض محدثین کا عمل بھی رہا ہے لیکن ہر ایک اسی کو بہتر اور افضل سمجھتا تھا کہ استاذ سے جو لفظ سنا ہے اسی کو بیان کریں اور یہی احتیاط کا تقاضہ بھی ہے، امام سخاوی فرماتے ہیں کہ : "وبالجملة فیستحب أن یورد الأحادیث بألفاظها" (۱۰۴)

حضرت عبداللہ بن عمر نے ایک شخص کو ایک روایت سنائی، انہوں نے اس روایت کو دوبارہ پڑھتے وقت روایت بالمعنی کر دیا تو حضرت ابن عمر نے ان کو فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ اللہ کے رسول نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا ہے جس کو تم استعمال کرتے ہو۔

اللہ کے رسول ﷺ نے " مثل المنافق کشاة بین غنمین" عرض کیا تھا۔ ابن عمر کے شاگرد نے اس کی تعبیر "مثل المنافق کشاة بین ربیضین" سے کر دی۔ ابن عمر نے کہا کہ

---

(۱۰۳) الکفایۃ ص ۱۷۱ (۱۰۴) فتح المغیث (۳/ ۱۴۷)

ایسا نہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے "بين غنمين" کہا ہے نہ کہ "بين ربيضين" (۱۰۵)

امام دارمی فرماتے ہیں کہ ابن عمر رسول سے جو سنتے تھے اس میں اضافہ، کمی و بیشی اور کوتاہی نہیں کرتے تھے۔

علامہ ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) کا بھی یہی طریقہ تھا، بلکہ یہ ان محدثین کو جو روایت بالمعنی کے قائل تھے ان کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ "لو حد ثوابه كما سمعوه كان خيرا لهم" (۱۰۶) جس طرح سنا ہے اگر ویسے بیان کرتے تو اچھا ہوتا۔

ابو معمر فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی میں حدیث کو ملحون سنتا ہوں، مسموع کی اتباع کرتے ہوئے ملحون (اعراب کی غلطی کے ساتھ) ہی روایت کرتا ہوں۔ (۱۰۷)

اسی طرح سے عبدالرحمٰن بن مھدی انتہائی محتاط تھے صرف وہی لفظ بیان کرنا پسند کرتے تھے جس کو استاذ سے سنا ہے۔ (۱۰۸)

اگر کوئی لفظ بذات خود نہیں سن پاتے بلکہ اپنے کسی ساتھی سے معلوم کئے ہوتے تو اس کی بھی وضاحت کرتے، یہ سب کارنامے مجرد احتیاط کی وجہ سے انجام دیے گئے، چنانچہ حضرت ابن عمر میقات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "ذكر لي ولم أسمع أن رسول الله ﷺ قال : ويهل أهل اليمن من يلملم" (۱۰۹)

اسی طرح سے حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے۔

حضرت جابر بن سمرہ فرماتے ہیں کہ "سمعت النبي ﷺ يقول:يكون اثنا عشر أميرا فقال كلمة لم أسمعها فقال أبي إنه قال : كلهم من قريش" (۱۱۰)

یعنی كلهم من قريش کا جملہ رسول سے نہیں سن سکے بلکہ ان کے والد نے ان کو بتایا تھا لہٰذا اس کی وضاحت فرمادی۔

---

(۱۰۵) مسند احمد (۲/۳۲)، سنن دارمی (۳۲۴) (۱۰۶) سنن دارمی (۱/۷۹)
(۱۰۷) مصدر سابق (۱۰۸) فتح المغیث (۳/۱۷۴)
(۱۰۹) مسلم (۱۱۸۲) (۱۱۰) مسلم (۱۸۲۱)

یزید بن ہارون، عبداللہ بن سرجس کی روایت کو جو دعاء سفر سے متعلق ہے اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ "أخبرنا عاصم وثبتنی شعبة عن عبداللّٰہ بن سرجس قال کان رسول اللّٰہ ﷺ إذا سافر قال ...... الخ" عاصم نے عبداللہ بن سرجس کے واسطہ سے ہم کو خبر دی جس کی وضاحت شعبہ نے کیا۔

اسی طرح حدیث "اشرف النبی ﷺ علی قتلی احد" کے بارے میں علی بن حرب کہتے ہیں کہ "حدثنا سفیان بن عیینة، عن الزهری وثبته معمر، عن أبی الصعیر، قال أشرف النبی ﷺ ...... الخ" (۱۱۱) زہری نے ابو صعیر سے روایت کیا جس کی وضاحت معمر نے کی۔

اندازہ لگایئے کہ کس طرح صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ، اور ان کے شاگردوں و محدثین نے حدیث رسول کے بیان کرنے میں احتیاط سے کام لیا ہے تا کہ حدیث رسول ہر طرح کے شکوک وشبہات سے بالاتر رہے۔

(۳) صرف مقدار مسموع کی روایت :

اسی سے ملتی جلتی ایک احتیاطی تدبیر یہ بھی تھی کہ سنی ہوئی روایت جس مقدار میں سنتے تھے اگرچہ اس کے معنی ومفہوم میں کوئی خامی یا کمی رہ جاتی تھی تو اسے اس کمی کے ساتھ روایت کرتے تھے اس لیے کہ رسول ﷺ سے یا اپنے استاذ سے اتنا ہی سنا ہے، مثلاً حضرت ابوجہیم رضی اللہ عنہ کی روایت "لو یعلم المار بین یدی المصلی ماذا علیه من الإثم لکان إن یقف أربعین خیرا له من أن یمر بین یدیه"

ابوالنضر فرماتے ہیں کہ "لا أدری أقال أربعین یوما أو شهرا أو سنة" (۱۱۲)

یعنی مصلی کے سامنے سے گذرنے والے کو یہ معلوم ہوتا کہ اس پر کیا گناہ ہے تو وہ گذرنے کے بجائے چالیس تک ٹھہرا رہتا، ابوالنضر (اس کے راوی) فرماتے ہیں کہ مجھ کو معلوم نہیں چالیس دن کہا یا چالیس ماہ، یا چالیس سال۔

---

(۱۱۱) الکفایۃ (۲۱۸) (۱۱۲) بخاری (۵۱۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک روایت بیان کی کہ "ما بين النفختين اربعون، قالوا أربعون يوما؟ قال : أبيت، قالوا أربعون سنة؟ قال: أبيت، قالوا أربعون شهرا؟ قال : أبيت" (۱۱۳)

دو صور پھونکنے کے درمیان کی مدت چالیس ہے، لوگوں نے کہا کہ چالیس دن، حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ (مدت کی تعیین سے) مجھ کو انکار ہے، پھر لوگوں نے کہا چالیس سال، کہا پتہ نہیں، پھر لوگوں نے کہا چالیس ماہ، کہا معلوم نہیں۔

(۴) شبہات کا ذکر :

ایسے ہی کسی لفظ کے بارے میں شبہ ہو جاتا تھا تو شبہ کے ساتھ ہی روایت کرتے تھے۔ مثلاً امام شافعی کو ایک روایت میں شبہ ہو گیا جس کو آپ نے امام مالک سے روایت کیا تھا، چنانچہ شبہ کے ساتھ اس طرح روایت بیان کیا کہ "حتى ياتي خازني من الغابة أو جاريتي من الغابة" (۱۱۴) اس کے بعد فرمایا کہ میں امام امالک سے بغیر شبہ کے صحیح پڑھا تھا پھر طویل وقفہ گذر گیا لہٰذا اس میں مجھ کو شبہ ہو گیا۔

اسی طرح تقدیم و تاخیر میں شبہ ہونے پر اس کی وضاحت کر دی، چنانچہ ایک روایت جو ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "أهل بيتي والأنصار عيبتي و كرشي، أو كرشي و عيبتي" یہاں راوی کو تقدیم و تاخیر میں شک ہو گیا، چنانچہ اسی شک کے ساتھ انہوں نے بیان کیا، حالانکہ معنی میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

ابن عمر کی ایک روایت میں ہے کہ "او سعوا على أنفسكم إذا وسع الله عليكم، أو إذا وسع الله عليكم فأوسعوا على أنفسكم"

عاصم جو ابن سیرین کے شاگرد ہیں فرماتے ہیں کہ "لاأدري أيهما بدأ" (۱۱۵)

---

(۱۱۳) بخاری (۴۸۱۴)، نیز دیکھیے فتح الباری (۸/۵۵۲)

(۱۱۴) صیانۃ الحدیث ص/۱۳۵ (۱۱۵) الکفایہ ص ۱۷۷-۱۷۸

مجھ کو پتہ نہیں کس لفظ سے شروع کیا تھا چنانچہ اظہار شک کے ساتھ ہی بیان کیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ " كان النبي ﷺ إذا خرج لحاجته تبعته أنا و غلام معنا عكازة، أو عصا، أو عنزة و معنا إداوة " (۱۱۶)

اللہ کے نبی ﷺ جب قضائے حاجت کے لیے نکلتے تو میں اور ایک بچہ آپ کے ساتھ جاتا ہمارے ساتھ (عکازۃ، یا عصا یا عنزہ یعنی) ایک چھڑی اور پانی کا لوٹا ہوتا، یہاں پر تین کلمہ ہم معنی ذکر کیا کیونکہ کسی راوی کو لفظ میں شبہ ہو گیا، تمام سننے والوں نے پھر اس کو اسی طرح روایت کیا۔

اسی طرح حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ " كان رسول الله ﷺ يأخذ هذا الرحل فيعدله فيصلي إلى آخرته، أو قال موخره " (۱۱۷)

یہاں بھی راوی کو "آخرته اور موخره" میں شبہ ہو گیا لہٰذا دونوں کلموں کا ذکر کر دیا، حالانکہ دونوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں کتب حدیث میں موجود ہیں جو اس امر پر غماز ہیں کہ حدیث رسول کی حفاظت میں کوئی کسر باقی نہیں۔

(۵) روایت حدیث میں چستی :

اسی احتیاط کا ایک منظر یہ بھی ہے کہ وہ روایت کے بیان کرنے، پڑھنے اور پڑھانے میں انتہائی چاق و چوبند ہوتے، نشاط اور چستی رکھتے، کسی طرح کی غفلت اور سستی ناقابل قبول ہوتی تھی سست اور کاہل مغفل اور لاپرواہ کی روایت خواہ وہ پڑھے یا پڑھائے کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہوتی ہے بلکہ ضعیف مانی جاتی ہے۔

نشاط و چستی کو دوبالا کرنے کے لیے درس سے پہلے غسل کرنا، باوضو ہونا، خوشبو لگانا اور وقار کے ساتھ مجلس درس میں آنا، اہتمام سے بیٹھنا وغیرہ عام عادت تھی، چلتے پھرتے سنی ہوئی حدیث کو قابل درس و تدریس نہیں سمجھا جاتا تھا، درمیان درس کسی بھی چیز سے شغف رکھنا معیوب سمجھا جاتا

---

(۱۱۶) بخاری (۱/۵۷۵) (۱۱۷) بخاری (۵۰۷)

تھا، اوصاف حمیدہ کا خیال رکھا جاتا تھا، معنی ومفہوم کو سمجھ کر دل وجان سے بیان کیا جاتا وغیرہ اسی اہتمام پر دلالت کرتی ہیں۔

عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ عام طور سے میں عبداللہ بن مسعود کے پاس جمعرات کی شام کو آیا کرتا تھا لیکن کبھی ان سے قال رسول اللہ ﷺ کہتے ہوئے نہیں سنا، ایک شام کو انہوں نے عرض کیا قال رسول اللہ ﷺ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کی حالت بالکل دگرگوں تھی، قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے، آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے رگیں پھولی ہوئی تھیں پوری حدیث بیان کرتے وقت لگ بھگ یہی کیفیت برقرار رہی۔ (۱۱۸)

جی ہاں! قال رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری کا احساس سلف صالحین کو ایسے ہی تھا یہ بدلی ہوئی کیفیت اس وجہ سے نہیں تھی کہ آپ کو حدیث رسول یاد نہ تھی یہ ذمہ داری کا زبردست احساس تھا کہ کہیں خدانخواستہ سہو ہو جائے تو قیامت تک کے لیے اس کا وبال اپنے اوپر آئے گا۔

امام مالکؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ دوران درس ڈاڑھی میں بچھو داخل ہو گیا درمیان درس کئی مرتبہ ڈنک مارا لیکن حدیث رسول کا یہ اہتمام کہ اف تک نہ کیا حالانکہ حالت تکلیف سے پریشان کن تھی۔ یہی امام مالک ہیں جب تک باوضو ہو کر خوشبو وغیرہ سے فارغ نہ ہو جاتے درس میں نہیں آتے۔ (۱۱۹)

امام بخاری رحمہ اللہ کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ صحیح بخاری کی حدیثوں کے انتخاب کے وقت سارے اصول وضوابط پرکھنے کے بعد غسل فرماتے۔ دو رکعت نماز پڑھتے، رب العزت سے استخارہ کرتے پھر حدیث رسول ''صحیح بخاری'' میں تحریر فرماتے۔ (۱۲۰) یہ سب اسی اہتمام کے نادر نمونے ہیں۔

تاریخ رجال کی ورق گردانی کیجیے ایک سے ایک مثالیں آپ کو ملیں گی۔ یہ واقعات تو محض بطور مثال بیان کیے گئے ہیں۔

---

(۱۱۸) مسند احمد (۶/۴۶۲) (۱۱۹) الباعث الحثیث ص ۱۴۷

(۱۲۰) طبقات الشافعیہ (۲/۷)

(۶) قلت تحدیث (کم سے کم روایت سنانا) :

احتیاط کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ بہت سارے صحابہ کرام کم از کم روایت کرنے کو افضل اور بہتر سمجھتے تھے، چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن زبیر نے اپنے والد حضرت زبیر بن عوام سے سوال کیا کہ آپ دوسرے لوگوں کی طرح کیوں حدیث نہیں بیان کرتے، انہوں نے جواب دیا کہ ایسا نہیں کہ میں رسول ﷺ کے ساتھ نہیں رہتا تھا یا آپ کی باتیں مجھ کو معلوم نہیں لیکن میں نے آپ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار" (۱۲۱)

لہٰذا وہ اس بنیاد پر حدیث رسول بیان کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے اور کم از کم روایت بیان کرتے تھے ان کا یہ خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے جس انداز میں اور جس مخرج کے ساتھ حدیث سنائی ہے ممکن ہے کہ ویسا مجھ سے نہ ادا ہو سکے تو میں بھی اس حدیث کے زد میں آجاؤں۔

ابن ابی لیلیٰ (متوفی ۸۶ھ) فرماتے ہیں کہ تقریباً ایک سو بیس انصار صحابہ کرام سے میری ملاقات ہوئی ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ ان کو حدیث نہ بیان کرنا پڑے بلکہ ان کا کوئی ساتھی اس کام کو انجام دیدے تو بہت بہتر ہوتا۔ (۱۲۲)

یہ مجرد اس ذمہ داری کا احساس تھا جو حفاظت حدیث کے تعلق سے ذہن میں پیوست ہو چکا تھا اسی بنا پر ان میں سے ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ کوئی دوسرا اس کو پورا کر دیتا کوئی نہیں چاہتا کہ بیان کی ذمہ داری اس پر آئے کیونکہ خدانخواستہ بیان میں کوئی غلطی ہو جائے یا سہو ہو جائے یا سننے والے انداز کلام سے کچھ اور سمجھ بیٹھیں تو اس کا خمیازہ بیان کرنے والے پر نہ آجائے لیکن جب ضرورت پڑتی تھی تب مجبوراً بیان کرتے تھے۔

خاص طور سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی موقف تھا کہ کثرت روایت سے اجتناب کیا جائے چنانچہ قرظہ بن کعب (متوفی ۵۰ھ تقریبا) فرماتے ہیں کہ جب ہم عراق گئے تو حضرت عمر

---

(۱۲۱) بخاری (۱۰۷-۱۰۸) (۱۲۲) سنن دارمی (۱۳۷)

نے ہم کو یہ وصیت کی "جودوا القرآن، واقلوا الروایۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" (۱۲۳) یعنی قرآن کو اچھی طرح سے پڑھو اور احادیث رسول کو کم از کم بیان کرو۔

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا خوف تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرنے میں لوگ غلطی نہ کر بیٹھیں، اس لئے قلت روایت کی ترغیب دیتے تھے۔ (۱۲۴)

صاحب انعام المنعم الباری شرح ثلاثیات بخاری فرماتے ہیں کہ : بعض صحابہ کرام نے کثرت روایت سے اس لیے پرہیز کیا ہے کیونکہ اس سے خطا کا امکان زیادہ ہوتا ہے، اور جن لوگوں نے بکثرت روایت کیا ہے تو وہ اس امر پر محمول ہے کہ ان کو اپنے اوپر اعتماد تھا۔ (۱۲۵)

کبھی کبھی روایت کم پڑھنے اور پڑھانے کی وجہ یہ بھی ہوتی تھی تا کہ اس کو اچھی طرح سے یاد کر لیا جائے۔

امام مالک رحمہ اللہ اپنے استاذ نافع (مولی ابن عمر) سے چند حدیثیں ہی پڑھتے تھے، پھر سبق بند کر دیتے اور وہ بذات خود چھ، سات حدیثوں سے زیادہ نہیں پڑھاتے تھے۔

مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ : محدثین کرام اور ائمہ حدیث نے خود بھی تھوڑا تھوڑا حاصل کیا، اور تھوڑا تھوڑا اپنے تلامذہ اور رفقاء کو بھی سنایا، کہ کمال ضبط وحفظ روایت ان کے نزدیک مقصود اصلی تھا اس سے زیادہ حصول ضبط وحفظ اور غایت احتیاط کیا ہوگی۔

امام شعبہ، معمر، ابن علیہ وغیرہ کے متعلق خطیب نے یہ نقل کیا ہے کہ یہ اپنے مشائخ سے صرف چار چار احادیث کا سماع کر کے واپس آجاتے تھے تا کہ ان حدیثوں کو اچھی طرح ذہن نشین ومحفوظ کر لیں۔ (۱۲۶)

---

(۱۲۳) جامع بیان العلم (۲/۱۲۰-۱۲۱) (۱۲۴) تذکرۃ الحفاظ (۱/۴)

(۱۲۵) صیانۃ الحدیث ص/۱۶۶ (۱۲۶) صیانۃ الحدیث (۱۴۲)

۸ - تدوین حدیث

(ا) دورِاول، دورِرسول :

قوم عرب کواللہ تعالی نے جو صلاحیت عطا کی تھی وہ کسی دوسری قوم کونہیں دیا تھا، ان کی فہم وفراست اورقوت حافظہ ضرب المثل تھی اپنی قوت حافظہ پران کواس قدر ناز تھا کہ وہ کسی چیز کو تحریر کرنا اپنے لیے باعثِ عار سمجھتے تھے، جو چیزیں بہت اہم ہوتی تھیں ان کوان کی اہمیت بتانے اور بطور ثبوت پیش کرنے کے لیے تحریر کرتے تھے نہ کہ بھول جانے کے خوف سے، مثلاً آپسی معاملات وغیرہ کی دستاویز، اسی طرح سے جو چیز ان کو بہت زیادہ پسند ہوتی تھی اس کو بھی عزت افزائی کے لیے تحریر کرتے تھے بلکہ مزید عزت دیتے ہوئے خانۂ کعبہ میں لٹکا دیتے تھے جیسے سبعہ معلقہ، ایسے ہی کسی چیز کو عام کرنے کے لیے تحریر کر کے خانہ کعبہ میں لٹکا دیا جاتا تھا، جیسے رسول اللہ ﷺ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے خلاف دوسرے لوگوں کا یکجا ہونا اوران کا بائیکاٹ کرنے کا معاہدہ۔

اس طرح کی چیزوں کی ضرورت ان کوکبھی کبھار ہی پیش آتی تھی، دینی مسائل ومعاملات رسم ورواج کی شکل میں تھے جن پران کا عمل تھا، لکھنے کی ضرورت نہ تھی بہر حال کسی چیز کوتحریر میں لانے کا مقصد یہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ اگر وہ چیز تحریر میں نہیں آئے گی تو بھول جائیں گے اور ناقابل اعتماد ٹھہرے گی بلکہ اظہار اہمیت، دستاویزی ثبوت، اظہار پسندیدگی اور تشہیر ہی عام طور سے تحریر کا سبب ہوتا تھا چوں کہ اس کی ضرورت شاذ ونادر ہی ہوا کرتی تھی اس لیے وہ پڑھنے لکھنے کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ ہی ضرورت محسوس کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لکھنے والے حضرات صرف خال خال پائے جاتے تھے وہ بھی مکہ مکرمہ جیسے ثقافتی ودینی مرکز میں مدینہ والے اس سے بالکل ناواقف تھے جیسا کہ شیخ صفی الرحمٰن صاحب نے الرحیق المختوم صفحہ ۱۸۵ پرذکر کیا ہے۔

رغبت تحریر :

لیکن جب قرآن کریم کا نزول ہوا اور پہلی ہی وحی میں علم، تعلیم، تعلم، اسباب علم کا چرچا ہوا اور قلم کے استعمال کا اشارہ ملا، اسباب تعلیم کے اپنانے کی رغبت دی گئی اور کہا گیا ﴿ اقرأ وربک الأکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم ﴾ (علق : ۴-۵) پڑھو تمہارا رب کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور انسان کو وہ باتیں بتائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اور منصب رسالت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ﴿ویعلمهم الکتاب والحکمة﴾ (جمعہ : ۲) آپ کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور جب تعلیم کے لیے پہلے ہی قلم کے استعمال کی جانب اشارہ کر دیا تو معلوم ہوا کہ کتاب وحکمت کی تعلیم میں قلم کا بڑا دخل ہے جس پر تاریخ شاہد ہے۔ قلم کا یہ مقام تھا کہ بدر کے کافر قیدیوں کو جو لکھنا جانتے تھے محض اس بنیاد پر رہا کر دیا گیا کہ وہ دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے علم کے فوائد وفضیلت پر روشنی ڈالی بلکہ اس کے حصول کو ہر مسلمان کے لیے فرض قرار دیا گیا "طلب العلم فریضة علی کل مسلم" (۱) علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

جس وقت لکھنے اور پڑھنے پر اتنا زیادہ زور دیا جا رہا تھا اس وقت مسلمانوں کے پاس کتاب وسنت کے علاوہ اور کوئی خاص چیز لکھنے اور پڑھنے کی نہیں تھی اگر وہ ان دونوں چیزوں کو نہ لکھتے پڑھتے تو علم کی تمام فضیلتیں اور تعلیم کی تمام کوششیں رائیگاں جاتیں۔

ابتدائے تحریر :

اللہ کے رسول ﷺ نے بہ نفس نفیس قرآن کریم کے تحریر کرانے کا اہتمام کیا تو صحابہ کرام میں سے ان لوگوں نے جو لکھنا سیکھ چکے تھے حدیث رسول تحریر کرنا شروع کر دیا اس لیے کہ قلم کے استعمال کرنے کی ہدایت بغیر کسی تفریق کے ﴿ علم بالقلم ﴾ اور ﴿ قل علمها عند

---

(۱) امام بیہقی نے حضرت انس سے اور امام طبرانی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔
صحیح الجامع الصغیر وزیادتہ نمبر ۳۹۱۳

ربـی فـی الکتـاب﴾ (طٰہٰ : ۵۲) میں مل چکی تھی جس سے اشارہ ملتا ہے کہ چیزوں کا تحریر کرنا مجرد نسیان کے خوف سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے اور مقاصد ہوتے ہیں اگر یہ کتاب (لوح محفوظ) نہ بھی ہوتی تو بھی اللہ رب العزت کسی چیز کو نہیں بھولتا، جو صحابہ کرام حدیث رسول تحریر کرتے تھے وہ سنت کی اہمیت، اس کی افادیت اور اس رغبت کی وجہ سے کرتے تھے جو سیرت رسول میں واضح ہے، اس لیے نہیں لکھتے تھے کہ وہ بھول جائیں گے۔

تکنیکی غلطی و ممانعت تحریر :

لیکن ان تحریر کرنے والے صحابہ کرام سے ایک تکنیکی غلطی ہوگئی وہ یہ کہ سنت رسول کو انہیں اوراق پر لکھنے لگے جن پر قرآن کریم لکھتے تھے اللہ کے رسول ﷺ نے جب یہ دیکھا تو اس خوف سے کہ کہیں قرآن و حدیث خلط ملط نہ ہو جائے حدیث لکھنے سے منع کر دیا بلکہ جو تحریریں ان اوراق پر تھیں جن پر قرآن کریم بھی تحریر تھا مٹانے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ ﴿لا تـکتبـوا عـنـی شیئـا سـوی القرآن ومن کتب فلیمحہ﴾ (۲) قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ تحریر نہ کرو جس نے کیا ہے وہ مٹا دے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ ممانعت ان لوگوں کے لیے تھی جو کتاب و سنت کو ایک جگہ لکھتے تھے۔ (۳)

اسباب ممانعت :

اس ممانعت کے دوسرے اسباب بھی ہو سکتے ہیں، مثلاً یہ بھی ممکن ہے کہ ممانعت کی وجہ یہ رہی ہو کہ کہیں تحریر کی ایسی عادت نہ پڑ جائے کہ حافظہ پر سے اعتماد اٹھ جائے گویا اس میں بقول ابن حبان، قوت حافظہ پر اعتماد کی تلقین تھی۔ (۴)

حالانکہ یہ سبب کمزور معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے پاس لکھنے کی دو ہی چیزیں تھیں کتاب اور سنت کتاب اللہ کو رسول اللہ ﷺ لکھا دیا کرتے تھے باقی بچا سنت کا معاملہ اب اگر اس کو اس بنیاد پر لکھنے سے منع کر دیا جاتا تاکہ قوت حافظہ کمزور نہ ہو جائے تو پھر کون سی

---

(۲) مسلم (۳۰۰۴) (۳) فتح الباری (۱/۲۰۸) (۴) الاحسان (۱/۱۴۲)

چیز بچتی ہے جس کے لکھنے اور پڑھنے کا آپ نے حکم دیا ہے؟ لہٰذا سبب اول ہی معقول ہے، اس لیے کہ آپ نے لکھنے سے صرف روکا ہی نہیں بلکہ لکھی ہوئی چیزوں کو مٹانے کا بھی حکم دیا، ظاہر ہے اگر اس کو نہ بھی مٹایا جاتا صرف مراجعہ نہ کرتے تو بھی قوت حافظہ کو محفوظ رکھنے کے لیے کافی تھا لیکن آپ نے مٹانے کا حکم دیا اور چوں کہ یہاں "من کتب عني شيئاً سوى القرآن" کی بات ہے اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ یہ تحریریں قرآنی اوراق کے ساتھ تھیں۔

یہ بھی ممکن ہے جیسا کہ بعض اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ اسلوب قرآن کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا چاہتے تھے اور یہ ان لوگوں کا معاملہ تھا جو نئے نئے ایمان لائے تھے قرآن اور سنت کے مقام میں فرق نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جن کے لیے کتاب وسنت کا اسلوب، دونوں کا مقام، شرح اور متن کا فرق واضح تھا ان کے لیے تحریر کی اجازت تھی۔ (۵)

اور اگر ممانعت عام بھی فرض کر لی جائے تو یہ ایک وقتی فرمان ہوگا جس کا منسوخ ہونا آپ کے قول وفعل دونوں سے تحریری ثبوت کے متاخر ہونے سے واضح ہے۔

ہاں یہ الگ بات ہے کہ حدیث رسول کے تحریر کا عمل سست رفتاری سے چلا اور رسول کے زمانہ میں صرف جزوی طور پر رائج ہو سکا کلی طور پر اس کا رواج نہ پڑ سکا، اس کے وہی سابقہ اسباب تھے، جس کی مرضی وخواہش ہوتی تھی وہی حسب منشا تحریر کرتے تھے۔

اُصل بنیاد :

حقیقت یہ ہے کہ کتاب وسنت کو محفوظ رکھنے کا سارا دارومدار اور مکمل اعتماد اس وقت قوت حافظہ پر تھا غالباً اسی وجہ سے حفاظ قرآن کی تعداد قرآن کے لکھے ہوئے نسخوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی بلکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تو قرآن کے نسخے تھے ہی نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب قرآن کے ضائع ہونے کا خدشہ ظاہر کیا تو اس کی وجہ انہوں نے حفاظ کرام کے بکثرت شہید ہونے کو قرار دیا نہ کہ لکھے ہوئے اوراق کے ضائع ہونے کو۔ (۶)

---

(۵) السنۃ قبل التدوین ص ر ۳۰۶-۳۰۹ (۶) بخاری (۴۹۸۶)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ حدیثیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ہیں اس لیے کہ وہ لکھتے تھے میں لکھتا نہ تھا۔ (۷)

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ بن عمرو کی حدیثوں کی تعداد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں سے بھی کم ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی ضروری نہیں کہ لکھنے والے کو زیادہ یاد ہوں اور نہ لکھنے والے کو کم یاد ہوں، حالانکہ یہ بات غالباً حضرت ابو ہریرہؓ نے قیاساً کہی ہوگی۔

اجازت تحریر :

حضرت عبداللہ بن عمرو کے تحریر کا واقعہ یہ ہے کہ جب لوگوں نے ان کو اس عمل سے منع کیا اور کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ کبھی خوش رہتے ہیں اور کبھی ناخوش تم رسول کی ہر بات کو تحریر کرتے ہو یہ اچھی بات نہیں اس میں وہ باتیں بھی آجائیں گی جن کو آپ حالت غضب میں کہتے ہیں جب حضرت عبداللہ بن عمرو نے آپ کو اس امر سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ : "اکتب فوالذی نفسی بیده ما یخرج منه إلا حق" (۸) لکھو! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس زبان سے حق کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا چاہے خوش رہوں یا ناخوش۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہاں پر آپ نے امر حاضر کا صیغہ استعمال کیا ہے اور جس اسلوب میں کہا ہے وہ تاکیدی اسلوب ہے۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کو منع کیا تھا انہوں نے وجہ یہ نہیں بتائی کہ حدیث کا تحریر کرنا جائز ہی نہیں بلکہ انہوں نے یہ کہا کہ اللہ کے رسول کی ہر حالت کی باتیں لکھنا ٹھیک نہیں گویا کہ وہ تحریر پر راضی تھے اور جانتے تھے کہ ممانعت عام نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سابقہ شہادت اس پر دلیل ہے کہ تحریر کا یہ واقعہ ۷ھ

---

(۷) بخاری (۱۱۳)

(۸) سنن ابوداؤد (۳۶۴۶)، مسند احمد (۲/۱۶۲)، سنن دارمی (۴۹۰) شیخ احمد شاکر فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ تعلیق مسند احمد (۱۰/۱۵)

یا اس کے بعد کا ہے کیوں کہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۷ھ میں مدینہ تشریف لائے تھے اور یہ بات انہوں نے اپنے شاگردوں سے کہی کہ "کان یکتب" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تسلسل بھی برقرار تھا اس کو کسی متاخر حکم نے منسوخ نہیں کیا، پھر دیگر دلائل یہ وضاحت کرتے ہیں کہ تحریر حدیث کا عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور آخر تک جاری رہا۔

۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر آپ نے جو خطبہ دیا تھا اس کو یمن کے رہنے والے ایک صحابی جن کو ابوشاہ کہا جاتا تھا انہوں نے آپ سے تحریراً طلب کیا آپ نے صحابہ سے خطاب کر کے فرمایا کہ : "اکتبوا لأبی شاہ" (۹) ابوشاہ کو لکھ کر دے دو آپ نے یہاں پر بھی امر کا صیغہ استعمال کیا ہے جو جمع کا صیغہ ہے اور فعل امر اگر کوئی قرینہ مانع نہ ہو تو وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

بذات خود آپ نے مختلف احکامات و پیغامات خطوط کی شکل میں روانہ کیے ان میں دو ایک کو چھوڑ کر بقیہ سارے خطوط ۷ھ سے لے کر ۹ھ کے ہیں۔

عمرو بن حزم انصاری (متوفی ۵۰ھ) کو جب آپ نے نجران کا والی بنایا تو ایک کتاب لکھ کر دی تھی جس میں طہارت، صلاۃ، زکوۃ، مال غنیمت، دیت، جنایات وغیرہ کی حدیثیں تھیں۔ (۱۰) نجران بھیجنے کا یہ واقعہ بھی ۹ھ کا ہے۔

وفات رسول سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے کہ آپ نے کچھ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا اور فرمایا کہ "اعطونی اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ أبدا" مجھ کو (قلم ورق وغیرہ) دو تمہارے لیے کچھ لکھ دیتا ہوں اس کے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے پھر آپ نے خود ہی فرمایا کہ : "دعونی ما أنا فیہ خیر مما تدعوننی إلیہ" (۱۱) جانے دو میں جس حال میں ہوں وہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے جس کی طرف تم مجھ کو بلاتے ہو۔ پھر آپ نے صحابہ کے اصرار کے باوجود اس کو اس وقت ترک کر دیا۔

---

(۹) بخاری (۱۱۲) (۱۰) الاستیعاب ترجمہ عمرو بن حزم (۲/۵۳۲)، دراسات فی الحدیث (۱/۱۳۹)
(۱۱) بخاری (۴۴۳۱)

محل شاہد یہ ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ کسی چیز کا تحریر کرنا ناجائز ہوتا تو آپ کبھی تحریر کا یہ ارادہ ظاہر نہ کرتے۔

حدیث کی پہلی کتاب :

جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ احادیث تحریر کرتے تھے، ان کی تحریر کردہ حدیثوں کو حدیث کی پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے جس کو انہوں نے "الصادقة" کے نام سے موسوم کر رکھا تھا، آگے چل کر یہ کتاب انہوں نے اپنے شاگردوں کو پڑھا دیا اور تحریر کرا دیا۔

دورِ ثانی، دورِ صحابہ :

دورِ رسول ﷺ کے بعد جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور شروع ہوتا ہے جو بحیثیتِ دور ۷۰ھ کے آس پاس تک رہتا ہے، کیونکہ اس کے بعد صحابۂ کرام کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی، خال خال حضرات ہی باقی بچے تھے، جن پر دور کا اطلاق توسعاً ہوتا ہے، بحیثیتِ وجود یہ حضرات ۱۱۰ھ تک باقی رہے جب آخری صحابی ابوطفیل لیثیؓ کا انتقال ہوا۔

اس کے بعد تابعین کا دور شروع ہوتا ہے جو تقریباً ۱۵۰ھ پر ختم ہوتا ہے، پھر تبع تابعین کا دور شروع ہوتا ہے جو تقریباً ۲۲۰ھ تک رہتا ہے، اس کے بعد تابع تبع تابعین کا دور آتا ہے جو تقریباً ۲۷۰ھ تک رہتا ہے۔

صحابۂ کرام کے ابتدائی دور میں صورت حال تقریباً اسی طرح برقرار رہی اس لیے کہ حالات میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا تحریر حدیث کا رواج مکمل طور پر نہ ہو سکا اگرچہ انفرادی طور پر لکھنے کا کام جاری رہا جو دن بدن بہتر ہوتا گیا۔

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت انس کو بحرین کا حاکم بنا کر بھیجا تو ان کو فرائض صدقہ سے متعلق احادیث تحریر کر کے دیا۔ (۱۲)

---

(۱۲) بخاری (۳۱۷)

صحابہ کا ابھی پہلا دور ہی گزر رہا تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال موجزن ہونے لگا کہ جیسے قرآن کریم کو جمع کر دیا گیا ہے ایسے ہی سنت رسول کو بھی جمع کر دینا چاہیے، چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے مجلس شوریٰ سے مشورہ کیا جو باتفاق رائے منظور ہو گیا۔ (۱۳)

حالانکہ اس اجماع کے بعد بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں اس وقت کوئی سرکاری فرمان جاری نہیں کیا، اور نہ ہی کوئی پیش رفت ہوئی، بلکہ دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اس تحریر کو زیادہ اہمیت و توجہ دینے لگیں، اور قرآن سے رشتہ کمزور پڑ جائے۔

لیکن پھر بھی انفرادی طور پر یہ کام ہوتا رہا، بلکہ خود حضرت عمر فاروق نے بہت ساری حدیثیں عتبہ بن فرقد کو لکھ کر دی تھیں جس میں سے ایک روایت یہ بھی ہے "لایلبس الحریر فی الدنیا إلا من لیس لہ فی الآخرۃ منہ شئی" (۱۴) جو دنیا میں ریشم استعمال کرتا ہے تو آخرت میں اس کو اس میں سے کچھ نہیں ملے گا، حدیث لکھنے کے تعلق سے ان کا یہ فرمان کافی مشہور ہے کہ "قیدوا العلم بالکتابۃ" علم کو تحریر کر کے قید کر لو۔ (۱۵)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ان کا مشہور صحیفہ تھا جو عموماً ان کے ساتھ تلوار کی نیام میں رکھا رہتا تھا جس میں دیت، جراحات، حرم مدینہ کے متعلق روایتیں موجود تھیں، جس کا ذکر صحیح بخاری میں موجود ہے۔ (۱۶)

صحابہ کے دور اول کے آخر میں جب فتنوں کی ابتداء ہوئی، تب ان کی توجہ حدیث لکھنے کی طرف مزید ہو گئی، اور صورت حال یہ ہو گئی کہ جو لوگ پہلے نہیں لکھتے تھے یا لکھنا نہیں پسند کرتے تھے اب ان کی رائے بھی بدل گئی اور وہ بھی لکھنے پڑھنے کو بہتر اور مفید سمجھنے لگے حتیٰ کہ اپنے شاگردوں کو اس کی ہدایت کرنے لگے۔ (۱۷)

---

(۱۳) جامع بیان العلم ۱/ ۶۴، تقیید العلم ص/ ۴۹

(۱۴) مسند احمد (۱/ ۳۶۱) (۱۵) تقیید العلم ص/ ۸۸، جامع بیان العلم (۱/ ۷۲)

(۱۶) بخاری (۲۸۲۰) (۱۷) دراسات فی الحدیث النبوی ۱/ ۷۶، کشف اللثام ۱/ ۱۱۱

حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے بچوں کو حدیث رسول لکھنے کی ہدایت دیتے رہتے تھے، ان کا فرمان ہے "كنا لا نعد من لم يكتب علمه شيئا" (۱۸) جو تحریر نہیں کرتا تھا ہم اس کے علم کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

حضرت جابر بن عبداللہ کے پاس ایک صحیفہ تھا، امام ذھبی فرماتے ہیں کہ ان کا صحیفہ مناسک حج سے متعلق تھا اس میں سے ایک طویل روایت صحیح مسلم کی کتاب الحج میں موجود ہے۔ (۱۹)

حضرت قتادہ بن دعامۃ سدوسی (متوفی ۱۱۷ھ) نے ایک مرتبہ سعید بن ابی عروبۃ کو سورہ بقرہ سنائی جس میں کوئی غلطی نہیں ہوئی، اس پر انھوں نے تعجب کا اظہار کیا تو قتادہ نے فرمایا کہ حضرت جابر بن عبداللہ کا صحیفہ مجھے سورہ بقرہ سے بھی زیادہ بہتر یاد ہے۔ (۲۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بڑی مقدار میں حدیثیں تحریر شدہ موجود تھیں، جس سے مختلف لوگوں نے حسب ضرورت نسخ کیا تھا، اور انھوں نے لکھایا تھا، جبکہ دور رسول میں وہ کچھ نہیں لکھتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ حسن بن عمرو بن امیہ ضمری نے حضرت ابو ہریرہ کو ایک حدیث سنائی، حضرت ابو ہریرہ نے اس پر اظہار تعجب کیا، تو انھوں نے کہا کہ میں نے آپ ہی سے سنا ہے، حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ اگر مجھ سے سنا ہے تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہوگی، چنانچہ وہ ان کو اپنے ساتھ گھر لے گئے، اور بہت ساری کتابوں کو دکھایا اور اس میں تلاش کیا، وہ حدیث اس میں مل گئی، حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ میں نے کہا تھا "إن كنت حدثتك فهو مكتوب عندي" (۲۱) حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے، ثبوت کی صورت میں حضرت ابو ہریرہ کے نسیان کو

---

(۱۸) تقیید العلم ۹۶، جامع البیان (۱/ ۷۳)

(۱۹) مسلم (۷/ ۲۱۳)، نیز ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ (۱/ ۴۳) (۲۰) طبقات ابن سعد (۵/ ۳۴۳)

(۲۱) جامع بیان العلم (۱/ ۷۴)، دراسات فی الحدیث النبوی (۱/ ۹۷)، فتح الباری (۱/ ۲۱۵)

ندرت پر محمول کیا ہے۔

اسی طرح بشیر بن نہیک فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہ کے پاس آتا تھا اور ان سے کتابیں لے کر نقل کرتا تھا پھر ان کو پڑھ کر سناتا تھا، پھر میں کہتا تھا کہ کیا یہ روایت میں نے آپ سے سنی کی نہیں؟ وہ کہتے تھے کہ ہاں سن لی (یعنی استاذ سے سننا اور استاذ کو سنانا دونوں کا ایک ہی حکم ہے) ابن رجب نے شرح علل ترمذی میں اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اس کی سند پر کلام کیا ہے اور اس کے راوی کو متروک کہا ہے۔ (۲۲) لیکن ان کے علاوہ اور بھی واقعات ہیں جس سے حضرت ابو ہریرہ کے پاس تحریروں کا ثبوت ملتا ہے، اور یہ کہ بہت سے لوگوں نے ان کے مجموعۂ احادیث سے حدیثیں لکھی تھیں، جن میں ہمام بن منبہ ہیں جن کے صحیفے کا نام "الصحیحۃ" تھا، یہ وہ قدیم ترین صحیفہ ہے جو چودہ سو سال کتب خانوں کی تاریکیوں میں زندگی گذارتا رہا، بالآخر ڈاکٹر حمید اللہ رحمہ اللہ نے تحقیق کر کے اس کو منظر عام پر پیش کیا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مکمل صحیفہ مسند احمد میں موجود ہے، دونوں کی حدیثوں میں کوئی فرق نہیں، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ محدثین نے جو کتابیں تحریر کی ہیں وہ انتہائی معتبر اور معیاری ہیں جن کی مثال تاریخ میں ناپید ہے۔

دیگر لوگوں میں سعید بن ابی سعید مقبری، مروان بن حکم، اور ابو صالح السمان وغیرہ ہیں جنھوں نے حضرت ابو ہریرہ کی کتابوں سے حدیثیں تحریر کی ہیں۔ (۲۳) سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا۔

نیز صحابی رسول حضرت عبیط بن شریط رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صحیفہ تھا جو "حدیث نبیط" کے نام سے مشہور ہے، موجودہ صحیفوں میں یہ صحیفہ انتہائی قدیم ترین ہے جو دمشق کی لائبریری "الظاهرية" میں 279 نمبر پر رجسٹرڈ ہے اور آج تک موجود ہے جس میں ۱۳ لوحات ہیں۔

---

(۲۲) دراسات فی الحدیث النبوی (۱/۹۷) (۲۳) دراسات فی الحدیث (۱/۹۷-۹۹)

اسی طرح سے اور بہت سارے صحیفے اور حدیث کی کتابیں ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں مقصد نہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے محض نمونہ کے لیے ان کی طرف اشارہ کرنا مقصد ہے۔ ویسے جن صحابہ نے حدیثیں تحریر کیں، یا تحریر کا حکم دیا، یا اپنے شاگردوں یا اہل خانہ کو تحریر کرایا ان کی تفصیل ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی حفظہ اللہ نے اپنی کتاب "دراسات فی الحدیث النبوی" میں تحریر کیا ہے، صحابہ کرام کے جن صحیفوں کا تذکرہ کتب تاریخ، وکتب رجال وغیرہ میں ملتا ہے اس کو بھی جمع کیا ہے جن کی تعداد باون ہے۔ (۲۴) اور جن کا تذکرہ نہیں ملتا ہے ان کو صحابہ اور ان کے شاگردوں کی تحریر اور ان کے اقوال کی روشنی میں قیاس کیا جا سکتا ہے۔

جب صحابہ کرام کا دوسرا دور خاتمہ کے قریب تھا اور تابعین کا اول دور شروع ہو رہا تھا اس وقت حدیث رسول تحریر کرنے کے لیے ایک مقامی سرکاری فرمان بھی جاری ہوا تھا، جو حضرت عمر کے مشورے کے بعد پہلا فرمان تھا جس کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے والد عبدالعزیز بن مروان (متوفی ۸۵ھ) نے اس وقت جاری کرایا تھا جب وہ مصر کے گورنر تھے۔

انھوں نے کثیر بن مرہ حضرمی کے پاس جو شام میں رہتے تھے یہ حکم نامہ بھیجا کہ صحابہ کرام سے جتنی روایتیں آپ نے سنی ہیں سب کو تحریر کر کے بھیج دیں۔ (۲۵)

اس واقعہ سے اس زمانہ کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تحریر حدیث نے ایک ایسا رخ اختیار کر لیا کہ حفظ اور یاد داشت پر اعتماد کا پہلو کمزور ہونے لگا، اور تحریر حدیث کو حفظ حدیث پر ترجیح حاصل ہونے لگی، اور یادداشت کی تائید کتابوں سے کی جانے لگی۔ حضرت ابو ہریرہ کے سابقہ واقعہ سے اس کی تائید ہوتی ہے اور حضرت انس کا یہ قول ہے کہ "غیر تحریر شدہ علم (حدیث) کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس پر صرف شاہد ہی نہیں بلکہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ حدیث کا لکھنا صرف ایک مشغلہ ہی نہیں بلکہ ضرورت بن چکی تھی۔

---

(۲۴) دیکھیے (۱/ ۹۴-۱۴۲)

(۲۵) طبقات ابن سعد (۷/ ۴۴۸)، تہذیب التہذیب (۸/ ۴۲۹)

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ حدیث رسول کے لکھنے کا کام جو رسول ﷺ کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا، دن بدن ترقی کرتا رہا اور صحابہ کے دور کے خاتمہ تک اس کا تحریر کرنا ضروری سمجھا جانے لگا اور اس پر اعتماد حفظ کے مقابلے میں زیادہ ہو گیا۔

یہیں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حدیث رسول کی حفاظت جس کی ابتدا یادداشت اور عمل کے تسلسل سے چلی آ رہی تھی، لکھنے کے ساتھ ساتھ مضبوط تر ہوتی گئی اور اس طرح سے سنت رسول ﷺ کی حفاظت کی گئی جس کی کوئی مثال نہیں اور ہو کیسے یہ تو قدرتی انتظام تھا جس سے ﴿إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحفظون﴾ (حجر : ۹) کی تکمیل ہو رہی تھی۔

اس دور میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کو رسالہ، صحیفہ، جزء، حدیث فلاں کہا جاتا تھا جب کہ بہت ساری کتابیں بغیر کسی نام کے تھیں، اور یہ کتابیں عموماً غیر مرتب ہوا کرتی تھیں جبکہ بعض کتابیں خاص خاص موضوع پر تھیں مثلاً زکاۃ، مناسک وغیرہ۔

یہ سارے صحیفے جس کو صحابہ نے تحریر کیا یا کرایا تھا اپنے شاگردوں کو منتقل کر دیا جنہوں نے اس کو لکھا، یاد کیا اور اس کے مطابق عمل کیا، پھر انھوں نے اپنے شاگردوں تک پہنچا دیا، اس طرح سے " فرب مبلغ أوعى له من سامع" پر تسلسل سے عمل ہوتا رہا یہاں تک کہ یہ پودا ایک تن آور درخت بن گیا۔ جو ﴿كشجرة طيبة أصلها ثابت و فرعها في السماء﴾ (ابراهیم : ۲۴) اور ﴿كزرع أخرج شطأه فآزره فا ستغلظ﴾ (فتح : ۲۹) کے مانند ہو گیا۔

دورِ ثالث از عمر ثانی، دورِ تابعین (۱۰۱-۱۵۰ھ) :

جب صحابہ کا آخری دور ختم ہو رہا تھا خال خال حضرات ہی باقی رہ گئے تھے تو خلیفہ خامس حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایک عام فرمان جاری کیا جس میں علماء کو حدیث رسول کے تحریر کرنے اور عام کرنے کا حکم دیا، عکرمہ بن عمار فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا خط میں نے سنا جس میں یہ حکم تھا کہ تمام اہل علم کو اطلاع دے دو کہ اپنی اپنی مسجدوں میں پھیل جائیں سنت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ (۲۶)

---

(۲۶) المحدث الفاضل ص ر ۱۵۳، اصول الحدیث، علومہ ومصطلحہ د ر محمد عجاج خطیب ص ر ۱۷۸

حافظ ابونعیم (متوفی ۴۳۰ھ) فرماتے ہیں کہ: "کتب عمر بن عبدالعزیز إلی الآفاق أنظروا حدیث رسول اللہ ﷺ فاجمعوہ" (۲۷) کہ حضرت عمر نے مختلف علاقوں میں خط لکھ کر یہ حکم دیا کہ حدیث رسول کا خیال کر و اس کو جمع کرو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خود بھی حدیث لکھتے تھے اور مدینہ کے گورنر ابوبکر بن عمرو بن حزم (متوفی ۱۱۷ھ) کو انہوں نے یہ حکم دیا کہ تمہارے پاس جو حدیثیں ہیں ان کو میرے پاس لکھ کر بھیج دو اور عمرۃ بنت عبدالرحمٰن (متوفی ۹۸ھ) کی روایتوں کو بھی تحریر کر کے بھیج دو، بعض مصادر میں عبدالرحمٰن بن قاسم (متوفی ۱۰۷ھ) کی روایتوں کا بھی ذکر ہے۔ (۲۸)

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ وہی ابوبکر بن عمرو ہیں جن کے والد کو رسول اللہ ﷺ نے نجران کی ذمہ داری سونپتے وقت حدیثوں کا ایک مجموعہ تحریر کرا کے دیا تھا جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اور عمرہ بنت عبدالرحمٰن ان کی خالہ تھیں جن کے پاس زیادہ تر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایتیں تھیں اسی طرح سے قاسم بن محمد جو فقہاء سبعہ میں سے ہیں ان کے پاس بھی حضرت عائشہ کی روایتیں تھیں۔

اس حکم نامہ کا اصل مرکز محدث مدینہ علامہ ابن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) رحمۃ اللہ علیہ تھے ان کو یوں خطاب کیا گیا "انظر ما کان من حدیث رسول اللہ ﷺ فاکتبہ فانی خفت دروس العلم و ذھاب العلماء" (۲۹) حدیثِ رسول کو تلاش کر کے لکھو کیونکہ مجھے علم کے مٹ جانے اور علماء کے چلے جانے کا خوف ہے۔

آپ کے حکم نامہ میں ایک اہم بات یہ تھی کہ وہ حدیثیں جمع کریں جو ثابت شدہ ہوں، دوسری بات یہ کہ حدیث رسول کے علاوہ اور کوئی چیز آثار وغیرہ نہ لکھیں، چنانچہ انہوں نے ابوبکر بن عمرو سے کہا تھا کہ "أکتب إلی ما ثبت عندک من الحدیث" (۳۰)

"ولا تقبل إلا حدیث النبی" (۳۱) اور خود اس کی نگرانی بھی کرتے تھے چنانچہ

---

(۲۷) فتح الباری (۱/۱۹۵) (۲۸) سنن دارمی (۱/۱۰۴)، مقدمۃ الجرح والتعدیل ص/۲۱

(۲۹) بخاری (۱/۱۹۴) (۳۰) اصول الحدیث ص/۱۷۸ (۳۱) بخاری (۱/۱۹۴)

عبداللہ بن ذکوان ابوالزناد (متوفی ۱۲۱ھ) فرماتے ہیں کہ میں نے اہل علم کا ایک مجمع حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس دیکھا جن لوگوں نے عمر بن عبدالعزیز کو حدیث رسول تحریر کر کے دیا تھا وہ اس کو چیک کر رہے تھے اگر کوئی ایسی حدیث ہوتی جس پر لوگوں کا عمل نہیں ہوتا تو وہ کہتے یہ تو زیادتی معلوم ہوتی ہے لوگوں کا عمل اس پر نہیں ہے۔ (۳۲)

چنانچہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی مستعدی سے یہ کام کیا دن ورات ایک کر کے گھر گھر جا کر حدیث رسول کو جمع کیا اور بلا تفریق مرد و زن ہر ایک سے حدیثوں کو حاصل کیا۔ (۳۳)

ابوالزناد کا کہنا ہے کہ "کنا نطوف مع الزهری علی العلماء و معه الالواح والصحف یکتب کل ما سمع" (۳۴) ہم بھی امام زہری کے ساتھ علماء کا چکر لگاتے تھے ان کے ہاتھ میں قلم اور کاغذ رہتا تھا وہ ہر بات کو لکھتے تھے۔

نیز ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہم لوگ صرف حلال وحرام سے متعلق حدیثیں لکھتے تھے اور وہ ہر حدیث لکھتے تھے پھر جب ہم کو ان کی ضرورت پڑی تو اس کی اہمیت سمجھ میں آ گئی اور یہ معلوم ہو گیا کہ سب سے زیادہ جانکار وہی ہیں۔ (۳۵)

امام زہری فرماتے ہیں کہ "لم یدون هذا العلم أحد قبل تدوینی" (۳۶) اس علم کو مجھ سے پہلے کسی نے مدون نہیں کیا۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ اس حکم نامہ سے پہلے ہی کتابت حدیث کے علم بردار اور اس کے شہسوار مانے جاتے تھے، اسی وجہ سے یہ ذمہ داری ان کو دی گئی۔

وہ صحیفے اور کتابیں جن کا تذکرہ قبل ازیں گزر چکا ہے ان کو انھوں نے اپنے اساتذہ اور صحابہ کے شاگردوں کے صحیفوں سے پہلے ہی حاصل کر لیا تھا اگر یہ بات نہ ہوتی تو امام زہری کی

---

(۳۲) اصول الحدیث عجاج خطیب ص ۱۷۸-۱۷۹

(۳۳) تہذیب التہذیب ترجمہ امام زہری

(۳۴) تذکرۃ الحفاظ (۱/۱۰۹)

(۳۵) جامع بیان العلم (۱/۷۳)

(۳۶) الرسالۃ المستطرفۃ ص ۴

تحریروں کی اتنی بڑی مقدار نہ ہوتی جس کا تذکرہ امام ذہبیؒ نے کیا ہے کہ جب ولید بن یزید (متوفی ۱۲۶ھ) کا قتل ہوا تو ان کے خزانے سے امام زہری کے علوم کے دفاتر جانوروں پر لاد کر لے جائے گئے۔ (۳۷)

یہ معلوم رہنا چاہیے کہ امام زہری نے جمع حدیث کا کام حضرت عمر بن عبدالعزیز کی موجودگی میں کر لیا تھا اور ان کے سامنے پیش کیا تھا وہ فرماتے ہیں کہ "أمرنا عمر بن عبدالعزيز بجمع السنن فكتبناها دفترا دفترا فبعث إلى كل أرض له عليها سلطان دفترا" (۳۸) عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے ہم نے دفتر کا دفتر تیار کر دیا۔ ہر جگہ جہاں ان کی حکومت تھی وہاں ایک ایک دفتر بھیج دیا گیا۔ البتہ ابوبکر بن عمرو نے جو جمع کیا تھا وہ بھیج نہ سکے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات ہو گئی۔

اس دور (۱۰۱-۱۵۰ھ) میں جن دیگر بزرگ شخصیات نے حدیث رسول تحریر کیا تھا اس میں سے کچھ افراد یہ ہیں :

- **مجاہد بن جبر مکی** (متوفی: ۱۰۲) جن کے پاس تفسیر قرآن، نواسخ قرآن سے متعلق لکھی ہوئی حدیثیں موجود تھیں، جن کو ان سے ابن جریج ابن ابی نجیح وغیرہ نے تحریر کیا۔ (۳۹)
- **امام شعبی عامر بن شراحیل شامی** (متوفی ۱۰۳ھ) جو اپنے ابتدائی دور میں لکھنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ سارا اعتماد حافظہ پر تھا جن کا بیان ہے : "ما كتبت سوداء في بيضاء" لیکن بعد میں انہوں نے بہت ساری حدیثیں تحریر کیں اور اپنے شاگردوں کو املا کرایا انہیں میں سے کتاب الجراح، کتاب الفرائض، کتاب الطلاق، مجموعۂ فقہیہ، احادیث قضاء وغیرہ ہیں۔ (۴۰)
- **ابو قلابہ عبداللہ بن زید جرمی** (متوفی : ۱۰۴ھ) انہوں نے حدیثوں کا ایک بڑا ذخیرہ تحریر کیا تھا ان کا کہنا تھا "الكتاب أحب إليّ من النسيان" بھول جانے سے لکھ لینا

---

(۳۷) تذکرۃ الحفاظ (۱/ ۱۱۲) (۳۸) اصول الحدیث علومہ ومصطلحہ ص/ ۱۸۰

(۳۹) دراسات فی الحدیث النبوی (۱/ ۱۶۴)

(۴۰) تذکرۃ الحفاظ، دراسات فی الحدیث النبوی (۱/ ۱۵۲-۱۵۳)

بہتر ہے۔اپنی کتابوں کوانہوں نے مقام "داریا" سے ایوب سختیانی کے پاس جانوروں پر لاد کر بھیجا تھا کچھ کتابیں بیہس جرمی کے گھر بھجوایا تھا۔ (۴۱)

● ابوبکر بن عمرو بن حزم (متوفی ۱۱۰ھ) یہی وہ شخصیت ہے جن کے ذریعے سے امام زہری کے پاس عمر بن عبدالعزیز کا حکم نامہ بھیجا گیا تھا اور خود ان کو بھی انھوں نے عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق کی روایتوں کو تحریر کرنے کا حکم دیا تھا، ان کی وفات کے بعد جب ان کے بیٹے سے ان کتابوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ضائع ہوگئیں۔ (۴۲)

● قتادہ بن دعامہ سدوسی بصری (متوفی ۱۱۷ھ) ان کے پاس بھی تفسیر قرآن سے متعلق احادیث لکھی ہوئی تھیں ان کا یہ کہنا تھا کہ تم لوگ احادیث تحریر کرنے سے کیوں گھبراتے ہو جب کہ اللہ کے پاس سب چیزیں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ ﴿قال علمها عند ربی فی کتاب لا یضل ربی ولا ینسی﴾ (طٰہ : ۵۲)

ان کی حدیثوں کو ابوعوانہ، امام اوزاعی، جریر، سعید بن ابی عروبہ، حماد بن سلمہ، شعبہ، معمر، ہمام بن یحییٰ وغیرہ نے تحریر کیا ہے۔ (۴۳)

● عطاء بن ابی رباح مکی (متوفی : ۱۱۷ھ) یہ اپنے ان شاگردوں کو جن کے پاس کاغذ نہیں رہتا تھا ان کو کاغذ دیتے تھے اور لکھنے والوں کی دلجوئی کرتے تھے۔ (۴۴)

● ابوعبداللہ مکحول شامی (متوفی ۱۱۸ھ) ان کے پاس سنن کے نام کی کتاب تھی اسی طرح بعض فقہی مسائل اور حج سے متعلق کتابیں لکھیں۔ (۴۵)

---

(۴۱) مصدر سابق (۱/۱۴۴)

(۴۲) تہذیب التہذیب (۱۲-۳۹) (۴۳) دراسات (۱/۱۹۶-۲۰۰)

(۴۴) تقیید العلم ص/۱۰۵، دراسات (۱/۱۹۰) (۴۵) دراسات (۱/۲۱۱)

● ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی (متوفی ۱۳۱ھ) یہ وہی ایوب ہیں جو ان لوگوں کی تردید کرتے تھے جو حدیث کو لکھنا پسند نہیں کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ ہم پر حدیث لکھنے پر عیب لگاتے ہیں بڑی غلطی پر ہیں اللہ رب العزت کا فرمان ہے ﴿ علمها عند ربي في كتاب﴾ (طٰہٰ : ۵۲) اللہ تعالیٰ جو کسی چیز کا محتاج نہیں جب اس کے پاس کتاب ہے تو ہم لوگوں کو حدیث لکھنے میں کیا مانع ہے۔ (۴۶)

اسی طرح سے :

● وہب بن منبہ (متوفی : ۱۱۴ھ)
● سلیمان بن مہران اعمش (متوفی : ۱۴۸ھ)
● عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج (متوفی : ۱۵۰ھ)
● محمد بن اسحاق صاحب المغازی (متوفی : ۱۵۰ھ)

وغیرہ نے حدیثیں تحریر کیں جن کی تفصیل دراسات فی الحدیث النبوی (۱/۱۸۰ تا ۱/۲۱۸) میں موجود ہے۔

اس دور میں جو کتابیں تحریر کی گئیں ان کی کمیت و کیفیت میں سابقہ دور کے مقابلہ میں کافی اضافہ ہوا، اگرچہ اس دور میں بھی زیادہ تر غیر مرتب کتابیں لکھی گئیں لیکن ابواب کی ترتیب پر حدیثوں کے لکھنے کا رجحان واضح ہو چکا تھا جیسا کہ سنن مکحول، سنن ابن جریج، جامع ابن جریج وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ : هذا بالنسبة إلى جمع الأحاديث بالأبواب أما جمع حديث إلى مثله في باب واحد ...... " (۴۷)

یہ تدوین حدیثوں کو مختلف ابواب میں جمع کرنے کا تھا البتہ ایک ہی معنوں کی روایتوں کو ایک باب میں جمع کرنا تو اس میں امام شعبی نے سبقت کی ہے چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ "هذا

---

(۴۶) سنن دارمی (۱/۱۰۴)، جامع بیان العلم (۱/۷۳) دراسات فی الحدیث

(۴۷) الرسالۃ المستطرفہ ص ۴

باب فی الطلاق ...... " پھر ہر باب میں کئی کئی حدیثوں کا ذکر کیا ہے۔

اس دور کے طریقہ تحریر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ کتابوں کا نام اس طرح رکھا گیا جو اصطلاحی نام معلوم ہوتا ہے لیکن ان میں اصطلاحی معنیٰ ہونے کی بجائے لغوی معنیٰ کا زیادہ دخل تھا، ان میں حدیثوں کے ساتھ ساتھ آثار وغیرہ کے لکھنے کا بھی رواج تھا اور اس کی ترتیب بھی بہت زیادہ دقت سے نہیں کی جاتی تھی۔

مختلف موضوعات مثلاً تفسیر، علوم تفسیر، سیرت رسول، ادب القضاء وغیرہ پر بھی کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

اس دور نے حدیث لکھنے کا جو اثر چھوڑا ہے اس کا اندازہ بعد میں آنے والے دور سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں عام طور پر کتابیں مرتب اور ابواب کے تحت ہوا کرتی تھیں۔

دورِ رابع (۱۵۱ - ۲۰۰ھ) :

اس دور میں مرتب کتابوں کے لکھنے کا کام زیادہ ہوا اسی طرح سے موضوعی اور فنی کتابیں بھی تالیف کی جانے لگیں، مثلاً تفسیر، عقائد احکام وغیرہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"ثم حدث فی أواخر عصر التابعین تدوین الآثار وتبویب الأخبار لما انتشر العلماء فی الأمصار وکثر الابتداع من الخوارج والروافض و منکری الأقدار وکانوا یصنفون علی باب واحد" (۴۸)

پھر تابعین کے آخری دور میں جب اہل علم مختلف شہروں میں پھیل گئے، خوارج، روافض اور منکرین قدر کی بدعتیں شروع ہوئیں تو حدیثوں کی تدوین اور تحریر کا کام ابواب کی ترتیب پر شروع ہوا یعنی حدیثوں کو مختلف ابواب میں مفہوم کے اعتبار سے منقسم کر دیا ویسے ایک معنیٰ کی روایتوں کو اکٹھا لکھنا تو یہ کام سب سے پہلے امام شعبیؒ (متوفی ۱۰۴ھ) نے کیا۔

اس دور میں جو کتابیں تحریر کی جاتی تھیں اس میں احادیث کے ساتھ آثار و اقوال بھی لکھے

---

(۴۸) مقدمہ فتح الباری ص/۶

جاتے تھے موطا امام مالک سے یہ بات بالکل واضح ہے اسی طرح سے "کتاب الأم" جو اس دور کی تحریر ہے وہ بھی اس بات پر شاہد ہے۔ اس دور کی کچھ اہم کتابیں یہ ہیں :

سنن ابن أبي ذئب (عبدالرحمٰن)	(متوفی ۱۵۸ ھ)	مدینہ
سنن زائدۃ بن قدامۃ	(متوفی ۱۶۰ ھ)	کوفہ
سنن ابراہیم بن طہمان	(متوفی ۱۶۳ ھ)	خراسان
جامع عبدالرزاق	(متوفی ۱۵۸ ھ)	یمن
جامع سفیان ثوری	(متوفی ۱۶۱ ھ)	کوفہ
جامع ابن وہب	(متوفی ۱۹۷ ھ)	مصر
موطا ابن ابي ذئب	(متوفی ۱۵۸ ھ)	مدینہ
موطا امام مالک	(متوفی ۱۷۹ ھ)	مدینہ (۴۹)

یہ دور وہ تھا جس میں حدیث کا نہ لکھنا باعث عیب سمجھا جاتا تھا اب یہ معاملہ ابتدائی دور کے مقابلہ میں بالکل برعکس ہو گیا، حدیث کے لکھنے لکھانے کی دھوم مچی ہوئی تھی، خلافت اسلامیہ کے شہروں میں سے کوئی ایسا شہر نہ تھا جس میں حدیث کے لکھنے اور لکھانے والے نہ ہوں ہر ایک کے پاس حدیث کی کتاب ہوتی تھی لکھتے تھے پھر یاد کرتے تھے اور حسب ضرورت اس سے مراجعہ کرتے تھے اس دور کے حدیث لکھنے والے محدثین میں سے کچھ مشہور ہستیاں یہ ہیں :

عبدالرحمٰن بن ابي ذئب	(متوفی ۱۵۸ ھ)	مدینہ
امام مالک بن انس اصبحی	(متوفی ۱۷۹ ھ)	مدینہ
سعید بن ابي عروبہ	(متوفی ۱۵۶ ھ)	بصرہ
شعبہ بن حجاج	(متوفی ۱۶۰ ھ)	بصرہ
ربیع بن صبیح	(متوفی ۱۶۰ ھ)	بصرہ

(۴۹) تفصیل کے لیے دیکھیے : دراسات في الحديث النبوي، تقييد العلم، جامع بيان العلم

حماد بن سلمہ	(متوفی ۱۶۷ ھ)	بصرہ
سفیان ثوری	(متوفی ۱۶۱ ھ)	کوفہ
معمر بن راشد	(متوفی ۱۵۳ ھ)	یمن
خالد بن جمیل	-	یمن
عبداللہ بن مبارک	(متوفی ۱۸۱ ھ)	خراسان
ہشیم بن بشیر	(متوفی ۱۸۳ ھ)	واسط
جریر بن عبدالحمید	(متوفی ۱۸۸ ھ)	رَیّ
عبداللہ بن وھب	(متوفی ۱۹۷ ھ)	مصر (۵۰)

دورِ خامس (۲۰۱ھ - ۲۵۰ھ):

جب دوسری صدی کا خاتمہ ہو رہا تھا اس وقت اور اس سے قبل حدیث رسول لکھنے کا کام بہت زور و شور سے جاری تھا لہٰذا اب اس طریقہ تصنیف کے بدلنے کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ تصنیف حدیث نے ایک نیا موڑ لیا اور اب ایسی کتابیں لکھنے کا پروگرام شروع ہوا جن میں اُحادیث رسول کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہ ہو، نہ تو صحابہ کے آثار ہوں اور نہ علماء کے اقوال ہوں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ : ”رأى بعض الأئمة على راس المأتين أن يفرد حديث النبى ﷺ خاصة فقل إمام من الحفاظ إلا وقد صنف حديثه على المسانيد“ (۵۱) دوسری صدی کے خاتمہ کے وقت بعض اُئمہ محدثین کے دلوں میں یہ بات آئی کہ خالص حدیث رسول پر کتابیں لکھی جائیں چنانچہ یہ کام شروع ہوا اور اس قدر ہوا کہ کوئی بھی محدث ایسا نہ تھا جس نے اپنی حدیثوں کو مسانید پر مرتب نہ کیا ہو۔

مسند ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں حدیث رسول کو صحابہ کی ترتیب پر اکٹھا کر دیا جائے۔

---

(۵۰) مقدمہ فتح الباری ص/۶، الرسالۃ المستطرفۃ ص/۴،
اصول الحدیث علومہ و مصطلحہ ڈاکٹر عجاج ص/۱۸۲

(۵۱) ھدی الساری ص/۶

اس طرح کی کتابوں سے ایک طرف جمع حدیث کا کام ہوا تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کس صحابی کی روایت کتنی ہے اس لیے کہ ان حدیثوں کو محدثین نے صحابہ کے نام پر مرتب کیا مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جو حدیثیں مروی تھیں ان کو ان کے نام کے نیچے جمع کر دیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایتیں، پھر حضرت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کی روایتیں۔

اس دور میں کثرت سے مسانید کی ترتیب پر کتابیں لکھی گئیں اور اس طرح سے احادیث رسول کو اکٹھا کر دیا گیا اور یہیں سے مسانید کے لکھنے کا دور (بحیثیت دور) ختم ہوگیا اگرچہ کچھ نہ کچھ کام جاری رہا اس دور کے بعد مسانید پر دو تین کتابیں بہت اہم لکھی گئیں ہیں۔

مسانید کے ساتھ ساتھ ابواب کی ترتیب پر بھی بہت بہتر کتابیں منظر عام پر آئیں مثلاً :

الأم :	امام محمد بن ادریس شافعی	(متوفی ۲۰۴ھ)
المصنف :	عبدالرزاق بن ہمام صنعانی	(متوفی ۲۱۱ھ)
المصنف :	ابوبکر بن ابی شیبہ	(متوفی ۲۳۵ھ)
السنن :	سعید بن منصور	(متوفی ۲۲۸ھ)

مسانید کی ترتیب پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سے کچھ یہ ہیں :

مسند أبو داؤد و طیالسی	(متوفی ۲۰۴ھ)
مسندأسد بن موسیٰ	(متوفی ۲۱۲ھ)
مسند العبسی	(متوفی ۲۱۳ھ)
مسند الحمیدی	(متوفی ۲۱۹ھ)
مسندمسدد	(متوفی ۲۲۸ھ)
مسندیحییٰ حمانی	(متوفی ۲۲۸ھ)
مسندنعیم بن حماد	(متوفی ۲۳۵ھ)
مسند امام احمد بن حنبل	(متوفی ۲۴۱ھ)

مسند العدنی	(متوفی ۲۴۳ھ)
مسند عبد بن حمید	(متوفی ۲۴۹ھ)
مسند بقی بن مخلد	(متوفی ۲۹۲ھ)
مسندأبو یعلیٰ الموصلی	(متوفی ۳۰۷ھ) (۵۲)

ان مسانید میں سب سے بڑی مسند، مسند بقی بن مخلد تھی لیکن وہ فی الحال مفقود ہے، موجودہ مسانید میں سب سے عظیم مسند، مسند امام احمد بن حنبل ہے اس کے بعد مسند ابو یعلی (مسند صغیر) ہے، ان مسانید میں سے مسند الطیالسی، مسند الحمیدی، مسند الامام احمد، مسند ابو یعلی موصلی مطبوع ہیں۔

دور مسانید کے بعد جو جمع احادیث کا دور تھا، تدوین حدیث کا آخری اور سنہرا دور آیا جس میں حسب ضرورت مرتب اور متنوع کتابیں تحریر کی گئیں۔ یہ دور اصحابِ کتب ستہ کا دور تھا۔

دور اصحاب کتب ستہ (۲۵۰-۳۰۳ھ) :
(چھٹا اور آخری دور)

اس دور کو اگر ائمہ کرام کی وفیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ تقریباً ۲۵۰ھ سے شروع ہوتا ہے اور ۳۰۳ھ امام نسائی کی وفات کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے، ویسے اس دور کا اصل وقت تیسری صدی کے دوسرے چوتھائی ہی سے شروع ہو جاتا ہے، یہی وہ دور تھا جس میں علم حدیث کی روشنی آب وتاب پر تھی، اسی دور میں علی بن المدینی، عبدالرحمٰن بن مھدی، امام یحییٰ بن معین، امام احمد، امام بخاری، امام ابوزرعہ رازی، امام دارمی، اصحاب کتب ستہ اپنے علم کی روشنی سے پوری دنیا کو منور کیے ہوئے تھے۔

مسانید کی تحریر کے رواج پا جانے کے بعد اہل علم نے یہ سوچا کہ ماضی قریب کی کتابیں اگر چہ خالص احادیث رسول کا مجموعہ ہیں، لیکن اس میں صحت وضعف کا خیال دقت کے ساتھ نہیں

---

(۵۲) مصدر سابق

کیا گیا ہے لہٰذا اب اس قسم کی کتابیں تیار کی جائیں جو صحیح احادیث کا مجموعہ یا کم از کم مقبول و معمول بہ حدیثوں کا مجموعہ ہوں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ امام اسحاق بن راہویہ (متوفی ۲۳۸ھ) کے مشورے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسی پس منظر میں ایک عظیم اور بے مثال کتاب "الجامع الصحیح المسند المختصر من حدیث رسول اللہ ﷺ وسننه وأيامه" تالیف کی گئی ہے جس کو دنیا ''صحیح بخاری'' کے نام سے جانتی ہے جس کو شرف اولیت کے ساتھ ساتھ شرف قبولیت بھی حاصل ہے، اس کتاب کو علماء زمانہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا، اس دور کے ماہرین فن نے اس کی تصدیق کی اس کی صحت کا اعتراف کیا، اس کو "أصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ" یعنی کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح ترین کتاب کا خطاب دیا، طبقہ در طبقہ یہ کتاب آج تک اسی عزت و شرف کے ساتھ پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، اس کتاب کا نہ پڑھنے والا صاحب الفضیلہ بننے سے محروم رہتا ہے۔

اسی کی مانند اسی دور میں دوسری کتاب تیار ہوئی جس کا نام "المسند الصحیح" ہے جو صحیح مسلم کے نام سے مشہور ہے، اول الذکر کتاب کے بعد کتب حدیث میں از روئے صحت اسی کا درجہ ہے، ان کی حدیثوں کو ''متفق علیہ'' کہا جاتا ہے، اور ان دونوں کے مجموعہ کو ''صحیحین'' کہا جاتا ہے۔

صحیحین کی امتیازی حیثیت اور اسباب

صحیح سے مراد حدیث صحیح ہے، جس میں علم اصول حدیث کے قاعدے کے اعتبار سے کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے پانچ شرائط کا ہونا ضروری ہے یعنی وہ حدیث : متصل السند ہو، عادل اور کامل ضبط راوی نے اس کو اپنے طرح ہی کے راوی سے روایت کیا ہو، معلل اور شاذ نہ ہو، صحیحین کی ساری متصل روایتیں ان شروط پر مکمل ہیں اس لیے ان کو صحیح کہا جاتا ہے۔

جب سے ان کتابوں کا وجود ہوا ہے اسی وقت سے ان کو شہرت اور قبول عام حاصل ہے، جو ان کی امتیازی خصوصیت ہے، کسی دوسری کتاب کو مجموعی یا انفرادی طور سے یہ مقام نہ مل سکا، جیسے ہی کسی روایت کے بارے میں یہ پتہ چل جائے کہ یہ صحیح بخاری یا صحیح مسلم کی ہے، یا متفق علیہ ہے، اس وقت ہر کامل مسلمان کو ایمان کی حلاوت محسوس ہوتی ہے، علم ویقین اور اعتماد کامل حاصل ہوتا ہے، اور قلبی سکون محسوس کرتا ہے، اس کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتا ہے، تحقیق وتدقیق کی ضرورت نہیں محسوس کرتا اس لیے کہ وہ تحصیل حاصل ہے، امت کے بڑے بڑے علماء ماہرین فن اسی کے خوشہ چیں ہیں، اس کے پڑھنے اور پڑھانے کا اہتمام کرتے ہیں، مسجدوں، محفلوں، مدرسوں اور جامعات میں ان کا درس ہوتا ہے۔ جب تک کوئی طالب علم صحیحین کو نہ پڑھ لے تب تک اس کو عالم نہیں تصور کیا جاتا، اور نہ اس کو سند فضیلت مل سکتی ہے، جب تک وہ ان کتابوں کو کم از کم ایک نظر نہیں پڑھ لیتا تب تک وہ صاحب فضیلت نہیں ہو سکتا، معاشرہ میں رہنے والوں کو اس بداہت سے انکار نہیں ہونا چاہیے۔

اس کتاب کی جملہ بنیادی حدیثوں کو جو متصل السند ہیں (معلق نہیں ہیں) ان کی صحت پر علماء امت کا اجماع رہا ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ : " أجمعت الأمة علی صحة هذين

الکتابین و وجوب العمل باحادیثھا" ان دونوں کتابوں کی صحت پر، اوران میں موجود حدیثوں کے واجب العمل ہونے پر پوری امت کا اجماع ہے۔ (۵۳)

ابواسحاق اسفرائینی کا کہنا ہے کہ: ماہرین فن کا اس پر اجماع ہے کہ صحیحین میں موجود ساری حدیثیں قطعی طور پر صحیح ہیں، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، اگر کچھ اختلاف ممکن ہے تو بعض راویان اور انفرادی اسناد پر ممکن ہے، البتہ ساری حدیثیں صحیح ہیں۔ (۵۴)

صرف چند حدیثیں ایسی ہیں جن پر بعض اہل علم نے اختلاف رائے کیا ہے، لیکن اختلاف رائے کمزور اصول پر مبنی ہے، جو جمہور محدثین کے اصول کے برخلاف ہے امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ طعن بعض محدثین کے ضعیف قاعدوں پر مبنی ہے جو جمہور کے برخلاف ہے، لہٰذا اس طعن سے دھوکہ میں نہیں آنا۔ (۵۵)

نیز ان کے تنقید کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایتیں صحت کے اس معیار پر نہیں ہیں جن کا التزام صاحب صحیحین نے کیا ہے، فی نفسہ صحت حدیث میں کسی کا اختلاف نہیں۔ (۵۵م)
حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ ان ساری روایتوں میں صاحب صحیحین کو ترجیح حاصل ہے، جب کہ اکثر اعتراضات صحیح بھی نہیں، یا یہ سب روایتیں دوسری سندوں سے موجود ہیں۔ (۵۶)

ان ساری منتقد حدیثوں کا مفصل اور تسلی بخش جواب بہت سارے علماء نے دیا ہے اور حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں ہر ایک حدیث کا جواب فرداً فرداً دے دیا ہے صرف دو تین روایتوں کے بارے میں تسلی بخش جواب نہ ہونے کا اعتراف حافظ ابن حجر نے کیا ہے، ان روایتوں کا جواب بھی اہل علم کے یہاں بہت تفصیل سے دیا گیا ہے، جس سے ساری منتقد روایتوں کا مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ (۵۷)

---

(۵۳) تہذیب الاسماء واللغات (۱/۷۳-۷۴) (۵۴) فتح المغیث (۱/۵۹)
(۵۵) ہدی الساری (۳۴۶) (۵۵م) انباعث الحثیث ص/۳۵
(۵۶) ہدی الساری ص/۳۴۶ (۵۷) مکانۃ الصحیحین ص/۳۸۷

جن لوگوں نے اس وقت اپنی رائے کا اظہار کیا تھا وہ اس کے اہل تھے امام دارقطنی جیسے ماہر علل اور امام وقت تھے جنہوں نے صحیحین کے ہر ہر حرف کو سمجھا تھا۔

لیکن موجودہ زمانہ میں کچھ نامعقول ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کو پوری امت سے اختلاف رائے آج بھی ہے، جن کی مثال پہاڑ پر سر پٹک کر اس کے گرانے کی کوشش کرنے والے کی طرح ہے، اگر جاہلوں سے اس طرح کی چیزوں کا صدور ہو تو وہ اتنا قابل افسوس نہیں جتنا کی کسی ذی رائے اور صاحب علم سے ہوتا ہے، اس لیے کہ ایک جاہل جس کے پاس علم حدیث کی گہرائی نہیں وہ کسی بھی لٹریچر یا مضمون کو پڑھ کر گمراہ ہوسکتا ہے، لیکن کسی عالم سے یہ توقع نہیں ہونی چاہیے ایسا وہی عالم کر سکتا ہے جس نے اپنا علم بھلا دیا ہو اور جاہلوں کے زیر سایہ اور ان کے ماحول میں زندگی گذارتا ہو۔

اس سے بھی زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ ان کا اختلاف ان احادیث سے نہیں ہے جن میں کچھ ائمہ کا اختلاف تھا، بلکہ ان کا اختلاف کچھ دیگر حدیثوں پر ہے، جس پر زنادقہ کو اعتراض تھا، جو کسی خاص کتاب سے متعلق نہ تھا بلکہ ان کا اعتراض ذخیرۂ حدیث پر تھا جس کو موجودہ دور کے مستشرقین نے اسلامی معاشرہ میں رائج کرنے کی کوشش کی ہے، اس طرح کا مزاج رکھنے والے دانستہ یا نادانستہ طور پر مستشرقین کے مستعار خدام ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اپنے وجود سے غافل ہیں، نہ کوئی ذاتی رائے وفکر رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنی تہذیب سے واقفیت ہے۔ بارہ سو سال قبل کے فرسودہ اعتراض کو دہراتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بہت بڑا کارنامہ انجام دے دیا۔

ایسے لوگوں کے بارے میں جو آج بھی احادیث صحیحین کے سلسلہ میں اختلاف کرتے ہیں، شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ "کل من يهون أمرهما فهو مبتدع متبع غير سبيل المومنين" (۵۸) ہر وہ شخص جو صحیحین کی توہین یا تخفیف کرتا ہے وہ بدعتی ہے، مومنوں کے راستہ سے ہٹ کر غیروں کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جو مومنوں کو چھوڑ کر

---

(۵۸) حجۃ اللہ البالغہ (۲۸۰/۱)

غیروں کا راستہ اختیار کرتا ہے قرآن کا یہ حکم ہے " کہ ہم اس کو اس کے کیے ہوئے کو سونپ دیں گے اور جہنم میں ڈال دیں گے جو انتہائی برا ٹھکانہ ہے۔"

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ : جملہ اہل علم صحیحین کی حدیثوں کو تسلیم کرتے ہیں، یہ ویسے ہی ہے جیسا کہ سارے فقہاء کسی مسئلہ پر اجماع کرلیں تو اس کا سب کے لیے ماننا ضروری ہے، اسی طرح سے محدثین کا ان کتابوں کی صحت پر اجماع ہے لہٰذا یہ سب کے لیے قابل تسلیم ہونا ضروری ہے، یہ حضرات خطاء پر اجماع نہیں کرسکتے۔ (۵۹)

صحیحین کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہے اس کی مختلف وجہیں ہوسکتی ہیں، کچھ اہم وجوہ یہ ہیں :

(۱) شیخین کی ذاتی شخصیت :

امام بخاری و مسلم رحمہ اللہ کو محدثین میں بڑا اونچا مقام حاصل ہے، ایک کو امیر المومنین فی الحدیث، سید الفقہاء، نادر زمانہ، امام وقت کا خطاب ملا ہے، تو دوسرے کو امام بخاری کے بعد دوسرا درجہ دیا گیا ہے، ان کو حافظ خراسان، حجۃ الاسلام، محدث نیساپور جیسے عظیم خطاب سے نوازا گیا ہے، فن حدیث میں ان حضرات کو جو صلاحیت حاصل تھی، معرفت رجال میں جو مقام تھا علل حدیث میں جو مہارت تھی، خاص طور سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو وہ دیگر کتب ستہ یا مسانید کے مؤلفین کو نہیں تھی، جس زمانہ میں یہ حضرات تھے اس زمانہ میں امام علی بن مدینیؒ، امام یحییٰ بن معینؒ، امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ، امام احمد بن حنبلؒ جیسے ماہرین فن موجود تھے، جو اپنے اپنے فن میں بے مثال تھے، ان سارے ائمہ کے علوم کو صاحب صحیحین نے جمع کیا، اور صورت حال یہ ہوگئی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علی بن مدینیؒ کے علاوہ میں نے کسی کے سامنے اپنے آپ کو کمزور نہیں محسوس کیا جب علی بن مدینیؒ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے شاگرد کے بارے میں یہ فرمایا : ان کو کہنے دو انہوں نے اپنے آپ کی طرح کسی کو نہیں دیکھا۔ (۵۹م)

---

(۵۹) مجموع الفتاوی (۱۸/۱۷) (۵۹م) ہدی الساری ص ر ۳۴۷

ان حضرات کی صحبت اور علم کا اتنا گہرا اثر انہوں نے قبول کیا کہ اپنے اساتذہ سے آگے نکل گئے، بعض بڑے بڑے اساتذہ ان شاگردوں سے گھبرانے لگے تھے۔

علمی برتری وتفوق کے علاوہ، تقوی وپرہیز گاری، عفت وعصمت، جلالت شان، تواضع وخاکساری سب کچھ اللہ نے ان بزرگوں کو عطا کیا تھا، قربان جائیے اس زندگی پر جس نے خشک روٹی پر قناعت کی، اور فرش خاکی پر بسیرہ ڈالا، چراغ کی جگہ چاند کی روشنی استعمال کرنے والے یہ وہ قدوسی نفوس ہیں جن کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے ان کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے دین کی حفاظت کے خاطر پیدا کیا تھا۔

(۲) رجال صحیحین کی نمایاں حیثیت :

ایک طرف شیخین کو اپنے ہم عصروں پر علمی اور عملی برتری حاصل تھی۔ تو دوسری طرف انہوں نے اپنی کتاب کے لیے جن راویان حدیث کا انتخاب کیا تھا وہ بھی یکتائے زمانہ تھے، دور صحابہؓ سے لے کر اپنے مشائخ کے دور تک ہر ہر طبقہ میں جن راویوں کے واسطہ سے انہوں نے روایت قبول کی وہ عدالت وثقاہت کے بلند ترین مقام پر فائز تھے، ان کی زندگی ہر طرح کے شکوک وشبہات سے بالاتر تھی، راویان حدیث میں جو بہتر سے بہتر معیار ہو سکتا تھا اسی بنیاد پر ان کا انتخاب کیا، جس کی شہادت ائمہ فن نے دی ہے۔

امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ : ان کے رجال درجہ علیا کے ہیں، امام ابوالحسن مقدسی صحیحین کے راویوں کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ " هذا جاز القنطره" انہوں نے پل پار کرلیا "یعنی بذلک أنه لایلتفت إلی ماقیل فیه" (٦٠) ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے سلسلہ میں کوئی تنقید قابل التفات نہیں۔ نیز خود حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ " قد حصل الاتفاق علی

---

(٦٠) ھدی الساری ص ر ۳۸۴

القول بتعد يلهم بطريق اللزوم......" (٦١) ان کی عدالت پر بطریقِ لزوم اتفاق ہو چکا ہے، لہٰذا یہ سارے راویوں سے برتر ہیں یہ ایک بنیادی ضابطہ ہے جس سے خروج نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء راویوں کی تعریف میں صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے تھے کہ یہ صحیحین کے راوی ہیں۔ نیز فرماتے ہیں کہ اس کتاب پر اجماع کا مطلب یہ ہوا کہ اس سے راویوں کی عدالت پر اجماع ہے، یہ امتیاز کسی اور کتاب کو حاصل نہیں۔ (٦٢)

علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ ان کے رجال کلام سے بالاتر ہیں، یہ اس سے کہیں آگے ہیں کہ ان پر زبان کھولی جائے، ان پر گفتگو تحصیل حاصل ہے۔ (٦٣)

ان کے جن رجال پر کچھ کلام کیا گیا ہے وہ اصل کتاب کے راوی نہیں ہیں، بلکہ متابعات وشواہد کے ہیں، اور ان پر جو نقد کیا گیا ہے وہ غیر موثر ہے، خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ : رجال صحیحین پر طعن کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ اس پر محمول ہیں کہ ان پر موثر جرح ثابت شدہ نہیں ہے جو واضح اور سبب کے ساتھ ہو۔ (قواعد التحدیث) تفصیلی جوابات کے لیے ملاحظہ ہو۔ (٦٤)

(۳) انتخاب حدیث میں تحقیق وتدقیق :

یہ کتابیں جس تحقیق جستجو اور اہتمام سے تحریر کی گئی ہیں وہ بھی ان کی مقبولیت اور شہرت میں نمایاں سبب ہے، صاحب صحیحین کی یہ کوشش رہی ہے کہ اس میں ان احادیث کا انتخاب کیا جائے جس کے متن کی صحت میں کوئی کلام نہ ہو، ان بنیادی حدیثوں کے لیے کچھ ایسے متابع وشواہد کا ذکر ضرور کیا ہے جس کے رجال میں اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اصل حدیث کی صحت میں کوئی کلام نہیں۔

---

(٦١) عشرون حدیثا من صحیح البخاری ص ۲۲ (٦٢) ہدی الساری (۳۸۴)
(٦٣) عشرون حدیثا ص ۱۹ (٦٤) ہدی الساری (۳۸۴-۴٦۴)

شدت تحقیق و تدقیق کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں موجودہ حدیثوں کا انتخاب امام بخاریؒ نے تقریباً چھ لاکھ حدیثوں سے کیا ہے، اور ان میں سے جو ہر ہر باب میں سب سے زیادہ صحیح ہیں انہیں کی تخریج کی ہے جن کی تعداد تکرار کے ساتھ ۷۳۹۷ ہے اور بغیر تکرار کے ۲۶۰۲ ہے۔ ان میں صرف صحیح احادیث کو ذکر کیا ہے، اس کی تالیف ترتیب و تنظیم میں تقریباً سولہ سال کا وقفہ لگا ہے۔ (۶۵) جس کے تراجم ابواب کو روضہ اطہر اور منبر رسول کے درمیان بیٹھ کر انتہائی روحانی ماحول میں یکسوئی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ (۶۶)

مزید برآں تحریر کردہ ہر حدیث کے لیے غسل اور دو رکعت نفل نماز ادا کر کے شرعی دلیل (یعنی استخارہ کر کے) اطمینان کر لیا۔ جس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت ہے، یہ اہتمام تالیف، یہ تدقیق و تحقیق ہر ایک کے حصہ میں نہیں آسکی ۔

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں

آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کے شاگرد خاص امام مسلمؒ نے بھی تحقیق و تحری کا نمونہ پیش کیا، انہوں نے تقریباً تین لاکھ مسموعہ احادیث کے مجموعہ سے اس کتاب صحیح کا انتخاب کیا۔ (۶۷) اس کی ترتیب و تفتیش میں پندرہ سال کا وقفہ صرف کیا۔ (۶۸) اس میں مکررات کو لے کر تقریباً آٹھ ہزار اور بغیر تکرار کے (۴۶۱۶) احادیث کی تخریج کی، اس بے شمار تحقیق و تدقیق اور اہتمام کی وجہ سے یہ کتابیں انتہائی صاف ستھری بن کر نکلیں جس کی وجہ سے ان کو قبول عام حاصل ہوا۔

---

(۶۵) تاریخ بغداد (۲/۱۴)
(۶۶) حوالہ مذکورہ (۲/۱۴)
(۶۷) تاریخ بغداد (۱۳/۱۰۱)
(۶۸) تذکرہ الحفاظ (۲/۵۸۹)

(۴) صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہونا :

ہر وہ شخص جو غرور و خود پسندی کی عینک اُتار کر انصاف کی نظر سے ان کتابوں کو دیکھے گا یقیناً اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گی کہ اس میں موجود حدیثیں دیگر کتب احادیث کے مقابلہ میں اصح ترین حدیثیں ہیں، اسی وجہ سے ان کو " أصح الكتب بعد كتاب الله" اللہ کی کتاب قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتاب ہونے کا شرف ملا، اس میں جتنی حدیثیں بسند متصل مروی ہیں وہ صحیح کے اعلیٰ ترین درجہ کی ہیں، جملہ ائمہ اصولِ حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ صحیح کے مختلف مراتب ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلا مرتبہ متفق علیہ کا پھر انفراد بخاری کا (جو صرف بخاری میں ہے) اس کے بعد انفراد مسلم کا، پھر جو ان دونوں کی شرط پر ہو، پھر جو صحیح بخاری کی شرط پر ہو، پھر جو صحیح مسلم کی شرط پر ہو، اس کے بعد وہ حدیثیں ہیں جن کو دیگر ائمہ نے صحیح کہا ہے، لہٰذا متفق علیہ حدیثیں سب سے اعلیٰ ہیں، اس میں سے بعض متواتر بھی ہیں، اور بقول حافظ ابن حجرؒ جو صحیح بخاری کے اسپیشلسٹ ہیں اور بقول امام سیوطی : امام بخاری کی موافقت امام مسلم نے عام طور سے کی ہے۔ صرف ۸۴۰ حدیثیں ایسی ہیں جن میں وہ منفرد ہیں۔ (۶۹)

شیخ محمد فواد عبدالباقیؒ نے متفق علیہ حدیثوں کو یکجا کر دیا ہے اور ایک خوبصورت نام "اللؤلؤ والمرجان فيما اتفق عليه الشيخان" سے ان کو موسوم کیا ہے، ان کے شمار کے اعتبار سے ۱۹۰۶ روایتیں متفق علیہ ہیں، اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ صحیح بخاری کی جملہ روایتیں بغیر تکرار کے ۲۶۰۲ ہیں، اس اعتبار سے صحیح بخاری میں ۶۹۶ حدیثیں ہی صرف ایسی ہیں جس میں امام بخاری منفرد ہیں بقیہ دیگر متفق علیہ ہیں۔ متفق علیہ روایتوں کو بعض ائمہ نے تواتر کا درجہ دیا ہے۔ امام ہروی فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو دونوں نے یا کسی ایک نے روایت کیا ہے تو وہ قطعی طور پر صحیح ہیں، اور علم قطعی نظری کا فائدہ دیتی ہیں۔ (۷۰)

---

(۶۹) (مكانة الصحيحين) (۷۰) (مكانة الصحيحين)

صحیحین میں جو روایتیں ہیں وہ اتصال سند، عدالت وضبط میں کمال، شذوذ اور علت سے عاری ہونے پر ایک اعتبار سے اصح ہیں اور اعلیٰ معیار کی ہیں، صحیح حدیث کی جو تعریف اہل علم نے کی ہے اور جو شرائط ذکر کیے ہیں وہ ان میں اکمل طریقے سے صادق آتی ہیں۔ امام مسلمؒ کے اس قول کا ذرا غور سے مطالعہ کریں "لیس کل شئ عندی صحیح وضعته ههنا إنما وضعت ههنا ما أجمعوا علیه" (۷۱) ہر وہ روایت جو ہمارے نزدیک صحیح تھی میں نے اس کو یہاں نہیں تحریر کیا ہے، بلکہ یہاں ان کو تحریر کیا ہے جن پر اہل علم کا اتفاق ہے۔

(۵) علم یقین کا فائدہ ملنا :

ان کتابوں کی حدیثوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم یقین ہوتا ہے، اس لیے کہ ان میں جو حدیثیں ہیں، وہ عام طور سے متفق علیہ ہیں، اور جو فائدہ اور علم تواتر سے حاصل ہوتا ہے وہ ان سے بھی ہوتا ہے ان کی حدیثوں پر استخراج بیسیوں ائمہ نے کیا ہے، مستخرج کی جو تعریف اور اصطلاح میں ان کا جو مفہوم ہے اس اعتبار سے یہ کتابیں جو صحیحین یا کسی ایک پر بحیثیت مستخرج تصنیف کی گئی ہیں، ان کی روایتوں کی مؤید ہیں، اس لئے مستخرج میں یہ ضروری ہے کہ مؤلف کتاب کی سند کے علاوہ استخراج کرنے والے کی روایتیں کسی دوسری سند سے مروی ہوں جو مؤلف کتاب کے شیخ یا شیخ الشیخ یا اس سے اوپر جا کر ملتی ہوں، اس طرح سے یہ مستخرجات ان کتابوں کی بڑی مؤید ہوتی ہیں جو ان کو علم یقین کا فائدہ دے کر مزید قوت دیتی ہیں۔

ابوبکر جوزقانی فرماتے ہیں کہ : ''میں نے صحیحین پر مستخرج لکھی جس میں پچیس ہزار چار سو اسّی سندیں ہیں۔ (۷۲)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''شیخین کی عظمتِ شان، صحیح وضعیف کی تمیز میں اُن کا اعلیٰ مقام، علمائے امت کا ان کتابوں کو بطور صحت قبول کرنا، حصول علم (یقینی ضروری) کا فائدہ دیتی

---

(۷۱) صحیح مسلم مع النووی (۱۲۲/۴) (۷۲) فتح المغیث (۳۷/۱)

ہے۔'' (۷۳)

ایسے ہی امت کا اجماع کر لینا اور بطور " أصح الكتب بعد كتاب الله" اس کو تسلیم کر لینا یہ دوسرا قرینہ ہے جو شرعی قرینہ ہے۔ اس سے ان کی صحت پر مزید اطمینان ویقین حاصل ہوتا ہے، اس لیے کہ اللہ کے رسول کا فرمان ہے " لا تجتمع أمتي على ضلالة " (۷۴) میری امت گمراہی (غلطی) پر اتفاق نہیں کر سکتی ہے۔

عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں کہ : جس پر امت کا اجماع ہوتا ہے وہ اسناد سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ (۷۵)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ : کسی حدیث کی صحت پر اجماع کر لینا علم یقینی کے فائدہ دینے کے اعتبار سے کثرت طرق کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ (۷٦)

ویسے بھی کسی حدیث کا صحیحین یا دونوں میں سے کسی ایک میں ہونا فی نفسہ خود ایک قرینہ ہے جو اس کو ''علم ظنی یقینی'' سے ''علم نظری یقینی'' تک پہنچا دیتا ہے، علماء کے یہاں یہ قاعدہ مشہور ہے کہ خبر واحد کے ساتھ اگر کوئی قرینہ ہو تو وہ ''علم ظنی'' کے مرتبہ سے بڑھ کر ''علم نظری'' تک پہنچ جاتا ہے۔ (۷۷)

صحیحین کی روایت کو حد درجہ گرا کر خبر آحاد ہی تسلیم کیا جائے تو بھی یہ قرینہ اس کو تقویت دے کر اعلیٰ معیار کا بنا دیتا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ ومسلمؒ نے اس کتاب میں جس کو صحیح کہا ہے وہ قطعی طور سے صحیح ہیں۔ (صحیح کہنے کا مطلب یہ ہے جس کو اپنی کتاب میں

---

(۷۳) نزهة النظر ص ر ۲۴-۲۵

(۷۴) سنن ابوداؤد (۴۲۵۳)، سنن ترمذی (۲۱۶۷ وصححہ)، سنن ابن ماجہ (۳۹۵۰)، مسند احمد (۱۴۵/۵)

(۷۵) فتح المغیث (۵۹/۱-۶۰) (۷٦) فتح المغیث (۶۰/۱) (۷۷) نزهة النظر ص ر ۲۴

صحیح سمجھ کر شامل کیا ہے۔) اس سے علم نظری (یعنی علم استدلالی) حاصل ہوتا ہے، علامہ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ: امت کا قبول کرنا علم نظری کا فائدہ دیتا ہے جس سے (مکمل) علم حاصل ہوتا ہے۔

(٦) خالص صحیح احادیث کا مجموعہ ہونے میں سبقت :

سابقہ کتب حدیث کی تالیف پر اگر نظر ڈالیں تو اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان سے قبل صحیح مجرد کی کوئی کتاب موجود نہ تھی، امت اسلامیہ بڑی شدت سے اس طرح کی کتابوں کی ضرورت محسوس کر رہی تھی، امام اسحاق بن راہویہؒ جملہ پر ذرا غور کیجیے "لـو جمعتم : الخ" کاش کہ تم لوگ خالص صحیح احادیث کا مختصر مجموعہ تیار کر لیتے تو بہت بہتر تھا۔ (٧٨) لفظ "لو" کس تشنگی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ انسان کو انسانی زندگی میں جس چیز کی اشد ضرورت ہو اور وہ دستیاب نہ ہو تو کس طرح انسان بے تاب رہتا ہے، اور جوں ہی وہ چیز دستیاب ہو جاتی ہے ہاتھوں ہاتھ اس کو لے لیا جاتا ہے۔

ملت اسلامیہ اپنی روحانی زندگی کے لیے انتہائی شدت سے صحیح کتاب حدیث کی منتظر تھی لہٰذا جیسے ہی۔ سب سے پہلے۔ امام بخاریؒ نے، اور پھر ان کے بعد ان کے شاگرد رشید امام مسلم نے ان کی تالیف کی اسلامی معاشرہ نے ہاتھوں ہاتھ ان کو لے لیا، علماء فن نے ان کی صحت اور اصح الکتب ہونے کی تصدیق کی خاص طور سے صحیح بخاری کو بڑا عظیم مقام ملا ۔

أول من صنف في الصحيح   محمد وخص بالترجيح

سب سے پہلے جس نے صحیح حدیثوں کو جمع کیا وہ محمد بن اسمٰعیل بخاری ہیں اور ان کو سب پر ترجیح حاصل ہے۔

---

(٧٨) ہدی الساری ص ر ٧

(۷) مؤلفین کا اقرار، علماء کی تصدیق، اجماع امت :

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی تصنیف مسجد حرام میں کی ہے اور اس میں کوئی حدیث اس وقت تک نہیں تحریر کی یہاں تک کہ استخارہ کیا اور دو رکعت نماز ادا کی اور اس کی صحت کا یقین ہوگیا۔ (۷۹) نیز فرماتے ہیں کہ "ما أدخلت في الجامع إلا ماصح" (۸۰) میں نے اس جامع میں صرف صحیح حدیثوں کو داخل کیا ہے اور بے شمار صحیح حدیثوں کو چھوڑ دیا ہے۔

امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ ''ليس كل شئي عندي صحيح وضعته ههنا، إنما وضعت ههنا ماأجمعو عليه'' (۸۱) ہر وہ چیز جو ہمارے یہاں صحیح ہے میں نے اس کو یہاں نہیں لکھا ہے، میں نے یہاں وہ لکھا ہے جس پر علماء کا اجماع ہے۔''

پھر ان کی تالیف کے بعد انہوں نے چنندہ علماء زمانہ کے سامنے پیش کیا، انہوں نے اس کی تصدیق کی اور بے حد پسند کیا، امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے صحیح کی تالیف کے بعد علی بن مدینیؒ، احمد بن حنبلؒ، یحیٰی بن معینؒ جو اس دور کے اساطین تھے۔ کے سامنے پیش کیا، انہوں نے اس کو بہت پسند کیا، اور اس کی صحت کی تصدیق کی سوائے چار روایتوں کے امام عقیلیؒ فرماتے ہیں کہ ان چاروں روایتوں میں بھی امام بخاریؒ کا قول ہی درست ہے۔ (۸۲)

امام مسلمؒ کا جو بیان گذرا کہ "ماأجمعوا عليه" ہی کو میں نے تحریر کیا ہے۔ اس کی تشریح میں علامہ بلقینیؒ فرماتے ہیں کہ " ما أجمعوا عليه" سے مراد احمد بن حنبلؒ، یحیٰی بن معینؒ، عثمان بن ابی شیبہؒ اور سعید بن منصور خراسانیؒ ہیں۔ (۸۳)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان ائمہ کی تائید صحیح مسلم کو بھی حاصل ہے۔ نیز امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ اس کی تصنیف کے بعد میں نے اس کو امام ابو زرعہ رازیؒ کو دکھایا جس کے بارے میں انہوں

---

(۷۹) ہدی الساری ص ۴۹۸
(۸۰) مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۵-۱۶
(۸۱) مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۶
(۸۲) ہدی الساری ص ۴۸۹
(۸۳) محاسن الاصطلاح ص ۹۱

نے کہا صحیح ہے اس میں کوئی علت نہیں ہے میں نے ان کو باقی رکھا، اور جس میں علت کا اشارہ کیا میں نے ان کو نکال دیا۔ (۸۴)

یہ سربلندی وکمال انہیں کتابوں کو حاصل ہے۔

اس کے علاوہ علماء کا جو ان کی صحت پر اجماع ہے جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جس نے صحیحین کو امتیازی حیثیت دی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھ عطا فرمائے اور سنت نبوی کی کھلے دل سے پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے، صحیح سنت نبوی کو قبول کرنے اور سمجھنے کی توفیق بخشے۔ آمین

☆☆☆

---

(۸۴) شرح مسلم (۱/۱۵)

سنن اربعہ

ان دونوں کتابوں کے علاوہ اسی دور میں کچھ اور کتابیں تحریر کی گئیں جن میں سنن اربعہ کو بڑی خصوصیت حاصل ہے، ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی الگ حیثیت ہے۔

سنن ابوداؤد :

یہ کتاب جس کا اصل نام "السنن" ہے اس کو امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (متوفی ۲۷۵ھ) نے تالیف کی ہے۔

یہ کتاب احکام کی حدیثوں میں سب سے جامع اور مشہور کتاب ہے، آپ نے اس میں ایسی حدیثوں کو ذکر نہیں کیا ہے جس کے راوی کے ترک پر اتفاق ہو۔ (۸۵) خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ : اس میں احکام کی ایسی بنیادی اور اصل روایتیں ہیں، میرے علم کے مطابق ایسا کسی نے نہیں کیا، اور نہ کسی کے کر سکنے کی امید ہے۔ (۸۶)

سنن ترمذی :

یہ امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ) کی تالیف ہے، یہ سنن اربعہ میں دوسرے نمبر کی کتاب ہے، امام ترمذی نے اس کو تحریر کرنے کے بعد علماء کے سامنے پیش کیا جنہوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ (۸۷) آپ امام بخاری کے اہم شاگردوں میں سے تھے جن سے اس کتاب میں استفادہ نمایاں ہے، اس میں ہر حدیث کا حکم واضح کر دیا گیا ہے، جو اس کتاب کی بہت اہم خوبی ہے، اس میں تقریباً وہ ساری حدیثیں جمع ہوئی ہیں جس پر علمائے

---

(۸۵) رسالۃ ابی داؤد ص ۲۵ (۸۶) الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ ۴۴ ص ۲۴۴

(۸۷) تہذیب التہذیب ۱: ۹ ۳۸۹

امت یا ائمہ اربعہ میں سے کسی کا عمل رہا ہے، بعض روایتیں بیان ضدیت کے طور پر یعنی کسی صحیح روایت کے مخالف ہونے کی وجہ سے محض ضعیف بیان کرنے کے لیے ذکر کی گئی ہیں، جن کا مقصد بیان ضعف ہے نہ کہ استدلال کرنا یا عمل دکھلانا ہے۔ (۸۸) عام طور سے روایتوں کے ذکر کرنے کے بعد یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس باب میں اور کن کن صحابہ سے روایتیں مروی ہیں، یہ کتاب علوم حدیثیہ اور مسائل فقہیہ کے اعتبار سے بھی ممتاز ہے۔

سنن نسائی :

یہ امام احمد بن شعیب ابوعبدالرحمٰن نسائی (متوفی ۳۰۳ھ) کی تالیف ہے، جس کو آپ نے "السنن الکبریٰ" سے مختصر کیا ہے، اس کا اصل نام "المجتبیٰ" ہے جو سنن صغریٰ یا سنن نسائی سے معروف ہے۔ اس میں جمع طرق، بیان اختلاف الفاظ پر کافی توجہ دی گئی ہے۔ آپ کی شرط یہ ہے کہ اس کتاب میں کسی متفق علیہ متروک راوی کی روایت قبول نہ کی جائے گی۔ (۸۹) بعض اہل علم نے اس کو صحیح کا خطاب دیا ہے جو توسع پسندی ہے۔

سنن ابن ماجہ :

یہ امام ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی (متوفی ۲۷۳ھ) کی تالیف ہے جس کا شمار اکثر اہل علم نے سنن اربعہ میں چوتھے نمبر پر کیا ہے، جس کی وجہ اس میں کثرت ابواب و کثرت زوائد کا وجود ہے، کیوں کہ کثرت ابواب کثرت استنباط اور کثرت مسائل پر دلالت کرتے ہیں، حالاں کہ اس کی زوائد حدیثیں عموماً ضعیف ہیں۔

زوائد کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ایسی حدیثیں بہت زیادہ ہیں جو دیگر کتب خمسہ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی) میں نہیں ہیں، سنن اربعہ میں سب سے زیادہ تعداد میں ضعیف روایتیں اسی میں ہیں۔

---

(۸۸) شروط الائمۃ الستۃ ص ر ۲۰

(۸۹) شروط الائمۃ الستۃ ص ر ۱۹

یہ وہ چھ اہم کتابیں ہیں جو اسی دور میں تحریر کی گئی ہیں۔ جن کے منظر عام پر آنے کے بعد دیگر کتب حدیث کی ضرورت کم سے کم ہوگئی، انہیں کتابوں پر از روئے عمل زیادہ اعتماد و انحصار کیا گیا، مدارس و جامعات میں ان کو شامل نصاب کیا گیا ان کے درس و تدریس کا اہتمام ہوا، انہیں کو ''دواوین اسلام'' ''امہات کتب'' اور ''اصول'' قرار دیا گیا، عرف عام میں انہیں کو ''صحاح ستہ'' بھی کہا جاتا ہے جس میں اکثریت کا خیال اور توسع کا دخل ہے۔ اہلِ علم ''صحاح ستہ'' کہنے کے بجائے ''کتبِ ستہ'' کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سنن اربعہ کے مراتب میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو ایک دوسرے پر فوقیت دی گئی ہے۔ البتہ سنن ابن ماجہ کو باتفاق آخر میں رکھا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ تینوں کتابیں تقریباً مرتبے میں برابر ہیں۔

دیگر اہم کتابیں

موطاء : امام مالک بن انس اصبحی (متوفی ۱۷۹ھ)

بہت سے اہل علم نے از روئے صحت اُس کو صحیحین پر بھی مقدم مانا ہے، حالانکہ اس میں مراسیل، مقاطیع اور بلاغات کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ کچھ اہل علم نے اس کو ابن ماجہ کی جگہ پر اسی وجہ سے کتبِ ستہ میں شمار کیا ہے۔

سنن دارمی : امام ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن (متوفی ۲۵۵ھ)

اس کو ''مسند دارمی'' بھی کہا جاتا ہے۔ جو اصطلاحی نہیں بلکہ لغوی معنی کے اعتبار سے ہے۔ (یعنی مسند بمعنی متصل ہے)

ابو معاویہ رزین نے ابن ماجہ کے بجائے اُس کو کتبِ ستہ میں شمار کیا ہے۔ اسی طرح سے علامہ مغلطائی، علامہ علائی اور شیخ عبدالحق دہلوی نے یہ کہا ہے کہ اس کو سنن ابن ماجہ اور موطاء کے بجائے کتب ستہ میں شمار کرنا بہتر ہے۔

سنن ابن ماجہ کے مقابلہ میں اس کی سندیں بہتر اور اعلیٰ ہیں لیکن چونکہ اس میں مرسل، معضل، منقطع روایتیں کافی تعداد میں ہیں۔ اس لیے اس کا درجہ کم ہو گیا۔

مسند احمد : امام احمد بن محمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ)

یہ کتاب موجودہ مسانید میں سب سے بڑی کتاب ہے جس میں تکرار کے ساتھ چالیس اور بغیر تکرار کے تیس ہزار حدیثیں ہیں۔

عمومی طور سے اہل علم نے کتب صحاح و سنن کے بعد مسانید کو تیسرے نمبر پر رکھا ہے، لیکن اس کے باوجود اس مسند کی حدیثیں از روئے سند بہت بہتر ہیں، اس میں جو ضعیف روایتیں ہیں زیادہ تر امام عبداللہ اور ابوبکر قطیعی کی زوائد ہیں۔

صحیح ابن خزیمہ : امام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ (متوفی ۳۱۱ھ)

کتاب کا اصل نام "مختصر المختصر من المسند الصحیح عن النبی ﷺ" ہے۔ کتب صحاح میں صحیحین کے بعد اس کا درجہ ہے اس لیے کہ حدیث پر حکم لگانے میں دیگر اصحابِ کتب صحاح سے زیادہ تحقیق اور احتیاط سے کام لیا ہے۔

مطبوعہ نسخہ ناقص ہے صرف کتاب الزکوٰۃ تک موجود ہے اور اتنا ہی مطبوع ہے۔

صحیح ابن حبان : امام ابو حاتم محمد بن احمد بن حبان تمیمی (متوفی ۳۵۴ھ) کتاب کا اصل نام " المسند الصحیح علی التقاسیم والأنواع من غیر وجود قطع فی سندھا ولاثبوت جرح فی ناقلیھا " ہے جس کو "التقاسیم والأنواع" کہا جاتا ہے، کتبِ صحاح میں یہ چوتھے نمبر پر ہے۔

اس کی ترتیب انتہائی مشکل تھی اس لیے علاؤالدین علی بن بلبان فارسی (متوفی ۷۳۹ھ) نے اُس کو فقہی ابواب پر مرتب کر دیا ہے جو " الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان" کے نام سے مطبوع ہے اور صحیح ابن حبان کی جگہ پر یہی متداول ہے۔

السنن الکبریٰ : امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی (متوفی ۴۵۸ھ) یہ کتبِ سنن میں سب سے بڑی کتاب ہے احکام کی حدیثوں کا سب سے بڑا ذخیرہ اس میں ہے۔ امام بیہقی کی دوسری کتاب ''السنن الصغریٰ'' کے مقابلے میں ان کا نام ''السنن الکبریٰ'' ہے۔

شرح السنۃ : یہ امام بغوی ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی (متوفی ۵۱۶ھ) کی تالیف ہے جو مشکوٰۃ المصابیح کے مؤلف ہیں۔ اس میں حدیثوں کو اپنی سند سے روایت کرنے کے بعد ضروری تشریح بھی مختصر انداز میں حدیث کی روشنی میں کر دیا ہے۔

ان کے علاوہ اور دیگر کتابیں ہیں جن کو علماء اسلام نے تالیف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے اور ہم لوگوں کو بھی حدیث نبوی کی خدمت کرنے اور اُس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

انواع کتبِ حدیث :

محدثین کرام نے حدیث رسول سے متعلق جو کتابیں تحریر کی ہیں وہ مختلف انواع کی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خاص خاص موضوع اور مسائل پر بھی کتابیں تصنیف کی ہیں، جیسے کتبِ عقائد، سنۃ، اخلاق، زہد، ترغیب وترہیب، اذکار، ادعیہ وغیرہ۔

پھر ان انواع میں سے ہر نوع پر مختلف تالیفات ہیں۔ لہٰذا ان کتابوں کا اعداد وشمار ناممکن ہے۔ اصحابِ فہارس نے اپنی اپنی کتابوں میں ان کا ذکر کیا ہے لیکن کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے تمام انواع کو جمع کر دیا ہے۔ مثلاً فهرسة ابن نديم اور فهرسة ابن خير اشبيلي، المعجم المفهرس اور المجمع المؤسس ابن حجر عسقلاني، الرساله المستطرفه كتاني، كشف الظنون و هدية العارفين حاجي خليفه وغیرہ الاعلام زركلي، معجم المؤلفين عمر رضا كحاله وغیرہ نے علوم شرعیہ کی کتابوں کا تذکرہ مذکورہ کتابوں میں کیا ہے

بہرحال انواعِ کتب حدیث میں سے ''متونِ حدیث'' سے متعلق بعض اہم قسمیں یہ ہیں :

اُجزاء : ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں ایک شخص کی مرویات، یا ایک موضوع کی مرویات اکٹھا کردی جائیں۔

جیسے : جزء حدیث مالک، جزء القرأۃ خلف الامام، دوسری قسم کو رسالہ بھی کہا جاتا ہے۔

اربعین : اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں ایک باب یا مختلف ابواب کی چالیس حدیثیں جمع کردی جائیں جیسے امام نووی کی "اربعین"

اطراف : اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں حدیث کے ابتدائی حصہ کو صحابہ کے نام پر مرتب کردیا جائے جو بقیہ حصہ پر دلالت کرے پھر اس کی سند کو مکمل یا ناقص ذکر کردیا جائے۔

جیسے : تحفة الأشراف بمعرفة الأطراف۔

جامع : حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں ہر باب کی حدیثیں شامل ہوں۔ وہ ابواب آٹھ ہیں :

(۱) عقائد (۲) احکام (۳) زہد ورقاق (۴) آداب
(۵) تفسیر (۶) تاریخ وسیر (۷) مناقب ومثالب (۸) فتن وملاحم

جامع کی تعریف اس طرح سے بھی کی جاسکتی ہے۔

جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں عقائد، احکام، رقاق، آداب، تفسیر، تاریخ وسیر، مناقب ومثالب اور فتن وملاحم کی حدیثیں پائی جائیں۔

جیسے : الجامع الصحیح للبخاری۔

زوائد : ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں کسی متعین کتاب سے کسی مخصوص کتاب کے مقابلہ میں جو زائد حدیثیں ہیں ان کو جمع کردیا جائے۔

جیسے : مصباح الزجاجہ فی زوائد ابن ماجہ۔

سنن ابن ماجہ میں کتب خمسہ کے مقابلہ میں جو زائد روایتیں ہیں ان کو اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔

سنن : حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں صرف اُحکام کی حدیثیں پائی جائیں، جو ابواب فقہ پر مرتب ہوں۔

جیسے : سنن ابوداؤد۔

مجامیع : ان کتابوں کو کہتے ہیں جس میں چند کتابوں کی روایتوں کو اکٹھا کر کے مرتب کر دیا جائے۔

جیسے : ابن اثیر کی جامع الأصول ۔

مستخرج : اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کوئی مؤلف کسی صاحب کتاب کی روایتوں کو اپنی سند سے جمع کر دے بشرطیکہ اس کی سند صاحب کتاب کے شیخ، یا شیخ الشیخ میں مل جائے۔

جیسے : مستخرج الاسماعیلی علی الصحیحین۔

مستدرک : اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کوئی مؤلف دوسرے شخص کی شرط پر اس سے فوت شدہ روایتوں کو اکٹھا کر دے۔

جیسے : امام حاکم کی المستدرک علی الصحیحین ۔

مسند : حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں ہر صحابی کی روایت کو الگ الگ جمع کر دیا گیا ہو۔

جیسے : مسند امام احمد، مسانید کی ترتیب مختلف ہوا کرتی ہے۔
مسند اس حدیث کو بھی کہتے ہیں جو متصل السند ہو۔

مصنف : اس کتاب کو کہتے ہیں جو ابواب فقہ پر مرتب ہو جس میں احادیث وآثار کے ساتھ ساتھ اقوال صحابہ، تابعین وغیرہ بھی ہوں۔

جیسے : مصنف ابن ابی شیبۃ، مصنف عبدالرزاق صنعانی۔

مؤطاء : اس کتاب کو کہتے ہیں جو ابواب فقہ پر مرتب ہو۔ جس میں اُحادیث وآثار کے ساتھ ساتھ مؤلف کا قول بھی شامل ہو۔

جیسے : مؤطاء امام مالک۔

موطاء ومصنف میں بس یہی ایک فرق ہے کہ مصنف میں مؤلف کے اقوال نہیں ہوتے جبکہ مؤطاء میں مولف کے اقوال بھی ہوتے ہیں۔

معجم : اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مشائخ کی ترتیب پر روایتوں کو جمع کر دیا گیا ہو۔

جیسے : امام طبرانی کی المعجم الصغیر اور المعجم الأوسط۔

کبھی کبھی مسند پر بھی معجم کا اطلاق کیا گیا ہے۔

جیسے : امام طبرانی کی المعجم الکبیر۔

☆☆☆

بابِ دوم

تحفظِ سنت کی علمی خدمات

۱ - علم اصول حدیث

تمہید : اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء ورسل کا جو سلسلہ شروع کیا اس کا خاتمہ سید الاولین والآخرین پر ہوا، غارِ حرا میں آپ کو بذریعہ جبرئیل علیہ السلام جو پیغام دیا گیا اس کی تعبیر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی کہ :

حسب عادت میں غارِ حرا میں محوِ عبادت تھا اتنے میں ایک فرشتہ آیا اور اس نے کہا کہ " اقرء" میں نے کہا کہ " ما أنا بقاری " یہی جملہ دوبارہ دہرایا اور وہی جواب ملا، بالآخر تیسری مرتبہ زور سے بھینچ کر فرمایا ﴿ اقرء باسم ربک الذی خلق ﴾ (العلق : ۱-۵)

قرآن کی یہ پہلی آیتیں ہیں جن کا نزول غارِ حرا میں ہوا اور وہیں آپ کو رسالت سے سرفراز کیا گیا۔

اُصول حدیث کا وجود :

قرآن کریم کی آیت ﴿ اقرء باسم ربک الذی خلق ﴾ (العلق : ۱-۵) سے پہلے وحی کی جو کیفیت آپ نے بیان کی، وہ صحیح بخاری کے ابتداء ہی میں موجود ہے۔ (۱)

آپ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے درمیان جو مکالمہ ہوا یہ حدیث رسول کی ابتدا ہے اور آپ نے جن باتوں کی نسبت فرشتے کی جانب کی یہ اسناد کی ابتدا ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ حدیث رسول کا وجود نزول قرآن سے پہلے ہے، نیز متن حدیث اور سند حدیث دونوں کی پیداوار اسی کے ساتھ ساتھ ہے۔

اصول حدیث کی اصطلاح میں سند اور متن کے اسی مجموعہ کا نام حدیث ہے، اس علم کا پورا

---

(۱) بخاری (۳)

دارومدار اسی سند اور متن پر ہوتا ہے، اس سند اور متن کی معرفت کے لیے جو اصول وضوابط ہیں اسی کے جاننے کو اصول حدیث کہا جاتا ہے، اور اس کے جو اصطلاحی کلمات ہیں وہ مصطلحات حدیث ہیں، اصول حدیث، مصطلح الحدیث، علم الحدیث درایۃ، علم اثر یہ سب ایک علم کے مختلف نام ہیں۔

اُصول حدیث کا ارتقاء :

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں، اصول وضوابط کی بہت زیادہ ضرورت نہ تھی اس لیے کہ سند میں ابھی تنوع نہیں تھا، اسناد کے لیے بس قال رسول اللہ ،یاسمعت رسول اللہ کافی تھا، زیادہ سے زیادہ عن جبرئیل ، عن ربہ عزوجل ،یاسمعت رسول اللہ ، قال أخبرنی جبرئیل کا تنوع تھا۔ ان واسطوں میں صرف آمنا وصدقنا کے علاوہ اور کوئی ضرورت نہیں تھی، متن حدیث میں کہیں ناسخ ومنسوخ اور کہیں بظاہر تعارض یا عدم فہم کی بات ہوسکتی تھی جس کی وضاحت موقع پر بذریعہ رسول یا کسی دوسرے صحابی کے ذریعہ ہوجاتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں پر اصحاب، صحابی کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں ہوا ہے، جس کا ذکر بعض منصوص حدیثوں میں موجود ہے ﴿ والذین اتبعوھم باحسان ﴾ (توبہ : ۱۰۰) کو تابعی کہا گیا، صحابہ کرام احادیث رسول کو آپ سے سنتے تھے، یا کسی اور صحابی سے سنتے تھے اور اس کو رسول کی جانب منسوب کردیتے تھے اس لیے کہ ان کا ماحول ومعاشرہ اصحابِ صدق وصفا، عدول وثقات کا معاشرہ تھا جس کا نقشہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یوں کھینچا ہے "واللہ ما کنا نکذب وما ندری ما الکذب" (۲) بخدا نہ ہم جھوٹ بولتے تھے نہ جانتے تھے۔

نسبت کرتے وقت جو صیغہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے استعمال کیا مثلاً "سمعت رسول اللہ ، حدثنا رسول اللہ وھو الصادق المصدوق ، قال رسول اللہ" یا جو صیغہ رسول نے

---

(۲) مقدمۃ الکامل (۱/۱۶۶)

استعمال کیا، مثلاً "أخبرني جبرئيل آنفا ، قال الله عزو جل " وغیرہ یہ ایسے صیغے ہیں جن کو صیغہ ادا کہا جاتا ہے، گویا کہ سند کے ساتھ ساتھ ان صیغوں کی بھی ابتداء ہوئی، معلوم یہ ہوا کہ اس دور میں حدیث، سند، متن، ناسخ، منسوخ، نسخ، تعارض، توفیق، صیغہ ادا، صحابی تابعی کی اصطلاح مفہوم اور معروف تھی۔

مصطلحات حدیث کے یہ چند نمونے ہیں جو رسول کے زمانہ میں شجرہ طیبہ کی شکل میں نمودار ہوئے، جو آگے چل کر ایک تن آور درخت بن گیا جس میں سے بے شمار شاخیں نکلیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بعد صحابہ کرام کا دور- جو خلفاء راشدین کا دور ہے۔ گذر رہا تھا اس میں کچھ ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے حدیث رسول میں خرد برد کرنے کی کوشش کی، رسول کی جانب وہ باتیں منسوب ہوئیں جو آپ نے نہیں کہی تھی۔ یہ ایک مخصوص پارٹی کا کام تھا جو اہل سنت سے الگ تھلگ " شيعان علي " کے نام سے اپنا مخصوص فکر رکھتی تھی، وضع حدیث کا یہ کام سب سے پہلے فضائل اشخاص سے شروع ہوا، آگے چل کر کچھ اور پارٹیاں تیار ہوئیں جو اس میں ان کے شریک کار بنیں لیکن سب کی گرفت ہوگئی۔

جیسے ہی اس کی بھنک صحابہ کے کان میں پڑی اس کی تدبیر کی گئی اور اسی پس منظر میں سب سے پہلے اسناد کی طلب اور پھر اس کی تحقیق شروع کر دی گئی۔

﴿ يا أيها الذين آمنوا إن جاء كم فاسق بنباء فتبينوا ﴾ (سورۃ الحجرات : ٦)

کا ارشاد پہلے ہی سے موجود تھا۔ جس میں اللہ نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا کہ اگر تمھارے پاس کوئی فاسق شخص خبر لائے تو اس کی تصدیق و وضاحت کرلو۔ کسی بھی خبر دینے والے کی فسق اسی وقت ظاہر ہوگی جب اس کی چھان بین کی جائے، اس کے علاوہ ﴿ واشهدوا ذوی عدل منكم ﴾ (سورۃ الطلاق : ۲) ﴿ ممن ترضون من الشهداء ﴾ (سورۃ البقرہ : ۲۸۲) بھی مشعل راہ تھی۔

طلب اسناد کے ساتھ یہ بھی جاننے کی ضرورت پڑی کہ کس نے کس سے، کب اور کہاں

روایت کیا ہے، سند میں کوئی خلل مثلاً انقطاع، ارسال، تدلیس وغیرہ تو نہیں، راوی کی ملاقات مروی عنہ سے ہے کہ نہیں، راوی کا نام ونسب، کنیت، سن وفات وغیرہ کیا ہے۔ اس طرح اصول حدیث کے ابواب میں ایک عظیم باب کا اضافہ ہوا۔

اسناد کی اتنی اہمیت ہوگئی کہ اہل علم کی طرف سے اس کو دین کا جزء قرار دیا گیا "الإسناد من الدين لو لا الإسناد لقال من شاء ماشاء" (۳) اسناد کا تعلق دین سے ہے اگر اسناد نہ ہوتی تو جس کی جو مرضی ہوتی سو وہ کہتا۔

جب بات یہاں تک آئی تو راویان حدیث کے کچھ ضوابط اور معیار بنائے گئے۔ جس کا نمونہ ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) کے اس قول میں ہے: "فینظر إلى أهل السنة فيو خذ حديثهم، وينظر إلى أهل البدع فلا يو خذ حديثهم" (۴)

راویوں کے سلسلے میں دیکھا جاتا تھا کہ کون اہلسنت سے ہے اور کون اہل بدعت سے۔ اہلسنت کی روایت مقبول اور اہل بدعت کی روایت مردود ہوتی تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بتایا کہ "فلما ركب الناس الصعب والذلول لم نأخذ من الناس إلا ما نعرف" (۵) جب لوگ ہر کس وناکس سے روایت بیان کرنے لگے تو ہم لوگوں سے وہی چیز لیتے جس کو ہم پہلے سے جانتے۔

پھر عدالت اور ضبط کی معلومات اکٹھا کی جانے لگی، جس پر ان کے مراتب متعین کیے گئے، امام، أثبت، أحفظ، أعلم، ثقه، ثبت وغیرہ کے الفاظ تعدیل کے لیے، کذاب، متروک، ترکوہ، ضعیف جدا، ضعیف، غیر ثقة وغیرہ کے الفاظ جرح کے لیے منتخب کیے گئے جس کی مثال قول رسول: نعم الرجل عبدالله، وبئس أخو العشيرة" (٦) میں موجود ہیں۔ جرح وتعدیل کے کلمات کی بنیاد پر احادیث کے مراتب مثلاً صحیح ضعیف کی تعیین کی گئی پھر اس میں حسب ضرورت اضافہ کیا گیا۔

---

(۳) الجرح والتعدیل (۲/۱۶) (۴) مقدمہ مسلم (۱/۸۴)
(۵) مصدر سابق (۱/۸۱) (٦) بخاری (٦٠٢٢)

جزوی تصنیف :

آگے چل کر جب حدیث رسول کا انتشار ہوا اور یہ قوم عرب سے آگے بڑھ کر قومِ عجم تک آ گئی تو اسباب ضعف میں کثرت اور تنوع ہو گیا لہٰذا ان اصولوں کی ترتیب و تنظیم میں اور گرمی آ گئی۔

علماء محدثین حسب ضرورت مصطلحات کا استعمال کرتے رہے۔ اور یہ معلومات سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہی، یہاں تک کہ مختلف اسلامی فنون میں تالیفات کا آغاز ہوا، ان تالیفات میں ضمناً یہ مسائل تحریر کیے گئے مثلاً امام شافعی نے "الأم" اور "الرسالہ" میں، امام علی بن مدینی، امام بخاری نے "کتاب العلل" اور کتب تواریخ میں، امام احمد نے "مسائل" میں، امام ترمذی نے "سنن" اور "کتاب العلل" میں، امام مسلم نے "مقدمة مسلم" اور امام ابوداوٗد نے "رسالة أبي داوٗد إلى أهل مكة" نیز دیگر حضرات نے مختلف کتابوں میں ان مصطلحات کا ذکر کیا۔ اس طرح یہ علم عملاً و تحریراً پھلتا پھولتا رہا۔

فنی تصنیف اور اس کی تاریخ :

بالآخر چوتھی صدی میں ان متفرق مسائل کو مستقل علم کی حیثیت سے کتابی شکل دے دی گئی، سب سے پہلی کتاب قاضی ابومحمد رامہرمزی (متوفی ۳۶۰ھ) نے "المحدث الفاصل" کے نام سے تحریر کی۔ ان کے بعد امام حاکم (متوفی ۴۰۵ھ) نے "معرفة علوم الحديث" اور امام ابونعیم اصبہانی (متوفی ۴۳۰ھ) نے اس پر "مستخرج" تحریر کی۔ اس کے بعد یکتاءِ زمانہ شخصیت، محدث مشرق ابوبکر احمد بن خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) کا دور آیا جو فن اصول حدیث کے عظیم معمار تھے۔ فن مصطلح میں اکثر و بیشتر فنون پر آپ نے کتابیں تحریر کیں اور بقول ابن نقطہ : "كل من جاء بعده فهو عيال على كتبه" کے مصداق بنے یعنی ہر وہ شخص جو خطیب بغدادی کے بعد آیا وہ اُن کی کتابوں کا محتاج رہا۔ آپ کی اہم کتابوں میں "الكفاية في معرفة الرواية" اور "الجامع لآداب الشيخ والسامع" ہے۔

آپ کے بعد اس فن میں تصنیف کا سلسلہ جاری رہا چنانچہ قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ) نے " الالماع فی ضبط الروایة وآداب السماع " اور ابو حفص عمر میانجی (متوفی ۵۸۰ھ) نے " ما لا یسع المحدث جهلة " کے نام سے کتابیں تصنیف کیں۔ یہاں تک کہ وقت کے مشہور محدث، فقیہ وامام، علامہ ابوعمرو عثمان بن عبدالرحمٰن بن الصلاح (متوفی ۶۴۳ھ) کا دور آیا جنھوں نے اس فن کو جلا بخشا اس کے اصول وضوابط کو جامع اور مانع بنایا اور اس فن میں ایک کتاب "علوم الحدیث " کے نام سے تصنیف کی جو " مقدمه ابن الصلاح " کے نام سے مشہور ومعروف ہے (۷) اور قریب قریب ہر جگہ پڑھائی جاتی ہے۔

آپ کے بعد علماء کی کدوکاوش زیادہ تر اسی کتاب سے متعلق رہی اور یہی مرجع محدثین بنی۔ چنانچہ کچھ حضرات نے اس کی شرحیں تحریر کیں، کچھ نے مختصر کیا تو کچھ نے نظم میں کر دیا، اور پھر اس نظم واختصار کی شرحیں تحریر ہوئیں۔

امام نووی (متوفی ۶۷۶ھ) نے اس کا ایک اختصار " الارشــاد " کے نام سے کیا جس کا مکمل نام " ارشاد طلاب الحقائق إلی معرفة سنن خیر الخلائق " ہے اور پھر اس اختصار کا اختصار " التقریب " میں کیا جس کا مکمل نام "التقریب والتیسیر لمعرفة سنن البشیر والنذیر " ہے۔ یہی وہ " تقریب " ہے جس کی شرح امام سیوطی نے " تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی " کے نام سے کیا ہے جو اس فن کی بہت اہم کتاب ہے۔

دیگر مختصرات میں ابن جماعة (متوفی ۷۳۳ھ) کی، " الخلاصة "، امام طیبی (متوفی ۷۴۳ھ) کی " اختصار علوم الحدیث "، ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) کی "اختصار علوم الحدیث " ہے جس کی شرح " الباعث الحدیث " ہے جو بہت سے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے، ایسے ہی علامہ ابن ملقن کی " المقنع " امام بلقینی کی "محاسن الاصطلاح " اس کی مختصرات ہیں۔

---

(۷) نزهة النظر ص ر ۴-۳

اس کی شرحوں میں امام عراقی (متوفی ۸۰٦ھ) کی "التقييد والإيضاح" امام زرکشی (متوفی ۷۹۴ھ) اور حافظ ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ) کی "النكت" ہے۔

حافظ عراقی نے اس کو نظم میں پرویا ہے جس کا نام "نظم الدرر في علم الأثر" ہے۔ یہی کتاب "ألفية العراقي" کے نام سے مشہور ہے، اس کی ایک مختصر شرح خود حافظ عراقی نے کیا ہے جس کا نام "التبصرة والتذكرة" ہے، اس کی ایک شرح علامہ بقاعی (متوفی ۸۸۵ھ) نے "النكت الوفية في شرح الألفية" میں کیا ہے، لیکن اس کی سب سے کامیاب شرح حافظ ابن حجر کے شاگرد خاص امام سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے کیا ہے جس کا نام "فتح المغيث على ألفية الحديث" ہے جو اس فن کی انتہائی اہم کتاب ہے اور عام طور سے اس فن میں مہارت پیدا کرنے کے لیے جامعات میں پڑھائی جاتی ہے۔

اس فن میں ایک مختصر اور جامع رسالہ حافظ ابن حجر نے "نخبة الفكر" کے نام سے تحریر کیا ہے اور پھر خود ہی اس کی شرح "نزهة النظر" کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب اس فن کے متوسط کتابوں میں بہت بہترین مانی جاتی ہے۔ ابن حجر کے علاوہ اور کئی حضرات نے "نخبة الفكر" کی شرح تحریر کی ہے۔

اسی "نخبة الفكر" کو امیر صنعانی نے نظم میں پرویا ہے جس کا نام "قصب السكر في نظم نخبة الفكر" رکھا ہے۔ اس کی شرح شیخ عبدالکریم مراد نے "سح المطر" کے نام سے کی ہے۔ راقم کی بھی اس پر ایک متوسط تعلیق ہے جو "قضاء الوطر بقصب السكر" کے نام سے مطبوع ہے۔

اس فن کی ایک اہم کتاب امیر صنعانی کی "توضيح الأفكار" ہے جو "تنقيح الأنظار" کی شرح ہے۔

دیگر کتابوں میں جمال الدین قاسمی کی "قواعد التحديث" شیخ طاہر جزائری کی "توجيه النظر" ڈاکٹر محمود طحان کی "تيسير مصطلح الحديث" شیخ عبدالرحمن مبارکپوری کی "تحفة أهل الفكر" اس فن کی مفید کتابیں ہیں تفصیل کے لیے کتب فہارس دیکھیں۔

اس فن میں اردو زبان میں ایک جامع کتاب "تحفة أهل النظر فی مصطلح أهل الخبر" شیخ ابومعاذ عبدالجلیل اثری مدنی کی تالیف ہے جو پانچ ابواب اور ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، نیز مقدمہ مشکوۃ کا ایک بامحاورہ ترجمہ شیخ مختار اختر فیضی حفظہ اللہ نے کیا ہے، وہ بھی اس سلسلہ کی ایک گرانقدر کڑی ہے۔ حضرت مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب فیضی حفظہ اللہ نے ''مبادی اصول حدیث'' کے نام سے سولہ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ مرتب کیا ہے جس میں اصول حدیث کی مصطلحات کو منظم و مختصر طریقے سے ذکر کیا ہے جو کافی مفید ہے خصوصاً ابتدائی معلومات حاصل کرنے والوں کے لیے بہت بہتر ہے، اس سلسلہ میں راقم سطور کی ایک حقیر کوشش ہے جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے اور ''رسالہ اصول حدیث'' کے نام سے مطبوع ہے اس میں ایک مقدمہ اور تین ابواب ہیں۔

مقدمہ میں اصول حدیث کا بنیادی خاکہ، تاریخ، ایجادی، تصنیفی اور تشریحی دور کے ساتھ ساتھ برائے معلومات اس فن کی بیشتر کتابوں کا ذکر ہے، باب اول میں حدیث اور اس کی قسموں پر گفتگو ہے، باب دوم میں راویوں کی معرفت اور باب سوم میں آداب روایت، تحریر حدیث، انواع کتب حدیث اور اہم کتابوں کا تعارف ہے۔

اصول حدیث کی ایک جھلک :

اصول حدیث کے قواعد کی ابتدا حدیث رسول سے ہوتی ہے، حدیث رسول امت کے پاس بذریعہ اسناد پہنچی ہے لہٰذا سند و متن اس فن کا موضوع ہے۔ حدیث بیان کرنے والوں کی تعداد ہر طبقہ میں اگر زیادہ ہے تو اس کو ''خبر متواتر'' اور کم ہے تو اس کو ''خبر آحاد'' کہتے ہیں، حدیث متواتر کی تعریف، قسمیں، مثالیں، شروط اور تعداد اور اس فن کی کتابوں کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ قسم مکمل ہو جاتی ہے اور اس پر یہیں گفتگو بھی ختم ہو جاتی ہے، اس لیے کہ اس کی صحت مسلم ہے، یہ علم ضروری یقینی کا فائدہ دیتی ہے، لہٰذا اس پر گفتگو کی زیادہ ضرورت اصول حدیث میں نہیں بلکہ اصول فقہ میں ہوتی ہے۔

اس کے بعد خبر آحاد پر گفتگو شروع ہوتی ہے سب سے پہلے اس کی تعریف اور قسمیں بتائی جاتی ہیں یہ تین قسموں پر مشتمل ہے، مشہور، عزیز اور غریب، پھر غریب کی دو قسمیں ہوتی ہیں، مطلق اور نسبی، خبر آحاد کی یہ تینوں قسمیں مل کر دو قسموں میں منقسم ہوتی ہیں، مقبول اور مردود، خبر مقبول کی چار قسمیں ہیں، صحیح لذاتہ، صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ، حسن لغیرہ، یہیں پر حسن غریب، اور حسن صحیح کے اجتماع کی وضاحت کی جاتی ہے، درجات صحیح، کتب صحاح کا تذکرہ اور صحیح حدیثوں کے مصادر کیا ہیں اس کی بھی نشاندہی ہو جاتی ہے، یہ خبر مقبول کبھی کبھی بظاہر متعارض ہوتی ہے، اس کو مختلف الحدیث کہا جاتا ہے، تعارض ختم کرنے کا کیا طریقہ ہے یہاں اس کی وضاحت ہوتی ہے سب سے پہلے تطبیق کی کوشش کی جاتی ہے اگر یہ ناممکن ہو تو ناسخ و منسوخ تلاش کیا جاتا ہے، عدم اطلاع کی صورت میں ترجیح سے کام لیا جاتا ہے ورنہ توقف اختیار کیا جائے گا۔

مختلف الحدیث، محکم، تطبیق، ناسخ، منسوخ، اسباب نسخ، ترجیح، اسباب ترجیح کا تذکرہ و تعارف بھی ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ مقبول کی بحث مکمل ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد خبر مردود کی بحث شروع ہوتی ہے (جس کو عرف عام میں ضعیف کہا جاتا ہے) حدیث یا تو سند میں عیب، یا راوی میں عیب، یا متن میں عیب کی بنیاد پر ضعیف ہوتی ہے۔ سند میں عیب سقوط جلی یا سقوط خفی کی وجہ سے ہوتا ہے (یعنی راوی کا سند میں کسی جگہ سے حذف ہونا واضح ہو یا مخفی ہو) اس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جس کی بنیاد پر معلق، مرسل، منقطع، معضل کی اصطلاح بنائی گئی ہے، اگر سقوط خفی ہے تو ارسال (جلی و خفی) تدلیس اور اس کی قسمیں اس کا حکم، مثالیں اور مدلس راویوں کا حکم بتایا جاتا ہے۔

اگر روایت میں ضعف راوی میں عیب کی وجہ سے ہوتا ہے تو اس کی مختلف شکلوں کو اور اسباب ضعف کو اور ان کے درجات کو بتایا جاتا ہے، وضع حدیث، اسباب وضع، معرفت وضع کے طریقے۔ اقسام وضاعین، کتب موضوعات وغیرہ پر بھی گفتگو ہوتی ہے۔ اسباب ضعف کی دس شکلیں مشہور ہیں۔ راوی کا حدیث رسول میں جھوٹ بولنا، عوام سے گفتگو میں جھوٹ بولنا، فحش غلط

کرنا، فحش غفلت کرنا، فسق کرنا، وہم ہونا، مخالفت ثقات کرنا، بدعتی ہونا، مجہول ہونا، خراب حافظہ والا ہونا، مخالفت کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں ان کو یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے۔ اور ان اصطلاحات کا تعارف کرایا جاتا ہے جو مخالفت کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں مثلاً مدرج، مقلوب، مضطرب، مصحف، محرف، مزید فی متصل الاسانید وغیرہ۔

ضعیف روایت کو تقویت دینے کے لیے دوسری ہم معنی روایتوں کو تلاش کیا جاتا ہے اس لیے یہاں پر متابعت، اس کی قسمیں، اعتبار، شاہد، نحوہ، مثلہ پر گفتگو ہوتی ہے۔

متن میں خرابی کی وجہ سے بھی روایتیں ضعیف ہوتی ہیں جس کی بنیاد پر شاذ، محفوظ، معرف ومنکر کی اصطلاحات بتائی جاتی ہیں، اس کے ساتھ ہی ساتھ حدیث کی پہلی تقسیم (جو راوی کی تعداد کے اعتبار سے ہوتی ہے جس کو متواتر اور آحاد میں تقسیم کیا جاتا ہے) پر گفتگو ختم ہوجاتی ہے۔ خبر متواتر برائے نام اور خبر آحاد پر بہت تفصیل سے گفتگو اس لیے کی جاتی ہے کیوں کہ خبر آحاد ہی اصول حدیث میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، جن سے استدلال کے بارے میں کچھ لوگوں کو بے جا شبہات ہوگئے ہیں، جن کا جواب اہل علم نے منفرد کتابوں میں دیا ہے۔

اس کے بعد حدیث کی دوسری تقسیم پر گفتگو شروع ہوتی ہے جو از روئے نسبت ہوئی ہے یعنی منقول بات کس کی جانب منسوب ہے، اگر اس کی نسبت اللہ رب العالمین کی جانب کی گئی ہے تو وہ حدیث قدسی ہے، رسول کی جانب کی گئی ہے تو مرفوع، صحابی کی جانب کی گئی ہے تو موقوف، تابعی یا ان کے بعد کی گئی ہے تو مقطوع ہے۔

یہاں پر حدیث قدسی اور قرآن میں فرق، حدیث قدسی اور دیگر احادیث میں فرق بتایا جاتا ہے، مرفوع کی قسمیں بتائی جاتی ہیں، مرفوع قولی، فعلی، تقریری صریحی اور حکمی کی وضاحت کی جاتی ہے۔ وہ صیغے جو مرفوع ہونے پر کنایتاً یا احتمالاً دلالت کرتے ہیں ان کی بھی وضاحت یہیں کی جاتی ہے۔ اس قسم میں بس اتنی ہی مختصر گفتگو ہوتی ہے، اس کے بعد دوسری معلومات کا تذکرہ ہوتا ہے، ان اہم مسائل میں ایک مسئلہ راویوں کی معرفت سے متعلق ہوتا ہے، جس کو اسماء رجال کہا جاتا ہے۔

اسماء رجال میں صحابی، مخضرم، تابعی، تبع تابعی وغیرہ کا تعارف اوران میں فرق ان کا مقام ان پر مطلع ہونے کا ذریعہ بتایا جاتا ہے، معرفت اسماء رجال کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جس میں اسماء وکنی، القاب وانساب، وفیات اور پیدائش عام حالات نیز ثقہ وضعیف کی معرفت کے ساتھ ساتھ ان روایتوں کی شکلیں بتائی جاتی ہیں جن کا تعلق اسماء رجال کی معرفت سے ہے۔

مثلاً متفق ومفترق، مؤتلف ومختلف، مہمل، ومتشابہ، منفردات ووحدان، مسلسل، من حدث ونسی، مدبج، اقران، روایت اکابر عن الاصاغر وغیرہ۔

اس کے بعد جرح وتعدیل کے مسائل، ان کے کلمات اوران کلمات کے مدلول ومراتب پر گفتگو کی جاتی ہے۔

علم اسماء رجال، اور علم جرح وتعدیل دونوں کا تعارف آگے آرہا ہے۔ (۸)

اس کے بعد آخری مرحلہ میں حدیث پڑھنے پڑھانے کی قسمیں، صیغۂ ادا وتحمل کا بیان، حدیث پڑھنے پڑھانے کے آداب، تحریر حدیث کے آداب، روایت بالمعنیٰ، اختصار حدیث، علمی خطابات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ کتب حدیث کی قسمیں اوراہم کتابیں اس مرحلہ میں ذکر کی جاتی ہیں یہیں ''علم اصول حدیث'' پر گفتگو مکمل ہوجاتی ہے اور اس طرح گوناگوں علمی مسائل، دقیق مصطلحات، اصول وضوابط کے ذریعہ حدیث رسول پرکھنے، اس پر نقد وجرح کرنے، کھرے وکھوٹے کی پہچان حاصل کرنے کا یہ علم سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ حدیث رسول کوانہیں کسوٹیوں پر پرکھ کر ہرقسم کے شک وشبہ سے بالاتر کردیا جاتا ہے، حدیث رسول کا محافظ یہ علم ان شاء اللہ قیامت تک باطل کے مقابلہ میں سینہ سپر رہے گا۔

فن مصطلح الحدیث کی اہمیت وضرورت :

اس فن کی اہمیت وضرورت بالکل واضح ہے، اس لیے کہ قرآن کریم کی صحیح تفسیر، اس کی وضاحت، اور مفہوم بیان کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے رسول پر ڈالی ﴿وأنــزلـنــا إليك

---

(۸) دیکھیے صفحہ ۱۷۸، ۱۸۷

الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم ﴾ (سورۃ النحل : ۱۸) یہ تفسیر امت کے پاس ان افراد کے واسطہ سے آئی ہے، جن کو راویانِ حدیث کہا جاتا ہے، ایسے ہی سنت رسول جو ایک مسلمان کے لیے اسوہ اور نمونہ ہے اور جس کے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، اور جس کے بغیر شریعت پر عمل ممکن نہیں، ہمارے پاس انہی افراد کے واسطے سے آئی ہے، لہٰذا ان کی معرفت اور ان کے بارے میں معلومات ضروری ہے۔ کسی بھی حدیث پر صحت وضعف کا دارو مدار انہیں پر ہوتا ہے، ان کی عدالت وضبط کی معرفت کے بغیر کسی حدیث پر فیصلہ کرنا ناممکن ہے، یہ ساری چیزیں اسی علم سے متعلق ہیں، ایسے ہی سندوں میں علل وشذوذ کا پایا جانا، ارسال وانقطاع کا ہونا وغیرہ ان تمام کی معرفت اسی فن سے متعلق ہیں۔

خاص طور سے اسناد کی معرفت بہت اہم ہے جو اصول حدیث کا بنیادی ستون ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر اہل علم نے اس علم کو دین کا جزء قرار دیا ہے۔ علامہ ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں کہ "إن هذه الأحاديث دين فانظروا عمن تاخذونها" (۹) یہ احادیث دین ہیں لہٰذا دیکھو کس سے لے رہے ہو۔

علی بن مدینی (متوفی ۲۳۴ھ) فرماتے ہیں کہ "معرفة الرجال نصف العلم" (۱۰) رجال کی معرفت نصف علم ہے۔

اس لیے کہ حدیث سند ومتن کے مجموعہ کا نام ہے اور سند راویوں کے سلسلہ کو کہا جاتا ہے، لہٰذا ان کی معرفت نصف علم ہے۔

اس فن کی معرفت کے بغیر حدیث رسول کا پڑھنا پڑھانا بے سود ہے۔ اس لیے کہ حدیث پڑھنے کا جو مقصد ہے وہ یہ ہے کہ اس پر عمل کرکے سعادت دارین حاصل کیا جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ حدیث کی صحت وضعف، مقبول ومردود، ناسخ ومنسوخ، راجح ومرجوح ہونا معلوم نہ ہوجائے۔ یہ معرفت اسی فن سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے کہ اس فن کا موضوع سخن ہی

---

(۹) الجرح والتعدیل (۲/۱۵)   (۱۰) المحدث الفاصل ص ۳۲۰

سند ومتن ہے، سند ومتن کسے کہتے ہیں یہ بھی اصول حدیث ہی سے معلوم کیا جاتا ہے، اس کے سارے جزئیات وکلیات کا دار ومدار انھیں پر ہے۔ لہٰذا اس کی اہمیت واضح ہے۔

طریقہ استفادہ :

کسی بھی فن کے حصول کے لیے بہتر وسائل اور ماہر معلم کی ضرورت پڑتی ہے۔ فن مصطلح کے لیے یہ دو بنیادیں اہم ہیں۔ سب سے پہلے اس کی ابتدائی معلومات اور مبادیات کو حاصل کرنا چاہیے اور اس کے لیے جو اس فن کی منتخب ابتدائی کتابیں ہیں ان کو سمجھ کر یاد کرنا چاہیے۔ خصوصاً منظوم کتابیں، اس لیے کہ وہ جلدی سے یاد ہو جاتی ہیں اور دیر تک برقرار رہتی ہیں۔

ان کتابوں میں میرے خیال سے حافظ ابن حجر کی کتاب " نخبة الفكر " اور اس کا نظم جو امیر صنعانی نے " قصب السكر " کے نام سے کیا ہے وہ بہت مفید ہے۔ ایسے ہی متأخرین علماء کی مختصرات مثلاً شیخ عبدالمحسن عباد کی کتاب " اجتناء الثمر " جو سوال وجواب کی شکل میں ہے اور شیخ عبدالکریم مراد اور استادِ محترم شیخ عبدالمحسن العباد کی مشترکہ تالیف "من أطيب المنح " کافی مفید ہے، اردو زبان میں " مبادی أصول حديث " مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی کی کتاب مناسب ہے۔ راقم کی تالیف ''رسالہ أصول حدیث'' بھی الحمد للہ بہت جامع کتاب ہے۔

مطول معلومات اور فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے نزہۃ النظر، مقدمہ ابن الصلاح، اور اس کی منظوم کتاب " ألفية العراقي " پھر اس کی شرح " فتح المغيث " امام سخاوی کی۔ اسی طرح سے "تدريب الراوي "، "توضيح الأفكار " اور "تيسير مصطلح الحديث" کافی مفید کتابیں ہیں۔

ان کتابوں کی درس وتدریس کے لیے ماہر معلم کا انتخاب بہتر ہوگا جو اس فن کے پیچ وخم سے واقف ہو، اس لیے کہ وہی بہتر طریقے سے اس کی تعلیم دے سکتا ہے مثل مشہور ہے " لكل فن رجال " ہر فن کے لیے کچھ فنکار ہوتے ہیں لہٰذا اس کا اہتمام ضروری ہے۔

غرض وغایت :

اس فن کے پڑھنے کا اصل مقصد وغرض یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ مقبول اور مردود حدیثوں کی معرفت حاصل ہو جائے تاکہ مقبول پر عمل اور مردود کو ترک کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ انجانے میں حدیث رسول کو چھوڑ دیا جائے اور غیر رسول کی باتوں کو حدیث سمجھ کر عمل کیا جائے، یہ تو بہت بڑا خسارہ ہوگا، اور ساری دین داری بیکار ہو جائے گی، درحقیقت حدیث رسول پر عمل کی سعادت اسی عمل کے ذریعے مل سکتی ہے۔

ضروری مصطلحات :

حدیث : اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال، افعال، تقریرات اور صفات کو حدیث کہا جاتا ہے۔

تقریر : ان اعمال واقوال کو کہا جاتا ہے جن کو کسی صحابی نے کیا یا کہا ہو، رسول کو اس کی اطلاع ملی ہو تو آپ نے اس کو اپنی خاموش رضامندی سے برقرار رکھا۔

اصول حدیث : ایسے قواعد کے جاننے کو جن سے سند اور متن کے حالات بحیثیت مقبول ومردود معلوم ہوں ان کو اصول حدیث کہا جاتا ہے۔

دیگر نام : دیگر ناموں میں اصول حدیث، مصطلح الحدیث، علم المصطلح، علم الحدیث درایۃ، نیز علم الاثر بھی ہے۔

موضوع : اس علم کا موضوع سند اور متن بحیثیت قبول ورد ہے۔

سند : حدیث بیان کرنے والے افراد کے اس سلسلہ کو کہا جاتا ہے جو متن تک جاتا ہے۔

متن : گفتگو کے اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سلسلہ اسناد کا خاتمہ ہوتا ہے۔

سند عالی : جس سند میں راویوں کی تعداد دوسری روایت کے مقابلہ میں کم ہو تو اس کو سند عالی کہا جاتا ہے۔

سند نازل : جس سند میں راویوں کی تعداد دوسری روایت کے مقابلہ میں زیادہ ہو تو اس کو سند نازل کہا جاتا ہے۔

متصل : اس سند کو کہتے ہیں جس میں کہیں انقطاع نہ ہو۔

حدیث کی قسمیں : باعتبار سند حدیث کی دو قسمیں ہیں :

(۱) متواتر (۲) آحاد

متواتر : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں روایت کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ ان کا اتفاق جھوٹ پر ممکن نہ ہو۔

اس کی دو قسمیں ہیں : متواتر لفظی، متواتر معنوی۔

خبر متواتر علم ضروری یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔

آحاد : آحاد واحد کی جمع ہے۔

خبر آحاد : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں روایت کرنے والوں کی تعداد حد تواتر تک نہ پہنچے۔

اس کی تین قسمیں ہیں :

مشہور : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں روایت کرنے والوں کی تعداد ہر طبقہ میں کم از کم تین ہو۔

عزیز : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں روایت کرنے والوں کی تعداد ہر طبقہ میں کم از کم دو ہو۔

غریب : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں روایت کرنے والوں کی تعداد کسی بھی طبقہ میں ایک ہو۔

خبر آحاد حسب مراتب علم نظری یقینی اور علم ظنی یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔

اعتبار : کسی غریب روایت کے لیے تابع یا شاہد تلاش کرنے کو اعتبار کہا جاتا ہے۔

تابع : وہ حدیث جو کسی غریب روایت کے لفظاً و معنیً یا صرف معنیً موافق ہو بشرطیکہ صحابی ایک ہو۔

شاھد : وہ حدیث جو کسی غریب روایت کے لفظاً و معنیً یا صرف معنیً موافق ہو بشرطیکہ دونوں کے صحابی الگ الگ ہوں۔

مِثلُہ : وہ حدیث جو دوسری حدیث کی ہم لفظ ہو۔

نحوہ : وہ حدیث جو دوسری حدیث کی ہم معنیٰ ہو۔

علم ضروری : اس علم کو کہتے ہیں جس کے ثبوت کے لیے استدلال کی ضرورت نہ ہو۔

علم نظری : اس علم کو کہتے ہیں جس کے ثبوت کے لیے استدلال کی ضرورت ہو اور اس کی تقویت کے لیے مزید قرینہ موجود ہو۔

علم ظنی : اس علم کو کہتے ہیں جس کے ثبوت کے لیے استدلال کی ضرورت ہو اور اس کی تقویت کے لیے کوئی مزید قرینہ موجود نہ ہو۔

متواتر روایتیں سب مقبول ہوتی ہیں، البتہ خبر آحاد میں مقبول اور مردود، دونوں ہوتی ہیں۔

مقبول : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں خبر دینے والے کی صداقت راجح ہو۔

مردود : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں خبر دینے والے کی صداقت راجح نہ ہو۔

مقبول کی چار قسمیں ہوتی ہیں :

صحیح لذاتہ : اس متصل السند حدیث کو کہتے ہیں جس کو عادل تام الضبط راوی نے اپنے ہم مثل سے روایت کیا ہو اور وہ معلل وشاذ نہ ہو۔

عادل : اس راوی کو کہتے ہیں جو (روایت بیان کرتے وقت) مسلمان، عاقل، بالغ رہا ہو، نیز گناہ کبیرہ اور مروت کو ختم کرنے والی چیزوں سے ہمیشہ محفوظ رہا ہو۔

ضابط : وہ راوی جو اپنی مرویات کو بہت اچھی طرح سے محفوظ رکھتا ہو۔

معلل : اس بظاہر صحیح روایت کو کہتے ہیں جس میں ایسی پوشیدہ خرابی پائی جائے جو حدیث کی صحت کے لیے مانع ہو۔

صحیح لغیرہ : اس متصل السند حدیث کو کہتے ہیں جس کو عادل خفیف الضبط راوی نے اپنے ہم مثل۔ یا اس سے بہتر۔ راوی سے روایت کیا ہو۔ نیز وہ حدیث معلل وشاذ نہ ہو، نیز مختلف طرق سے وارد ہو۔

صحیح کے مختلف درجات ہیں۔

حسن لذاتہ : اس متصل السند حدیث کو کہتے ہیں، جس کو عادل، خفیف الضبط راوی نے اپنے ہم مثل۔ یا اس سے بہتر۔ راوی سے روایت کیا ہو، اور وہ معلل وشاذ نہ ہو۔

حسن لغیرہ : اس خفیف الضعیف روایت کو کہتے ہیں جو متعدد طرق سے وارد ہو۔

دوسری تعریف : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں صحیح یا حسن کی بعض صفت یا مکمل صفات نہ پائی جائے۔

حسن صحیح کا اجتماع : ایک ہی حدیث میں "حسن صحیح" کا اجتماع یا تو تعدد طرق یا اس پر حکم میں تردد کی وجہ سے ہوتا ہے۔

تعددِ طرق کی صورت میں یہ مجرد صحیح کے مقابلے میں بہتر، اور تردد کی صورت میں کم تر ہوتا ہے۔

مختلف الحدیث : مقبول روایتیں اگر باہم متعارض ہوں جن میں توفیق ممکن ہو تو ان کو مختلف الحدیث کہا جاتا ہے۔

محکم : مقبول روایتیں اگر باہم متعارض نہ ہوں تو ان کو محکم کہا جاتا ہے۔

توفیق وتطبیق : مقبول روایتوں سے تعارض ختم کر کے اس میں موافقت پیدا کر دی جائے تو اس کو توفیق وتطبیق کہا جاتا ہے۔

جمع : متعارض روایتوں کے مفہوم کو الگ الگ چیزوں پر محمول کر کے توفیق دی جائے تو اس کو جمع کہتے ہیں۔

نسخ : کسی متقدم شرعی حکم کو کسی متاخر شرعی حکم سے اٹھا دینے کو نسخ کہتے ہیں۔

ناسخ : اس متاخر حدیث کو کہتے ہیں جو اپنے سے متقدم حدیث کے حکم کو ختم کردے۔

منسوخ : اس متقدم حدیث کو کہتے ہیں جس کا حکم کسی متاخر حدیث سے اٹھالیا گیا ہو۔

ترجیح : دو متعارض روایتوں میں سے کسی سبب کی وجہ سے ایک کو قابل عمل اور دوسرے کو قابل ترک قرار دیے جانے کو ترجیح کہا جاتا ہے جس کے بے شمار اسباب ہیں۔

مردود کو ضعیف کہتے ہیں، اسباب ضعف کی بنیاد پر اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ضعیف روایت مردود ہونے کی وجہ سے کسی بھی حال میں قابل قبول نہیں جیسے کہ مقبول روایت کسی بھی حال میں قابل ترک نہیں۔اس سے ماخوذ حکم کے مطابق اس پر عمل واجب ہوگا۔

ضعف کے دو بنیادی اسباب ہوتے ہیں :

(۱) انقطاع سند

(۲) راوی میں عیب

سند میں انقطاع کی بنیاد پر روایتوں کے ضعیف ہونے کی مختلف شکلیں ہیں جو یہ ہیں :

معلَق : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی ابتدائی سند یا مکمل سند محذوف ہو۔

منقطع : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے درمیان سند سے ایک یا متعدد راوی متفرق مقام سے ساقط ہوں۔

مرسَل : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے آخری سند میں سقوط ہو یعنی تابعی صحابی کو چھوڑ کر رسول سے روایت کرے۔

معضل : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے درمیان سند سے دو یا دو سے زائد راوی مسلسل ساقط ہوں۔

مرسل خفی : راوی کسی ایسے شخص سے روایت کرے جس کا ہم عصر نہ ہو یا ہم عصر ہو مگر ملاقات نہ ہوئی ہو اور وہ ایسا صیغہ استعمال کرے جس سے سماع (سننے) کا وہم ہو رہا ہو۔

تدلیس : راوی اپنے استاذ سے نہ سنی ہوئی بات ایسے صیغہ سے بیان کرے جس سے سماع کا وہم ہو (مثلاً : قال، عن، ان) جب کہ اس کے پاس استاد سے اجازت بھی نہ ہو۔ ایسے راوی کو مُدلِّس اور ایسی روایت کو مُدلَّس کہتے ہیں۔

راوی میں عیب کی وجہ سے روایت ضعیف ہونے کی مندرجہ ذیل شکلیں ہوتی ہیں :

موضوع : اس حدیث کو کہتے ہیں جو رسول کی جانب گھڑ کر منسوب کی جائے۔

متروک : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو متہم بالکذب شخص روایت کرے۔

متہم بالکذب : وہ شخص ہوتا ہے جو آپس میں جھوٹ بولتا ہو یا دورانِ گفتگو اس کی بات سے اس کے جھوٹ کی گرفت ہو یا ایسی روایت بیان کرنے میں منفرد ہو جو دین کے بنیادی اصول کے خلاف ہو۔ نیز اس میں اس شخص کے علاوہ کوئی ایسا نہ ہو جو قابل گرفت ہو۔ (۱۱)

معلل : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں علت پائی جائے یا جس کے راوی سے بکثرت وہم سرزد ہو۔

شاذ : اس روایت کو کہتے ہیں جس کو ثقہ راوی، ثقات یا اوثق کے خلاف روایت کرے، اس کے مقابل کو محفوظ کہا جاتا ہے۔

منکر : اس روایت کو کہتے ہیں جس کو ضعیف راوی ثقہ کے خلاف روایت کرے اس کے مقابل کو معروف کہا جاتا ہے۔

(منکر کی مشہور تعریف یہی ہے) بعض علماء کے یہاں **منکر** : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا راوی بکثرت غلطی کرتا ہو یا بہت زیادہ مغفل یا فاسق ہو۔

مدرج : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند یا متن میں تبدیلی کر کے مخالفت کی جائے، ادراج کبھی کسی لفظ کی تشریح کے لیے ہوتا ہے تو وہ مقبول ہوتا ہے۔

---

(۱۱) شرح قصب السکر ص ر ۴۳

مقلوب : اس روایت کو کہتے ہیں جس کی سند یا متن میں تقدیم وتاخیر کر کے مخالفت کی جائے۔ (امتحان کے لیے ایسا کرنا درست ہے بشرطیکہ اسی مجلس میں وضاحت کر دی جائے)

مزید فی متصل الأسانید : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند میں ایک راوی کا اضافہ کر کے مخالفت کی جائے۔ (اگر یہ زیادتی مخالف سے قوی راوی نے کیا ہو اور وہاں تصریح سماع موجود ہو تو مقبول ہوتی ہے)

مضطرب : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند یا متن میں ایسی تبدیلی کر کے مخالفت کی جائے جس میں کوئی راجح نہ ہو۔ (اگر کوئی جہت راجح ہو جائے تو اضطراب ختم ہو جاتا ہے)

مصحف : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں کلمہ کی شکل باقی رکھتے ہوئے نقطہ میں تبدیلی کر کے مخالفت کی جائے، جیسے ''شیئا'' کی تبدیلی ''ستاً'' ہے۔

محرف : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں کلمہ کی شکل باقی رکھتے ہوئے حرکت میں تبدیلی کر کے مخالفت کی جائے۔ جیسے عَقیل، عُقیل۔

مخالفت کی جتنی شکلیں ہیں اگر یہ بکثرت پائی جائیں تب روایت مردود ضعیف ہوتی ہے اور اگر شاذ و نادر ہو تو مقبول ہوتی ہے۔

مجہول : اس روایت کو کہتے ہیں جس کے راوی کی ذات یا صفات معلوم نہ ہو۔

مبہم : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند میں بعض راوی کا نام معلوم نہ ہو۔

مختلط : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی کا حافظہ عارضی طور پر کمزور ہو۔

سیّ الحفظ : اس راوی کو کہتے ہیں جس کا حافظہ دائمی طور پر کمزور ہو۔

روایۃ المبتدع : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو ایسا شخص روایت کرے جو بدعت مکفرہ یا بدعتِ مفسقہ کا مرتکب ہو۔

بدعت مکفرہ کرنے والے کی روایت مردود ہوتی ہے۔ بدعتِ مفسقہ کی روایت اس شرط پر مقبول ہوتی ہے کہ راوی بذاتِ خود ثقہ ہو، بدعت کی دعوت نہ دیتا ہو، نیز بدعت کی ترغیب سے

متعلق نہ ہو۔

نسبت کے اعتبار سے حدیث کی چار قسمیں ہیں :

حدیث قدسی : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو رسول اللہ نے اللہ کی جانب منسوب کیا ہے۔

مرفوع : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی نسبت رسول کی جانب کی گئی ہو۔

موقوف : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی نسبت کسی صحابی کی جانب کی گئی ہو۔

مقطوع : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی نسبت کسی تابعی وغیرہ کی جانب سے کی گئی ہو۔

دیگر مصطلحات :

رسول : انسانوں میں اللہ کے وہ منتخب بندے جن کو شریعت دے کر لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیا گیا ہو۔

صحابی : جس نے رسول سے حالت ایمان میں ملاقات کی ہو اور اسی پر اس کا انتقال ہوا ہو۔

تابعی : جس نے کسی صحابی سے حالت ایمان میں ملاقات کی ہو اور اسی پر انتقال ہوا ہو۔

تبع تابعی : جس نے کسی تابعی سے حالت ایمان میں ملاقات کی ہو اور اسی پر انتقال ہوا ہو۔

محدث : ہر وہ شخص جو علم حدیث سے روایۃ و درایۃ شغف رکھتا ہو اور اکثر و بیشتر روایتوں اور اپنے دور کے راویوں سے باخبر ہو۔

حافظ : ہر وہ شخص جس کی معرفتِ حدیث و رجال عدم معرفت، کے مقابلہ میں زیادہ ہو۔ (۱۲)

محدثین کرام کی یہ وہ عظیم علمی اصولی خدمات ہیں جن کی کوئی مثال نہیں۔ یہ سب حدیث رسول کا کرشمہ ہے۔

☆☆☆

---

(۱۲) ملخص از کتب مصطلح

۲ - علمِ اسناد

اسناد کی تعریف : اسناد سند سے ماخوذ ہے جو لغوی اعتبار سے مختلف معنی میں مستعمل ہے، اُسی میں سے پہاڑ کے دامن کی بلندی، بلند زمین، جس پر انسان ٹیک لگائے اس کو سند کہا جاتا ہے۔ (۱)

اصطلاح میں قائل کی جانب قول کے نسبت کرنے کو اسناد کہا جاتا ہے۔ (۲)

علمِ اسناد : علم اسناد اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے راویانِ حدیث کی معرفت حاصل ہو۔ (۳)

اسناد کا وجود : اسناد کا وجود تو اسی وقت سے ہوا ہے جب سے حدیث رسول کا وجود ہوا ہے غار حرا میں پہلی مرتبہ وحی کا نزول ہوا تو آپ نے آکر حضرت خدیجہ سے سارا واقعہ سنایا، جس میں اس ناموس (فرشتہ) کی آمد کا ذکر اور ان کے پڑھانے کا قصہ مذکور ہے۔ (۴) آپ نے مختلف باتوں کی جو نسبت جبرئیل کی طرف کی ہے یہی اصلا سند کی ابتدا ہے کیوں کہ اللہ کا پیغام جس واسطہ سے آیا ہے اس میں اس واسطہ کا ذکر ہے۔

حضرت خدیجہ کا آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے جانا اور یہ کہنا کہ "اسمع من ابن عمک" اپنے بھتیجے کی بات سنیے، یہ اسناد عالی کی کیفیت ہے جس میں حضرت خدیجہ نے جو سنا تھا وہ خود نہیں کہا بلکہ رسول سے بلا واسطہ سننے کو کہا۔

بہت سارے مواقع پر اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے خود حدیثوں کی اسناد اللہ رب

---

(۱) لسان العرب ۳/ ۲۲۰ (۲) نزھۃ ص/ ۹۲

(۳) الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ ص/ ۹۳ (۴) بخاری (۳)

العالمین کی جانب کی ہے (ایسی حدیثوں کو اصطلاح میں احادیث قدسیہ کہا جاتا ہے) کبھی کبھی آپ نے اپنی باتوں کی نسبت حضرت جبرئیل کی طرف کی ہے مثلاً آپ کا کہنا "حدثني جبرئيل آنفا" (۵) ابھی ابھی جبرئیل مجھ کو بتا کر گئے۔ یا آپ کا یہ کہنا کہ "فانه جبرئيل أتاكم ليعلمكم دينكم" (۶) یقین وہ جبرئیل تھے جو تم کو دین سکھانے آئے تھے۔

صحابہ کرام بھی آپ کی باتوں کو جب دوسروں تک پہنچاتے تھے تو اس کی تعبیر قال رسول الله، فعل رسول الله، رأيت رسول الله وغیرہ سے کرتے تھے، یہی وہ نسبت ہے جو دن بدن وسیع ہوتی گئی اور اسناد کی قسمیں بنتی گئیں۔

طلب اسناد : جب رسول اللہ ﷺ کا دور گزر گیا، اور صحابۂ کرام کا دور اول چل رہا تھا تو فتنوں نے جنم لیا جس کی تفصیل وضع حدیث کے باب میں آئے گی۔ ان فتنوں نے امت کو تقسیم کر دیا، خلیفہ ثالث ذی النورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے، جنگ جمل اور صفین کا افسوسناک واقعہ پیش آیا اور خیر امت مختلف فرقوں میں بٹنا شروع ہوگئی، ہر فرقہ اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا تھا جس کے لیے انہوں نے حدیث رسول کو مشق ستم بنایا، اپنی تائید میں رسول اور خلفاء کی جانب ایسی باتیں منسوب کرنے لگے جس کو انہوں نے نہیں کہا تھا، جب نوبت یہاں تک پہنچی تو پاسبان سنت نبوی حرکت میں آگئے اور سلسلہ اسناد جس کا وجود پہلے ہی سے تھا، لیکن اس کی طلب میں رعایت تھی (کیوں کہ وہ دور رسول سے متصل تھا اس لیے اگر واسطہ بھی ہوتا تو صحابی کا یا تابعی کا) اب یہ رعایت ختم کر دی گئی اور سختی سے اس کی طلب شروع کر دی گئی اور صورت حال یہ ہوگئی کہ پہلے یہ بتایئے کہ آپ نے کس سے سنا ہے پھر آگے بتایئے کہ کیا سنا ہے پھر جیسے جیسے زمانہ کی صورت حال میں تبدیلی آنے لگی ویسے ویسے حفاظت حدیث کے انتظامات میں تیزی اور تنوع ہوتا گیا، حالات کی اسی تبدیلی کی جانب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ (متوفی ۶۸ھ) نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے کہ : "كنا مرة إذا سمعنا رجلا يقول قال رسول الله ﷺ

---

(۵) بخاری (۴۴۸۰) (۶) مسلم (۸)

ابتدرته أبصارنا وأصغينا إليه بآذاننا ...... الخ" (۷) ایک وہ دور تھا کہ جب ہم کسی سے یہ سنتے تھے "قال رسول اللہ ﷺ......الخ" تو ہماری نگاہیں اس کی طرف لپک پڑتی تھیں اور ہم ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے لیکن جب صورت حال بدل گئی اور لوگ رطب و یابس بیان کرنے لگے تو اب ہم ان کی انہیں باتوں کو مانتے ہیں جن کو پہلے سے جانتے ہیں (یعنی انجان حدیث انجان لوگوں سے نہیں قبول کرتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں کوئی خارجی چیز داخل کر دی گئی ہو)

علامہ ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) نے اس صورت حال کی تعبیر کچھ یوں کی ہے " لم يكونوا يسئلون عن الإسناد فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالكم" (۸) دور سابق میں اسناد (رسول اور قائل کے درمیان کا واسطہ) کے بارے میں اہل علم سوال نہیں کرتے تھے (حالاں کہ واسطہ موجود تھا) لیکن جب فتنہ (شہادت عثمان) کا وقوع ہوا تو اہل علم نے لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ (پہلے) ان کا نام بتاؤ جن سے تم نے یہ حدیث سنی ہے نام ظاہر کرنے کے بعد اگر اس میں کوئی بدعتی (رافضی) ہوتا تو اس کی روایت نہیں لی جاتی اور اگر اہل سنت سے ہوتا تو اس کی روایت قبول کی جاتی تھی (اس لیے کہ اس دور میں اہل سنت میں کذب بیانی نہیں تھی یہ خرابی ان میں ۲۰ھ کے بعد پیدا ہوئی ہے)

ابراہیم نخعی (متوفی ۹۵ھ) فرماتے ہیں کہ چوں کہ مختار بن عبید کے زمانہ میں حضرت علی کی جانب جھوٹ باتیں بہت منسوب ہونے لگیں اس لیے اسناد کی طلب کی جانے لگی۔ (۹)

مختار بن عبید کا اصل زمانہ ۱۱ھ سے ۲۷ھ تک کا تھا۔

اسناد دینی ضرورت : پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس میں شدت بڑھتی گئی یہاں تک کہ یہ ایک ضروری امر ہو گیا۔ سند کے بغیر کوئی کسی کی بات پر کان بھی نہیں دھرتا، علماء اور اہل علم ہمیشہ اس کے خوگر رہے، علامہ ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں کہ "إن هذا العلم دين فانظروا

---

(۷) مقدمہ صحیح مسلم (۸۱/۱ مع النووی) (۸) مقدمہ مسلم (۸۴/۱)، شرح علل ترمذی ص ۸۱/۱

(۹) شرح علل ترمذی ص ۸۲ - ۸۳

عمن تاخذون دینکم " (۱۰) اسی طرح کی بات حضرت علی سے بھی منقول ہے۔ (۱۱)

امام زہری (متوفی ۱۲۴ھ) کا یہ قول مشہور ہے کہ "چھت پر بغیر زینہ کے چڑھنا ممکن نہیں۔" (۱۲) یعنی بغیر سند کے حدیث رسول تک پہنچنا ممکن نہیں۔

ہشام بن عروہ (متوفی ۱۴۶ھ) فرماتے ہیں کہ "إذا حدثك رجل بحديث فقل ممن هذا" (۱۳) جب تم سے کوئی حدیث بیان کرے تو اس سے کہو کہ کس سے سنا ہے۔

سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ "الاسناد سلاح المومن" (۱۴) اسناد مومن کا ہتھیار ہے۔

ابن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) فرماتے ہیں کہ " ولولا الاسناد لقال من شاء ماشاء" (۱۵) اگر اسناد نہ ہوتی تو جس کی جو مرضی ہوتی وہ کہتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ طلب اسناد ایک ضروری امر ہو گیا، اور ہر خاص وعام کے لیے ایک مسلمہ اصول بن گیا، جاہل ہو یا عالم، دیہاتی ہو یا شہری، مفتی ہو یا مستفتی ہر ایک حدیث رسول کے لیے اس کو بنیاد سمجھنے لگا۔

سفیان بن عیینہ (متوفی ۱۹۸ھ) کی خدمت میں ایک دیہاتی حاضر ہوا اور یہ فتوی پوچھا کہ اگر عورت طواف بیت اللہ سے پہلے حائضہ ہو جائے تو کیا کرے؟ انہوں نے جواب دیا کہ طواف کے علاوہ تمام اعمال حج ادا کرے۔ دیہاتی نے کہا کہ کوئی دلیل ہے؟ انہوں نے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت اور ان کا واقعہ ہے جس میں رسول ﷺ نے ان کو یہی حکم دیا تھا۔ اس دیہاتی نے کہا کہ اس کی کوئی سند ہے؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں، مجھ کو یہ بات عبدالرحمٰن بن قاسم نے اپنے والد کے واسطہ سے بتائی ہے جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ

---

(۱۰) مقدمہ صحیح مسلم (۸۴/۱)، الجرح والتعدیل (۱۵/۲) (۱۱) الکفایہ ص ۱۲۱

(۱۲) الجرح والتعدیل (۱۶/۲) (۱۳) السنۃ قبل التدوین ص ۲۲۶

(۱۴) المجروحین (۱۹/۱)، شرح علل ترمذی ص ۱۸۸

(۱۵) مقدمہ مسلم (۸۷/۱)، جرح وتعدیل (۱۶/۲)

عنہا سے سنا ہے۔ (۱۶)

غور کیجیے کہ سفیان بن عیینہ جیسے جلیل القدر امام اور محدث سے ایک دیہاتی سند طلب کر رہا ہے جب کہ یہاں معاملہ درس حدیث کا نہیں بلکہ فتویٰ کا تھا۔

علامہ مدائنی فرماتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے ایک صاحب کو بغیر سند کے حدیث بیان کرتے ہوئے سنا تو اس نے انہیں فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ بغیر نکیل اور لگام کے اس کو کیوں بھیج رہے ہو۔ (۱۷) (یعنی بغیر سند کے کیوں بیان کر رہے ہو)

جب کہ عام گفتگو اور فتویٰ وغیرہ میں اس کی اتنی اہمیت نہیں اس کی اصل ضرورت تحدیث حدیث کے وقت ہوتی ہے پھر بھی عام حالات میں جہلا بھی اس کو ضروری سمجھتے تھے۔

امام زہری (متوفی ۱۲۴ھ) کے سامنے ابن ابی فروہ نے قال رسول اللہ ﷺ کہہ کر حدیث بیان کرنا شروع کیا تو امام زہری نے کہا کہ ابن ابی فروہ تجھ کو کس چیز نے اتنا جری بنا دیا ہے کہ تو اپنی حدیثوں کی سند نہیں بتاتا، ایسی حدیثیں بیان کرتا ہے جو بے لگام اور بے نکیل ہیں۔ (۱۸)

حدیث رسول میں اسناد کے التزام کا نتیجہ یہ ہوا کہ استعمال اسناد ایک عام مزاج بن گیا حتیٰ کہ حدیث رسول کے علاوہ دیگر اسلامی فنون، تفسیر، سیرت، تاریخ، اقوال رجال وغیرہ کے لیے بھی اس کا استعمال ضروری ہو گیا۔ (۱۹) اسی اسناد کی بنیاد پر دیگر علوم مثلاً علم جرح وتعدیل اور علم اسماء رجال وغیرہ ایجاد ہوئے۔

☆☆☆

---

(۱۶) الکفایۃ فی الروایۃ ص ر ۴۴

(۱۷) السنۃ قبل التدوین ص ر ۲۲۴

(۱۸) معرفۃ علوم الحدیث ص ر ۲۸

(۱۹) جرح وتعدیل ۲۳-۲۸ (ڈاکٹر اقبال)

۳ - علم جرح وتعدیل

قبل ازیں یہ بات گذر چکی ہے کہ محدثین کرام نے سنت رسول کی حفاظت کے لیے جو بار آور کوششیں کیں ان کے نتیجے میں علم اسناد کا ظہور ہوا۔ اسی علم اسناد سے متفرع ہونے والا ایک اور اہم علم، ''علم جرح وتعدیل'' ہے جس کا حفاظت سنت میں بہت اہم کردار ہے، اسی علم کے ذریعہ سے صحیح اور غلط حدیثوں میں تمیز کی جاتی ہے، یہی کھرے اور کھوٹے کا معیار ہے، اس علم کے بغیر حدیث رسول کی حفاظت ممکن نہیں۔

اصول حدیث کی کتابوں میں نیز دفاع حدیث کی کتابوں میں اس علم پر جا بجا گفتگو موجود ہے، خاص قسم کی کتابوں میں فن علم جرح وتعدیل کے نام سے اس کے اصولوں کو جمع کیا گیا ہے، جس کا ایک خاکہ پیش خدمت ہے۔

جرح وتعدیل :

یہ علم دو کلمہ - جرح اور تعدیل - کے مجموعہ کا نام ہے۔

جرح : راویوں کے ایسے عیوب بیان کرنے کو کہا جاتا ہے جس سے ان کی عدالت اور ضبط ختم ہوجائے یا اس طرح داغدار ہوجائے جس سے ان کی روایت ناقابل اعتبار ہوجائے۔ (۱)

تعدیل : راویوں پر عادل اور ضابط ہونے کا حکم لگانا۔ (۲)

عادل : ہر اس مسلمان کو کہتے ہیں جو عاقل بالغ ہو، اسباب فسق اور مروت کو ختم کردینے والی چیزوں سے محفوظ ہو۔ (۳)

---

(۱) جرح وتعدیل ص ر ۱۳۴ (۲) مقدمہ ابن الصلاح ص ر ۹۴ (۳) مقدمہ ابن الصلاح ص ر ۹۴

ضابط : اس صاحب اتقان اور بیدار مغز راوی کو کہتے ہیں جو اپنی حدیثوں کو :

۱- اگر یادداشت سے حدیث پڑھا رہا ہے تو بہت اچھی طرح سے یاد رکھتا ہو۔

۲- اور اگر کتاب سے پڑھا رہا ہے تو خرد برد سے محفوظ رکھتا ہو۔

۳- اور اگر روایت بالمعنیٰ کر رہا ہے تو روایت کے معنیٰ و مفہوم کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ (۴)

علم جرح وتعدیل : ایسے علم کو کہا جاتا ہے جس میں راویوں کے جرح وتعدیل پر مخصوص کلمات اور ان کے مراتب کے اعتبار سے بحث کی جائے۔ (۵)

جرح وتعدیل کا مقصد اور اس کی اجازت :

جرح وتعدیل کا اصل مقصد حدیث رسول کی حفاظت کرنا ہے، اس سے کسی کی بے جا ستائش کرنا یا کسی پر عیب لگانا مقصود نہیں، لہٰذا اس کا استعمال اسی حد تک ہونا چاہیے جس سے کہ اصل مقصد حاصل ہو جائے۔

شریعت مطہرہ نے اس کی اجازت دے رکھی ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ﴿ یاأیها الذین آمنوا إن جاء کم فاسق بنباء فتبینوا﴾ (حجرات : ٦) اے مومنو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ فاسق کے خبر کی تصدیق کر لو، معلوم ہوا کہ اگر ایسا شخص خبر لائے جو فاسق نہ ہو تو اس کی خبر قبول کر لو، اور اگر ایسا شخص خبر لائے جس کے بارے میں معلومات نہیں تو اس کا پتہ کر لو کہ وہ فاسق ہے یا عادل، چونکہ کسی بھی مخبر کے بارے میں معلومات حاصل کیے بغیر فاسق ہونے کا حکم لگانا ممکن نہیں لہٰذا یہ معلوم ہوا کہ سب سے پہلے مخبر کی حیثیت معلوم کرنا ضروری ہے کیوں کہ اس کی خبر کے قبول اور عدم قبول کا دارومدار اسی حیثیت پر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بہت سے مواقع پر کسی کی تعریف کی ہے یا کسی کی خرابی بتائی ہے مثلاً جب فاطمہ بنت قیس نے آپ سے اپنی شادی کے سلسلہ میں مشورہ کیا اور یہ اطلاع دی کہ تین افراد

---

(۴) الباعث الحثیث ص ر ۹۲-۹۳ (۵) الحطہ ص ر ۸۹، جرح وتعدیل ص ر ۱۷۹

نے پیغام رشتہ دیا ہے، حضرت معاویہ، حضرت ابوجہم اور حضرت اسامہ تو آپ نے فرمایا کہ "أما أبو جهم فلايضع عصاه عن عاتقه، وأما معاوية فصعلوك، انكحى أسامة بن زيد" ابوجہم کی لاٹھی ہمیشہ گردن پر رہتی ہے (یعنی عورتوں کو ستاتے ہیں یا کہ ہمیشہ سفر پر رہتے ہیں) اور معاویہ فقیر آدمی ہیں، تم اسامہ بن زید سے نکاح کرلو۔ (٦)

یہاں پر یہ معاملہ صرف زوجین کی خیر خواہی کا تھا پھر بھی آپ نے اس کی خاطر دو آدمیوں کا عیب بتادیا اور ایک کی ستائش کی، تو شریعت محمدی جس سے پوری امت کی بھلائی مقصود ہے اس کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی بھی خبر دینے والے کی اچھائی اور برائی واضح کردی جائے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ "من روى عني حديثا وهو يعلم أنه كذب فهو أحد الكاذبين" (٧) جو شخص میری طرف نسبت کرکے حدیث بیان کرتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ حدیث گھڑی ہوئی ہے تو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا یہ بھی ہے۔ یہاں پر اللہ کے رسول نے موضوع اور گھڑی ہوئی روایت بیان کرنے سے منع کیا ہے، اور جو شخص ایسا کرتا ہے اس کو کاذب قرار دیا ہے جو جرح شدید ہے۔

عقل سلیم کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ جب دنیاوی امور و معاملات میں شہادت دینے والے گواہوں کی جرح و تعدیل باجماع امت کی جاسکتی ہے تو دینی امور جہاں حلال و حرام کی معرفت کا معاملہ ہے وہاں بدرجہ اولیٰ جرح و تعدیل جائز اور درست ہونی چاہیے۔

اسباب جرح :

کسی بھی راوی پر جرح یا اس کی تعدیل کرنا مشکل ترین کام ہے، اس کے لیے بھی کچھ اصول وضوابط ہیں، بنیادی طور سے راوی کے مجروح ہونے کے دو اسباب ہوتے ہیں عدم عدالت یا اس میں عیب، عدم ضبط یا اس میں عیب۔

---

(٦) مسلم (۱۴۸۰) (٧) مقدمہ مسلم، سنن ترمذی (۲۶۶۲) وقال حسن صحیح، مسند احمد (۱/ ۱۱۳)

کوئی راوی اگر حدیث رسول میں جھوٹ بولتا ہے یا اس پر جھوٹ کا الزام لگا ہوا ہے (یعنی عام بول چال میں جھوٹ ثابت ہے) یا گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے (یعنی فاسق ہوتا ہے) یا بدعتی ہے یا اس کے بارے میں کوئی معرفت نہیں تو اس کی عدالت ختم سمجھی جاتی ہے، ایسے ہی اگر راوی حدیث پڑھتے وقت سن تمیز میں نہ ہو یا حدیث بیان کرتے وقت نابالغ ہو یا مجنون ہو یا صاحب مروت نہ ہوتو بھی اس کی روایت ناقابل قبول ہوتی ہے۔

اور اگر راوی بہت زیادہ غلطی کرتا ہو یا مغفل ہو یا اسے بکثرت وہم ہو جاتا ہو یا ثقہ راوی کی مخالفت کرتا ہو یا حافظہ کمزور ہوتو اس کا ضبط ختم سمجھا جاتا ہے۔

لہٰذا جب ان دونوں (عدالت وضبط) میں سے کسی میں بھی عیب یا خلل پایا جائے تو راوی مجروح اور ضعیف ہوگا اور جس طرح اسباب ضعف شدید ہوں گے اسی اعتبار سے اس کا ضعیف ہونا بھی شدید ہوگا۔

البتہ اگر راوی تدلیس یا ارسال کرتا ہے (یعنی ایسے شخص سے جس سے روایت نہیں سنی یا جس کا ہم عصر بھی نہیں اس سے ایسے صیغہ سے روایت کرے جس سے اس سے سننے کا شبہ ہوتا ہے) تو بعض حالات میں اس کی روایت ضعیف سمجھی جاتی ہے نیز اگر کوئی شخص بکثرت ضعفاء سے روایت کرتا ہے یا صرف کتاب کا مطالعہ کر کے بغیر استاد سے پڑھے ہوئے حدیث سناتا ہے تو وہ بھی مجروح ہوتا ہے۔ (۸)

اسباب ثقاہت :

راوی اگر صاحب ایمان، صاحب تقوی ومروت ہے، عاقل اور بالغ ہے، اسباب فسق اور مروت کو ختم کر دینے والی چیزوں سے محفوظ ہے تو اس کو عادل سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر چست وچالاک ہو، اپنی روایتوں کو اچھی طرح یاد رکھنے والا، اپنی کتاب کی نگہداشت کرنے والا، روایت بالمعنی کرتے وقت معنی ومفہوم کو سمجھتا ہو تو اس کو ضابط سمجھا جاتا ہے۔

اور جب عدالت اور ضبط دونوں چیزیں بیک وقت درست ہوں تو راوی ثقہ سمجھا جاتا ہے۔

---

(۸) جرح وتعدیل ص ر ۱۰۹

معرفت کے طریقے :

فن جرح وتعدیل کا ایجاد اس امت کا عظیم کارنامہ ہے، سابقہ امتوں میں سے کسی کے وہم وگمان میں اس کا تصور بھی نہ ہوا، اور نہ ہی اپنے دین کی حفاظت کے لیے انہوں نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا۔ اس فن کے اصول وضوابط انتہائی دقیق ہوتے ہیں جس کا سمجھنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں، اس کے مخصوص ماہرین ہوتے تھے جن کو ائمہ جرح وتعدیل کہا جاتا ہے، جو راویوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرتے تھے، یہ معلومات یا توان کی ذاتی معرفت پر مبنی ہوتی تھی اگر راوی ان کے دور کا ہوتا تھا جس کو وہ بذات خود دیکھتے تھے، اس کے حالات کا مطالعہ کرتے تھے، اس کے رہن سہن، اخلاق وعادات، تعلیم وتعلم، سفر وحضر، اساتذہ وتلامذہ اور کارکردگی پر نظر رکھتے تھے، اور اگر راوی ان کے دور کا نہیں ہوتا تو وہ اس دور کے امام نقد سے اس کے بارے میں معلومات ان کے شاگردوں کے ذریعہ یا بذات خود حاصل کرتے تھے، اس طرح راویوں کے بارے میں معلومات کی منتقلی ایک دوسرے تک ہوتی رہتی تھی۔

اختلاف رائے :

چونکہ ائمہ نقد کی تعداد ہر زمانہ میں اچھی خاصی رہتی تھی جن کی معرفت مختلف ہوا کرتی تھی لہٰذا راویوں کے بارے میں اختلاف رائے کا ظہور ہوا، ایک ہی راوی کے بارے میں ایک امام کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ کہتا ہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی معلومات کے مطابق اپنے خیال کا اظہار کیا، کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی امام نے کسی راوی کے بارے میں دو طرح کی باتیں کہی ہیں، اس طرح کی صورت حال کو تعارض جرح وتعدیل کہا جاتا ہے، ایسی صورت میں ان اقوال میں توفیق دی جاتی ہے اور ہر ایک کے قول کو الگ الگ جہت پر محمول کیا جاتا ہے، اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر اسباب جرح وتعدیل کو دیکھا جاتا ہے، اور اس کی بنیاد پر اقوال کو ایک دوسرے پر ترجیح دی جاتی ہے اور اگر تعارض کی صورت حال نہ ہو تو امام کی بات تسلیم کر لی جاتی ہے اور اس کو ظن غالب پر محمول کیا جاتا ہے جو علم یقینی کا آخری درجہ ہے۔

ائمہ کی دیانت داری :

جن ائمہ نے راویوں پر جرح وتعدیل کیا ہے وہ انتہائی دیانت دار، صادق اور خدا ترس ہوتے تھے، وہ برملا حق کا اظہار کرتے تھے، نہ کسی قرابت داری کا اثر لیتے نہ دوستی کی پرواہ کرتے، نہ انہوں نے اپنے باپ کو بخشا نہ بیٹے کو، نہ دوست کو چھوڑا نہ رشتہ دار کو بلکہ ہر ایک میں جو خوبی وخامی نظر آئی اس کو واضح کر دیا۔

چنانچہ امام علی بن المدینی نے اپنے والد پر، امام ابوداؤد نے اپنے بیٹے پر، وکیع بن جراح نے اپنے والد پر، امام شعبہ نے اپنے داماد پر- جو ان کا خرچہ چلاتے تھے- زید بن انیسہ نے اپنے بھائی پر، امام یحییٰ بن معین نے اپنے دوست پر جرح کیا اور ان کی روایتوں کو قبول کرنے سے منع کر دیا۔ (۹)

شروط ناقد :

ان ائمہ کے لیے بھی کچھ شرائط ہیں اگر وہ ان شرائط پر پورا اترتے ہیں تب تو ان کی بات قبول کی جاتی ہے ورنہ نہیں، وہ شرائط یہ ہیں :

- وہ بذات خود عادل، ثقہ، چست وچالاک ہو۔
- راویوں کے بارے میں معلومات رکھتا ہو، تعصب، تساہل وتنگ نظری اور جانب داری سے پاک ہو۔
- اسباب جرح وتعدیل کو جانتا ہو۔
- عربی زبان اور عرفی کلمات کے مفہوم کو جانتا ہو۔
- حلال وحرام کی معرفت رکھتا ہو۔
- جب یہ تمام شرائط پائی جائیں تب ہی وہ راویوں کے بارے میں اپنی معلومات دے سکتا ہے۔

---

(۹) جرح وتعدیل (۲۴۸-۲۴۹)

ضروری بات :

جرح وتعدیل ایک ضرورت ہے لہٰذا اس کو ضرورت کے وقت ہی استعمال کرنا چاہیے، اس میں مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنا چاہیے، راویوں کے بارے میں جو کچھ کہنا ہے اس کی مکمل تحقیق وتصدیق کے بعد ہی زبان پر لانا چاہیے، فرط غضب، اندھی محبت یا بطور مذاق صادر ہونے والے جرح وتعدیل کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے، کوئی بھی جرح وتعدیل جن کا سبب کمزور ہوتا ہے وہ مقبول نہیں ہوتا، پس منظر اور مخصوص حالات کا اعتبار بھی ضروری ہے۔

ان تمام شروط وضوابط کے باوجود اگر کسی سے غلطی اور بھول چوک ہو جائے تو دیگر قواعد کے ذریعے اس کو رفع کیا جا سکتا ہے۔

درجات رواۃ :

جتنے بھی راوی ہیں ان کو دو گروپ اور درجوں - ثقہ اور ضعیف - میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ان میں سے ہر ایک کے مختلف درجات ہوتے ہیں جن کی بناء پر ان کی روایتوں پر صحیح، حسن، ضعیف، متروک اور موضوع ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔

ثقہ راویوں کے چھ درجات ہیں ہر درجہ کے لیے مخصوص کلمات ہوتے ہیں جن کو مراتب تعدیل کہا جاتا ہے۔

- پہلا درجہ وہ ہے جو مبالغہ یا اسم تفضیل کے صیغے سے وارد ہو یا جو اس کے معنی میں ہوں جیسے : أصدق الناس، لا يعرف له نظير۔
- دوسرا درجہ وہ ہے جس میں راوی کی ثقاہت تاکید لفظی سے بیان کی گئی ہو۔ جیسے : ثقہ ثقہ، یا تاکید معنوی سے بیان کی گئی ہو جیسے : ثقہ ثبت۔
- تیسرا درجہ وہ ہے جس میں راوی کی ثقاہت بغیر تاکید کے بیان کی گئی ہو جیسے ثقہ۔
- چوتھا درجہ وہ ہے جس میں عدالت واضح اور ضبط غیر واضح ہو جیسے صدوق۔

- پانچواں درجہ وہ ہے جس میں عدالت وضبط صراحت سے مذکور نہ ہو جیسے شیخ وسط۔
- چھٹا مرتبہ وہ ہے جس میں عدالت وضبط میں شبہ کا اظہار ہو جیسے صویلح۔

اسی طرح سے جرح یعنی ضعیف راویوں کے بھی چھ درجات ہوتے ہیں :

- پہلا درجہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں ضعیف ہونے کا اشارہ ہو جیسے لین الحدیث، یہ ضعیف کا سب سے کمتر درجہ ہوتا ہے۔
- دوسرا مرتبہ وہ ہے کہ اس میں راوی کے ضعیف ہونے کی صراحت ہو جیسے ضعیف۔
- تیسرا درجہ وہ ہے جو راوی کے کثرت ضعیف ہونے پر دلالت کرے جیسے ضعیف جدا۔
- چوتھا درجہ وہ ہے جو اس کے متہم بالکذب ہونے پر دلالت کرے جیسے متہم بالکذب۔
- پانچواں درجہ وہ ہے جو راوی کے جھوٹا ہونے پر دلالت کرے جیسے کذاب۔
- چھٹا مرتبہ: جو سب سے بدترین ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں راوی سے دروغ گوئی میں مبالغہ پایا جائے۔ یعنی بہت بڑا جھوٹا ہو۔ جیسے أكذب الناس (۱۰)

حرف آخر :

علم جرح وتعدیل کا یہ ایک ہلکا سا خاکہ ہے جس میں موٹی موٹی باتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محدثین نے کس طرح سے جگر سوزی اور عرق ریزی کر کے اصول وضوابط کو تیار کیا ہے، اور انہوں نے سنت رسول کی حفاظت کی خاطر پوری قوت صرف کر دی ہے۔ دقیق سے دقیق تر ضوابط، ان کے جزئیات کا استنباط عقل وخرد، قوت استنباط پر غماز ہے۔

مکمل تفصیل اس فن کی بڑی بڑی کتابوں میں موجود ہے۔

اردو زبان میں اس موضوع پر راقم کی بھی ایک حقیر کوشش ہے جو ۷۵ صفحات پر مشتمل اور مطبوع ہے جس کا نام ''جرح وتعدیل'' ہے، میرے علم کے مطابق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب

---

(۱۰) جرح وتعدیل (۲۲۳ - ۲۲۶)

ہے جس کا مطالعہ ان شاء اللہ اس فن کی معرفت کے لیے کافی مفید ثابت ہوگا۔

علامہ حالی نے محدثین کی ان کوششوں پر اس طرح تبصرہ کیا ہے۔

کیے جرح و تعدیل کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں
اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو
اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازن علم دیں جس بشر کو
لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو
پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزا اس کا چکھ کر
کیا فاش راوی میں جو عیب پایا
مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا
ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ صوفی کو چھوڑا نہ ملا کو چھوڑا

☆☆☆

۴ - علم اسماء رجال

علم اسناد پر متفرع ہونے والا یہ دوسرا علم ہے جس کا تعلق "جرح و تعدیل" سے چولی دامن کا ہے، اس گہرے تعلق کی وجہ سے دونوں علوم بسا اوقات یکجا ہو جاتے ہیں اور ان کے مصادر و مراجع مشترک ہو جاتے ہیں، جن کتابوں کو کتب جرح و تعدیل کہا جاتا ہے انہیں کو کتب اسماء رجال بھی کہا جاتا ہے۔

علم اسماء رجال :

اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے راویان حدیث کے عام حالات معلوم کیے جائیں۔

راویان حدیث میں صحابی، مخضرم، تابعی اور دیگر رواۃ شامل ہوتے ہیں، ان راویوں کے مختلف طبقات و درجات ہوتے ہیں، صحابہ کرام رواۃ حدیث کے طبقہ اولیٰ میں شمار کیے جاتے ہیں۔

اگر راوی حدیث صحابی رسول ہیں تو ان کے بارے میں صرف اتنی سی معلومات حدیث پر حکم لگانے کے لیے کافی ہوتی ہے کہ آپ صحابی رسول ہیں، جرح و تعدیل کے تفصیلی اصول وضوابط کے اجراء کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ ان اصول وضوابط کے ذریعہ راوی کی ثقاہت اور عدم ثقاہت معلوم کی جاتی ہے۔ اس کی روایت قابل قبول ہو سکتی ہے کہ نہیں اس کا حکم اس کی ذات کی معرفت کے بعد لگایا جا سکتا ہے، چوں کہ صحابہ کرام کی ثقاہت ایک مسلمہ حقیقت ہے ان کی صداقت و امانت، اور فضیلت کا ذکر کتاب و سنت میں موجود ہے، ان کو رضائے الٰہی کا پروانہ مل چکا ہے، جنت کی بشارت ان کو دنیا ہی میں دیدی گئی ہے، ظاہر ہے کہ ایسے انسان عدالت وثقاہت کے بیان کے محتاج نہیں ہوتے۔

قرآن کریم نے انہیں کے بارے میں ﴿ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ﴾ (مائدہ ۱۱۹) کہا ہے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔ ﴿ کنتم خیر أمة أخرجت للناس ﴾ (آل عمران ۱۱۰) کے سب سے پہلے مصداق وہی ہیں، یعنی تم بہترین امت ہو انسانوں کی رہنمائی کے لیے تمھارا ظہور ہوا ہے۔ ﴿ أولئک هم الصادقون ﴾ (حشر ۵۹) کی بشارت انہیں کو دی گئی ہے، یعنی وہ سب سچے لوگ ہیں۔ ﴿ لهم مغفرة ورزق كريم ﴾ (انفال ۷۴) کا وعدہ انہیں سے سب سے پہلے کیا گیا ہے، یعنی ان کے لیے مغفرت اور رزق کریم ہے۔ ﴿ وكلا وعد الله الحسنىٰ ﴾ (نساء ۹۵) کا پیغام انہیں کو ملا ہے، یعنی ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔

صحابہ کرام کی حقیقی تعداد اللہ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں، بعض مورخین نے ان کی تعداد رسول ﷺ کی وفات کے وقت ایک لاکھ چودہ ہزار بتائی ہے جیسا کہ امام ابوزرعہ سے منقول ہے۔ (۱)

لیکن عام طور سے ان کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہے، جن حضرات کے بارے میں کچھ معلومات ملتی ہے ان کی تعداد تقریباً دس ہزار ہوگی، اور جن لوگوں سے روایتیں مروی ہیں ان کی تعداد کافی مختصر ہے، ان کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے اوپر نہیں ہوسکتی۔

مسند بقی بن مخلد جو اس روئے زمین پر سب سے بڑی مسند بتائی جاتی ہے (جس میں تمام صحابہ کرام جن سے روایتیں مروی ہیں ان کا نام اور ان کی روایت مذکور ہے) اس میں صحابہ کرام کی کل تعداد ایک ہزار آٹھ ہے۔ (۲) ان میں سے بہت سارے وہ حضرات ہیں جن سے صرف ایک یا دو روایتیں مروی ہیں جب کہ زیادہ تر روایت بیان کرنے والے وہ صحابہ کرام ہیں جو بیعت رضوان اور فتح مکہ سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔ جو حضرات فتح مکہ کے بعد ایمان لائے ان کی

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح ص ر ۲۶۸، تدریب الراوی (۲ر ۲۲۰)، جرح وتعدیل ص ر ۷ا

(۲) جوامع السیرۃ ص ر ۲۷۵-۳۱۵

روایتوں کی تعداد بہت کم ہے، اور ان کی روایتیں ان صحابہ سے بھی مروی ہیں جو سابقین اولین ہیں، انہیں لوگوں میں سے سات صحابہ کرام ایسے ہیں جن کی روایتیں ایک ہزار سے اوپر ہیں، ایسے لوگوں کو مکثرین صحابہ کہا جاتا ہے۔ (۳)

لہٰذا کسی بھی صحابی کے بارے میں صرف صحابی ہونے کا ثبوت مل جانا ہی کافی ہے دیگر معلومات کی بحیثیت راوی ضرورت نہیں۔

ویسے اگر کسی صحابی رسول کے بارے میں معلومات چاہیے تو ان کتابوں سے استفادہ کر سکتے ہیں جن کو " کتب معرفت صحابہ" یا "مصادر صحابہ" کہا جاتا ہے، ان میں تین مستند کتابیں کافی مشہور ہیں، 'الإستیعاب فی معرفة الأصحاب' تالیف حافظ ابن عبدالبر قرطبی (متوفی ۴۶۳ھ)، 'أسد الغابة فی معرفة الصحابة' تالیف حافظ ابن اثیر جزری (متوفی ۶۳۰ھ)، 'الاصابة فی تمییز الصحابة' تالیف خاتمۂ حفاظ حافظ ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ)، موخر الذکر کتاب اس فن میں سب سے جامع کتاب سمجھی جاتی ہے البتہ اس کتاب کی ترتیب سمجھنے کے لیے اس کا مقدمہ ضرور پڑھ لیں، یہ کتابیں عربی زبان میں ہیں۔

اردو زبان میں "سیر الصحابہ" جلد اول تا ششم جو دار المصنفین کی مطبوعات میں سے ہے، اس سلسلہ میں مفید کتاب ہے۔

صحابہ کرام کے بعد جو راویان حدیث ہیں ان کو بترتیب تابعی، تبع تابعی، تابع تبع تابعی کہا جاتا ہے، صحابہ اور تابعین کے درمیان ایک جماعت ان حضرات کی ہے جو رسول کے زمانہ میں ایمان تو لے آئے لیکن رسول اللہ ﷺ کا دیدار نہ کر سکے ان کو 'مخضرم' کہا جاتا ہے جن کا شمار بھی تابعین بلکہ بڑے بڑے تابعین میں ہوتا ہے۔

عام طور سے راویوں کا سلسلہ تیسری صدی کے خاتمہ تک مکمل ہو جاتا ہے جہاں کہ حدیث کی بڑی بڑی اور منظم کتابیں کتب ستہ وغیرہ لکھ کر مکمل ہوئیں ان راویوں کے بارے میں

---

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کی تالیف جرح وتعدیل (اردو) ص ر ۷۷

(حدیث کا حکم بحیثیت صحت وضعف معلوم کرنے کے لیے) معلومات ضروری ہوتی ہے اور جرح وتعدیل کے قاعدے ان پر نافذ کئے جاتے ہیں، اگرچہ صحابہ کرام کے بعد دورتابعین میں اس کی زیادہ ضرورت نہیں تھی، پھر بھی حدیث رسول کی حفاظت کے خاطر قواعد کا اجرا یہیں سے ہوتا ہے، لہٰذا علم اسماء رجال کی ضرورت بھی یہیں سے پیش آتی ہے۔

اس علم کے ذریعے راوی کا نام ونسب، وطن، پیدائش، تعلیم وتربیت، استاذ وشاگرد، طبقہ، مقام سفر، دوست واحباب، تقوی وپرہیزگاری، اخلاق وعادات، عبادت وریاضت، معاشرہ میں ان کا عمل ودخل، منصب، عوام اور علماء کے تبصرے، ان کی نگاہ میں ان کا مقام، ان کی حدیثوں کے منتشر ہونے کے مقام، وفات وغیرہ معلوم کیا جاتا ہے، زندگی کے انہیں حالات میں ایک اہم نقطہ راوی کی ثقاہت وضعف کی معرفت ہوتی ہے، ائمہ نقد نے ان کو پرکھنے کے بعد کیا خطاب دیا ہے، ان کی روایت قابل قبول ہے کہ نہیں، یہی ان کی زندگی کا خلاصہ اور نتیجہ ہوتا ہے۔

یعنی علم اسماء رجال کے ذریعہ راوی کے عام حالات اور اس کی زندگی کے ہر گوشہ پر نظر ڈالی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اور دیگر معلومات ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر مختلف اصطلاحات کا وجود ہوا ہے۔ مثلاً :

اسماء کی معرفت :

اس میں راوی کے نام وکنیت کی معرفت حاصل کی جاتی ہے، اشتراک، عدم اشتراک، تعیین کے ساتھ اس کا ذکر وارد ہے یا بغیر تعیین کے دیگر کیا کیفیت ہے، اس اعتبار سے بنائے گئے کچھ اصطلاحات یہ ہیں :

اسماء مفردہ : وہ نام جس کے مشابہ کوئی دوسرا نام نہ ہو جیسے احمد بن عُجیّان۔

مہمل : دو یا دو سے زیادہ راوی اگر ایک ہی نام کے ہوں جن میں تمیز نہ کیا جا سکے۔

متفق ومفترق : وہ راوی جن کے نام اور ان کے آباء واجداد کے نام لکھنے اور بولنے

میں ایک جیسے ہوں۔ جیسے محمد بن محمد، اسی طرح سے وہ راوی بھی اس میں شامل ہیں جن کا نام وکنیت اورنسبت وغیرہ ایک جیسی ہو جیسے عمر بن خطاب اس نام کے چھ افراد ہیں۔

مؤتلف ومختلف : وہ راوی جن کے نام ونسب وکنیت وغیرہ لکھنے میں ایک جیسے ہوں لیکن تلفظ میں الگ ہوں جسے سلَام، سلّام۔

متشابہ : وہ راوی جن کے نام لکھنے اور بولنے میں متفق ہوں لیکن ان کے آباء کے نام بولنے میں مختلف ہوں جیسے محمد بن عَقِیل اور محمد بن عُقَیل۔

منفردات : وہ راوی جن سے ایک روایت مروی ہو۔

وحدان : وہ راوی جن سے صرف ایک ہی شخص نے روایت کیا ہو۔

روایۃ الأکابر عن الأصاغر : زیادہ عمر کا راوی کم عمر راوی سے روایت کرے۔

روایۃ الأصاغر عن الأکابر : کم عمر راوی بڑی عمر کے راوی سے روایت کرے۔

روایۃ الآباء عن الأبناء : والدین یا والد کا اپنے بچے سے روایت کرنا۔

روایۃ الأبناء عن الآباء : بچوں کی روایت والدین سے کرنا۔

کنیت کی معرفت :

کنیت اس نام کو کہتے ہیں جو "اب" یا "ام" یا ابن وبنت سے شروع ہو جیسے (ابن شہاب، ام کلثوم، ابو ہریرہ، بنت سیرین) (۴)

اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں :

کنی مجردہ : اس کنیت کو کہتے ہیں جس کا کوئی نام یا لقب نہ ہو۔

کنی مقیدہ : اس کنیت کو کہتے ہیں جس کا کوئی نام یا لقب بھی ہو۔

چونکہ اہل عرب عام طور سے کسی کا نام لے کر پکارنا بے ادبی تصور کرتے تھے، اسی طرح

---

(۴) الاسماء والکنی مقدمہ محقق (۹/۱)

بچوں کے نام کے بگڑنے کے خوف سے بچپن ہی میں ان کو کنیت سے پکارنے لگتے تھے، جس کی وجہ سے کنیت کا استعمال بکثرت ہوگیا۔ کبھی کبھی ایک فرد کی مختلف کنیتیں ہوتی تھیں جیسے ابن جریج جن کی کنیت ابوخالد اور ابوولید ہے، بعض زیادہ مشہور ہوتا تھا بعض کم، کنیت کا استعمال خواتین اور حضرات دونوں کے لیے ہوتا تھا، نیز کثرت کی وجہ سے اس کی مختلف شکلیں بن گئیں، بعض ایسے حضرات ہوئے جن کا کوئی نام نہیں ہوتا تھا، کنیت ہی نام کے قائم مقام ہوتی تھی، جیسے صحابی رسول ابوشاہ یمانی۔ یا نام ہوتا تھا پھر بھی کنیت سے مشہور ہوتے تھے جیسے حضرت ابوبکر بن ابوقحافہ جن کا نام عبداللہ بن عثمان ہے، بعض ایسے تھے جن کی کنیت نام کی جگہ لے لیتی اور ان کی دوسری کنیت رکھ دی جاتی جیسے ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث جو فقہائے سبعہ میں سے ہیں، ان کا نام ابوبکر اور کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے، یا کنیت لقب کے قائم مقام ہوجاتی اور پھر دوسری کنیت سے مشہور ہوجاتے جیسے حضرت علی جن کی کنیت ابوالحسن ہے اور لقب ابوتراب ہے۔ (۵)

اسی طرح سے وہ حضرات جن کی کنیت ان کے والد کے نام یا کنیت کے مطابق ہو یا ان کی کنیت ان کی زوجہ کی کنیت کی طرح ہو وغیرہ وغیرہ، اس کی مختلف شکلیں ہیں جو اسی فن ''فن اسماء رجال'' سے معلوم کی جاتی ہیں۔ کنیت کی معرفت کیلیے سب سے جامع کتاب 'المقتنى في سرد الكنى' امام ذہبی کی کتاب ہے۔

القاب کی معرفت :

اسی طرح راوی کے القاب اور اس کے اسباب بھی اس فن سے معلوم کیے جاتے ہیں۔

القاب : لقب کی جمع ہے، محدثین کے یہاں لقب اس صفت کو کہتے ہیں جو مسمی پر بحیثیت مدح وذم یا بحیثیت بلندی وپستی دلالت کرے خواہ یہ لقب بطور نام مستعمل ہو یا بطور کنیت ونسبت۔ (۶)

استعمال کے اعتبار سے لقب کی تین قسمیں ہیں :

---

(۵) مقدمہ ابن الصلاح، معرفۃ الاسماء والکنی ص/ ۲۹۶ (۶) فتح المغیث (۴/ ۲۰۷)

لقب تشریف : جیسے افضل۔

لقب توہین : جیسے بُطَیط۔

لقب تعریف : جیسے اَعمش۔ (۷)

شرعی حکم : وہ لقب جو صاحب لقب کو پسند نہیں اس کا استعمال درست نہیں، وہ تنابز بالالقاب میں شامل ہوتا ہے الا یہ کہ کوئی مجبوری ہو مثلاً اس کے علاوہ اور کچھ معلوم نہ ہو، یا اس کے بغیر تعارف نہ ہو سکے۔

القاب کبھی بغیر سبب کے بن جاتے ہیں اور کبھی کسی سبب سے بھی بنتے ہیں۔ کچھ مشہور اصحابِ القاب مندرجہ ذیل ہیں :

بندار (ماہر) ان کا نام : محمد بن بشار ہے جو امام بخاری کے استاذ تھے ان کا یہ لقب کثرت حفظ حدیث کی بنا پر پڑ گیا تھا۔

غندر (شور مچانے والا) : یہ محمد بن جعفر کا لقب ہے، ابن جریج کی مجلس میں کسی سے بات کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ "اسکت یا غندر" اے شور مچانے والے خاموش ہو جاؤ، یہیں سے یہ ان کا لقب پڑ گیا۔

مطین (مٹی سے لت پت) : یہ ابو جعفر حضرمی کا لقب ہے، بچپن میں یہ کچھ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، سارے بچے ان کے جسم پر مٹی ڈال رہے تھے، ابو نعیم فضل بن دکین کا گذر ادھر سے ہوا انہوں نے کہا یا مطین (اے مٹی سے پوتے ہوئے بچے) پڑھائی کیوں نہیں کرتے۔ یہیں سے ان کا لقب مطین ہو گیا۔

دو انتہائی محترم راوی ہیں جو خراب لقب سے ملقب ہو گئے :

معاویہ بن عبدالکریم الضال : مکہ جاتے وقت راستہ بھٹک گئے، لہٰذا ان کا لقب ضال (بھٹکنے والا) پڑ گیا۔

---

(۷) فتح الوہاب فیمن اشتہر من المحدثین بالالقاب ص ۷

عبداللہ بن محمد الضعیف : یہ جسمانی اعتبار سے کمزور تھے اس لیے ان کا لقب ضعیف پڑ گیا۔

ان چیزوں کی معرفت محدث کے لیے ضروری ہے ورنہ عبدالکریم کو گمراہ اور عبداللہ بن محمد کو ضعیف سمجھ بیٹھیں گے اور ان کی روایت کو مردود قرار دے دیں گے۔

نسبت کی معرفت :

اسی علم کے ذریعہ نسبت کی معرفت بھی حاصل کی جاتی ہے، حسب ونسب کے ذریعہ فخر ومباحات کرنا اہل عرب کا طرہ امتیاز تھا، اس لیے وہ اپنی نسبت اپنے خاندان کی طرف ضرور کرتے تھے۔

نسبت : دو چیزوں کے درمیان تعلق قائم کرنے کو نسبت کہا جاتا ہے۔ (۸) یعنی صاحب نسبت اور شئے منسوب کے درمیان تعلق کا قیام۔

عجم میں حسب ونسب کا اہتمام نہیں تھا اس لیے وہ صنعت، حرفت، گاؤں، شہر، وطن کی جانب نسبت کرتے تھے، آگے چل کر مذہب کی جانب نسبت کرنے لگے، بہت سے راوی نسبت سے اس قدر مشہور ہوتے تھے کہ اسی سے ان کی معرفت ہوتی تھی مثلاً ذہلی، اوزاعی، زہری وغیرہ۔

اس لیے محدثین نسبت کی معرفت کا بہت اہتمام کرتے تھے اس سے راویوں کی تعیین میں بڑی آسانی ہو جاتی تھی، جب نام ونسب یکساں ہو جاتے تو کنیت، نسبت، لقب وغیرہ سے تفریق کی جاتی تھی، اس میں تصحیف اور غلطی سے بچنے کے لیے بڑی بڑی کتابیں تحریر کی گئی ہیں جن میں نسبتوں کا ذکر اور اس کی جانب منسوب راویوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔

بعض راوی ایسے ہوتے ہیں جن کی نسبت غیر آباء کی طرف ہوتی ہے جیسے :

احمد بن حنبل : یہ اپنے دادا کی جانب منسوب ہیں والد کا نام محمد تھا۔

---

(۸) التعریفات ص ر ۲۴۱

محمد بن حنفیہ : یہ اپنی والدہ جو بنی حنیفہ خاندان سے تھیں ان کی جانب منسوب ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔

اسماعیل بن عُلَیَّہ : یہ اپنی ماں کی جانب منسوب ہیں اور والد کا نام ابراہیم تھا۔

کبھی کبھی نسبت واضح نہیں ہوتی کیوں کہ وہ ایسی چیز کی جانب منسوب ہو جاتے جو ان کی اصل نہیں ہوتی جیسے :

یزید الفقیر : یہ فقیر و محتاج نہیں تھے بلکہ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف رہتی تھی جس کو عربی میں فقر کہا جاتا ہے لہٰذا یہ اسی کی جانب منسوب ہو گئے۔

خالد حذاء : حذاء کہتے ہیں جوتا بنانے والے (موچی) کو، یہ (خالد بن مہران بصری جو خالد حذاء کے نام سے مشہور ہو گئے) جوتا سازی کا کام نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے پاس جا کر بیٹھتے تھے لہٰذا اسی کی جانب منسوب ہو گئے۔

اسماعیل بن خالد مکی : یہ مکہ کے رہنے والے نہیں تھے بلکہ بکثرت حج کرتے تھے اس لیے مکہ کی جانب منسوب ہو گئے۔

اسمائے رجال کے ذریعہ یہ متنوع معلومات اور ان کی باریکیاں اصول حدیث کی کتابوں کا ایک مستقل باب ہے، جب کہ اس میں تقریباً ہر جزئی مسئلہ پر اہل علم کی خاص طور سے حافظ مشرق علامہ خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) کی تالیفات ہیں۔ (۹)

نیز راویان حدیث کی معرفت کے لیے کچھ مخصوص کتابیں تحریر کی گئی ہیں جن کو کتب اسماء رجال کہا جاتا ہے۔

کتب اسماء رجال :

راویوں کی عام معرفت کے لیے جو کتابیں لکھی گئی ہیں بنیادی طور سے ان کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : (۱) کتب عامہ (۲) کتب خاصہ۔

---

(۹) التقیید والإیضاح ص ۴۲۴

کتب عامہ میں ہر قسم کے راویوں کا تذکرہ ہوتا ہے خواہ وہ صحابی ہوں یا تابعی، ثقہ ہوں یا ضعیف، کسی بھی جگہ کے رہنے والے ہوں اور کسی بھی طبقہ کے ہوں، البتہ کتب خاصہ میں کسی خاص قسم کے راویوں کا تذکرہ، ہوتا مثلاً صرف ثقہ کا تذکرہ، یا صرف ضعفاء کا تذکرہ، یا کسی خاص کتاب کے رایوں کا تذکرہ وغیرہ۔ کتب عامہ کی مشہور کتابوں میں امام بخاری کی تاریخ کبیر، ابن ابی حاتم رازی کی جرح وتعدیل ہے۔

کتب خاصہ کی کچھ اہم کتابیں یہ ہیں :

معرفت صحابہ کے لیے سب سے بہتر اور معروف کتاب "الإصابة في تمييز الصحابة" حافظ ابن حجر کی ہے، معرفت ضعفاء کے لیے سب سے بہتر کتاب "میزان الاعتدال" امام ذہبی کی ہے۔

معرفت ثقات کے لیے : "الثقات" حافظ ابن حبان کی ہے۔

کتب ستہ کے راویوں کی معرفت کے لیے : حافظ ابن حجر کی کتاب " تقريب التهذيب" اور "تهذيب التهذيب" ہے۔ کسی مخصوص شہر کے راویوں کی معرفت کے لیے اس شہر سے متعلق جو کتابیں ہوتی ہیں وہ ہیں مثلاً "تاريخ بغداد"، "تاريخ دمشق"۔

کنیت سے مشہور راویوں کی معرفت کے لیے : المقنى في سرد الكنى، امام ذہبی کی ہے، لیکن اس میں زیادہ تفصیل نہیں ہے۔

القاب سے مشہور راویوں کی معرفت کے لیے : فتح الوهاب فيمن اشتهر من المحدثين بالألقاب استادِ گرامی شیخ حماد محمد انصاری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔

انساب سے مشہور راویوں کی معرفت کے لیے : "الأنساب" امام سمعانی کی اور اس کی مختصر اللباب ابن اثیر کی ہے۔

مؤتلف ومختلف کے لیے الاكمال لابن ماكولا ہے۔ اسی طرح سے دیگر خصوصی صفت سے متصف راویوں کی معرفت کے لیے کتابیں ہیں۔

یہ وہ گراں قدر خدمات ہیں جن کو محدثین عظام رحمہ اللہ نے حدیث رسول کی حفاظت کے لیے پیش کیا ہے جس پر بظاہر اضافہ ممکن نہیں۔ اسلام کے سپوتوں کی یہ عظیم خدمات اگر نہ ہوتیں تو مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح اپنے دین کے تعلق سے اندھیروں میں بھٹکتے رہتے، آج ساری دنیا میں انہیں کے علوم پر لاکھوں ڈگریاں دی جاتی ہیں اور سب انہیں کے خوشہ چیں ہیں خواہ وہ اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں۔

۵ - علم معرفتِ وضع حدیث

جب بھی حدیث گھڑنے والوں نے احادیث رسول کے خلاف کوئی بھی کام کیا فوراً محدثین عظام کا محافظ دستہ حرکت میں آیا اور ہر طرح کے کذب ودجل کو تار تار کر دیا اور احادیث رسول کو ہر طرح کی ریشہ دوانیوں سے پاک کیا، اللہ تعالیٰ نے ان قدوسی نفوس کو اسی کام کے لیے دنیا میں وجود بخشا تھا، انہیں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو پورا کیا جو دین کی حفاظت کے لیے ﴿إنا نحن نزلنا الذكر وإناله لحافظون﴾ (حجر : ۹) میں کہا تھا ''کہ ہم نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے پاسباں ہیں۔

اگر ان کی یہ مخلصانہ کوشش نہ ہوتی تو یہ دین بھی سابقہ ادیان کی طرح خلط ملط ہو جاتا، یہ کوئی کہنے کی بات نہیں اس کا بدیہی ہونا ہر اس صاحب علم پر واضح ہے جس کو اسلامی تاریخ سے ذرا بھی واقفیت ہے، نقد حدیث کا ایسا اصول وضابطہ انہوں نے تیار کیا جس کی مثال نہیں ملتی، نقد علمی کے میدان میں ساری دنیا انہیں کی خوشہ چیں ہے، بڑے بڑے پروفیسروں اور اسلامک اسکالروں کی ڈگریاں انہیں کے دیے ہوئے علم کی مرہون منت ہیں یہ انہیں کے بنائے ہوئے اصول وضابطوں کو کانٹ چھانٹ کر کے اپنی طرف منسوب کر کے بڑی بڑی ڈگریاں اور تنخواہیں وصولتے ہیں اور اپنے ہم خیالوں کو یہ باور کرانے کی کوششیں کرتے ہیں کہ وہی حقیقت میں علم کے موجد، نقاد اور صاحب فکر وفن ہیں، مستشرقین کی جماعت یہی کچھ کر کے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتی ہے جب ان کی باتوں اور تحقیق کو نقد کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو وہی جماعت ہے جو کبھی ''کان یسرق الحدیث'' کے نام سے موسوم تھی، موجودہ دور کے نام نہاد مفکرین جو حدیث رسول پر نقد داخلی وخارجی کے نام پر طبع آزمائی کر رہے ہیں ان کی آوارگی عقل کا سلسلہ اسناد بھی انہیں سے ملتا ہے جو دوسروں کے علم کی چوری کر کے اپنی طرف

منسوب کر لیتے ہیں اور ﴿ ویحبون أن یحمدوا بما لم یفعلوا﴾ (آل عمران : ۱۸۸)
کا مصداق بنتے ہیں۔ یعنی وہ پسند کرتے ہیں کہ ناکردہ چیز پر ان کی تعریف کی جائے۔

وہ محدثین عظام جن کی زندگی کا مقصد حق اور بے باکی تھا، راست بازی جن کا شیوہ، تقویٰ و پاکیزگی جن کا مظہر، خدمت حدیث جن کا مقصد تھا انہوں نے اس طرح کے تمام بازیگروں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا، اور دین کی وہ حفاظت کی جس کی مثال تاریخ ادیان میں ناپید ہے۔

حالات وواقعات اس پر شاہد ہیں اہل عدل وانصاف کی شہادت اس کا بین ثبوت ہے۔

امام ابن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) سے جب کسی نے حدیث رسول میں افتراء پردازی کے بھیانک انجام کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا: گھبرانے کی کوئی بات نہیں "یعیش لها الجهابذة" (۱) اس کے لیے بڑے بڑے ماہرین فن موجود ہیں اور پھر انہوں نے قرآن کریم کی مذکورہ آیت کی تلاوت کی جس میں دین کی حفاظت کا ذکر ہے۔ گویا کہ یہ استدلال تھا کہ فن حدیث کے ماہرین کی تخلیق اسی لیے کی گئی ہے اور اس آیت کے وعدۂ تحفظ سے مراد محافظین کی یہی جماعت ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اس جماعت کی جانب اپنے عظیم خطبہ میں اشارہ کیا تھا "فلیبلغ الشاهد منکم الغائب، فرب مبلغ أوعى له من سامع" (۲) کہ موجودہ حضرات بعد میں آنے والوں تک میری بات پہنچا دیں اس لئے کہ بہت سے ایسے لوگ جن تک میری بات پہنچائی جائے گی وہ حاضرین سے زیادہ اچھی طرح اس کو یاد رکھیں گے اور اس کی حفاظت کریں گے۔

نیز آپ ﷺ نے اسی جماعت کے بارے میں فرمایا تھا کہ "یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تاویل الجاهلین وانتحال المبطلین" (۳)

---

(۱) الجرح والتعدیل (۱/ ۳)، الکفایۃ ص/ ۳۷، فتح المغیث (۱/ ۳۰۳) (۲) بخاری (۱۳۶۴)

(۳) البدر المنیر (۱/ ۲۱۵ مع حاشیہ) یہ روایت مختلف طرق سے وارد ہے، امام احمد نے صحیح اور دیگر بعض اہل علم نے حسن قرار دیا ہے۔

ہر گذر جانے والی جماعت کے بعد اس علم دین کو عادل حضرات حاصل کریں گے جو جاہلوں کی تاویل اور باطل پرستوں کے باطل دعووں کو ختم کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارت اسی جماعت محدثین نے پوری کی ہے، ہارون رشید کے سامنے جب ایک ملحد نے چار ہزار گھڑی ہوئی حدیثوں کے ذریعہ دین کو برباد کرنے کا دعوی کیا تو ہارون رشید نے بڑے اعتماد سے جواب دیا اور کہا "أين أنت يا عدو الله من عبدالله بن المبارك وأبي إسحاق الفزاري ينخلانها فيخرجانها حرفا حرفا" (۴) اے اللہ کے دشمن! تو کس چکر میں ہے عبداللہ بن مبارک اور ابواسحاق فزاری جیسے نامور علماء ومحدثین ان گھڑی ہوئی روایتوں کو چھان، چھان کر الگ کر رہے ہیں اور ہر ہر (باطل) کلمہ کو اس سے نکال رہے ہیں۔

ہارون رشید نے اگر چہ اپنے زمانہ کے نامور علماء میں سے صرف دو ہی کا نام لیا ہے لیکن اس طرح کے بے شمار نقاد وقت تھے جو اس کام میں ہر دور میں مصروف رہے، کوئی بھی زمانہ ایسا نہ تھا جو اس طرح کے ائمہ فن سے خالی رہا ہو۔

علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ جب لوگوں نے حدیث رسول سے کھیلنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے یکتاء زمانہ علماء ونقاد کو تیار کیا جنہوں نے غلط اور صحیح کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ کر دیا، اللہ تعالیٰ نے کسی بھی زمانے کو ایسے علماء سے خالی نہیں رکھا۔ (۵)

ابراہیم بن حسین فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں، اور امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ابو خیثمہ اور چند لوگ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک نوجوان آیا اور اس نے یحییٰ بن معین کی توجہ موضوع حدیثوں کی طرف دلائی۔ انھوں نے فرمایا کہ : "إن للعلم شبابا ينتقدون العلم" (٦) اس علم کے کچھ نوجوان ہیں جو اس کو پرکھ رہے ہیں۔

---

(۴) تہذیب التہذیب (۱/۱۵۲)، تنزیہ الشریعہ ۱/۱۶

(۵) الموضوعات الکبریٰ (۱/۳۱)، تنزیہ الشریعہ ص/۱۶ (٦) الکفایہ ص/۳٦

امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ جب تک ابو حامد شرقی (احمد بن محمد بن حسن نیساپوری) باحیات ہیں کسی کی ہمت نہیں کہ وہ حدیث رسول میں کذب بیانی کر سکے۔ (۷)

امام دارقطنی نے ایک مرتبہ بغداد کے جھوٹوں سے کہا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میری موجودگی میں حدیث رسول میں دروغ گوئی کر سکتے ہو۔ (۸) یعنی اگر کوئی گھڑنے کی کوشش کرے گا تو میں اس کی گرفت کروں گا۔

علامہ ابن جوزی نے ایک مرتبہ قصاصین کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ جب تک میں موجود ہوں تمہارے لیے کھوٹا سکہ رائج کرنا ممکن نہیں۔ (۹)

یہ بھی اللہ کی ایک مہربانی تھی کہ حدیث گھڑنے والوں کی گرفت فوراً ہو جایا کرتی تھی۔ سفیان کہتے ہیں کہ "ماستر اللہ عزوجل أحدا یکذب الحدیث" (۱۰) اللہ تعالیٰ نے کسی ایسے شخص کو مخفی نہیں رکھا جو حدیث رسول میں جھوٹ بولتا تھا۔

ابن مبارک فرماتے ہیں کہ : "لو ھم رجل فی السحر أن یکذب فی الحدیث لأصبح الناس یقولون فلان کذاب" (۱۱) اگر کوئی شخص سحر کے وقت حدیث میں جھوٹ بولنے کا ارادہ کرتا تو صبح ہوتے ہوتے وہ لوگوں میں مشہور ہو جاتا کہ فلاں جھوٹا ہے۔

علماء امت نے جس طرح ان جھوٹوں کی گرفت کی اور ان گڑھی ہوئی روایتوں کو معلوم کیا وہ اس بات پر غماز ہے کہ ان یکتائے زمانہ علماء نے اپنی تحقیق وجستجو سے ان تمام کی معرفت حاصل کر لی۔

یہ کس قدر واضح ثبوت ہے کہ گھڑنے والوں کا نام ونسب، قبیلہ، وطن، پتہ، گھڑنے کا مقصد، گھڑی ہوئی روایت سب کو معلوم کر کے ان کو کتابوں میں مقید کر دیا، اور قیامت تک کے لیے حق اور ناحق واضح کر دیا۔ پھر بھی اگر کسی کو نظر نہ آئے تو ان کو اپنی عقل وخرد پر رونا اور علم پر ماتم کرنا چاہیے۔

---

(۷) الموضوعات (۴۵/۱)

(۸) الموضوعات الکبریٰ (۴۵/۱-۴۶)، فتح المغیث (۳۰۳/۱)

(۹) الموضوعات (۴۵/۱) (۱۰) الموضوعات (۴۸/۱) (۱۱) الموضوعات (۴۹/۱)

حفاظت حدیث کے تعلق سے جو اصولی خدمات انہوں نے انجام دیا ہے وہ متنوع ہیں، جن میں سے بہت ساری خدمات کا ذکر ہو چکا ہے، یہاں صرف وضع حدیث سے متعلق جو خدمات انہوں نے انجام دی ہے اسی کا تذکرہ کرنا مقصد ہے جس سے ہر صاحب عقل وخرد یہ بات اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہے کہ ان ارباب علم ودانش نے جو کاوشیں کی ہیں ان تک پہنچنا ممکن نہیں چہ جائے کہ ان پر برتری اور تفوق کا دعوی کیا جائے۔

قواعد معرفت وضع :

گھڑی ہوئی حدیث کی معرفت بعض حالات میں آسان ہوتی ہے البتہ کچھ ایسے بھی حالات ہوتے ہیں جن میں ان کی معرفت بہت مشکل ہوتی ہے، راوی ومروی کے حالات اور دیگر قرائن سے اس کا پتہ لگایا جاتا ہے، اسی لیے محدثین کرام نے گڑھی ہوئی حدیث کی معرفت کے لیے کچھ اصول وضابطے بنائے ہیں، جن میں سے بعض کا تعلق سند سے ہے اور زیادہ تر کا تعلق متن سے ہے :

علامات سند

اقرار : سند کے ذریعہ گھڑی ہوئی حدیثوں کی معرفت کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خود گھڑنے والے نے اس کا اعتراف کیا ہو اور یہ بتا دیا ہو کہ میں نے حدیث گڑھی ہے، جیسا کہ بعض کذابین سے منقول ہے، جب ان میں سے بعض کو اپنے اس عمل پر ندامت ہوئی اور اللہ کا خوف ہوا تو انہوں نے گھڑنے کا اعتراف کیا جیسا کہ نصر بن طریف ابو جزی قصاب نے کیا تھا، جب بیماری کے عالم میں اس کو زندگی سے مایوسی کا احساس ہوا تو کہا کہ ”كذبت في أحاديث واستغفر الله“ لوگوں نے کہا کہ اچھا ہوا کہ آپ نے توبہ کر لی، لیکن پھر صحت یاب ہوا تو ان حدیثوں کو پھر سے بیان کرنے لگا۔ (۱۲) ابو شیبہ فرماتے ہیں کہ میں خانۂ کعبہ کا طواف کر رہا تھا

---

(۱۲) الموضوعات (۱/۴۹)، میزان الاعتدال (۴/۲۵۱)

ایک شخص میرے آگے تھا اور اس طرح دعا کر رہا تھا ''اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف فرما دے ویسے مجھ کو امید نہیں کہ تو ایسا کرے گا'' میں نے اس سے کہا کہ تمہاری مایوسی تمہارے گناہوں سے زیادہ بڑی معلوم ہوتی ہے؟ اس نے کہا کہ آپ اپنا کام کیجیے، میں نے کہا کہ آپ مجھ کو ضرور بتائیے کہ کیا بات ہے، آپ اتنے مایوس کیوں ہیں؟ اس نے کہا : میں نے رسول اللہ ﷺ کے نام سے پچاس حدیثیں گھڑی ہیں جو لوگوں میں منتشر ہیں، میں ان میں سے کسی کو واپس کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ (۱۳)

کچھ لوگوں نے پوچھے جانے پر اس کا اعتراف کیا کہ انہوں نے خود گھڑا ہے جیسا کہ ابوعصمہ نوح بن ابی مریم اور میسرہ بن عبدربہ نے ''فضائل قرآن'' سے متعلق احادیث گھڑنے کا اعتراف کیا ہے، ایسے ہی عمر بن صبیح بن عمران تیمی نے رسول ﷺ کا خطبہ گھڑنے کا اعتراف کیا۔

کبھی گرفتار ہونے اور سزائیں دیے جانے کے بعد انہوں نے اس کا اعتراف کیا جیسے عبدالکریم بن ابی العوجاء نے قتل ہونے سے پہلے چار ہزار حدیثوں کے گھڑنے کا اعتراف کیا۔ (۱۴)

اس طرح کے اقرار کو محدثین نے معرفت وضع کے لیے سب سے قوی دلیل قرار دیا ہے، سوائے ابن دقیق العید کے، ان کا کہنا ہے "وھذا کاف فی ردہ ولکنہ لیس بقاطع فی کونہ موضوعاً لجواز أن یکذب فی ھذا الاقرار بعینہ" (۱۵) اس حدیث کے مردود ہونے کے لیے یہ تو کافی ضرور ہے لیکن قطعی طور سے موضوع کہنے کے لیے کافی نہیں اس لیے کہ ممکن ہے کہ وہ اپنے اس اقرار میں بھی جھوٹ بول رہا ہو۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''حکم ظن پر غالب ہوتا ہے اور وہ یہاں موجود ہے''، جس طرح قاتل وزانی کا اعتراف قابل قبول ہے، اسی طرح اس کا بھی اقرار قابل قبول ہے۔ (۱۶)

---

(۱۳) الموضوعات (۱/۴۹) (۱۴) میزان الاعتدال (۲/۶۴۴)
(۱۵) الاقتراح فی بیان الاصطلاح ص/۲۳۴ (۱۶) فتح المغیث (۱/۳۱۷)

بعض لوگوں مثلاً ابن جزری وغیرہ نے ابن دقیق العید کے کلام سے یہ سمجھا ہے کہ اس کا اعتبار ہی نہیں، حالاں کہ ایسی بات نہیں، انہوں نے صرف قطعیت کی نفی کی ہے، اس کی نفی سے حکم کی نفی لازم نہیں آتی، اس لیے کہ حکم ظن غالب پر ہوتا ہے، ممکنات کا دروازہ کھولنے سے صرف وسوسہ پیدا ہوتا ہے۔ (۱۷)

اقرار کے قائم مقام :

کبھی ایسے حالات اور ایسے قرینے ہوتے ہیں جن سے واضح طور پر راوی کا جھوٹ بولنا ثابت ہو جاتا ہے اگر چہ وہ صراحت سے اس کا اقرار نہیں کرتا لیکن جھوٹ پر صریح دلیل ہونے کی وجہ سے اس کو اقرار کے قائم مقام قرار دیا جاتا ہے، جن قرائن و دلائل سے راوی کا جھوٹ واضح ہوتا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں :

تاریخ کے موافق نہ ہونا :

راوی کسی ایسے شخص سے سماع کا دعویٰ کرے جس سے حقیقت میں اس کی ملاقات نہ ہوئی ہو۔

خواہ اس وجہ سے نہ ہوئی ہو کہ اس کی ولادت اس شیخ کی وفات کے بعد ہوئی ہو۔

یا اس شہر میں یہ کبھی گیا ہی نہیں جہاں شیخ نے درس دیا ہو۔

یا جس شہر میں ملاقات کا دعویٰ کیا ہو اس شہر کا وجود ہی نہ ہو۔

جیسے اسحٰق بن بشر ابو حذیفہ بخاری نے ابن طاؤس سے سماع کا دعویٰ کیا جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ کس سن میں آپ نے ان سے ملاقات کی؟ تو انہوں نے جو سن بتایا اس سے دو سال پہلے ہی وہ وفات پا چکے تھے۔ (۱۸)

اسی طرح محمود بن احمد ہروی نے ہشام بن عمار سے ملاقات کا دعویٰ کیا، ابن حبان نے ان سے سوال کیا کہ آپ شام کس سن میں گئے؟ انہوں نے کہا : ۲۵۰ھ میں، علامہ ابن حبان نے فرمایا ان کی تو وفات ۲۴۵ھ ہی میں ہوگئی تھی، پھر ان سے روایت کیسے کی؟ جب وہ پھنس گیا تو

(۱۷) فتح المغیث (۳۱۷/۱) (۱۸) الوضع فی الحدیث (۲۸۸/۱)

کہا : ممکن ہے وہ کوئی دوسرے ہوں؟ (۱۹)

ایسے ہی سہل بن ذکوان نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع کا دعویٰ کیا تو اس سے یہ پوچھا گیا کہ ان سے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی؟ اس نے کہا: واسط میں، امام ذہبی کہتے ہیں کہ: اس طرح سے جھوٹ کا پتہ چلتا ہے اس لیے کہ واسط شہر کے آباد ہونے سے پہلے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو چکا تھا، اسے تو حجاج نے آباد کرایا ہے۔'' (۲۰)

اسی طرح عمر بن موسیٰ نے خالد بن معدان سے ملاقات کا دعویٰ کیا، جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ ان سے کب ملاقات کی؟ تو کہا : ۱۰۸ھ میں، جب یہ سوال کیا گیا کہ کہاں ملاقات کی؟ تو کہا کہ غزوۂ ارمینیہ میں، حالاں کہ ان کی وفات ۱۰۴ھ میں ہی ہوگئی تھی اور یہ کبھی غزوۂ ارمینیہ میں شریک نہیں ہوئے، یہ تو روم کی طرف غزوے میں تھے۔ (۲۱)

احمد بن عبداللہ جو یباری کی مجلس میں اس مسئلے پر اختلاف ہوگیا کہ حسن بصری نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ نہیں؟ چنانچہ اس نے ایک مرفوع روایت گھڑ دی کہ رسول ﷺ نے کہا ہے کہ حسن بصری نے ابوہریرہ سے سنا ہے، تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا ممکن نہیں کیوں کہ حسن بصری اور رسول ﷺ کے زمانے میں کافی فاصلہ ہے۔ (۲۲)

یہی وجہ ہے کہ محدثین کے یہاں علم تاریخ کی معرفتِ رجال کے لیے بڑی اہمیت ہے، ان کی وفات و پیدائش، مقام سفر، وقت سفر اور مختلف شہروں میں قیام کی مدت وغیرہ کی معرفت ایک محدث کے لیے انتہائی ضروری ہوتی ہے، اس سے کذابین کی گرفت بڑی آسانی سے ہو جاتی تھی۔

حسان بن زید کہتے ہیں کہ ''تاریخ سے جھوٹوں کو پکڑنے میں جتنی مدد ملتی ہے اتنی کسی سے نہیں ملتی۔'' (۲۳)

---

(۱۹) المجروحین (۳/۴۵) (۲۰) میزان الاعتدال (۲/۲۴۳)

(۲۱) الکفایۃ ص ۱۱۹ (۲۲) النکت (۲/۸۴۲)

(۲۳) السنۃ قبل التدوین ص / ۲۴۰

سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ ''جب راویوں نے جھوٹ کا استعمال کیا تو ہم نے ان کے لیے تاریخ کا استعمال کیا۔'' (۲۴)

حفص بن غیاث کہتے ہیں کہ ''جب تم کسی شیخ کو متہم تصور کرو تو اس کا محاسبہ تاریخ کے ذریعہ کرو۔'' (۲۵)

ضعیف راوی کی روایت سے شیخ کا انکار کرنا :

اگر کوئی راوی کسی شیخ سے کوئی روایت بیان کرے، جب شیخ سے اس کی روایت کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ قطعی طور سے صراحت کے ساتھ بلا تامل اس کا انکار کر دے، اگر یہ شاگرد متکلم فیہ اور ضعیف ہو تو یہ ایک قرینہ ہے کہ راوی جھوٹ بول رہا ہے، جیسے حسن بن عمارہ نے حکم عن یحیی کے واسطے سے کچھ روایتیں بیان کیں، جب حکم سے ان روایتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے قطعی طور سے ان کا انکار کر دیا، چنانچہ امام شعبہ کہتے ہیں کہ ''حسن بن عمارہ نے حکم کے واسطے سے کچھ حدیثیں سنائیں، ہم نے حَکَم سے ان کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے ان میں سے کوئی بھی حدیث نہیں سنی ہے۔'' (۲۶)

لیکن راوی اگر ثقہ ہے اور شیخ اس کا تذبذب کے ساتھ انکار کر رہا ہے تو یہ ''مَن حدّث ونسی'' میں شمار ہوگا، گویا کہ شیخ نے روایت تو کی ہے لیکن روایت کے بعد ان کو یاد نہ رہا، اس صورت میں دونوں میں سے کسی کو مطعون نہیں کیا جائے گا اور روایت قابل قبول ہوگی اور اگر جزم کے ساتھ انکار کرے لیکن راوی ثقہ ہے تو بھی روایت قابل قبول نہ ہوگی۔ (۲۷)

بدعتی راوی کا بدعت کے موافق روایت کرنا :

راوی اگر بدعتی ہے اور وہ بدعت کو تقویت دینے والی روایتیں بیان کرتا ہے تو یہ بھی اس

---

(۲۴) الکفایۃ ص/۱۱۹، مقدمۃ ابن الصلاح ص/۳۴۳-۳۴۴

(۲۵) الکفایۃ ص/۱۱۹، مقدمہ ص/۳۴۴ (۲۶) میزان (۱/۵۱۴)، الوضع فی الحدیث (۱/۲۹۲)

(۲۷) شرح قصب السکر ص/۱۱۸ (شیخ عبدالکریم مراد)

روایت کے موضوع ہونے پر ایک دلیل اور قرینہ ہے، امام سیوطی فرماتے ہیں کہ ''قرائن وضع میں سے یہ بھی ہے کہ راوی رافضی ہو اور جو روایت بیان کر رہا ہے اس میں صحابہ پر طعن ہو یا راوی ناصبی ہو اور روایت اہل بیت پر طعن و تشنیع سے متعلق ہو، وعلیٰ ہذا القیاس، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ روایت گھڑی ہوئی ہے۔'' (۲۸)

روایت کی کوئی سند نہ ہونا :

کوئی ایسی روایت جو کتابوں میں مذکور تو ہو لیکن کہیں اس کی کوئی سند نہ ہو تو وہ روایت بھی موضوع شمار کی جائے گی، اس لیے کہ سند ایک بنیادی شئی ہے، اس کا عدم وجود حدیث کی عدم صحت پر دلالت کرتا ہے، بنا بریں علماء نے سند کو مؤمن کا ہتھیار قرار دیا ہے اور بعض نے اس کو دین کہا ہے، جیسا کہ علم اسناد کے موضوع میں گذر چکا۔

لیکن یہاں یہ ضروری ہے کہ سند کے عدم وجود کا حکم لگانا مکمل جستجو کے بغیر درست نہیں، یہ کام وہی کر سکتا ہے جو کتب حدیث اور اسناد کی معرفت رکھتا ہو، اسی وجہ سے اس طرح کی روایتوں پر اہل علم کا حکم بہت کم ملتا ہے، مثلاً یہ قول ''كنت كنزاً مخفياً لا أُعرف فأحببت أن أُعرف فخلقت خلقاً وتعرفت إليهم فعرفوني'' (۲۹) علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن حجر اور زرکشی فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

اس روایت کا متقدمین کی کتابوں میں نہ ہونا :

یہی حال اس روایت کا بھی ہے جو سابقہ کتب حدیث میں نہ پائی جائے، متاخرین کی کتابوں میں اس کا ذکر پایا جائے تو یہ علامت ہے کہ مذکورہ روایت موضوع ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ ''ایک قوم ایسی آئے گی جو اس طرح کی حدیث بیان کرے گی جس کو نہ تم نے سنا ہوگا نہ تمہارے باپ دادا نے سنا ہوگا۔'' (۳۰)

---

(۲۸) تدریب الراوی ۱/۲۷۲، تنزیہ الشریعہ ص/۸، الحطۃ ص/۱۱۵

(۲۹) الوضع فی الحدیث (۱/۳۰۳ - ۳۰۵) (۳۰) مقدمہ مسلم (۱/۷۸)

امام رازی کہتے ہیں کہ "إن الخبر إذا روی فی زمن قد استقرت فیه الأخبار فإذا فتش عنه لم یوجد فی بطون الإسناد ولا فی صدر الرجال عُلم بطلانه" (۳۱) اگر روایت اس دور میں بیان کی جاتی ہے جس میں حدیثوں کے جمع کا کام مکمل ہوگیا، اب اس کو ان میں تلاش کیا جائے وہ نہ ملے تو سمجھو کہ وہ باطل ہے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو دواوین سنت میں نہ ہو تو وہ مردود ہوگی خواہ بیان کرنے والا کتنا ہی بڑا متقی کیوں نہ ہو۔ (۳۲)

اسی وجہ سے علامہ ابن جوزیؒ نے یہ کہا ہے کہ "إذا رأیت الحدیث یباین المعقول أو یخالف المنقول أو یناقض الاصول فاعلم أنه موضوع" قال "ومعنی یناقض الأصول أن یکون خارجاً عن دواوین الاسلام من المسانید والکتب المشهورة" (۳۳)

جب کسی حدیث کو دیکھو کہ وہ عقل یا نقل کے خلاف ہو یا اصول کے مخالف ہو تو سمجھ لو کہ وہ موضوع ہے، اصول کے مخالف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں موجود نہ ہو۔

امام علائی کہتے ہیں کہ ''عدم وجود کا اعتبار اس وقت کیا جائے گا جب تلاش و تفتیش کا کام ایسے حفاظ کریں جو تمام یا اکثر حدیثوں کو جانتے ہیں۔'' (۳۴)

راوی کا جھوٹا ہونا :

بعض راوی ایسے ہوتے ہیں جو جھوٹ بولنے میں مشہور ہوتے ہیں، حتی کہ حدیث رسول میں بھی جھوٹ بولتے ہیں، اہل علم نے اس طرح کے راویوں کی نشان دہی کی ہے اور ان کے اس عمل کو ان کی روایت پر موضوع ہونے کے لیے دلیل بنایا ہے، علامہ ابن عراق کنانی فرماتے ہیں

---

(۳۱) النکت ۲/ ۸۴۷، وتوضیح الافکار (۲/ ۹۷)

(۳۲) الوضع فی الحدیث (۱/ ۳۰۶)

(۳۳) الموضوعات الکبری (۱/ ۱۰۶) تدریب الراوی (۱/ ۲۷۷)

(۳۴) توضیح الافکار (۲/ ۹۷)

کہ "ومنها اَن يصرح بتكذيب راويه جمع كثير يمتنع في العادة تواطئهم على الكذب اَو تقليد بعضهم بعضاً" (۳۵) انہی قرائن میں سے یہ بھی ہے کہ اس روایت کے راوی کے جھوٹا ہونے کی ایک جماعت نے تصریح کی ہو جن کا جھوٹ پر اتفاق یا ایک دوسرے کی تقلید ممکن نہ ہو۔

اس طرح کے راویوں کی تحدید اہل علم نے کردی ہے اور ان کا ذکر کتب موضوعات میں تفصیل سے کردیا ہے، جن کی اچھی خاصی تعداد ہے، ان میں سے بعض کا ذکر ''کذابین کی نشان دہی'' عنوان کے تحت آئے گا۔ (ص ر ۳۱۸)

جہاں بھی اس طرح کے راویوں کے واسطے سے کوئی روایت منقول ہوئی، خود بخود اس پر وضع کا نشان لگ جاتا ہے کیوں کہ ان کا کارکردگی نے ان کو بے اعتبار بنادیا ہے، اس میں دونوں قسم کے راوی شریک ہیں خواہ وہ حدیث رسول میں جھوٹ بولتے ہوں یا عام گفتگو میں جھوٹ بولنے کی عادت ہو، پہلے کی روایت کو موضوع اور دوسرے کی روایت کو متروک کہا جاتا ہے۔

غیر معتبر راوی کا ثقات کی مخالفت کرنا :

کوئی غیر معتبر راوی اپنے استاذ سے ایسی روایت بیان کرے جو اس کے دیگر قابل اعتبار تلامذہ نہیں کرتے ہیں تو اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ اس راوی کے کذب بیانی کا نتیجہ ہے۔

یا اپنے استاذ کی کتاب سے روایت پڑھے تو اس میں کچھ اضافہ کردے، جب کتاب سے ملایا جائے تو اس میں نہ ملے، اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس راوی نے کذب بیانی سے کام لیا ہے، جیسے حسن بن علی بن صالح عدوی نے لیث بن سعد کے واسطے سے یہ روایت نقل کی "ما أحسن الله خلق رجل وخُلقه فأطعمه النار" ابن عدی فرماتے ہیں کہ ''یہ حدیث باطل ہے، ہمارے پاس لیث بن سعد کا نسخہ ہے، اس میں یہ روایت نہیں ہے۔'' (۳۶)

---

(۳۵) تنزیہ الشریعۃ (۶/۱)، نیز دیکھیے النکت (۸۴۶/۲)، توضیح الافکار (۹۶/۲)

(۳۶) الکامل (۷۵۱/۲)

یا اپنے استاذ سے جو نسخہ روایت کر رہا ہے دیگر ساتھی بھی اس میں شریک ہیں لیکن یہ بعض روایتوں میں منفرد ہو جاتا ہے جو ان راویوں کے پاس نہیں، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس راوی نے نسخہ میں کچھ اپنی طرف سے ملا دیا ہے جیسے خالد بن عمرو قرشی نے بہت سی روایتیں اس نسخہ میں بڑھا دی تھیں جس کو انہوں نے لیث بن سعد عن یزید بن حبیب کے واسطے سے روایت کیا تھا۔ (۳۷)

ثقات سے منقول نہ ہونا :

ایسے ہی اگر کوئی راوی جو جھوٹا ہو اپنے استاذ سے ایسی روایت بیان کرے جو اس کے ثقہ شاگردوں کے پاس موجود نہ ہو تو اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس نے یہ روایت گھڑ لی ہے۔ (۳۸)

راوی کے دیگر حالات :

کبھی راوی کے نفسیات، جذبات اور اس طرح دیگر حالات سے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ اس نے حدیث گھڑنے کا کام کیا ہے خواہ اس کا جذبہ انتقامی رہا ہو یا کوئی ذاتی منفعت مخفی ہو، جیسے کہ سعد بن طریف کا واقعہ ہے، جب ان کے پاس ان کا بیٹا مدرس کے پاس سے روتا ہوا آیا انہوں نے بچے سے رونے کا سبب دریافت کیا؟ اس نے جواب دیا کہ معلم نے مارا ہے، سعد نے کہا : ابھی میں ان کی خبر لیتا ہوں ان لوگوں کو رسوا کر کے چھوڑوں گا، چناں چہ اس نے عکرمہ عن ابن عباس کے واسطے سے حدیث گھڑ دی "معلموا صبیانکم شرارکم" بچوں کو پڑھانے والے بہت شریر ہوتے ہیں۔

اسی طرح سے محمد بن حجاج نخعی نے "الھریسة تشد الظھر" والی روایت گھڑ لی تھی اس لیے کہ وہ اس کو بیچتا تھا۔ یعنی کوفتہ پیٹھ کو مضبوط کرتا ہے۔

اسی طرح غیاث بن میمون کی گھڑی ہوئی روایت کی گرفت ہوئی تھی۔ (۳۹)

---

(۳۷) الوضع فی الحدیث (۱/ ۲۹۴-۲۹۶) (۳۸) فتنۂ انکار حدیث (۳/ ۴۰۰)

(۳۹) الحطۃ ص/ ۱۱۶، السنۃ ومکانتہا ص/ ۹۸، تدریب الراوی (۱/ ۲۷۷)

علامات متن

گھڑی ہوئی حدیث کی معرفت کے لیے محدثین نے جس طرح سند پر نقد کیا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کے متن پر نقد کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ متن سے متعلق وضع حدیث کے قرائن سند کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔

علامہ ابن دقیق فرماتے ہیں کہ "كثيراً ما يحكمون بذلك باعتبار يرجع إلى المروى وألفاظ الحديث" (۴۰) محدثین کرام وضع حدیث کا فیصلہ مروی اور الفاظ حدیث کی بنیاد پر زیادہ کرتے ہیں۔ نیز فرماتے ہیں کہ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث رسول کے ساتھ لگے رہنے سے ایسا ملکہ اور مزاج بن جاتا ہے جس سے رسول اور غیر رسول کے الفاظ میں فرق محسوس ہو جاتا ہے۔'' (۴۱)

لہٰذا جب حدیث موضوع ہوتی ہے تو اس کے سنتے ہی دل میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ تو رسول ﷺ کی سیرت کے خلاف ہے، جس کی بنیاد پر تفتیش شروع ہو جاتی ہے اور بالآخر موضوع ہونے کا پتہ چل جاتا ہے۔

علامہ بلقینی فرماتے ہیں کہ ''اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی کی ایک زمانہ تک خدمت کرے، اس کے ساتھ رہے تو وہ اس کی پسند اور ناپسند کو اچھی طرح جانتا ہے پھر اگر کوئی دوسرا شخص اس کے برعکس پسند ناپسند کی اطلاع دے تو ذہن خود بخود اس کی تکذیب کرتا ہے۔'' (۴۲)

ابن خثیم فرماتے ہیں کہ "إن للحديث ضوءاً كضوء النهار وظلمة كظلمة الليل" (۴۳)

---

(۴۰) فتح المغیث (۱/۳۱۵) (۴۱) النکت علی ابن الصلاح (۲/۸۴۳)

(۴۲) تدریب الراوی (۱/۲۷۶)

(۴۳) الموضوعات الکبری (۱/۱۰۳) تدریب الراوی (۱/۲۷۵)

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ "والأحادیث الموضوعة علیها ظلمة ورکاکة ومجازفات باردة تنادی علیٰ وضعها واختلاقها" (۴۴)

موضوع حدیثوں میں ایسی ظلمت وتاریکی، رکاکت اور مبالغہ آرائی ہوتی ہے جو اس کے موضوع اور گھڑی ہوئی ہونے کا اعلان کرتی ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ ''مروی کے قرائن راوی کے قرائن سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں''۔ نیز علامہ ابن الصلاح کے قول "قد یفهمون الوضع من قرینة حال الراوی أو المروی" (۴۵) پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ "هذا الثانی هو الغالب وأما الأول فنادر" یہ جو دوسرا امر ہے وہی عمومی ہے اور پہلا نادر ہے۔

ایک شخص نے کسی محدث سے یہ پوچھا کہ آپ کیسے سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں کذاب ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ''اگر کوئی یہ کہے کہ کدو کو بغیر ذبح کیے ہوئے نہ کھاؤ تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ شخص جھوٹا ہے۔'' (۴۶) کیوں کہ یہ سیرت رسول ﷺ سے میل نہیں کھاتا۔

بہرحال متن کے پرکھنے کے جو اصول ہیں محدثین نے ان کو بھرپور طریقہ سے استعمال کیا ہے اور اس کے قواعد کو منضبط کیا ہے، ان میں سے کچھ عام قواعد ہیں اور کچھ خاص خاص موضوع سے متعلق ہیں۔

علامہ ابن قیم سے کسی نے سوال کیا کہ ''سند کے دیکھے بغیر وضع پہچاننے کا کوئی خاص ضابطہ ہے؟ تو انہوں نے اس کے جواب میں ایک جامع کتاب تصنیف کر دی جو موضوع حدیث کی معرفت اور پہچان کے لیے انتہائی اہم ضوابط کا مجموعہ ہے، جس کا نام "المنار المنیف فی الصحیح والضعیف" ہے، دیگر اہل علم نے بھی ان ضروری اصولوں کو کتب مصطلح اور کتب موضوعات میں بیان کیا ہے، ان میں سے کچھ اہم اصول یہ ہیں :

---

(۴۴) المنار المنیف ص/۵۰ (۴۵) النکت (۲/۸۴۳) (۴۶) مصدر سابق

قرآن کریم کی صریح مخالفت :

وہ حدیث جس میں کلام اللہ کی صریح مخالفت پائی جائے ،جس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہ ہوتو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ حدیث گھڑی ہوئی ہے کیوں کہ حدیث رسول اللہ ﷺ کبھی بھی قرآن کے احکام کے مخالف نہیں ہوسکتی، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں اللہ کی طرف سے منزّل ہیں، جیسا کہ ابتداء میں تنزیلی حیثیت کے عنوان کے تحت یہ بات گذر چکی، لہٰذا یہ آپس میں متعارض نہیں ہو سکتے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ ''ان امور کلّیہ میں سے جن سے موضوع حدیث کو پہچانا جاتا ہے اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "مخالفة الحديث لصريح القرآن" ''حدیث صریح قرآن کے مخالف ہو'' مثلاً یہ موضوع حدیث کہ ''دنیا کی مقدار سات ہزار سال ہے اور ہم لوگ ساتویں ہزار میں ہیں۔'' یہ بالکل جھوٹ ہے کیوں کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو ہر ایک کو قیامت کی تاریخ کا علم ہوتا جب کہ قرآن قیامت کے بارے میں کہتا ہے کہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (لقمان : ۳۴) یقیناً قیامت کا علم۔یعنی کب قائم ہوگی۔اللہ ہی کے پاس ہے۔

لہٰذا مذکورہ حدیث اس آیت کے بالکل منافی ہے جس کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔(۴۷)

صحیح سنت رسول ﷺ کے مخالف ہونا :

جس طرح سے کتاب اللہ میں آپس میں کوئی تعارض وٹکراؤ نہیں ہے اسی طرح سے سنت رسول اللہ ﷺ میں بھی کوئی تعارض وٹکراؤ نہیں، لہٰذا اگر کوئی حدیث کسی صحیح حدیث سے متعارض ہے جس میں توفیق، نسخ یا ترجیح کی گنجائش نہ ہو جس کے ذریعہ سے ان حدیثوں سے تعارض کا خاتمہ کیا جاتا ہے جو بظاہر سامع اور قاری کو متعارض نظر آتی ہیں۔

تو یہ اس کے موضوع ہونے پر غماز ہے۔ یہ وہ تعارض ہے جس کو تعارض ظاہری کہا جاتا ہے یعنی دیکھنے میں تو متعارض ہے لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں اس لیے کہ تعارض کے شرائط اس

---

(۴۷) المنار المنیف ص/۸۰

میں پائے نہیں جاتے اور ان دونوں کا اپنا خاص معنی ومفہوم ہوتا ہے یا ان میں کوئی متقدم ہوتا ہے اور کوئی متاخر، متاخر کے ذریعہ سے متقدم کے حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے یا ایک کو دوسرے پر ترجیحی اصولوں کی بنیاد پر راجح قرار دیا جاتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ کے رسول ﷺ سے ایسی دو صحیح حدیثیں منقول نہیں جن میں ایسا تعارض ہو کہ عام خاص، مجمل مفسّر اور نسخ کا امکان نہ ہو۔'' (۴۸)

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''مجھ کو ایسی دو صحیح حدیثیں نہیں معلوم جن میں تضاد (حقیقی) ہو، اگر کسی کو معلوم ہو تو مجھ کو بتائے میں تطبیق کی صورت بتاتا ہوں۔'' (۴۹)

صاحب ''مسلّم الثبوت'' فرماتے ہیں کہ ''تعارض حقیقی ناممکن ہے اس لیے کہ اس سے تناقض اور عبث لازم آتا ہے جس سے شارع منزہ ہے، تعارض جہالت کی وجہ سے معلوم پڑتا ہے۔'' (۵۰)

لہٰذا اگر کوئی ایسی روایت بیان کرتا ہے جو صحیح روایت کے خلاف ہے جس میں کوئی صورت تطبیق کی نہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ رسول کا قول نہیں۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ ''وہ تمام روایتیں جن میں محمد یا احمد نام سے موسوم ہونے پر جہنم سے نجات کی بشارت ہے وہ سب ان تمام صحیح روایتوں کے مخالف ہیں جن میں نجات کے لیے ایمان اور عمل صالح کو مدار قرار دیا گیا ہے۔'' (۵۱)

نیز شریعت کے مزاج کے یہ بالکل منافی ہے کہ نجات نام ونسب کی بنیاد پر ہوتی ہے، نجات کی بنیاد تقوی پر ہے ﴿إن أكرمكم عند الله أتقاكم﴾ (حجرات : ۱۳) نیز اللہ کے رسول کا فرمان ہے کہ ''من بطّأ به عمله لم يُسرع به نسبُه'' (۵۲) جس کا عمل صاحب عمل کو مؤخر کر دیتا ہے تو اس کا حسب نسب اس کو آگے نہیں کر سکتا۔

---

(۴۸) الرسالۃ ص/ ۲۱۷-۲۱۶، نیز دیکھیے ارشاد الفحول ص/ ۲۷۵

(۴۹) مسلم الثبوت (۲/ ۱۸۹) نیز دیکھیے أصول التوفیق بین الأحادیث المتعارضۃ، فصل التعارض

(۵۰) الکفایۃ فی علم الروایۃ ص/ ۴۳۲-۴۳۳ (۵۱) المنار المنیف ص/ ۵۷ (۵۲) مسلم (۲۶۹۹)

عقل صریح کے مخالف ہونا :

جو حدیث عقل صحیح وسلیم کے بالکل مخالف ہو جس کو معمولی عقل والا شخص بھی خلاف عقل تصور کرے، اس میں کسی تاویل اور تطبیق کی گنجائش نہ ہو تو اہل اصول کے یہاں یہ اس کے موضوع ہونے پر دلیل ہے، اس لیے کہ شریعت خلاف عقل نہیں ہوتی۔ (۵۳)

مثلاً یہ روایت کہ "إن الله عز و جل خلق الفرس فأجراها فعرقت ثم خلق نفسه منها" (۵۴) اللہ تعالیٰ نے پہلے گھوڑا پیدا کیا پھر اس کو دوڑایا، اس سے پسینہ نکلا، اس پسینے سے اپنے آپ کو وجود بخشا۔ یہ روایت اس قدر بیہودگی پر مشتمل ہے جس کو کوئی بھی عقل قبول نہیں کر سکتی، تخلیق کا یہ ماجرا یا طریقہ عقل میں بالکل نہیں سما سکتا اس لیے کہ جس کا وجود ہی نہ ہو وہ کیسے کسی کو وجود دے سکتا ہے، یہاں تو خالق اور مخلوق کی معرفت ہی مفقود ہے، لہٰذا یہ اس کے بطلان کی دلیل ہے۔ ممکن ہے اس کو کسی حلولی مزاج رکھنے والے نے گھڑا ہو۔

مشاہدے کے خلاف ہونا :

یعنی اگر کوئی روایت اس طرح سے بیان کی جائے جس کے مفہوم کے وجود کا امکان نہ ہو، تجربات ومشاہدات بتاتے ہوں کہ ایسا نہیں ہوتا ہے، علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں جیسے '' عوج بن عنق'' سے متعلق واقعات، جن میں اس کی لمبائی تین ہزار تین سو تیس گز اور ایک تہائی گز بتائی گئی ہے اور یہ کہ طوفان نوح اس کے ٹخنے تک بھی نہیں پہنچا تھا، تو یہ مشاہدے اور تجربے کے بالکل خلاف ہے بلکہ یہ صحیح حدیث کے بھی مخالف ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ '' اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ساٹھ گز کا بنایا، پھر برابر انسانوں کی تخلیق گھٹتی گئی یہاں تک کہ موجودہ صورت حال آ پہنچی۔'' (۵۵)

---

(۵۳) النکت (۸۴۵/۲) (۵۴) الوضع فی الحدیث (۳۰۲/۱)

(۵۵) بخاری (۶۲۲۷)، نیز دیکھیے المنار المنیف ص/۷۷

انبیاء ورسُل کے شایانِ شان نہ ہونا :

جس روایت میں اتنی گھٹیا اور گری ہوئی باتیں ہوں کہ جن کو کوئی نبی نہیں کہہ سکتا تو سید الانبیاء ورسل ایسی گھٹیا بات کیسے کہہ سکتے ہیں جن کا کلام وحی الٰہی ہوتا ہے، مثلاً یہ قول کہ "النظر إلى الوجه الحسن يجلو البصر" (خوب صورت چہروں کو دیکھنے سے نگاہ تیز ہوتی ہے) یہ تو کسی آوارہ مزاج کی بات ہوسکتی ہے، شریف انسان بھی اس طرح کی بات نہیں کرتا، نبی ورسول تو اخلاق کی بلندیوں پر ہوتے ہیں۔

اور مثلاً یہ حدیث "النظر إلى الوجه الجميل عبادة" (۵۶) حسین چہروں کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔

لفظی ومعنوی کمزوری ہونا :

جس کلام میں فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے کمزوری پائی جائے تو وہ حدیث رسول نہیں ہوسکتا کیوں کہ اللہ کے رسول ﷺ افصح العرب تھے، آپ کو جوامع الکلم سے نوازا گیا تھا، لہٰذا آپ کے کلام میں فصاحت وبلاغت کی کمزوری نہیں ہوسکتی، یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے جب راوی نے روایت باللفظ کی ہو لیکن اگر کہیں راوی نے روایت بالمعنی کی ہے تو فصاحت وبلاغت کی کمزوری ممکن ہے، اسی لیے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ : ''رکاکت لفظ کے ساتھ ساتھ معنی کی کمزوری بھی ہونی چاہیے، مجرد فصاحت وبلاغت کی کمزوری وضع پر دلالت نہیں کرتی، یہ اس صورت میں ممکن ہے جب راوی یہ دعویٰ کرے کہ مذکورہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے کلمات ہیں، لہٰذا وضع کا حکم لگانے کے لیے لفظ اور معنی دونوں میں رکاکت ضروری ہے۔'' علامہ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ ''رکاکت لفظ سے لفظ ومعنی دونوں کی کمزوری مراد ہوتی ہے۔'' (۵۷)

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ "رکاکت في المعنى" کا مطلب یہ ہے کہ ضرورتاً اور استدلالاً وہ عقل کے خلاف ہو جس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو جیسے : "لا تأكلوا القرعة حتى تذبحوها" (۵۸) کدو کو بغیر ذبح کیے ہوئے نہ کھاؤ۔

---

(۵۶) المنار المنیف ص ۶۲ (۵۷) النکت (۲/ ۸۴۴) (۵۸) المحدث الفاصل ص ۳۱۶

انتہائی مبالغہ آرائی کا پایا جانا :

اگر کوئی ایسی حدیث بیان کی جائے جس میں معمولی عمل پر بڑی بڑی بشارتیں اور فضیلتیں موجود ہوں یا معمولی غلطی پر شدید ترین وعید ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے، عموماً گھڑنے والوں نے فضیلت کے باب میں اس طرح کی روایتیں گھڑی ہیں مثلاً : "من قال لاإله إلاالله خلق الله له من تلك الكلمة طائراً له سبعون ألف لسان لكل لسان سبعون ألف لغة يستغفرون له" جس نے "لا إله إلا الله " کہا تو اللہ تعالیٰ اس کلمے سے ایک پرندہ بناتا ہے جس کی ستر ہزار زبانیں ہوتی ہیں اور ہر زبان میں ستر ہزار بولیاں ہوتی ہیں جو اس کے کہنے والے کے تو بہ واستغفار کرتی ہیں۔

اس طرح معمولی کام پر جنت میں ستر ہزار شہروں کا ملنا، ہر شہر میں ستر ہزار محل ہونا، ہر محل میں ستر ہزار حورعین کا ہونا وغیرہ، اس طرح سے مبالغہ آرائی کرنے والے یا تو جاہل ہوتے ہیں یا بددین ہوتے ہیں جو رسول کی توہین کرنا چاہتے ہیں۔ (۵۹)

امر واقعہ کے خلاف ہونا :

یعنی اس میں ایسا شرعی حکم ہو جو حقیقت کے منافی ہو، دیگر شواہد و دلائل سے اس کا مخالف ہونا ثابت ہو، مثلاً حدیث "وضع الجزية عن أهل خيبر" یعنی "اللہ کے رسول ﷺ نے خیبر والوں سے جزیہ معاف کر دیا تھا، اس معاہدے کو معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے تحریر کیا جس پر سعد بن معاذ کی شہادت تھی۔"

یہ حدیث امر واقعہ کے بالکل خلاف ہے کیوں کہ اس میں سعد بن معاذ کی شہادت کا تذکرہ ہے جب کہ سعد بن معاذ کی وفات غزوۂ احزاب کے فوراً بعد ۵ھ میں ہوگئی تھی اور خیبر ان کی وفات کے دو سال بعد ۷ھ میں فتح ہوا ہے، نیز معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کے بدست تحریر کرنے کی بات کہی گئی ہے حالاں کہ وہ فتح خیبر کے وقت وہاں موجود نہیں تھے، اس وقت تک تو

---

(۵۹) المنار المنیف ص/۵۱

وہ ایمان بھی نہیں لائے تھے، وہ فتح مکہ کے وقت ۸ھ میں ایمان لائے، جو غزوۂ خیبر کے ایک سال کے بعد ہوا، پھر انہوں نے یہ معاہدہ کیسے اور کب لکھا، نیز اس وقت جزیہ لینا غیر معروف تھا، صحابۂ کرام اور اہل عرب اس کو جانتے ہی نہیں تھے، شریعت میں اس کا حکم غزوۂ تبوک کے بعد آیا ہے، نیز اس میں یہ بھی ہے کہ اہل خیبر سے مشقت کا کام اور بیگار لینا ختم کر دیا گیا تھا، جب کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بیگار لینے کا رواج ہی نہیں تھا، لہٰذا یہ روایت مختلف طرح سے امر واقعہ کے خلاف ہے جس سے اس کے موضوع ہونے کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ (۶۰)

بذات خود باطل ہونا :

بعض گھڑی ہوئی روایتیں اس قدر باطل ہوتی ہیں کہ وہ بذاتِ خود اپنے بطلان پر دلالت کرتی ہیں۔ اس لیے کہ جو چیز فی نفسہ باطل ہو یہ کیسے ممکن ہے کہ رسول ﷺ اس کی تصدیق کریں مثلاً یہ قول "إذا غضب الله تعالى أنزل الوحي بالفارسية وإذا رضي أنزله بالعربية" (۶۱) جب اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے تو فارسی زبان میں وحی کا نزول فرماتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے تو عربی زبان میں نازل کرتا ہے۔

اسی طرح یہ قول کہ ''جس کے پاس صدقہ کرنے بھر کا مال نہ ہو تو وہ یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے۔'' یہ فی نفسہ باطل ہے کیوں کہ صدقہ وخیرات انسانی ہمدردی اور تعاون باہمی ہے۔ پھر لعنت کا بھیجنا صدقہ وزکات کے قائم مقام کیسے ہوسکتا۔

مضحکہ بن جانے والی بات ہونا :

رسول کی جانب ایسی بات منسوب کی جائے جو لوگوں کے لیے مضحکہ اور مذاق بن جانے کے لائق ہو، اس طرح کی باتیں تو اصحاب عقل ودانش بھی نہیں کہتے کہ وہ یا ان کا قول مضحکہ یا مذاق بن جائے تو رسول اللہ ﷺ اس طرح کی بات کیسے کہہ سکتے ہیں! مثلاً "لو كان الأرز رجلاً لكان حليماً" اگر چاول انسان ہوتا تو بڑا بردبار ہوتا۔ ایسے ہی "الباذنجان شفاء لما أكل له"

---

(۶۰) المنار المنیف ص/۱۰۲-۱۰۳ (۶۱) المنار المنیف ص/۵۹

بگین ہر مرض میں جس کے لیے وہ استعمال کیا جائے مفید (شفا) ہے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ ''اس طرح کی بات اگر کوئی ماہر طبیب بھی کہے تو لوگ اس کو مذاق بنالیں گے کیوں کہ یہ اسی طرح کی بات ہے۔'' (۶۲)

جس میں تمام صحابہ کے حدیث چھپانے کا دعویٰ ہو :

وہ تمام حدیثیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اسے تمام صحابہ نے متفقہ طور سے چھپالیا اور کسی نے اس کو نہیں بتایا، جس طرح سے شیعان علی کا دعویٰ ہے کہ ''حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت آپ ﷺ نے حضرت علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ کہا کہ "هـذا وصيـي وأخـي والـخـليفة من بعدي" (۶۳) کہ یہ میرے وصی اور بھائی ہیں اور میرے بعد خلیفہ ہوں گے، لہٰذا ان کی سمع وطاعت کرو لیکن تمام صحابہ نے اس کو چھپالیا اور کسی نے نہیں بتایا۔

کیوں کہ اس طرح کا عمل صحابہ کرام سے ممکن نہیں، ان کی عادت یہ تھی کہ حدیث رسول ﷺ کو حتی الامکان دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے اور اس کے لیے قربانی کا جذبہ رکھتے تھے، جس کی وضاحت ''تبلیغ حدیث'' کے موضوع میں کی جاچکی ہے۔ (ص ر ۹۲)

یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر تمام صحابہ وصحابیات جو وہاں موجود تھے سب اس کو چھپانے پر متفق ہو گئے، تو اس کا پتہ کیسے چلا؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ جو بات جم غفیر میں کہی جائے اس کے چھپانے پر سب کا اجماع ہو جائے اور وہ بات چھپ جائے اور کوئی اس کی مخالفت نہ کرے؟

ایک قابل غور نقطہ یہ بھی ہے کہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اگر اس کو چھپالیا تو اس کا مقصد یہ رہا ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ نہ بن سکیں، اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ تمام صحابہ وصحابیات کی نگاہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قدر ناپسندیدہ تھے کہ کوئی بھی ان کو مسلمانوں کا رہنما بنانا پسند نہیں کرتا تھا تو کیا واقعی۔ نعوذ باللہ۔ حضرت علی ایسے ہی تھے؟

---

(۶۲) المنار المنیف ص ر ۵۰ (۶۳) المنار المنیف ص ر ۵۷

نادر واقعہ کا نقل غریب ہونا :

اس سے ملتا جلتا یہ واقعہ بھی ہے کہ اگر کسی روایت میں ایسی بات کہی گئی ہو جو اس قدر نادر ہو کہ اس کا منقول اور مشہور ہونا فطری ہو، ہر سننے اور دیکھنے والا اس کے بیان کرنے پر مجبور ہو لیکن پھر بھی اس کے بیان کرنے والے شاذ و نادر لوگ ہوں تو یہ امر روایت کے موضوع ہونے پر دلالت کرتا ہے، مثلاً وہ روایت جو حضرت اسماء کے واسطے سے منقول ہے کہ "عصر کے بعد سورج کو حضرت علی کے لیے واپس کر دیا گیا تھا جس کو تمام لوگوں نے دیکھا۔" لیکن یہ غریب واقعہ صرف حضرت اسماء بنت عُمیس ہی سے منقول ہے۔ (٦٤)

☆☆☆

---

(٦٤) المنار المنیف ص ۵۷-۵۸

معرفت وضع کے جامع قوانین

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مایہ ناز کتاب ''المنار المنیف'' میں وضع حدیث کی معرفت کے لیے کچھ مسائل میں عام قاعدہ بتادیا ہے اور اس میں یہ وضاحت کردی ہے کہ اس مفہوم سے متعلق جتنی حدیثیں مروی ومنقول ہیں سب موضوع ہیں، انہیں میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں :

● عقل سے متعلق جتنی حدیثیں ہیں سب باطل ہیں، علامہ عقیلی اور ابن حبان نے ابوالفتح ازدی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "لا یصح فی العقل حدیث" عقل سے متعلق کوئی حدیث صحیح نہیں۔ ص ۶۶-۶۷

● حضرت خضر کے موجود ہونے کے متعلق تمام روایتیں باطل ہیں، علامہ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ : کتاب وسنت، اجماع محققین اور عقل ہر اعتبار سے اس طرح کی روایتیں باطل ہیں۔ ص/ ۶۷-۶۹

● حسین چہروں کے دیکھنے یا ان کی تعریف وغیرہ سے متعلق تمام روایتیں باطل ہیں۔

● جس حدیث میں سنہ، مہینہ، دن یا تاریخ کے تعین کے ساتھ کوئی پیشن گوئی کی گئی ہے تو وہ سب گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔ ص/ ۶۳-۶۴

● ہر حدیث جو صخرہ بیت المقدس سے متعلق ہے سب گھڑی ہوئی ہیں۔ ص/ ۸۷

● مخصوص ایام یا مخصوص راتوں میں خاص نماز ادا کرنے سے متعلق یا ان کی فضیلت کے بیان میں وارد روایتیں ایسے ہی صلاۃ الرغائب سے متعلق روایتیں سب موضوع ہیں۔ ص/ ۹۵

● ہفتہ کے مخصوص ایام میں نماز پڑھنے کی روایتیں صحیح نہیں۔ (۱)

---

(۱) أسنی المطالب ص/ ۳۷۱

● ہر حدیث جس میں رجب کے مہینے میں روزہ رکھنے کی بات کہی گئی ہے موضوع ہے۔

ص/ ۹۶

حافظ ابن حجر نے فضل رجب سے متعلق ایک رسالہ تحریر کیا ہے جس کا نام "تبین العجب بما ورد فی فضل رجب" ہے اس میں اس طرح کی حدیثوں پر اظہار تعجب کیا ہے۔

● پندرہویں شعبان کی رات کو نماز پڑھنے سے متعلق ساری روایتیں باطل ہیں۔

ص/ ۹۸

مباح اور جائز صنعتوں کی مذمت میں وارد شدہ روایتیں بھی باطل ہیں، اس لیے کہ جس چیز کو اللہ اور اس کے رسول نے مباح کر دیا ہے پھر وہ اس کی مذمت نہیں کر سکتے۔

● کبوتر بازی کے جواز سے نیز مرغی پالنے کی فضیلت اور اولاد کی مذمت سے متعلق روایتیں موضوع ہیں۔ ص/ ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۰۹

● عاشورہ کے دن سرمہ لگانے، زینت کرنے، اولاد پر کشادگی کرنے، مخصوص نماز ادا کرنے سے متعلق تمام روایتیں باطل ہیں۔ ص/ ۱۱۱

● عاشورہ کے فضیلت سے متعلق روزہ رکھنے کی روایت جو صحیحین میں ہے، جن میں آپ نے روزہ رکھا اور اس کا حکم دیا اور اس دن صیام کی فضیلت بتائی ہے اس کے علاوہ جو روایتیں ہیں، زیارۃ علماء، سرمہ لگانا، زینت کرنا، دیگر اعمال حسنہ یہ سب قاتلین حسین رضی اللہ عنہ کی وضع کردہ ہیں، جنہوں نے اس دن کو خوشی کا دن بنالیا، جیسے روافض نے اس کو غم کا دن بنالیا ہے، اسی طرح سے وہ تمام روایتیں جس میں آدم، نوح، ابراہیم و یونس، یعقوب و یوسف علیہم السلام وغیرہ کے ملنے یا توبہ قبول کرنے سے نجات دینے کی بات ہے سب گھڑی ہوئی روایتیں ہیں۔ (۲)

● وضو کرتے وقت ہر عضو کو دھونے کے لیے مخصوص دعا والی روایتیں موضوع ہیں۔

ص/ ۱۲۰

---

(۲) اسنی المطالب ص/ ۳۷۲

- ایسے ہی گردن پر مسح کرنے سے متعلق تمام روایتیں موضوع ہیں۔ ص/ ۱۲۰
- وضو کرنے کے بعد ہاتھ خشک کرنے سے متعلق روایتیں بھی ایسے ہی ہیں۔ ص/ ۱۱۹
- اقل حیض کی تعیین تین دن سے اور اکثر حیض کی تعیین دس دن سے کرنے والی روایتیں بھی ایسے ہی ہیں۔ ص/ ۱۲۲
- غیر شادی شدہ کی فضیلت سے متعلق روایتیں باطل ہیں۔ ص/ ۱۳۱
- حبۃ السوداء (کلونجی) کے علاوہ حبوب کی فضیلت سے متعلق کوئی روایت صحیح نہیں۔ (۳)
- مسور، چاول، بینگن، لوبیہ، انار، کشمش، ھندبا، تربوز، ککڑی، پنیر، ہریسہ، کراث کی فضیلت سے متعلق تمام روایتیں باطل ہیں۔ ص/ ۱۲۸
- مختلف پھولوں کی فضیلت سے متعلق روایتیں بھی ایسے ہی ہیں۔ ص/ ۱۳۰
- شطرنج کھیلنے کے جواز پر دلالت کرنے والی روایتیں رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہیں۔ ص/ ۱۳۴
- رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین کی ممانعت سے متعلق روایتیں گھڑی ہوئی ہیں۔
- وضو کرنے کے بعد پانی چھڑکنے والی روایتیں باطل ہیں۔ ص/ ۱۱۸
- ایمان کے کم ہونے اور زیادہ ہونے سے متعلق نصاً کوئی روایت ثابت نہیں۔ ص/ ۱۱۹

جس حدیث میں لفظ حمیراء مستعمل ہے اس میں تین روایتوں کے علاوہ سب باطل ہیں، وہ تین روایتیں یہ ہیں:

۱ - خذوا شطر دینکم من حمیراء۔

۲ - انظری یا حمیراء أن لا تکونی إلاأنت۔

۳ - یا حمیراء أتحبین أن تنظری إلیهم۔

---

(۳) اسنی المطالب (۳۷۳)

- حبشہ، سوڈان، ترک ممالک، اصبہان کی مذمت پر دلالت کرنے والی روایتیں گھڑی ہوئی ہیں۔ ص ر ۱۰۱
- حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی مذمت، اسی طرح اہل بیت کی مذمت، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مذمت، امام شافعی کی مذمت پر دلالت کرنے والی روایتیں گھڑی ہوئی ہیں۔ ص ر ۱۱۷
- خلیفہ مہدی کی فضیلت سے متعلق روایتیں باطل ہیں۔ ص ر ۱۳۱
- بنوامیہ کی مدح، منصور، سفاح، ہارون رشید، امام ابوحنیفہ کی مدح پر دلالت کرنے والی روایتیں سب گھڑی ہوئی ہیں۔ ص ر ۱۱۷
- بغداد، بصرہ، کوفہ، مرو، عسقلان، اسکندریہ، نصیبین، انطاکیہ، شہروں سے متعلق روایتیں فضیلت ہوں یا فضیحت موضوع ہیں۔ ص ر ۱۱۷

کسی شہر کا جنت یا جہنم سے ہونے پر دلالت کرنے والی روایتیں بھی گھڑی ہوئی ہیں۔ ص ر ۱۱۷

مختلف صوفیانہ لقب مثلاً قطب، غوث، فقہاء، نجباء اوتاد وغیرہ کی نسبت رسول کی جانب غلط ہے۔ (۴)

ابدال شام سے متعلق جو روایت ہے وہ ان کی اصطلاح کے مطابق نہیں۔

☆☆☆

---

(۵) اسنی المطالب ص ر ۳۷۲

باب سوم

تحفظ سنت کی دفاعی خدمات

وضع حدیث کا دفاع

وضع کا لغوی معنی :

لغوی اعتبار سے لفظ ''وضع'' مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً :

۱- کسی چیز کو گھڑ لینا، کہا جاتا ہے کہ "فلان وضع الشیٔ وضعاً" یعنی اختلقه (۱) فلاں نے فلاں چیز گھڑ لی۔

۲- اسی طرح سے کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے جوڑنے اور اس سے چپکانے کو بھی ''وضع'' کہا جاتا ہے، ابن دحیہ فرماتے ہیں کہ "وضع فلان علیٰ فلان کذا : أی ألصقه" (۲) فلاں نے فلاں پر وضع کیا یعنی اس سے لاکر جوڑ دیا۔

۳- اسی طرح سے کسی چیز کو اتارنا اور اس کو نیچے گرا دینا یا کسی کے مقام کو گھٹا دینے کو بھی ''وضع'' کہا جاتا ہے۔

صاحب ''لسان'' فرماتے ہیں کہ "الوضع ضد الرفع ووضع الشیء من یده : ألقاه" (۳) یعنی وضع (پستی) رفع (بلندی) کے برعکس ہے، کسی چیز کو اپنے ہاتھ سے وضع کرنے کا مطلب ہے اس کو پھینک دینا۔

اسی طرح سے وضع الدّین، وضع الجنایة اور وضع الحرب (۴) قرض کو ختم کر دینے، جرم کو اور لڑائی کو ساقط کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔

ابن عرّاق فرماتے ہیں کہ "وضع الشیء یضعه- بالفتح- أسقطه، اسی لفظ ''وضع'' سے ''موضوع'' کا اصطلاحی کلمہ ماخوذ ہے جو اسم مفعول ہے، جس کا معنی ہے گھڑی

---

(۱) تاج العروس (۵/۵۴۵) (۲) لسان العرب (۸/۳۹٦)

(۳) تنزیہ الشریعة (۱/۵) (۴) لسان العرب (۸/۳۹٦)

ہوئی، جوڑی ہوئی، یا پھینکی ہوئی چیز۔"

امام ابن حجر فرماتے ہیں کہ "موضوع لغت میں جیسا کہ ابن دحیہ نے فرمایا ہے ملصق کے معنی میں ہے، نیز "حط" اور "اسقاط" کے معنی میں بھی آتا ہے، لیکن پہلا معنی یہاں زیادہ مناسب ہے۔ (۵)

ان تمام معنوں کا اعتبار اصطلاحی تعریف میں ممکن ہے اس لیے کہ جو حدیث موضوع ہوتی ہے وہ رسول پر لگائی ہوئی اور گھڑی ہوئی ہوتی ہے جس کا مقام گرا ہوا ہوتا ہے اور وہ پھینکی ہوئی ہوتی ہے۔

اصطلاحی تعریف :

موضوع اس حدیث کو کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر گھڑ لی گئی ہو اور آپ کے ساتھ جوڑ دی گئی ہو۔

اہل علم نے اس کی تعریف میں دو کلمے استعمال کیے ہیں "الموضوع المختلق" حافظ عراقی نے اس میں "المکذوب" کا بھی اضافہ کیا ہے، جب کہ یہ سارے کلمات ہم معنی ہیں، مجرد تاکید کے لیے مستعمل ہیں تاکہ اس سے نفرت دلائی جائے اور اس کی قباحت کا اظہار کیا جائے۔ (۶)

گھڑی ہوئی چیز جو رسول کی جانب منسوب کر دی جاتی ہے خواہ عمداً ہو یا سہواً اس کو موضوع کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عمر بن حسن فلاتہ فرماتے ہیں کہ "كل ما ألصق بالنبي ﷺ عمداً أو سهواً (۷) ہر وہ چیز جو رسول پر عمداً یا سہواً چسپاں کر دی جائے وہ موضوع ہے" لہٰذا اس تعریف میں عمداً اضافہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

کچھ اہل علم نے سہواً رسول کی جانب منسوب شدہ چیز کو موضوع کہنے کے بجائے "باطل"

---

(۵) النکت علی ابن الصلاح (۸۳۸/۲) (۶) فتح المغیث (۲۹۴/۱)
(۷) الوضع فی الحدیث (۱۰۸/۱)

کہا ہے اور عمداً گھڑی ہوئی چیز کو ''موضوع'' کہا ہے، اس طرح سے دونوں میں فرق کیا ہے۔ (۸)

علامہ ابن تیمیہ نے اس کی تعریف دوطرح سے کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمداً اور سہواً دونوں کو ''موضوع'' کہا جاتا ہے چناں چہ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ''وہ گھڑی ہوئی چیز جس کو گھڑنے والا عمداً کرتا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا کہ ''جس چیز کا غلط ہونا معلوم ہو خواہ کہنے والے نے عمداً نہیں بلکہ غلطی سے کہا ہو تو وہ موضوع ہے۔'' (۹)

علامہ معلمی یمانی فرماتے ہیں کہ ''جب ناقدین حدیث کے اتنے دلائل ہوجاتے ہیں جس سے یہ ظن غالب ہوتا ہے کہ مذکورہ خبر کی نسبت رسول کی جانب صحیح نہیں تو اس کے لیے کبھی باطل اور کبھی موضوع کا لفظ استعمال کیا ہے، دونوں الفاظ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خبر گھڑی ہوئی ہے چاہے عمداً ہو یا سہواً حالاں کہ عمداً کے لیے موضوع کا لفظ متبادر ہے (اور سہواً کے لیے باطل کا) لیکن کتب موضوعات کے جامعین نے اس پر توجہ نہیں دی بلکہ دونوں طرح کی روایتوں کو اپنی کتابوں (موضوعات) میں شامل کیا ہے خواہ عمداً ہو یا سہواً۔ (۱۰)

کلام موضوع کی نوعیت :

گھڑی ہوئی روایت کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں :

۱ — کبھی گھڑنے والا اپنی گھڑی ہوئی بات کو رسول کی جانب منسوب کردیتا ہے، جس کے مختلف اسباب ہوسکتے ہیں، مثلاً فضائل قرآن کی روایتیں جن کو نوح بن ابی مریم نے گھڑ کر رسول کی جانب منسوب کردیا۔

۲ — کبھی کسی صحابی، تابعی، حکماء کے اقوال یا اسرائیلیات کو رسول کی جانب منسوب کردیا جاتا ہے۔

---

(۸) مصدر سابق (۹) الوضع فی الحدیث (۱/۱۰۸) (۱۰) مقدمہ الفوائد المجموعۃ ص ر ۴

۳ – کبھی غلط فہمی کی وجہ سے کوئی بات رسول کی جانب منسوب کردی جاتی ہے جو وضع کے خانہ میں چلی جاتی ہے جیسا کہ ثابت بن موسیٰ زاہد سے اس طرح کی غلطی سرزد ہوگئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ جب وہ شریک بن عبداللہ القاضی کی مجلس میں تشریف لائے اس وقت قاضی شریک مسند درس پر تھے اور سند مکمل کر چکے تھے، آگے حدیث رسول سنانے والے تھے اتنے میں جب ان کی نظران پر پڑی تو انہوں نے ان کی تعریف میں یہ جملہ کہہ دیا کہ "من کثرت صلوته بالليل حسن وجهه بالنهار" (۱۱) ثابت بن موسیٰ نے یہ سمجھا کہ سند کے بعد جو حدیث بیان کرنے جا رہے تھے وہ یہی حدیث ہے لہٰذا انہوں نے اس کو حدیث سمجھ کر روایت کر دیا، اس طرح یہ روایت موضوعات کے خانہ میں پہنچ گئی۔

موضوع کو حدیث کہنے کی وجہ :

گھڑی ہوئی روایت حقیقت میں حدیث رسول نہیں ہوتی ہے جب کہ اس کا شمار اصطلاح میں حدیث کی قسموں میں کیا جاتا ہے اور کتب موضوعات کو اقسام کتب حدیث میں شمار کیا جاتا ہے، اس کی مختلف وجہیں ہوسکتی ہیں :

۱ – سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ یہ ایک اصطلاحی معاملہ ہے، بحیثیت اصطلاح مجرد افہام وتفہیم کے لیے حدیث لگا دیا جاتا ہے اور ان طریقوں کی معرفت کی وجہ سے جن سے موضوع کا پتہ لگایا جاتا ہے جو اصول حدیث کے علوم میں سے ایک علم ہے لہٰذا اس کے ساتھ حدیث لگا دیا جاتا ہے۔

۲ – اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حدیث رسول سے اس کو خارج کرنے کے لیے بطور ضدیت انواع حدیث میں شمار کیا گیا ہے اس لیے کہ اشیاء اپنے اضداد سے پہچانی جاتی ہیں لہٰذا محض پہچان کرانے اور سمجھنے کے لیے اس کا شمار حدیث رسول کے اقسام میں کیا گیا ہے ورنہ حقیقت میں یہ اس کے لائق نہیں کہ اس کے ساتھ لفظ حدیث کو لگایا جائے، اس وجہ کو امام بخاری نے سب سے احسن قرار دیا ہے۔

---

(۱۱) مقدمہ ابن الصلاح مع حاشیہ بتصرف ص ر ۹۰، وفتح المغیث (۱ر ۳۱۱)

۳ - بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ چوں کہ گھڑنے والے نے اس کو حدیث سمجھ کر گھڑا ہے اور سنانے والے کو وہ یہی یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ حدیث رسول ہے اور کتنے لوگ گھڑی ہوئی روایتوں کو حدیث رسول سمجھتے ہیں لہٰذا اس اعتبار سے اس کو حدیث کہہ دیا گیا ہے۔

۴ - ایک وجہ یہ بھی کہی جاتی ہے کہ چوں کہ اس میں بھی حدیث رسول کی طرح عمل تحدیث پایا جاتا ہے اور سلسلہ وار اسناد سے یہ بھی منقول ہوتی ہے لہٰذا اس معمولی اشتراک کی بنا پر اقسام حدیث میں اس کو شمار کر لیا گیا ہے۔

۵ - ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وضع حدیث کا حکم ظن غالب پر ہوتا ہے جس میں اس کی گنجائش رہتی ہے کہ حقیقت میں وہ صحیح ہو، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "والحکم علیہ بالوضع إنما ھو بطریق الظن الغالب لا بالقطع إذ قد یصدق الکذوب" (۱۲) موضوع پر وضع کا حکم ظن غالب کی بنیاد پر لگایا جاتا ہے نہ کہ وہ قطعیت کی بنیاد پر ہے کیوں کہ کبھی کبھی جھوٹا بھی سچ بول دیتا ہے۔

اگر چہ یہ انتہائی کمزور پہلو ہوتا ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں لیکن ایک دھندھلا سا امکان اس کا بھی ہوتا ہے کہ وہ حقیقت میں حدیث رسول ہو لہٰذا اس ناحیہ سے اس کو اقسام حدیث میں شامل کیا گیا ہے۔

موضوع کا حکم :

موضوع حدیث کا بیان کرنا اور اس کو لوگوں کے سامنے منظر عام پر لانا ناجائز اور حرام ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی مفہوم سے ہو، عقیدہ سے متعلق ہو یا احکام سے فضائل اعمال اور ترغیب وترہیب سے یا قصص اور مواعظ سے کیوں کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو نہیں بتایا تو کسی بھی فرد کے لیے کسی بھی مقصد سے رسول کی جانب اس کی نسبت کرنا دروغ گوئی اور بہتان ہے۔

---

(۱۲) نزہۃ ص ۷۰، دیکھیے فتح المغیث (۱/۲۹۵)، الوضع فی الحدیث (۱/۱۱۰-۱۱۱)

شریعت نے کسی بھی فرد کو اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ روایت غلط اور جھوٹی ہے، رسول کا قول و عمل نہیں ہے اس کو رسول کی جانب منسوب کرے، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے "من حدّث عني حديثاً وهو يرىٰ أنه كذب فهو أحد الكاذبين" (۱۳) جو شخص میرے واسطہ سے کوئی حدیث بیان کرتا ہے حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ غلط ہے تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔

غور کرنے کی بات ہے رسول نے یہ فرمایا کہ "وهو يظن" اگر اس کو اس کا ظن و گمان بھی ہے تو وہ اس وعید کا مستحق ہے چہ جائے کہ یقینی طور سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ گھڑی ہوئی روایت ہے اور جھوٹی بات ہے تو اس کی نسبت رسول کی جانب کرنے والا اس سے بھی زیادہ وعید کا مستحق ہوگا "وإن الكذب يهدي إلى الفجور وإن الفجور يهدي إلى النار" (۱۴) اور جھوٹ فسق و فجور کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور فسق و فجور جہنم کی راہ دکھاتا ہے۔

گھڑنے والے اور گھڑی ہوئی چیز کو بیان کرنے والے دونوں کو ایک درجہ میں رکھا ہے لہٰذا گھڑنا اور بیان کرنا دونوں بہ شہادت رسول کاذب ہیں۔

خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ "يجب على المحدث أن لا يروي شيئا من الأخبار المصنوعة والأحاديث الباطلة الموضوعة فمن نقل ذلك باء بالإثم المبين ودخل في جملة الكذابين" (۱۵) محدث پر یہ واجب ہے کہ موضوع اور باطل حدیثیں بیان نہ کرے اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ واضح گناہ کرتا ہے اور جملہ کذابین میں شمار ہوگا۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ "جو شخص موضوع روایتیں بیان کرتا ہے اور یہ وضاحت نہیں کرتا کہ یہ گھڑی ہوئی روایت ہے جو رسول کی جانب منسوب کر دی گئی ہے تو ایسا شخص ضرب شدید اور حبس طویل کا مستحق ہے۔" (۱۶)

---

(۱۳) مقدمہ مسلم (۱/۶۲) (۱۴) مسلم (۲۶۰۷)

(۱۵) فتح المغیث (۱/۲۹۵) (۱۶) فتح المغیث (۱/۲۹۵)

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ مجرد یہ کہہ دینے سے کہ یہ روایت ''موضوع'' ہے کام نہیں چلے گا بلکہ اس کی وضاحت کرنی ضروری ہے اس لیے کہ یہ ممکن ہے کہ عوام یہ نہ سمجھ سکیں کہ موضوع حدیث کیا ہوتی ہے۔

خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ جو شخص موضوع روایت کو محض اس لیے بیان کرتا ہے تا کہ اس کی قباحت واضح کر دے اور اس کے گھڑنے والے کی فضیحت کرے، لوگوں کو اس سے ڈرائے اور نفرت دلائے تو اس کے لیے موضوع حدیث بیان کرنا درست ہے جس طرح سے شاہد کے حالات کو واضح کرنا اور اس کا عیب بیان کرنا درست ہے۔ (۱۷)

ڈاکٹر فلاتہ فرماتے ہیں کہ موضوع روایت بیان کرنے والا دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ اس کو جانتا ہے یا نہیں جانتا، اگر نہیں جانتا ہے تو بیان کرنے پر گنہگار نہ ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ اس نے حدیث کی معرفت میں کوتاہی کی اور اس میں تثبت حاصل نہیں کیا۔

اور اگر اس کو جانتا ہے اور بیان کرنے کا مقصد اس کی خرابی بیان کرنا اور اس سے سماج اور معاشرے پر پڑنے والے برے اثرات کو واضح کرنا ہے تو اس کے لیے موضوع حدیث بیان کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے، اہل علم نے اسی بنیاد پر موضوعات میں کتابیں تحریر کی ہیں اور امت کو ان سے ڈرایا ہے۔

اور اگر یہ مقصد نہیں تو پھر علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اس کا بیان کرنا حرام ہے خواہ کسی بھی معنی سے اس کا تعلق ہو۔ (۱۸)

موضوع روایت بدترین روایت ہوتی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، امام خطابی اور ابن الصلاح نے اس کو ''شر أنواع الضعیف'' (ضعیف میں بدتر قسم) قرار دیا تو بعض اہل علم نے ان پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ حدیث رسول ہوتی ہی نہیں تو اس کو ضعیف کی قسم میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟

---

(۱۷) الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع (۲/۹۹) (۱۸) الوضع فی الحدیث (۱/۳۲۳-۳۲۴)

حافظ ابن حجر نے ان کا قول ذکر کرنے کے بعد اس کی تاویل کی ہے اور کہا کہ "ویمکن الجواب بأنه أراد بالحديث القدر المشترك وهو ما يحدث به" (۱۹) یعنی اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے حدیث سے مراد ''قدر مشترک'' لیا ہے جو تمام حدیثوں میں ہے اور وہ ''اس کا بیان کرنا'' ہے۔

امام سخاوی نے دونوں کا قول ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ "قد يقال : إن أفعل التفضيل ليست هنا على بابها حتى لا يلزم الإشتراك بين الضعيف والموضوع، اللهم أن يقال : إن ذلك في الضعيف بالنسبة إلى المقبول" (۲۰) یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسم تفضیل اپنے حقیقی معنی میں نہیں تاکہ ضعیف اور موضوع میں اشتراک نہ لازم آئے الا یہ کہ یہ کہا جائے کہ یہاں اس کو ضعیف میں مقبول کا خیال کر کے شمار کرلیا ہے اس لیے کہ مقبول کے مقابلہ میں جو ہوگا وہ مردود ہوگا اور بہ نسبت مقبول یہ مردود ہے لہذا ضعیف کی قسم نہیں بلکہ مردود کے مقابل ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ علماء نے اس کو ضعیف میں بھی شمار کرنا گوارہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کو ایک الگ قسم ہی مانا ہے (۲۱) جس کا رسول سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وضع اور واضع کا حکم :

دروغ گوئی اور کذب بیانی شریعت اسلامیہ میں جرم عظیم سمجھا جاتا ہے، اس کی قباحت، شناعت، وعید اور کذاب کے مستحق عذاب کے بارے میں کتاب وسنت میں وافر مقدار میں دلائل موجود ہیں، اس کی یہ قباحت اور خرابیاں ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہیں وہ بھی اس صورت میں جب کہ اس کا تعلق انسانوں کے باہمی مسائل اور آپسی معاملات میں ہوں۔

لیکن خدانخواستہ اگر یہ کذب بیانی انسانوں سے تجاوز کر کے اللہ اور اس کے رسول کے معاملات، دین وشریعت تک پہنچادی جائے تو ظاہر بات ہے اس سے آگے جھوٹ کا اور کوئی درجہ

---

(۱۹) النکت (۸۳۸/۲) (۲۰) فتح المغیث (۲۹۴/۲) (۲۱) تیسیر المصطلح ص ۸۹

باقی نہیں رہ جاتا اور اس کی شناعت انتہائی درجہ کو پہنچ جاتی ہے جن کو سخت وعید، عذاب جہنم، روسیاہی اور ہلاکت کی دھمکی دی گئی ہے، اللہ کا فرمان ہے ﴿ویوم القیامة تری الذین کذبوا علی اللہ وجوھھم مسوَدّة﴾ (زمر : ٦٠) قیامت کے دن تم دیکھو گے جن لوگوں نے اللہ پر جھوٹ گھڑا ہے ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

اور اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ "من کذب علیّ متعمّداً فلیتبوأ مقعده من النار" جو متواتر طرق سے ثابت شدہ ہے، اسی طرح اس کے ہم معنی روایتیں "من یقل علی ما لم أقل فلیتبوأ مقعده من النار" "لا تکذبوا علی فإنه من کذب علی یلج النار" اور "إنّ کذباً علیّ لیس ککذب علی أحد من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعده من النـار" (۲۲) یہ تمام حدیثیں اس عمل کے مرتکب کو عذاب جہنم کی وعید سناتی ہیں، اسی وجہ سے بعض اہل علم نے ایسے لوگوں کو کافر قرار دیا ہے۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت کا یہ خیال ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ گھڑنا کفر ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ گھڑ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا خالص کفر ہے۔ (۲۳)

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ "والحق أنه فاحشة عظیمة وموبقة کبیرة ولکن لا یکفر بها إلا أن یستحله" (۲۴) حق یہ ہے کہ یہ عمل انتہائی بدتر اور ہلاکت خیز ہے لیکن اس کا کرنے والا کافر نہیں ہوگا إلا یہ کہ وہ اس کو حلال سمجھے۔

ڈاکٹر عمر حسن فلاتہ فرماتے ہیں کہ جو شخص عمداً حدیث گھڑتا ہے اور اس کے ساتھ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جھوٹ گھڑنا حرام ہے تو ایسا آدمی فاسق ہوتا ہے۔

اور جو جھوٹ کو حلال اور جائز سمجھ کر بغیر کسی تاویل کے گھڑتا ہے تو وہ کافر مباح الدم ہوتا ہے، صرف جھوٹ گھڑنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس گناہ کبیرہ کو حلال اور جائز سمجھنے کی وجہ سے، سلف

---

(۲۲) بخاری (۱۲۹۱)، مقدمہ مسلم (۴) (۲۳) کتاب الکبائر للذہبی ص/۷۰

(۲۴) فتح المغیث (۲/۷۵)

اور ائمۂ حدیث کے عمل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

اور جو شخص تاویل کرتا ہے اگر یہ تاویل فاسد ہو تو اس کی روایت مردود ہے اور وہ وعید کا مستحق ہے لیکن اس کو فاسق نہیں کہا جائے گا کیوں کہ وہ ایسے شبہ میں مبتلا ہے جو اس سے فسق کو روک دیتا ہے۔

اور جس سے یہ کام غلطی سے سرزد ہو گیا ہے تو صرف اس کی وہ روایت مردود ہو گی جس میں اس سے غلطی ہوئی ہے وہ کسی وعید کا مستحق نہ ہو گا اور نہ اس پر فسق کا اطلاق ہو گا۔ (۲۵)

تائب از وضع حدیث کا حکم :

جو شخص جان بوجھ کر حدیث گھڑتا ہے یا غلطی سے جھوٹ بول دیتا ہے یا سبقت لسانی سے جھوٹ نکل جاتا ہے، اس کی غلطی اور سبقت لسانی پر تنبیہ کی جاتی ہے لیکن معرفت کے باوجود اصلاح نہیں کرتا بلکہ اپنی غلطی پر ڈٹا رہتا ہے تو اہل علم کے یہاں ان سب کا حکم برابر ہے اور اس طرح کے راویان اگر توبہ کر لیں تو بھی ان کی روایت صحیح قول کے مطابق قابل قبول نہیں، ویسے اس سلسلہ میں اہل علم کے دو نظریے ہیں :

۱ – جمہور کا کہنا ہے کہ کذاب کی روایت کبھی بھی قابل قبول نہیں خواہ توبہ کرے یا نہ کرے توبہ کا تعلق اس کے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے، اس کی توبہ بارگاہ رب میں مقبول ہے یا نہیں کسی کو کیا معلوم؟ لہٰذا یہ مسئلہ اس کے اور اللہ کے مابین ہے۔

یہاں معاملہ اصلاً شریعت مطہرہ کی حفاظت کا ہے اور وضع حدیث شریعت کے لیے قابل ضرر اور سم قاتل ہے جس کے نقصان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے جو پوری امت کو لاحق ہوتا ہے، لہٰذا سد ذریعہ اور سنت رسول میں احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کی روایت کو کبھی بھی قابل قبول نہ مانا جائے، یہی خیال امام بخاری کے استاذ امام حُمیدی، امام احمد، امام ابن مبارک، امام ابن معین، نیز

---

(۲۵) الوضع فی الحدیث (۱/ ۳۱۸۔۳۱۹)

خطیب بغدادی، امام صیرفی اور ابومظفر سمعانی کا ہے۔ (۲۶)

۲ - دوسرا نظریہ امام نووی کا ہے وہ کہتے ہیں کہ توبہ کرنے والے کی روایت بعد توبہ قابل قبول ہے، یہی قول امام مالک کا بھی ہے وہ کہتے ہیں کہ "یجب أن یقبل حدیثه إذا ثبتت توبته" (۲۷)

امام نووی جمہور کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مذہب پر کوئی دلیل نہیں بلکہ یہ شرعی اصولوں کے خلاف ہے، جب ایک شخص توبہ کے شروط کے مطابق توبہ کر لیتا ہے تو اصول یہ کہتا ہے کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے جس طرح کافر کے ایمان لانے کے بعد کی روایت اور شہادت مقبول ہے ویسے یہاں بھی مقبول ہونا چاہیے دونوں میں کوئی فرق نہیں، ان ائمہ کی صرف یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ اس طرح زجر بلیغ اور توبیخ شدید کی جاسکتی ہے (تاکہ دوسرے کذابوں کے لیے نصیحت ہو جائے) اس لیے کہ اس کا ضرر قیامت تک منتشر اور شائع ہوتا ہے جب کہ مجرد کذب کا ضرر اتنا وسیع نہیں ہوتا۔ (۲۸)

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قاعدہ کے اعتبار سے تو اس کو قبول مانا ہے لیکن ائمہ کی توجیہ کا بھی اعتبار کیا ہے اس لیے راجح جمہور کا قول ہے اور اس کی علت: کذاب کی توبیخ و تذلیل بلیغ کرنا، شریعت مطہرہ کی حفاظت کی طلب ہے۔

اس کا کافر کے ایمان لانے پر قیاس کرنا درست نہیں اس لیے کہ کافر کا حالت کفر سے (حالت شر سے) حالت ایمان (حالت خیر) میں آنا ہوتا ہے اور یہ حالت خیر سے حالت شر۔ کذب بیانی۔ کی طرف جانا ہوتا ہے، لہٰذا دونوں میں فرق ہے، نیز حالت کفر میں تحمل مقبول ہے صرف اداء مقبول نہیں، جب کہ کاذب کا حالت کذب میں تحمل بھی مقبول نہیں۔ لہٰذا دونوں میں فرق ہے۔ جہاں تک توبہ کا معاملہ ہے تو وہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان کا معاملہ ہے، اس میں اس سے قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

---

(۲۶) فتح المغیث (۲/۲۷۔۷۱)، الوضع فی الحدیث (۱/۳۲۰۔۳۲۱)

(۲۷) الکفایۃ ص/۱۱۷ (۲۸) شرح مسلم (۱/۷۰)، تدریب الراوی (۱/۳۳۰)

توبہ کے مقبول ہونے کو فرض بھی کر لیا جائے تو بھی احتیاط کا یہی تقاضہ ہے کہ روایت مردود ہو اور اگر توبہ کے عدم قبول کو فرض کیا جائے تو روایت کے قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ "توبته فیما بینه و بین اللّٰه تعالیٰ و لا یکتب حدیثه أبداً" (۲۹) اس کی توبہ کا معاملہ اس کے اور اللہ کے درمیان ہے، اس کی روایت کبھی بھی مقبول نہیں۔

امام ابن المبارک فرماتے ہیں کہ "کاذب کی سزا یہ ہے کہ اس کی صداقت کو بھی رد کر دیا جائے۔" (۳۰)

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ سمعانی اور صیرفی کے قول کی تائید فقہ کے بعض مسائل سے ہوتی ہے، یعنی اس میں شرعی ضوابط کی خلاف ورزی نہیں پائی جاتی ہے۔

مثلاً زانی اگر توبہ کر لے تو بھی محصن کا حکم اس پر نہیں لگتا، اس کے توبہ کے بعد اب اگر کوئی اس پر الزام زنا لگائے تو اس کو حد قذف نہیں لگایا جائے گا اس لیے کہ اس کی عزت پر جو بٹہ لگ چکا ہے وہ باقی ہے۔

اسی طرح سے کاذب کی روایت کا بھی معاملہ ہے اس کی شخصیت پر جو عیب لگ چکا ہے اس سے وہ داغدار ہو گیا ہے، توبہ سے وہ داغ ختم نہیں ہوتا اور نہ ایک صادق امین کی طرح اس کی شخصیت صاف ستھری ہو سکتی ہے۔ (۳۱)

خلاصہ یہ ہوا کہ حدیث رسول میں جھوٹ بولنے والا اگر اس سے توبہ بھی کر لے تو بھی اس کی روایت قابل قبول نہیں، بعض حضرات نے تو اس کی توبہ کا اعتبار بھی نہیں کیا ہے، ان کا یہ فرمانا ہے کہ ایسا شخص اپنی توبہ کی خبر میں بھی جھوٹا ہو سکتا ہے۔

وضع کے مفاسد :

وضع حدیث کا بدترین اثر امت پر اجتماعی و انفرادی ہر اعتبار سے ہوتا ہے، فی نفسہ یہ گھناونا کام کرنے والا شخص ذاتی طور سے جہاں وعید شدید کا مستحق ہے وہیں دیگر افراد کے عقیدہ اور اعمال

---

(۲۹) الکفایۃ ص ۱۱۷ (۳۰) مصدر سابق (۳۱) الوضع (۱/ ۳۲۳)

پر بھی برا اثر ڈالتا ہے، یہ ماحول کو دین حنیف کا مخالف اور بدعت کا گہوارہ بنا دیتا ہے اور افراد کے مزاج کو بدل دیتا ہے۔

اس لیے کہ حدیث گھڑنے والا مختلف ابواب میں حدیثیں گھڑتا ہے کبھی اس کا تعلق عقیدہ سے ہوتا ہے کبھی عبادات واحکام سے ہوتا ہے اور کبھی فضائل ورذائل سے۔

اب اگر کوئی شخص گھڑی ہوئی حدیث کے مطابق عقیدہ رکھتا ہے اور اس کو دین وشریعت سمجھتا ہے تو ظاہری بات ہے کہ درحقیقت اس کا عقیدہ خراب ہے، مثلاً ائمہ کرام کے بارے میں فضائل کی حدیثیں گھڑنا اور ان کو معصوم سمجھنا شریعت کے بالکل منافی ہے، اسی طرح سے عبادات واحکام میں ایسی ایسی چیزوں کو گھڑنا جو شریعت کے بالکل منافی ہے جیسے سال میں مختلف عیدوں کا منانا وغیرہ یہ عمل بدعت کے خانہ میں جاتا ہے اور بدعت درحقیقت سنت کے مخالف ایک محاذ ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقی دین اور صحیح عقیدہ انسانوں سے مخفی رہ جاتا ہے، پھر وہ حقیقی شریعت کو کوئی مقام نہیں دیتا اور گھڑی ہوئی باتوں کو دین کے نام پر آسمان کی بلندی تک پہنچا دیتا ہے، موضوعات کی بنیاد پر آج جو بدعتیں رائج ہیں وہ سب اسی قبیل کی بن چکی ہیں اور "بدأ الاسلام غریباً وسیعود غریباً" کا نقشہ سامنے ہے یعنی مذہب اسلام کی ابتدا اجنبیت کی شکل میں ہوئی اور عنقریب وہ اجنبی ہو جائے گا، یہ اجنبیت اس وجہ سے ہوگی کہ لوگ حقیقی دین کو مصنوعی اور بدعی دین کے مقابلہ میں بھول جائیں گے اور وہ سب اسی دروغ کا نتیجہ ہوگا، اپنے اس شریعت کے برخلاف عمل پر بدعتی طرح طرح کی دلیلیں اور کٹھ حجتی پیش کرتا اور غلو کی حد تک اس سے محبت کرتا ہے۔

کبھی کبھی یہ گھڑی ہوئی روایت کسی کی فضیحت میں ہوتی ہے جب کہ شریعت میں ان کی فضیلت موجود ہے یا اس کے برعکس، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ صاحب فضیلت صاحب فضیحت بن گیا اور صاحب فضیحت صاحب فضیلت بن گیا اور یہ سب رسول کے نام پر ہوا، اب جس کی حقیقت میں توقیر ہونی چاہیے اس کی توہین وتذلیل ہو رہی ہے، خلفاء اربعہ اور صحابۂ کرام کے متعلق اس

طرح فضیحت کی کتنی روایتیں گھڑی گئیں اور ایک قوم کے عقیدہ کی مکمل بنیاد انہی موضوعات پر ہے۔

آج حقیقت یہ ہے کہ وضع حدیث اور موضوع روایات نے دین پر قبضہ جما رکھا ہے، اصل دین و شریعت عوام الناس اور خاص طور سے خواتین پر مخفی ہو چکا ہے، ان لوگوں کو موضوع روایتیں صحیح روایتوں کے مقابلہ میں زیادہ اچھی اور بھلی معلوم ہوتی ہیں، بزرگوں کی تالیفات میں رطب و یابس کا آنا، فضائل اعمال کے نام سے جان بوجھ کر ان کو کتابوں میں جگہ دے کر عوام الناس کو اس کی جانب راغب کرنا رسول کے ساتھ دشمنی کے مترادف ہے، اہل علم کو جو معاشرے میں مشہور روایتیں ہیں ان کی چھان بین کر کے بیان کرنا چاہیے، بلا تحقیق و جستجو اور بے بنیاد باتوں سے جہاں اعدائے دین کو طعن و تشنیع کا موقع ملتا ہے وہیں وہ بھی مسلمانوں کی من پسند شریعت اور مصنوعی دین کو حقیقی دین اسلام سمجھتا ہے، پھر یہ دعوت دین میں رکاوٹ کا بڑا سبب بنتا ہے، علامہ البانی فرماتے ہیں کہ موضوعات کے چلن اور اس کے پھیلنے نے بے شمار مفاسد پیدا کر دیے، ان میں سے بعض کا تعلق اعتقادی اور غیبی امور سے ہے اور بعض کا تعلق تشریعی امور سے ہے۔ (۳۲)

شیخ ابوغدہ فرماتے ہیں کہ موضوع حدیثوں کے انتشار سے دینی ثقافت کمزور اور اسلام کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے، اس سے اسلام کا حقیقی چہرہ ان لوگوں کی نگاہ میں مسخ ہو جاتا ہے جو دین سے ناواقف ہیں۔ (۳۳)

☆☆☆

---

(۳۲) سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ (۱/۱۰)　　(۳۳) مقدمہ المنار المنیف ص/۵

تاریخ وضع حدیث

دور رسول اور صحابہ کا ماحول :

اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں صحابہ کرام کا جو دینی شعور اور دعوتی جذبہ تھا، اس کی مثال نہیں ملتی، انہی محترم ہستیوں کو "خیر الناس قرنی" ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہی ﴿کنتم خیر أمة أخرجت للناس﴾ (آل عمران : ۱۱۰) کے اولین مصداق ہیں۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کے ماحول و معاشرہ میں کذب بیانی کی کوئی گنجائش نہ تھی، دروغ گوئی کو جرم عظیم سمجھا جاتا تھا، ان کو کتاب وسنت کا جو صدق وصفا کا درس ملا تھا وہ یہ تھا ﴿یاأیها الذین آمنوا اتقوا اللّٰہ و کونوا مع الصادقین﴾ (توبہ : ۱۱۹) اے مؤمنو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

نیز صادقین کو یہ عظیم بشارت پہلی بار انہی لوگوں کے دل ودماغ نے قبول کیا ﴿قال اللّٰہ هذا یوم ینفع الصادقین صدقهم﴾ (مائدہ : ۱۱۹) اللہ فرمائے گا کہ آج کے دن صادقین کو ان کی صدق گوئی فائدہ پہنچائے گی۔

ان کو رسول کا دیا ہوا یہ درس اچھی طرح یاد تھا کہ "علیکم بالصدق فإن الصدق یهدی إلی البر وإن البر یهدی إلی الجنة" (۳۴) سچائی کو لازم پکڑو یقیناً سچائی بھلائی کا راستہ دکھاتی ہے اور بھلائی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

جھوٹ بولنے کی قباحت، اس کی فضیحت اور اس کی برائی وگناہ بھی حدیث رسول کے ہراول دستہ کو بتایا گیا تھا ﴿فلعنة اللّٰہ علی الکاذبین﴾ (بقرہ : ۹۸) کاذبین پر اللہ کی لعنت ہے۔

---

(۳۴) بخاری (۶۰۹۴)، مسلم (۲۶۰۷)

﴿إن الله لا يهدى من هو مسرف كذاب﴾ (غافر: ۲۸) یقیناً اللہ تعالیٰ مسرفین اور جھوٹوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمان کہ "وإن الكذب يهدى إلى الفجور وإن الفجور يهدى إلى النار" (۳۵) یقیناً جھوٹ فجور کی رہنمائی کرتا ہے اور فجور جہنم میں لے جاتا ہے۔

یہ وعید شدید بھی ان کو اچھی طرح معلوم تھا، ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ کذب بیانی نفاق اور منافق کی علامت ہے حتیٰ کہ بہ تکلف جھوٹ بولنے، ہنسنے ہنسانے کے لیے جھوٹ بولنے کی وعید سے بھی وہ واقف تھے، لہٰذا کسی بھی قسم کی دروغ گوئی کا ان کے یہاں گذر نہ تھا، اسی ماحول کا نقشہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یوں کھینچا ہے "والله ما كنا نكذب وما ندرى ما الكذب" (۳۶) بخدا! نہ ہم جھوٹ بولتے تھے اور نہ جانتے تھے کہ جھوٹ کیا ہے۔

جھوٹ نہ جاننے کی خبر دینا درحقیقت اس سے حضرات صحابہ کرام کی بیزاری، نفرت اور ان کے ماحول میں اس کے عدم وجود کی اطلاع ہے۔

ان اصحاب صدق وصفا، اہل امانت ودیانت کے دور کے بارے میں حضرت حُذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جس میں کسی سے لین دین، بیع وشراء کرنے میں کوئی فکر نہیں ہوتی تھی، اگر کسی مسلمان سے معاملہ کیا جاتا تو اس کی امانت داری اس کو ادا کرنے پر مجبور کردیتی، اور اگر کسی کافر سے کیا جاتا تو حکومت وقت ادا کرا دیتی، لیکن آج صورت حال بدل گئی۔'' (۳۷)

جب خرید وفروخت اور دنیاوی معاملات میں اس قدر معتمد تھے تو دین کے معاملہ میں وہ کس قدر قابل اعتماد رہے ہوں گے، ہر صاحب عقل وخرد اس کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، یہ کتاب وسنت پر جذبہ عمل کا نتیجہ تھا، ہر حکم کو وہ بلا چوں وچرا تسلیم کرتے تھے۔

جہاں تک حدیث رسول کا معاملہ ہے تو اس میں کذب بیانی اور دروغ گوئی تو عام لوگوں سے جھوٹ بولنے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بڑھ کر گناہ ہے پھر کیوں کر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ

(۳۵) مصدر سابق (۳۶) الکامل (۱/۱۶۶)، المستدرک (۱/۱۲۷)
(۳۷) بخاری (۳۵، ۱۳)، مسلم (۲۳۰)

حضرات جونور نبوت سے بلا واسطہ مستفیض ہو رہے تھے حدیث رسول میں ایسی جرأت کر سکتے تھے جو آپسی بات چیت میں نہیں کرتے تھے؟

رسول کے فرمان پر سب سے زیادہ پابندی سے عمل کرنے والے یہی لوگ تھے جن کو آپ نے حدیث رسول میں جھوٹ بولنے کی سزا بھی بتا دی تھی، آپ نے فرمایا کہ "إن كذباً على ليس ككذب على غيره، من كذب على فليتبوأ مقعده من النار" (۳۸) یہ حدیث متواتر ہے۔ میرے اوپر جھوٹ گھڑنا دوسروں پر جھوٹ گھڑنے کی طرح نہیں ہے، جو میرے اوپر جھوٹ گھڑتا ہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کو بناتا ہے۔

نیز اللہ کے رسول ﷺ نے امانت اور دیانت کے ساتھ تبلیغ رسالت کی جو بشارت دی تھی اس نے اس پر چار چاند لگا دیا تھا، آپ نے فرمایا تھا کہ "نضر الله امرأ سمع مقالتي فحفظها ثم أداها إلى من لم يسمعها" (۳۹) اللہ ایسے شخص کو بارونق بنائے جس نے میری بات کو سنا پھر اس کو یاد کر لیا اور ان تک پہنچا دیا جس نے مجھ سے نہیں سنا تھا۔

رسول ﷺ کے زمانہ میں جھوٹ کا امکان نہ تھا:

اگر رسول ﷺ کے زمانہ میں کوئی اس طرح کی جسارت کرتا بھی تو فوراً اس کی گرفت ہو جاتی، کوئی بچ کر نکل نہ سکتا، اس لیے کہ صحابہ کرام ہر افتاد میں رسول کی جانب رجوع فرماتے اور آپ سے دریافت کرتے رہتے تھے، حدیث ضمام بن ثعلبہ اس کی مثال ہے، جو اللہ کی وحدانیت، رسول کی رسالت، نماز و روزہ، حج و زکاۃ کے بارے میں معلومات لینے کے لیے آپ سے بذات خود سوال کرنے آئے تھے۔

عمرو بن سلمہ کی روایت جس میں یہ ہے کہ "میرے والد بھی ان خبروں کی بذات خود تحقیق کے لیے رسول ﷺ کے پاس گئے جو دین کے بارے میں قافلے والوں سے سنتے رہتے تھے۔" (۴۰) پہلی روایت متفق علیہ ہے دوسری روایت صحیح بخاری میں ہے۔

---

(۳۸) بخاری (۱۰۷)، مقدمہ مسلم (۷۰/۱) (۳۹) مسند احمد (۸۰/۲)، دارمی (۲۳۶)، ترمذی (۲۶۲۷) وقال حسن صحیح (۴۰) بخاری (۶۳)، مسلم (۱۲)۔ بخاری (۴۳۰۲)

اگر خدانخواستہ کوئی دین میں ایسی بات شامل کرتا جس کا اس سے تعلق نہیں تو بذریعۂ وحی اس کی اطلاع ہوجاتی اور وہ فوراً گرفت میں آجاتا، جب منافقین کی مکاریوں اور ریشہ دوانیوں کی اطلاع دی جاتی تھی تو شریعت میں کذب بیانی کرنے والوں کو کیسے معاف کیا جاسکتا تھا؟ (۴۱)
لہٰذا جن لوگوں کا خیال ہے کہ رسول کے زمانہ میں یا کسی صحابی نے حدیث گھڑی ہے وہ زعم باطل ہے اس پر کوئی دلیل موجود نہیں۔

دور رسول میں نسبت وضع کی حیثیت :

کچھ اہل علم نے اسباب ورود حدیث میں "من كذب على متعمداً فليتبوأ مقعده من النار" کا ایک سبب ورود ذکر کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص کسی عورت پر عاشق تھا، وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن عورت کے خاندان والے راضی نہ ہوئے، ایک دن یہ شخص اس قبیلہ میں گیا اور کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے اس قبیلہ کے اہل وعیال اور جان و مال کا مالک بنادیا ہے اور یہ اجازت دی ہے کہ میں جہاں چاہوں رہوں اور جیسی مرضی ہو سو کروں، قبیلہ والوں نے رسول ﷺ سے دریافت کیا تو وہ بات غلط تھی، اس پر آپ نے فرمایا "من كذب على متعمداً ..." (۴۲)

بعض اہل علم نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ رسول کے زمانہ میں وضع حدیث کا یہ واقعہ پیش آیا گویا وضع کی ابتدا رسول کے زمانہ میں ہوئی۔

احمد امین مصری کہتے ہیں کہ "يظهر أن هذا الوضع حدث في عهد الرسول ﷺ فحديث "من كذب على متعمداً..." يغلب على الظن أنه قيل لحادثة زور فيها على الرسول ﷺ" (۴۳)

---

(۴۱) الحدیث والمحدثون ص ۴۷۹-۴۸۰

(۴۲) أسباب ورود الحديث لابن حمزة الحسيني (۳/۲۳۲)

(۴۳) الوضع فی الحدیث بحوالہ فجر الاسلام ص ۲۵۸

احمد امین جیسی شخصیات سے یہ توقع نہیں کہ اس روایت کی صحت یا عدم صحت کی خبر نہیں؟ "یغلب علی الظن" کا جملہ بتاتا ہے کہ اس کی صحت پر ان کو یقین نہیں؟ اور اگر صحیح بھی ہوتو احمد امین جیسے مزاج رکھنے والے حضرات کو تو اس کو دلیل بنانا بھی نہیں چاہیے، اس لیے کہ جو لوگ صحیح احادیث کو رد کرنے کی جسارت رکھتے ہیں اور ببانگ دہل انکار سنت کرتے ہیں ان کو تو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے، لیکن بات چوں کہ اپنے مطلب کی ہے تو ضعیف سند سے وارد شدہ حدیث بھی قابل استدلال ہو جاتی ہے اور یہ بے بنیاد ظن غالب بھی ان کا کام کر دیتی ہے، جو صرف فرد ہی پر مبنی ہے البتہ وہ علم جو ثقہ اور صادق وامین کے واسطہ سے منقول ہے محض خبر واحد ہونے یا اس کے ساتھ "ظنی" لگ جانے سے ان جیسے حضرات کے یہاں مردود ہوتا ہے، یہ تو علمی امانت کا خون کرنا ہے۔ بعض دیگر اہل علم نے بھی اس کو اپنی کتابوں میں وضع حدیث کی ابتدا کے لیے قابل استیناس سمجھا ہے۔ (۴۴)

مذکورہ واقعہ مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں۔ جس میں تعارض بھی ہے۔ کئی صحابہ کی جانب منسوب کر کے بیان کیا گیا ہے۔

ایک روایت حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے منسوب کی جاتی ہے جس کو امام طحاوی نے "مشکل الآثار" میں اور امام ابن الجوزی نے "الموضوعات الکبریٰ" میں روایت کیا ہے۔ (۴۵)

لیکن اس روایت کا دار و مدار صالح بن حیان پر ہے جو اس کی روایت میں منفرد ہیں، اہل علم کا ان کے ضعف پر اتفاق ہے، امام بخاری نے ان کے بارے میں "فیہ نظر" کہا ہے، جو جرح شدید ہے، بعض لوگوں نے ان کی روایت کو "متروک" قرار دیا ہے۔ (۴۶)

دوسری روایت ابن الزبیر کی جانب منسوب ہے جس کو ابن الجوزی نے 'الموضوعات'

---

(۴۴) الحدیث والمحدثون ص/۴۸۰

(۴۵) دیکھیے الموضوعات (۱/۵۶)، وأسباب ورود الحدیث (۳/۲۲۲)

(۴۶) میزان الاعتدال (۲/۲۹۲)، الضعفاء والمتروکین لابن الجوزی (۲/۴۸)،

(۱/۵۷) پر روایت کیا ہے، اس میں دوراوی السری بن یزید الخراسانی اور محمد بن الفزاری ابوجعفر ہیں، جن کے بارے میں ڈاکٹر فلاتہ کہتے ہیں کہ ''کتب رجال وتراجم میں ان کا ترجمہ مجھ کو نہ مل سکا، جس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ دونوں مجہول ہیں۔'' (۴۷)

تیسرے راوی داود بن زبرقان ہیں جن کے بارے میں امام ابن ابی حاتم نے "ضعیف الحدیث ، ذاھب الحدیث" اور ابن مَعین نے "لیس بشیء" کہا ہے، حافظ ازدی نے "متروک الحدیث" اور جوزجانی نے "کذاب" کہا ہے، دیگر اہل علم میں سے کسی نے توثیق نہیں کی ہے۔ (۴۸)

ایک روایت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے، جس کو طبرانی نے ''اوسط'' میں روایت کیا ہے، جس میں عطاء بن السائب مختلط راوی ہیں، ان سے وُہیب بن خالد نے اختلاط کے بعد روایت کیا ہے۔ (۴۹)

ایک روایت ابن الحنفیہ کی جانب منسوب ہے، جس کو طبرانی نے "المعجم الکبیر" میں روایت کیا ہے، اس میں ایک راوی ابوحمزہ الشمالی "ضعیف الحدیث ،واھی الحدیث" ہیں۔ (۵۰)

ایک روایت سعید بن جُبیر کی جانب منسوب کی جاتی ہے جس میں ابہام اور جہالت ہے۔ (۵۱)

اس طرح سے یہ واقعہ کسی بھی سند سے اس لائق نہیں کہ اس کا اعتبار کیا جائے چہ جائیکہ وہ قابل احتجاج ہو۔

علامہ ابن الجوزی نے ''الموضوعات'' میں ذکر کر کے اس کی حیثیت کو واضح کر دیا ہے اور ظاہر ہے جس کی سند میں جہالت وظلمات، نکارت وضعف ہو جس کے راوی "متروک، منکر

---

(۴۷) الوضع (۱/۱۸۱) (۴۸) الجرح والتعدیل (۳/۴۱۳)، میزان الاعتدال (۲/۷۔۸)

(۴۹) مجمع الزوائد (۱/۱۴۵)، اسباب ورود الحدیث (۳/۲۳۳)

(۵۰) المجمع (۱/۱۴۵) (۵۱) المصنف (۱۲/۲۶۱)

الحدیث ، واھی الحدیث اورذاھب الحدیث" ہوں، وہ کیوں کر قابل احتجاج ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر عمر فلاتہ فرماتے ہیں کہ کسی کو کثرت طرق سے دھوکہ کھانے اور قوی قرار دینے کی ضرورت نہیں جس انداز و طرق سے یہ روایت مروی ہے وہ اس کی نکارت میں اضافہ کرتی ہے۔ (۵۲)

اس واقعہ کے سیاق میں جو تضاد ہے وہ بھی اس کے ناقابل قبول ہونے کی ایک دلیل ہے، اس کے بعض سیاق میں ہے کہ ''آپ نے قبیلہ والوں کی شکایت سننے کے بعد ابوبکر وعمر کو بھیجا اوران سے یہ کہا کہ اگر زندہ مل جائے تو قتل کر دینا اور جلا دینا اور مردہ ملے تو تمہارا کام ختم، جب یہ لوگ چلے گئے تو پتہ چلا کہ وہ شخص پیشاب کرنے کے لیے اٹھا تھا رات میں سانپ نے کاٹ لیا تو وہ مر گیا، ان لوگوں نے اس کو جلا دیا۔'' (۵۳)

ایک سیاق میں ہے کہ ''آپ نے ایک انصاری صحابی کو بھیجا اور کہا کہ مل جائے تو قتل کر دینا اور جلا دینا، جب یہ گئے تو وہ دفن کیا جا چکا تھا، چنانچہ قبر سے نکال کر اس کو جلا دیا۔'' (۵۴)

ایک سیاق میں ہے کہ'' آپ نے حضرت علی اور حضرت زبیر کو بھیجا اور کہا کہ اگر مل جائے تو قتل کر دینا، جب یہ لوگ گئے تو پتہ چلا کہ سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے وہ مر گیا، لہٰذا یہ لوگ واپس آ گئے۔'' (۵۵)

اسی طرح بعض روایات میں ہے کہ وہ شخص جب وہاں گیا تو کہا کہ "إن رسول الله ﷺ أرسلني إليكم وأمركم أن تزوجوني من فلانة"

بعض میں یہ ہے کہ "أمرني رسول الله ﷺ أن أحكم في نسائكم بما شئتُ"

بعض میں یہ ہے کہ "أمرني أي بيت شئتُ استطلعتُ"

بعض میں یہ ہے کہ "أمرني أن أحكم فيكم برأيي وفي أموالكم وفي كذا وكذا، وكان خطب امرأة منهم في الجاهلية فأبوا أن يزوجوه ثم ذهب حتى نزل على المراءة"

---

(۵۲) الوضع (۱/۱۸۸) (۵۳، ۵۴) مجمع الزوائد (۱/۱۴۵) (۵۵) المصنف (۱۲/۲۶۱)

بعض میں ہے کہ "أمرني أن أحكم في أموالكم ودمائكم ثم انطلق ونزل على تلك المرأة"

اس طرح سے گرگٹ کی طرح شکل بدلنے والی روایت جو تضاد اور نکارت سے صرف پُر ہی نہیں بلکہ اس میں فواحش و منکرات کی ترغیب اور دوسروں کی بے آبروئی کی کھلی اجازت ہے، ناحق قتل کرنا وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو شریعت کے مزاج کے منافی، آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ کے خلاف ہیں، پھر ایسی روایت کیوں کر قابل اعتناء ہو سکتی ہے کسی بھی صحابی سے یہ عمل ناممکن ہے، لہٰذا یہ واقعہ من گھڑت ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ رسول کے زمانہ میں وضع حدیث کی ابتداء نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی صحابی نے اس جرم کا ارتکاب کیا اور نہ ہی اس کا امکان تھا جیسا کہ تفصیل گذر چکی ہے، امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ''ان لوگوں کی بات قابل التفات نہیں، جو حدیث "من كذب علي..." کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے بارے میں وارد ہے جس نے ایک قوم کے پاس جا کر یہ دعویٰ کیا کہ مجھ کو رسول نے بھیجا ہے ... الخ، اس لیے کہ اس کی سند صحیح نہیں۔

ان سب چیزوں کے علاوہ ایک روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حدیث "من كذب علي..." کا سبب ورود کچھ اور ہے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ الغافقی فرماتے ہیں کہ ''آپ نے ہم سے جو آخری عہد و پیمان لیا وہ "عليكم بكتاب الله وسترجعون إلى قوم يحبون الحديث عني فمن قال علي ما لم أقل فليتبوأ مقعده من النار ومن حفظ شيئا فليحدث به" اس کو امام احمد، بزار اور طبرانی نے روایت کیا ہے جس کے رجال ثقات ہیں۔ (٥٦) اللہ کے رسول نے فرمایا ہے کہ اللہ کی کتاب لازم پکڑنا، آپ لوگ ایسی قوم کے پاس جائیں گے جن کی خواہش ہوگی کہ میری باتیں سنیں، پس کسی شخص نے وہ بات میری جانب منسوب کر دی جو میں نے نہیں کہا ہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنائے، جس کو میری بات اچھی طرح یاد ہو وہی بیان کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سبب ورود یہ نصیحت ہے جو آپ نے حدیث کے بیان کرنے میں احتیاط کی

---

(٥٦) مجمع الزوائد (۱/ ۱۴۴)

رہنمائی کی تھی۔

ایسے ہی "حدثوا عن بنی إسرائیل ولا حرج،ومن کذب علی..." نیز "إن کذباً علی لیس ککذب علی أحد،من کذب علی متعمداً..." کا سیاق یہ بتاتا ہے کہ آپ نے یہ حدیث اسی احتیاط کے تعلق سے کہی تھی نہ کہ کسی جھوٹ کے پس منظر میں۔

عبدالرحمٰن بن عدیس رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب وضع کی حیثیت :

ایک دوسرے صحابی جن کا نام عبدالرحمٰن بن عدیس ہے اور جو اصحاب شجرہ (بیعۃ الرضوان) میں سے ہیں،ان کی جانب بھی یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیحت میں حدیث گھڑی ہے اور اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ وضع حدیث کی ابتداء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوئی ہے۔

واقعہ یوں ذکر کیا جاتا ہے کہ مصر کی طرف سے جو باغی گروپ آیا تھا اس کی قیادت عبدالرحمٰن بن عدیس کرر ہے تھے،دوسرے صحابی ابوثور فہمی کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عدیس منبر رسول پر گئے اور اس پر انہوں نے یہ کہا کہ ابن مسعود نے مجھ کو خبر دی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ "إن عثمان أضل من عیبة علی بعلها" دوسرے لفظ میں (من عتبة علیٰ قفلها) ابوثور فرماتے ہیں کہ میں نے عثمان کو اس کی اطلاع دی تو انہوں نے فرمایا کہ "کذب واللّٰہ ابن عدیس،ما سمعها من ابن مسعود ولا سمعها ابن مسعود من رسول اللّٰہ" (۵۷)

اس روایت کو ابن الجوزی نے روایت کیا ہے،جس کی سند کا دارومدار ابوبکر بن عبیدہ (ابن ابی الدنیا) قال حُدثت عن کامل بن طلحة حدثنا ابن لهیعة ثنا یزید بن عمرو المعافری پر ہے۔

اس روایت میں ابن ابی الدنیا اور کامل بن طلحہ کے درمیان انقطاع پایا جاتا ہے جیسا کہ سند سے واضح ہے اور خود کامل بن طلحہ متکلم فیہ راوی ہیں۔

---

(۵۷) الموضوعات (۱/۳۳۵)، نیز دیکھیے اللآلی المصنوعۃ (۱/۳۱۸)، وتنزیہ الشریعۃ (۱/۳۴۹)

دوسری علت یہ ہے کہ اس میں ابن لہیعہ ضعیف اور مختلط ہیں اور ابن لہیعہ سے کامل بن طلحہ نے یہ روایت اختلاط کے بعد نقل کیا ہے، لہٰذا ان دوعلتوں کی وجہ سے یہ روایت قابل قبول نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کو امام ابن الجوزی نے موضوعات میں ذکر کر کے اس کے مقام کو واضح کر دیا ہے۔

اس واقعہ کو ابن لہیعہ سے ولید بن مسلم نے بھی روایت کیا ہے لیکن انہوں نے موقوفاً روایت کیا ہے یعنی یہ کہ ابن عدیس نے اپنی طرف سے یہ بات حضرت عثمان کو کہی تھی نہ تو اس میں ابن مسعود کا واسطہ ہے اور نہ رسول کا حوالہ ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی روایت مرفوعاً صحیح نہیں۔

جب کہ اس کا موقوفاً بھی صحیح ہونا محل نظر ہے اس لیے کہ ابن لہیعہ ہر صورت میں اس کی سند میں موجود ہی ہیں اور ان سے ولید بن مسلم نے بھی اختلاط کے بعد روایت کیا ہے، ابن لہیعہ سے صرف عبادلہ کی روایت اختلاط سے پہلے کی ہے، بقیہ سب کی اختلاط کے بعد کی ہے۔

امام ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ اوائل واواخر سب کا سماع ایک جیسا ہے، ہاں یہ الگ بات ہے کہ ابن المبارک اور ابن وہب ان کی اصل کتابوں کو دیکھتے تھے اور یہ یعنی ابن لہیعہ قابل احتجاج نہیں، ابن معین فرماتے ہیں کہ وہ کتابوں کے جلنے سے پہلے اور بعد ہر حال میں ضعیف ہیں۔ (۵۸)

اگر اس کو موقوفاً صحیح بھی مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کی اپنی ذاتی رائے ہے جو حضرت عثمان کے بارے میں انہوں نے قائم کی تھی، حالاں کہ یہ ان خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے پر رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی، جس کو "بیعۃ الرضوان" کہا جاتا ہے۔

پھر بھی ان سے ناراض ہونے کا امکان ہو سکتا ہے اس لیے کہ یہ صحابی رسول مدینہ میں نہیں تھے بلکہ مدینہ سے بہت دور مصر میں تھے اور مصر ابن سبا کا سیاسی مرکز تھا، جہاں حضرت عثمان کے خلاف طرح طرح کی باتیں اڑائی جاتی تھی اور افواہیں پھیلائی جاتی تھیں، نادانستہ طور سے وہ بھی ان کے دام فریب میں آ گئے اور حضرت عثمان کے مخالف بن گئے، مخالفت کی صورت میں ایک

---

(۵۸) میزان الاعتدال (۲/۴۷۷)

دوسرے پر تنقید کرنا انسانی فطرت ہے لہٰذا اس طرح کی بات کہہ دینا بعید از قیاس نہیں، بہر حال اس واقعہ سے بھی اس پر استدلال درست نہیں کہ کسی صحابی رسول نے وضع حدیث کا ارتکاب کیا ہے، واللہ اعلم۔

ڈاکٹر عمر فلاتہ فرماتے ہیں کہ اس طرح کی بات رسول کی جانب منسوب کرنا بعید از قیاس ہے وہ بھی علی الاعلان منبر رسول پر یہ بات کہی جائے اور کوئی اس پر نکیر نہ کرے ممکن نہیں۔ (۵۹)

نیز فرماتے ہیں کہ اس روایت کے بیان کرنے میں ابن لہیعہ سے غلطی ہوئی ہے، وہ ضعیف ہونے کے علاوہ ضعفاء سے تدلیس کرتے تھے اور مختلط بھی ہو گئے تھے، اگر یہ کسی روایت کے بیان کرنے میں منفرد ہوں تو جمہور محدثین کے یہاں ان کی روایت مردود ہوتی ہے اور یہ اسی طرح کی روایت ہے جو نا قابل اعتبار ہے۔ (۶۰)

ان کے اندر تشیع بھی پایا جاتا تھا اور یہ روایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں ہے، اگر بدعتی کی روایت سے مذہب کی تائید ہو رہی ہو تو اس کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی، اس اعتبار سے بھی یہ مقبول نہیں۔

وضع حدیث کا پس منظر :

رسول اللہ ﷺ کا دور گذر جانے کے بعد خلفاء راشدین۔ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم۔ کا دور آیا، جس میں سنت رسول کے تعلق سے انتہائی محتاط رویہ اختیار کیا گیا، خاص طور سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو رعب و دبدبہ تھا کسی کو شریعت کے خلاف پر مارنے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی، حدیث رسول پر آپ کی نگرانی بڑی شدید تھی، قلت تحدیث کا ضابطہ آپ ہی کا دیا ہوا ہے، روایت حدیث میں تحقیق کی رہنمائی آپ ہی نے فرمائی ہے۔ (جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے)

لیکن جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور گذر گیا اور آپ کی شہادت سے وہ مضبوط

---

(۵۹) الوضع فی الحدیث (۱/۱۹۰) (۶۰) الوضع (۱/۱۹۸)

بند ٹوٹ گیا جو فتنوں کے لیے مضبوط باندھ تھا، اب فتنوں کو سر اٹھانے کا موقع ملا چنانچہ انہی فتنوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے خونی پنجوں میں دبالیا، آپ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے باہمی اختلافات نے فرقوں کی شکل اختیار کرلی، یوں تو خوارج کا وجود اسی وقت ہو چکا تھا جب انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان کے خلاف خروج و بغاوت کی اور پھر حضرت علی کے دامن میں پناہ لی، ابھی چند ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ یہ باغیانہ مزاج وہاں بھی رنگ لایا اور عین لڑائی میں جب جنگ صفّین آخری مرحلہ میں تھی انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا اور ''خوارج'' کے نام سے موسوم ہوئے، یہ کسی بھی صورت میں حضرت علی کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھے ''کلمة حق أريد به الباطل'' کا سہارا لیا، مسئلہ تحکیم کو لے کر حضرت علی کو کافر و مرتد تک قرار دے دیا۔

ٹھیک ان کے مقابلہ میں ایک دوسری پارٹی تھی جو ہر حال میں بظاہر حضرت علی کا ساتھ دینے کو تیار تھی، انہوں نے اپنے لیے ''شیعانِ علی'' کا خطاب منتخب کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس قدر غلو کیا کہ ''عصمتِ علی'' بلکہ ''الوہیتِ علی'' کا عقیدہ بنالیا۔

تیسری پارٹی وہ تھی جو پہلے ہی سے امیر معاویہ کی قیادت میں شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بدلہ کے نام پر حضرت علی سے نبرد آزما تھی۔

امویّین، خوارج اور شیعانِ علی کا تشخص ہو جانے سے اپنے آپ چوتھی جماعت کو بھی ایک پارٹی کی شکل میں دیکھا جانے لگا یہ عام مسلمانوں کی جماعت تھی جنہوں نے افراط و تفریط سے ہٹ کر سمع و طاعت کو ''لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق'' کی بنیاد پر اپنا معیار بنایا، وہ ان لڑائیوں کو جو باہمی لڑائیاں تھیں فتنہ تصور کرتے تھے اور ان سے الگ تھلگ رہنے کی تلقین کرتے، عموماً صحابہ کرام اور اہل علم کی جماعت اس پر گامزن تھی انہی کو جمہور کہا جانے لگا، اگرچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے تنازل اختیار کرنے کے بعد ''عام الجماعه'' کا بھی سال آیا لیکن ان پارٹیوں کا خاتمہ نہ ہوا، یزید بن معاویہ کے خلیفہ بنتے ہی دبی ہوئی یہ چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور

فتنوں کے دہانے کھل گئے، ان پارٹیوں کا اختلاف جو ابتدا میں بالکل سیاسی اختلاف تھا آہستہ آہستہ دینی شکل اختیار کر گیا اور فرقوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

وضع حدیث کی ابتدا :

شیعان علی میں سے وہ جماعت جو ابن سبا سے قریب تھی، سب سے پہلے حدیث رسول میں جھوٹ بولنے کی بیماری ان میں شروع ہوئی اور خود سردار قوم ابن سبا کو اس کار شر میں اولیت حاصل ہے، کذب بیانی ودروغ گوئی اور حضرت علی کی شخصیت میں غلو کی بنیاد پر حضرت علی نے اس کو ہلاک کر دیا تھا۔ (٦١)

بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ اس نے کذب بیانی سے کام ضرور لیا تھا لیکن اس کے دروغ گوئی کا حلقہ ابھی اتنا وسیع نہیں ہوا تھا کہ حدیث رسول تک پہنچ جائے بلکہ وہ حضرت علی ہی کی حد تک محدود تھی، وہ طرح طرح کی باتیں گھڑ کر کے حضرت علی کی جانب منسوب کر دیتا تھا اور لوگوں میں اس کی تشہیر کرتا، حضرت علی کے ''وصی'' ہونے کا دعویٰ اسی کی ایجاد ہے، رسول کی رجعت، حضرت علی کی الوہیت وغیرہ کا عقیدہ اسی کا من گھڑت عقیدہ تھا لیکن وہ ان باتوں کو رسول کی طرف منسوب نہیں کرتا تھا۔ (٦٢)

ڈاکٹر عمر حسن فلاتہ کا یہی خیال ہے، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ وضع حدیث کی ابتداء پہلی صدی کے تیسرے دہے میں ہوئی ہے اور اس کی سوئی انہوں نے مختار بن عبید ثقفی الکذاب کی طرف گھمائی ہے اور اس کو راجح قرار دیا ہے۔ (٦٣)

شیخ ابوشہبہ اور شیخ ابوزہو کا خیال ہے کہ وضع حدیث کی ابتداء ۴۱ھ کے آس پاس ہوئی ہے۔

ڈاکٹر عمر فلاتہ نے ان کے اقوال کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی حالاں کہ آپ نے جن

---

(٦١) لسان المیزان : ترجمہ ابن سبا (٦٢) الوضع فی الحدیث (۱/۲۰۱۔۲۰۲)

(٦٣) الوضع فی الحدیث (۱/۲۱۳۔۲۱۴)

دلائل کا ذکر کیا ہے وہ اپنے مدلول پر صراحت کے ساتھ دلالت نہیں کرتے بلکہ جن لوگوں نے ۴۰ھ کے آس پاس وضع حدیث کی ابتدا بتائی ہے ان کی بات زیادہ قرین قیاس ہے اور ان کے دلائل زیادہ واضح ہیں۔

عبداللہ بن سبا جیسا بدعقیدہ شخص جو حضرت علی کو معبود اور الٰہ کہہ سکتا ہے اور ان پر جھوٹ گھڑنے کی عادت ہوگئی تھی جو خلیفہ وقت کے خلاف عوام کو بغاوت پر اکسا سکتا ہے، وہ بھی مصر جیسی سرزمین میں جہاں صحابہ کرام کی تعداد انتہائی کم تھی، کیا ایسا شخص حدیث گھڑنے میں کوئی خطرہ یا کوئی قباحت محسوس کرے گا؟

محترم ڈاکٹر صاحب نے امام طبری کے حوالے سے اس کا ایک قول ذکر کیا ہے خود اس میں ایک ایسا جملہ موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی کی ولایت کا عقیدہ اسی نے رسول کی جانب منسوب کیا ہے چنانچہ اس نے کہا کہ "لكل نبي وصي وعلي وصيي، محمد خاتم الأنبياء، وعلي خاتم الأوصياء ومن أظلم ممن لم يُجز وصية رسول الله" (۶۴) ہر نبی کا کوئی نہ کوئی وصی ہوتا ہے، محمد ﷺ خاتم الانبیاء اور علی خاتم اوصیاء ہیں، اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے جو رسول کی وصیت کو نافذ نہ کرے۔

حضرت علی کو وصی بتانے کے بعد یہ کہنا کہ جس نے رسول کی وصیت کو نافذ نہ کیا اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے؟ یہ رسول کی جانب صریح نسبت ہے، امام ذہبی نے خزیمہ بن نصیر سے یہ نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت علی کو صفین میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ "قاتلهم الله أي عصابة بيضاء سوّدوا وأي حديث من حديث رسول الله أفسدوا" (۶۵) اللہ تعالیٰ ان کو برباد کرے کیسے بے داغ لوگوں کو انہوں نے داغدار بنادیا اور حدیث رسول کو کس طرح برباد کیا۔

اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وضع حدیث کی ابتدا ابن سبا اور اس کی پارٹی نے کی تھی، امام

(۶۴) الوضع فی الحدیث (۲۰۱/۱)، بحوالہ تاریخ طبری (۳۴۰/۴)

(۶۵) تذکرۃ الحفاظ (۱۲/۱) (۶۶) لسان المیزان (۲۸۹/۳)

شعبی رحمہ اللہ نے جو بات کہی ہے وہ اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے وہ فرماتے ہیں کہ "اول من کذب عبداللہ بن سبا" (٦٦) سب سے پہلے کذب بیانی ابن سبا نے کی ہے، یہاں کذب بیانی سے مراد عام کذب نہیں بلکہ حدیث میں کذب بیانی مقصود ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ "بین یدی الساعة ثلاثین کذابا وإنک لأحدھم" (٦٧) قیامت سے پہلے تیس بڑے جھوٹے ہوں گے اور تو ان میں کا ایک ہے۔

جو شخص دین کو تباہ و برباد کرنے کا بیڑا اٹھائے اس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی، وہ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے، حضرت علی کے وصی یا خلیفہ ہونے کے متعلق جو روایتیں گھڑی گئی ہیں وہ خود اس پر غماز ہیں کہ یہ روایتیں ان کو خلیفہ بنانے کے پس منظر میں گھڑی گئی ہیں، جن سے ان کی فضیلت کا اظہار ہوتا تھا، خلیفہ بنائے جانے کے بعد "علی وصیی وخلیفة من بعدی" گھڑنے کی کوئی ضرورت باقی ہی نہیں رہ گئی، اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وضع حدیث کی ابتدا ۳۶ھ کے آس پاس کی ہے۔

علامہ ابن سیرین متوفی ۱۱۰ھ کے قول "فلما وقعت الفتنة قالوا سمو النا رجالکم" (٦٨) سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ فتنہ کے بعد وہاں کوئی خرابی ضرور اہل علم نے محسوس کی تھی تبھی انہوں نے سند کی طلب شروع کی، فتنہ سے مراد علماء اہل سنت کے یہاں شہادت عثمان رضی اللہ عنہ اور اس سے متصل رونما ہونے والے اختلافات وحادثات ہیں۔ (٦٩)

حضرت ابن عباسؓ کا یہ کہنا کہ "إنا کنا نحدث عن رسول اللہ ﷺ إذا لم یکن یکذب علیه فلما رکب الناس الصعب والذلول ترکنا الحدیث عنه" (٧٠) سے اشارہ انہی فتنوں کی جانب ہے جس کی طرف ابن سیرین نے اشارہ کیا ہے، اس لیے کہ اس وقت اسی فتنے کو شہرت حاصل تھی۔

---

(٦٧) مسند أبی یعلیٰ، لسان المیزان (۳/۲۹۰) (٦٨) مقدمہ مسلم ۱/۸۴

(٦٩) ارشاد النبیل ص/۱۳ (٧٠) مقدمہ مسلم (۱/۸۰)

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث رسول میں کذب بیانی شہادت عثمان کے بعد کی پیداوار ہے، امام حاکم فرماتے ہیں "قد بدأ ظهور الوضع في سنة إحدى و أربعين بعد الهجرة على عهد الخليفة الرابع علي بن أبي طالب حين تنازع المسلمون شيعاً وأحزاباً وانقسموا سياسياً إلى جمهور وخوارج وشيعة" (۷۱) ظہور وضع کی ابتدا ۴۱ھ میں ہوئی ہے جب خلیفہ رابع حضرت علی کے دور میں مسلمانوں میں تفرقہ ہوا اور وہ جمہور، خوارج اور شیعہ میں بٹ گئے۔

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ابھی اس شر کی ابتدا تھی لہذا ہر کوئی اس کی جرأت نہیں کرتا تھا، خال خال افراد ابن سبا اور اس کی جماعت میں تھے جو ایسا مزاج رکھتے تھے، آہستہ آہستہ اس میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کام پر دوسروں کو ورغلایا جاتا اور اس کے لیے مال وزر اور طاقت کا استعمال کیا گیا۔

چنانچہ مختار بن عبید کذاب نے اس طرح کی پیشکش کچھ لوگوں سے کی تھی، اگر چہ یہ جرم کرنے پر وہ راضی نہ ہوئے اور بعض نے اپنی جان بھی قربان کردی، لیکن اس سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ وضع حدیث کے لیے لوگوں کو ورغلایا جاتا تھا۔ (۷۲) یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ وضع حدیث کی ابتدا فتنہ ابن سبا سے ہوئی ہے، اگر چہ ابتدائی وقت میں رفتار انتہائی سست تھی، البتہ آگے چل کر اس میں کچھ اور اضافہ ہوا اور مختار بن عبید کے زمانے میں اس میں اور تیزی آئی۔

☆☆☆

---

(۷۱) فتنہ انکار حدیث کا ایک نیا روپ (۳۴۰/۳) بحوالہ معرفۃ علوم الحدیث للحاکم

(۷۲) الوضع (۲۱۲/۱)

وضاعین کے اقسام واسباب وضع

یہ بات مسلم ہے کہ بہت ساری حدیثیں اپنی طرف سے گھڑ لی گئی ہیں اور ان کی نسبت رسول ﷺ کی طرف کردی گئی ہے، حدیثیں کیوں گھڑی گئیں؟ اس کے مختلف مقاصد تھے، ابتداء میں اس کے مقاصد سیاسی تھے، آگے چل کر اس میں تنوع پیدا ہوگیا اور مقاصد مختلف ہوگئے، کسی نے اپنے دین ومذہب کی سربلندی وقوت بہم پہنچانے کے لیے یہ کام شروع کیا تو کسی نے ذاتی اغراض کی خاطر یہ فعل شنیع کیا، کچھ نے خواہش نفس کی اتباع میں یہ کام کیا، کچھ تجارتی مقاصد ودنیاوی اغراض نے بھی اس میں حصہ لیا، کسی نے اسلام کو نقصان پہنچانے تو کسی نے حکام وقت کا تقرب حاصل کرنے اور بعض نے شہرت طلبی کے لیے بھی یہ کام کیا ہے اور کچھ لوگوں نے لوگوں کو نیکیوں کی طرف راغب کرنے یا برائیوں سے روکنے اور انجام سے ڈرانے کے لیے بھی حدیثوں کو گھڑ لیا ہے، اس طرح کے وضاعین ایسے لوگ بھی ہیں جن کو زاہد وصالح ومتقی سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ لوگ اسلام کے لیے سخت نقصان دہ ہیں کیوں کہ ان کی ظاہری ثقاہت وتقوی پر اعتماد کرکے عوام الناس ان کی گھڑی ہوئی احادیث پر عمل شروع کردیتے ہیں، ان مقاصد کو جاننے کے لیے وضع حدیث کے اسباب کا جاننا ضروری ہے کیوں کہ یہاں اسباب ہی مقاصد کی تعیین کرتے ہیں، ان اسباب کو چار بنیادی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

سیاسی اسباب، دینی اسباب، دنیوی اسباب، عصبیت پرستی :

۱- سیاسی اسباب :

جب انسان پر خالص سیاست کا غلبہ ہوجاتا ہے تو روحانیت ختم ہوجاتی ہے، پھر سیاست داں اپنے آپ کو اور اپنی سیاست کو چمکانے کے لیے اور اس کو تہ وبالا ہونے سے محفوظ

رکھنے کے لیے سب کچھ کر گذرتا ہے، دروغ گوئی وکذب بیانی، رشوت خوری ورشوت دہی، دھاندلی اور مکاری سے لے کر قتل وغارت گری، فتنہ وفساد تک سب کچھ روا رکھا جاتا ہے بلکہ موجودہ زمانے میں یہی چیزیں سیاست کی روح بن گئی ہیں، قدیم زمانہ میں بھی سیاست کا کھیل جدا نہ تھا، حکمرانوں کا باپ اور بیٹے کو قتل کرنا، بھائیوں اور قرابت داروں کو تختۂ دار پر لٹکا دینا ان کی سنت ہے، موجودہ زمانہ میں ہزاروں بے گناہوں کا قتل عام اسی سیاست کا شاخسانہ ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ جب سیاست پر روحانیت کا غلبہ ہوتا ہے یا روحانیت کا اثر ہوتا ہے تو پھر حقیقت میں وہی سیاست حکیمانہ قیادت میں بدل جاتی ہے، عوام الناس سکون واطمینان محسوس کرتے ہیں، جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت ہوتی ہے، عدل ومساوات قائم ہوتا ہے، پھر یہی سیاست دان اگر صاحب ایمان ہے تو ''امام عادل'' کے عظیم خطاب سے سرفراز ہو کر عرش عظیم کے سایہ کا مستحق بھی ہو جاتا ہے اور بقول رسول ﷺ "خیر الناس انفعهم للناس" (۱) سب سے بہتر انسان وہ ہے جو دوسروں کے لیے مفید ہو) کی بشارت اس کو ملتی ہے، یہی سیاست طریقۂ نبوت پر سمجھی جاتی ہے۔

دور رسالت میں جب اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو ''منہاج نبوت'' پر سیاست کی بنیاد ڈالی گئی، پھر آپ کے بعد خلفاء راشدین کا دور آیا، ان کا ابتدائی دورِ سیاست بطریقۂ نبوی کا روشن مینار تھا، حاکم ورعایا سب خدا ترس تھے، خلفاء کی گرفت عوام پر کافی مضبوط تھی اس لیے کہ "أولی الامر" کی اطاعت وفرماں برداری کو وہ جزء ایمان سمجھتے تھے ﴿یا أیها الذین آمنوا أطیعوا الله وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم﴾ (نساء : ۵۹) اے ایمان والو! اللہ، اس کے رسول اور ذمہ داروں کی اطاعت کرو۔ اللہ کے اس حکم کو وہ اچھی طرح سے سمجھتے تھے جس میں اہل ایمان کو خاص طور سے مخاطب کیا گیا ہے۔

آہستہ آہستہ سمع وطاعت کا جذبہ ماند پڑتا گیا اور اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان "وان

---

(۱) صحیح الجامع الصغیر (۳۲۸۹)

أمر عليكم عبد حبشي" (۲) اگرچہ تمہارا زمہ دار کالا کلوٹا بدشکل غلام ہی کیوں نہ ہو اس کی اطاعت وفرماں برداری سے دست بردار نہ ہونا کو بھلا دیا گیا۔

پھر جب دانستہ یا نادانستہ طور سے مسلمان اس درس کو بھول گئے تو خلفاء کی گرفت خلافت پر کمزور پڑ گئی، یہی کچھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں ہوا اور حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ خلیفۂ وقت کو ظلماً شہید کر دیا گیا، جو مسلمانوں میں بہت بڑا فتنہ تھا اور یہی آگے چل کر انتشار کا سبب بنا، اسی کے پس منظر میں مسلمانوں میں نئی نئی سیاسی جماعتیں پیدا ہوئیں، انداز فکر میں مماثلت ختم ہوگئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں تین سیاسی فرقے نمودار ہوئے، ایک پارٹی نے کہا کہ ''ہم حضرت علی کے ساتھ نہیں رہ سکتے کیوں کہ وہ۔ نعوذ باللہ۔ کافر ومرتد ہوگئے، انسانوں کے فیصلے کو انہوں نے کیوں قبول کیا۔'' لہٰذا انہوں نے بغاوت وخروج کیا اور ''خارجی'' بن گئے۔

دوسری پارٹی نے کہا ''ہم بہرصورت حضرت علی کا ساتھ دیں گے اس لیے کہ آپ معصوم ہیں آپ سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔'' لہٰذا ان کا خطاب ''شیعان علی'' پڑ گیا۔

''شیعان معاویہ'' کی پارٹی پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ شام اور عراق میں مخاصمت جاری ہوگئی، خاص طور سے عراق میں سیاسی اتھل پتھل جاری رہا، بچے عام مسلمان جو خلیفۂ وقت کو خلیفہ تسلیم کرتے تھے اور کسی سیاست میں آئے بغیر صاف دل سے خلیفہ کے متبع تھے، وہ ان سیاست بازیوں کو جس کو لوگوں نے اپنے اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا' فتنہ تصور کرتے تھے اور اس سے الگ تھلگ رہنے کی وصیت کرتے تھے، ان سیاست بازیوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے حدیث رسول کو مشق ستم بنایا، اس لیے کہ اس اِتباعِ کتاب وسنت کے دور میں کوئی بات اس وقت تک قابل قبول نہ ہوتی تھی جب تک کہ کتاب وسنت میں اس کی دلیل نہ ہو، یہ کتاب اللہ میں خرد برد تو نہیں کر سکتے تھے لہٰذا سنت رسول کو استعمال کیا اور رسول کی جانب غلط باتوں کو منسوب کرنے لگے، ان سیاسی جماعتوں میں سے بعض یہ ہیں :

---

(۲) مسلم (۳۷)

شیعان علی :

عبداللہ بن سبا کی پارٹی جنہوں نے آگے چل کر ''شیعان علی'' کا خطاب اپنے اوپر چسپاں کرلیا تھا اور بعد میں حضرت علی کا نام بھی محذوف ہوگیا پھر یہ پارٹی ''شیعہ'' کے نام سے موسوم ہوئی، پھر سیاسی پارٹی سے ہٹ کر دینی فرقہ میں بدل گئی، اس پارٹی نے اپنے ابتدائی مرحلہ ہی میں حدیث گھڑنے کا کام شروع کر دیا۔

اس تفصیل میں جانے سے پہلے ان کا مختصر تعارف پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

تشیع یا شیعیت کا معنی ہے : مدد کرنا اور تعاون کرنا۔

متقدمین علماء اہل سنت کے یہاں ان لوگوں کو شیعہ کہا جاتا تھا جو حضرت علی کو حضرت عثمان پر بطور خلیفہ مقدم مانتے تھے۔

اور جو حضرت علی کے مخالفین کو برا بھلا کہتے تھے ان کو ''غالی شیعہ'' کہا جاتا تھا۔

البتہ متاخرین کے یہاں غالی شیعہ وہ ہے جو حضرت علی کو ہر ایک پر مقدم مانتا ہے اور خلافت کو صرف حضرت علی کا حق تصور کرتا ہے اور دیگر حضرات کو غاصب اور کافر قرار دیتا ہے۔

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ "فالشيعي الغالي في زمان السلف وعرفهم هو من تكلم في عثمان والزبير وطلحة ومعاوية وطائفة ممن حارب عليا وتعرض لسبهم، والغالي في زماننا وعرفنا هو الذي يكفر هؤلاء السادة ويتبرأ من الشيخين أيضاً وهذا ضال مُضل" (۳) سلف کے زمانہ میں متشدد شیعہ وہ ہوتا تھا جو حضرت عثمان، طلحہ، زبیر، امیر معاویہ اور حضرت علی کے مخالف جماعت کو برا بھلا کہتا تھا، اور ہمارے زمانہ میں متشدد وہ ہے جو ان حضرت کو کافر گردانتا ہے اور شیخین سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے یہ گمراہ اور گمراہ گر ہے۔

البتہ وہ لوگ جو مجرد حضرت علی کو حضرت عثمان پر مقدم مانتے ہیں اور شیخین کی خلافت کو صحیح مانتے ہیں یا ان پر سب وشتم نہیں کرتے تو یہ معتدل شیعہ ہیں۔

---

(۳) میزان الاعتدال (۱/۶)

شیعان علی کے یہاں تشیع یہ ہے کہ حضرت علی رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں اور آپ کے بعد امام وصی ہیں اور امامت (جو مثل بادشاہت ہے اس) کا حق صرف انہی کی اولاد میں ہے، ان میں مختلف فرقے ہیں، بعض کے یہاں اس قدر غلو پایا جاتا ہے کہ وہ حضرت علی کی الوہیت اور وفات کے بعد رجعت پر یقین رکھتے ہیں۔

شیخ صفی الرحمٰن مبا کپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رجعت کا عقیدہ شیعہ کہ کتابوں میں یہ ہے کہ مہدی قائم الزمان کا ظہور ہوگا اہل سنت کی تمام مساجد بشمول مسجد نبوی کو ڈھادیا جائے گا حضرت ابوبکر وعمر عثمان حضرت عائشہ وحفصہ اور دیگر خلفاء اہل سنت کو ان کی قبروں سے نکال کر زندہ کیا جائے گا ان سے انتقام لیا جائے گا تمام شیعان علی زندہ کردیے جائیں گے سب مل کر تمام مخالفین شیعہ کو قتل کریں گے اس طرح پورے عالم میں امن وامان قائم ہوگا۔ (۴)

ان میں سے بعض کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت علی ہی اصل میں نبی تھے، حضرت جبرئیل کے سمجھنے میں غلطی ہوئی، اور یہ کہ موجودہ قرآن ناقص ہے، اصل قرآن امام غائب لے کر چلے گئے، یہی امام غائب امام مہدی ہوں گے، ان کا سب سے بدترین عقیدہ ''عقیدہ تقیہ'' ہے۔

انہی روافض میں سے ایک جماعت ہے جس کو ''خطابیہ'' کہا جاتا ہے جو آل بیت میں بالترتیب حلول کے قائل ہیں، شیخ محمد ابوزہو فرماتے ہیں کہ ''حقیقت یہ ہے کہ تشیع محض ایک پردہ ہے جس کے پیچھے اعداء اسلام، یہود ونصاریٰ، مجوس وملحدین کی ایک جماعت تھی جو اس دین کو دجل وفریب سے کمزور کرنا چاہتی تھی، اس لیے کہ وہ قوم (قوم عرب) جس کو وہ (اہل فارس) سب سے بدترین سمجھتے تھے ان کے اوپر ان کی حکومت ناقابل برداشت تھی، چوں کہ طاقت کے ذریعہ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے لہٰذا دجل وفریب سے کام لے کر اہل بیت سے محبت وعقیدت کا اظہار کیا اور حدیث کے گھڑنے میں ہر ایک پر سبقت لے گئے۔'' (۵)

---

(۴) منۃ المنعم فی شرح صحیح مسلم (۱/۴۱)　　(۵) الحدیث والمحدثون ص/۹۱-۹۲

اہل سنت روافض پر اعتماد نہیں کرتے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ "مـافـی أهل الأهواء أشهد بالزور من الرافضة" (٦) بدعتیوں میں رافضہ سے جھوٹا کوئی نہیں ہے۔

امام ابن المبارک فرماتے ہیں کہ "الـدین لأهل الحدیث والکلام والحِیل لأهل الرأی والکذب للرافضة" (۷) دین داری اہل حدیثوں کے پاس ہے، فلسفیانہ گفتگو اور حیلہ سازی اصحاب رای (خالص فقہاء) کے یہاں ہے اور جھوٹ رافضیوں کے پاس ہے۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ "رافضیوں کی کذب بیانی ضرب المثل بن گئی ہے۔" (۸)

یہی وجہ ہے کہ ائمہ ان کی شہادت کو بھی قبول نہیں کرتے، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کا یہی خیال ہے۔ (۹)

امام ابوحنیفہ سے سوال کیا گیا کہ حدیث کس سے پڑھی جائے؟ تو انہوں نے جواب دیا "مِن کل عدل فی هواه اِلا الشیعة" (۱۰)

شریک القاضی کہتے ہیں کہ "ہر ایک سے روایت کرو سوائے روافض کے، کیوں کہ یہ حدیث گھڑتے ہیں اور اس کو دین سمجھتے ہیں۔" (۱۱)

اس عدم اعتماد کی خاص وجہ یہ تھی کہ حدیث گھڑنے میں یہ انتہائی شہرت یافتہ ہو چکے تھے اور انہی کے ہاتھوں سے اس شر کا افتتاح ہوا اور وضع حدیث کا ناپاک عمل انہوں نے ہی شروع کیا تھا، جس کا اعتراف مشہور شیعی عالم ابن ابی الحدید نے بھی کیا ہے، وہ کہتا ہے "اِن أصـل الأکـاذیـب فی أحادیث الفـضائل کان من جهة الشیعة فإنهم وضعوا فی مبدا الأمر أحادیث مختلفة فی صاحبهم، حملهم علی وضعها عداوة خصومهم" (۱۲)

---

(٦) فتح المغیث (۳۰۱/۲)

(۷) السنۃ قبل التدوین ص/۱۹٦، بحوالہ المنتقی من منہاج الاعتدال ص/۴۸۰

(۸) مصدر سابق (۹) الکفایۃ فی علم الروایۃ ص/۱۲۵

(۱۰) الکفایۃ ص/۱۲٦ (۱۱) السنۃ ومکانتہا ص/۷۹ بحوالہ منہاج السنۃ

(۱۲) السنۃ قبل التدوین ص/۱۹۵ بحوالہ شرح نہج البلاغۃ (۲٦/۳)

حقیقت یہ ہے کہ فضائل میں وضع حدیث کی بنیاد شیعوں کی طرف سے رکھی گئی ہے، انہوں نے مختلف حدیثیں اپنے صاحب (حضرت علی) کے بارے میں وضع کیں، اس کام پر ان کو ان کے مخالفین کی عداوت نے ابھارا۔

چنانچہ شیعوں نے حضرت علی اور آل بیت کی فضیلت اور ان کے مخالفین کی فضیحت میں زمین سے آسمان کا قلابہ ملا دیا، حالانکہ نہ حضرت علی کو اور نہ آل بیت کو ان گھڑی ہوئی روایتوں کی ضرورت تھی، ان کی فضیلت میں جو احادیث صحیحہ موجود ہیں، وہ ان کے مقام کو اجاگر کرنے کے لیے بہت کافی ہیں۔

علامہ ابن الجوزی فرماتے ہیں "فضائل علی الصحیحة کثیرة غیر أن الرافضة لا تقنع فوضعت له ما یضع لا ما یرفع" (۱۳)

حضرت علی کے فضائل میں بہت زیادہ صحیح حدیثیں ہیں لیکن رافضہ کو ان پر قناعت نہ ہوئی چنانچہ انہوں نے اتنی حدیثیں گھڑ ڈالیں جن سے ان کا مقام اونچا ہونے کے بجائے نیچا ہو گیا۔

وضع حدیث میں یہ کام انہوں نے اس بڑے پیمانہ پر کیا کہ عراق کی پیشانی پر ایک بدنما داغ لگ گیا اور عراق وضع حدیث کے لیے مشہور ہو گیا، اس کا نام ''دارالضرب'' پڑ گیا اور وہاں سے آنے والی روایتیں مشکوک ہو گئیں، خاص طور سے اہل مدینہ ان تمام روایتوں سے بچنے لگے جس کے راویوں میں کوئی عراقی ہوتا تھا اس لیے کہ شیعوں کی اصل آبادی اس وقت عراق ہی میں تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں "یا أهل العراق ! أهل الشام خیر منکم خرج إلیهم نفر من أصحاب رسول الله ﷺ کثیر فحدثونا بما نعرف، وخرج إلیکم نفر قلیل من أصحابه فحدثتمونا بما نعرف وبما لا نعرف" (۱۴) اے عراق والو! شام والے تم سے بہتر ہیں، ان کے یہاں صحابہ کرام کی بڑی تعداد گئی، انہوں نے جو روایتیں بیان کیں

---

(۱۳) السنۃ قبل التدوین ص/۱۹۶ (۱۴) بحوث فی السنۃ ص/۲۶، بحوالہ تاریخ ابن عساکر (۱/۶۹)

وہ ہم سب کو معلوم ہیں اور تمہارے یہاں بہت تھوڑے صحابہ کرام گئے، تمہارے یہاں سے جو حدیثیں نکلیں ان میں سے بعض ہم کو معلوم ہیں اور بعض معلوم نہیں۔ (یعنی حق و باطل خلط ملط ہوگیا)

انہی عراقیوں کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما جیسے بزرگ ،متقی وخداترس صحابی فرماتے ہیں کہ ''عراق میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں اور دوسروں کو جھٹلاتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔'' (۱۵)

خود اصحاب علی نے ان شیعان علی کے بارے میں فرمایا "قاتلهم الله أى علم أفسدوا" (۱۶) اللہ ان کو تباہ کردے! کس علم کو انہوں نے برباد کردیا۔

امام شعبی متوفی ۱۰۴ھ فرماتے ہیں کہ ''سب سے پہلے کذب بیانی ابن سبانے شروع کی، یہ حضرت علیؓ کی جانب جھوٹی باتوں کو اس قدر منسوب کرتا تھا کہ وہ بھی اس سے تنگ آچکے تھے اور کہتے تھے کہ اس کمینے کلوٹے سے ہمارا کیا واسطہ!'' (۱۷)

علامہ خلیلی نے ''الارشاد'' میں ذکر کیا ہے کہ ''روافض نے حضرت علی اور آل بیت کی فضیلت میں تین ہزار حدیثیں گھڑی ہیں۔''

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی ان کا قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ''اس تعداد میں مبالغہ بھی ہوسکتا ہے لیکن اس سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ روافض (شیعان علی) کے یہاں حدیثیں گھڑنے میں کثرت پائی جاتی تھی۔'' (۱۸)

بہرحال یہ سب سے پہلی جماعت ہے جس نے حدیث گھڑنے کا کام وسیع پیمانہ پر کیا، ابتدا میں یہ گھڑی ہوئی روایتیں عموماً حضرت علی اور آل بیت کی فضیلت سے متعلق ہوتی تھیں یا مخالفین کی فضیحت سے، انہوں نے مخالفین کی فضیحت میں بھی طرح طرح کی حدیثیں گھڑی ہیں حتی

---

(۱۵) الطبقات الکبریٰ (۴/۲۶۷) (۱۶) مقدمہ مسلم (۱/۸۳)
(۱۷) لسان المیزان (۳/۲۸۹۔۲۹۰) (۱۸) السنۃ ومکانتھا ص/۸۱

کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو بھی نہیں بخشا، امیر معاویہ ویزید اور بنی امیہ کی فضیحت میں بھی خوب گل کھلائے ہیں۔

واقعہ غدیر خم میں خلافت علی اور وصیت علی کا افسانہ، ولایت علی وغیرہ سب انہی کی کرم فرمائیاں ہیں، ان کی گھڑی ہوئی روایتوں کے کچھ نمونے یہ ہیں :

يا علي! أخصمك بالنبوة ولا نبي بعدي (۱۹)

من أراد أن ينظر إلى آدم في علمه، ونوح في فهمه، وإبراهيم في حلمه، ويحيىٰ في زهده، وموسىٰ في بطشه فلينظر إلى علي (۲۰)

یعنی آدم کا علم، نوح کی سمجھ، ابراہیم کی بردباری، یحیٰی کا زہد اور موسیٰ کی گرفت دیکھنا ہو تو حضرت علی کو دیکھ لو۔ یعنی ان تمام انبیاء کی صفات حضرت علی میں موجود ہیں اور بات یہ ہوئی کہ :

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔

مثلي مثل شجرة: أنا أصلها، وعلي فرعها، والحسن والحسين ثمرتها، والشيعة ورقها فأي شيء يخرج من الطيب إلا الطيب (۲۱)

میری مثال درخت کے مانند ہے : میں جڑ ہوں، علی شاخیں ہیں، حسن اور حسین اس کے پھل ہیں اور شیعہ اس کی پتیاں ہیں، اچھی چیز سے اچھی چیز کے علاوہ اور کیا نکلتی ہے؟

شیخین اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم واُمویین کی فضیحت میں بھی حدیثیں گھڑی گئی ہیں، انہی میں سے یہ حدیث بھی ہے کہ "حضرت عمر نے حضرت فاطمہ کی درہ سے پٹائی کی اور ان کو دیوار اور دروازہ کے درمیان اتنا زور سے دبایا کہ انہوں نے رو کر کہا : ہائے ابا جان! نیز حضرت علی کی گردن میں رسی ڈال کر گھسیٹا، ان کے پیچھے پیچھے حضرت فاطمہ چلا رہی تھیں اور حسن وحسین رو رہے تھے۔"

اس طرح کی اور بہت سی من گھڑت روایتوں کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کے ذکر کرنے کے

---

(۱۹) اللآلی المصنوعۃ ۱ر ۳۲۳ (۲۰) الفوائد المجموعۃ ص ر ۳۴۵ (۲۱) الفوائد المجموعۃ

بعد خود ابن ابی الحدید جو شیعی معتزلی ہے، کہتا ہے کہ "فکل ذلک لا أصل له" ان کی کوئی اصل نہیں ہے، حدیث والوں نے اس کو نہ روایت کیا ہے، نہ جانتے ہیں، یہ ایسی باتیں ہیں جن کے نقل کرنے میں شیعہ منفرد ہیں۔ (۲۲)

مخالفین شیعہ اور وضع حدیث :

جب شیعان علی کی اس حرکت کو ان کے مخالفین نے دیکھا تو انہوں نے بھی برائی کا بدلہ برائی سے دیا اور ردعمل کے طور پر اپنے موافقین کی فضیلت اور مخالفین کی فضیحت میں روایتیں گھڑ ڈالیں، ان میں سے بعض حضرات یہ ہیں :

اہل سنت کے جذباتی :

انہی لوگوں میں اہل سنت کے وہ جاہل عوام تھے جو جذباتی تھے، جو حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے خلاف کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہ تھے، جب شیعان علی کی گھڑی ہوئی روایتوں کو سنا جن میں شیخین۔ ابوبکر وعمر۔ کی فضیحت تھی تو انہوں نے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی حمایت کا اظہار کرتے ہوئے ان کے حق میں اور ان کی فضیلت میں حدیثیں گھڑ لیں، مثلاً احمد بن عبداللہ کاوش نے ایک شخص کو حضرت علی کی فضیلت میں حدیث گھڑتے سنا تو اس نے اس کے ردِ فعل میں حضرت ابوبکر کی فضیلت میں حدیث گھڑ دی اور اس کو کار خیر بھی تصور کیا۔ (۲۳)

کچھ حدیثیں فرداً فرداً نام کے ساتھ گھڑی گئیں اور کچھ میں مختلف لوگوں کا نام ساتھ میں ملا لیا گیا، ان گھڑی ہوئی باتوں میں سے کچھ یہ ہیں :

من شتم الصديق فإنه زنديق ومن شتم عمر فمأواه سقر ومن شتم عثمان فخصمه الرحمن ومن شتم عليا فخصمه النبی (۲۴)

---

(۲۲) السنۃ ومکانتہا ص/ ۸۰ بحوالہ شرح نہج البلاغۃ (۱/ ۱۳۵)، السنۃ قبل التدوین ص/ ۱۹۹، بحوالہ شرح نہج البلاغۃ (۱/ ۱۵۸۔۱۵۹)

(۲۳) لسان المیزان (۱/ ۲۱۸)، الوضع فی الحدیث (۱/ ۲۶۳) (۲۴) الفوائد المجموعۃ ص/ ۳۳۹

جس نے صدیق کو گالی دی وہ زندیق ہے، جس نے عمر کو برا کہا اس کا ٹھکانا سقر (جہنم) ہے اور جس نے عثمان کو گالی دی تو اس کا مدمقابل رحمٰن۔ اللہ۔ ہے اور جس نے علی کو گالی دی تو اس کے مدمقابل نبی ﷺ ہیں۔

شب معراج میں جب میں نے اللہ سے یہ درخواست کہ "اِجعل الخليفة بعدی علی بن أبی طالب" میرے بعد علی بن ابی طالب کو خلیفہ کر دینا، یہ سننا تھا کہ آسمان میں زلزلہ آ گیا، فرشتے خوف کے مارے کنارے ہو گئے اور چاروں جانب سے آواز دینے لگے کہ اے محمد ﷺ! پڑھیے ﴿ وما تشاؤن اِلا أن يشاء الله رب العالمين ﴾ (دھر : ۳۰) جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور اللہ کی چاہت یہ ہے کہ آپ کے بعد ابوبکر خلیفہ ہوں۔ (۲۵)

سماء دنیا پر اسی ہزار فرشتے اس شخص کے لیے دعا کرتے ہیں جو ابوبکر وعمر سے محبت کرتا ہے اور دوسرے آسمان پر اسی ہزار فرشتے اس شخص پر لعنت بھیجتے ہیں جو ان دونوں کو مبغوض رکھتا ہے۔ (۲۶)

ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، اتنے میں ابوبکر دکھائی دیے جبرئیل نے کہا کہ ابوبکر جا رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا : ارے آپ ابوبکر کو پہچانتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ آسمان میں زمین کے مقابلہ میں زیادہ مشہور ہیں، فرشتوں کے یہاں ان کا نام ''حلیم قریش'' ہے، دنیا میں یہ آپ کے وزیر ہیں اور آپ کی وفات کے بعد خلیفہ ہیں۔ (۲۷)

امویوں کا کردار :

جس طرح شیعہ کی مخالفت میں جاہل عوام اہل سنت نے ان کا جواب دیتے ہوئے حدیثیں گھڑیں، اسی طرح سے بنوامیہ نے بھی شیعہ کے مقابلہ میں اور آگے چل کر بنی عباس کے

---

(۲۵) الفوائد المجموعہ ص ر ۳۳۵ (۲۶) مصدر سابق ص ر ۳۳۸

(۲۷) تنزیہ الشریعۃ (۱ر ۳۴۴) نیز دیکھیے الوضع فی الحدیث (۱ر ۲۵۱)

مقابلہ میں حدیثیں گھڑیں، شیعوں نے بنی امیہ کی فضیحت اور خاص طور سے امیر معاویہ وغیرہ کے بارے میں حدیثیں گھڑیں تو ان کو دیکھ کر بنی امیہ نے بھی اسی طرح سے مقابلہ آرائی کی اور ان کی فضیلت میں بے شمار حدیثیں گھڑ ڈالیں اور ساتھ ساتھ خلفاء ثلاثہ کی فضیلت میں بھی حدیثیں گھڑیں، ان کی گھڑی ہوئی روایتوں کا نمونہ ملاحظہ کیجیے :

"الأمناء ثلاثة أنا و جبرئيل و معاوية" (۲۸) امانت دار اللہ کی نگاہ میں صرف تین ہیں، میں (رسول اللہ ﷺ) جبرئیل اور معاویہ۔

"إنه ﷺ أخذ القلم من علي و دفعه إلى معاوية" (۲۹) اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علی سے قلم چھین لیا اور معاویہ کو دے دیا۔

"يبعث معاوية يوم القيامة وعليه رداء من نور الايمان" (۳۰) قیامت کے دن جب امیر معاویہ اٹھائے جائیں گے تو ان کے اوپر ایمان کے نور کی چادر ہوگی۔

"جب معاویہ کو میرے منبر پر دیکھو تو ان کی بات قبول کرو کیوں کہ وہ امین و مامون ہیں۔" (۳۱)

بنو عباس کے مؤیدین :

شیعان علی اور مؤیدین معاویہ کے درمیان جو سیاسی اختلاف چل رہا تھا اس کے پس منظر میں مختلف حدیثیں وضع کی گئیں، دوسری صدی ہجری کے اوائل میں بنی امیہ کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے شیعان علی نے بنی عباس کا بھرپور ساتھ دیا خفیہ طور سے بنی عباس کے لیے ماحول تیار کیا جانے لگا، اس کے لیے بارہ نقیب اور ستر اعوان وانصار مقرر کیے گئے، یہ لوگ کبھی تاجروں کے بھیس میں اور کبھی عابدوں اور بزرگوں کے بھیس میں اور کبھی حُجاج کے بھیس میں لوگوں سے ملتے اور ان کے لیے راہ ہموار کرتے، ان مبلغین نے اس مقصد کے حصول کے لیے دھوم دھام سے حدیثیں گھڑیں، جن میں بنی عباس اور حضرت عباس کی فضیلت اور ان کی حکومت کے قیام کی بشارت

---

(۲۸) الفوائد المجموعۃ ص ر ۴۰۴ (۲۹) مصدر سابق

(۳۰) مصدر سابق ص ر ۴۰۶ (۳۱) الموضوعات (۲۷/۱)

دینے والی روایتوں اور بنی امیہ کی بدترین فضیحت کرنے والی روایتوں کو گھڑ کر کے خوب خوب اچھالا، یہاں تک کہ بنو عباس کی حکومت قائم ہوگئی۔ (۳۲)

اس سلسلہ میں ان کی گھڑی ہوئی روایتوں کا نمونہ مندرجہ ذیل ہے :

ایک مرتبہ حضرت عباس کو آتے ہوئے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ : میرے چچا چالیس خلفاء کے باپ ہیں، یہ قریش میں سب سے زیادہ سخی اور حسین وجمیل ہیں، ان کی اولاد میں سفاح، منصور اور مہدی ہیں، اے چچا! میرے ذریعہ اللہ نے اس امر کا آغاز کیا اور اس کا انجام آپ کی اولاد میں سے ایک فرد کے ہاتھوں ہوگا۔ (۳۳)

نعم یا عباس اذا کانت سنة خمس وثلاثون فھی لک ولولدک منھم:سفاح،ومنصور ومھدی" (۳۴) اے عباس! پینتیس سال کے بعد حکومت آپ کی اور آپ کی اولاد کی ہوگی، انہی میں سے سفاح، منصور اور مہدی ہیں۔

بنو امیہ جتنے دن تک حکومت کریں گے، بنو عباس ان کے دوگنا عرصہ تک خلافت کریں گے، ایک دن کے بدلہ میں دو دن اور ایک ماہ کے بدلہ میں دو ماہ۔ (۳۵)

ایک مرتبہ حضرت جبرئیل سیاہ قبا اور کالا عمامہ باندھ کر اترے، میں نے کہا: کیا بات ہے، آج تک اس شکل میں میں نے نہیں دیکھا؟ فرمایا کہ یہ آپ کے چچا عباس کی اولاد میں بادشاہوں کی شکل ہے، میں نے کہا کہ کیا وہ حق پر ہوں گے؟ کہا کہ جی ہاں! تو آپ نے ان کے لیے دعا کی " اللھم اغفر للعباس وولدہ حیث کانو اوأین کانوا" (۳٦) اے اللہ تو عباس اور ان کی اولاد کو معاف فرما جہاں بھی ہوں۔

جب بنی امیہ والوں کو اپنے منبر پر دیکھتا ہوں تو بہت دکھ ہوتا ہے اور جب بنی عباس کو دیکھتا ہوں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔

---

(۳۲) تنزیہ الشریعۃ (۱۱/۲) (۳۳) فتنۂ انکار حدیث کا نیا روپ (۳۴۹/۳)
(۳۴) تذکرۃ الموضوعات ص/۱۰۰ (۳۵) تنزیہ الشریعۃ (۱۱/۲) (۳٦) تنزیہ الشریعۃ (۱۰/۲)

شیخ غازی عزیر حفظہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ ”حضرت معاویہ اور بنوامیہ کی تنقیص کی حد تک تو شیعہ حضرات بنوعباس کے حامی و ناصر تھے لیکن جب عوام کو بنوامیہ کے اقتدار سے متنفر کرنے میں ان کی کوششیں کامیاب ہوگئیں تو ان دونوں گروہوں میں اقتدار پر قابض ہونے کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی، بنوعباس اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے جبکہ شیعہ اقتدار کو حضرت علی کی اولاد میں منتقل کرنے کے خواہاں تھے، بنوعباس نے شیعوں کے زور کو کمزور کرنے اور حضرت علی کی اولاد کو دعواء خلافت سے باز رکھنے کے لیے پھر احادیث وضع کرنے کا طریقہ اختیار کیا چنانچہ اس بارے میں چند مشہور روایات بطور مثال پیش خدمت ہیں :

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباس سے کہا کہ : آپ کی اولاد بادشاہ ہوگی، اس وقت حضرت علی بھی موجود تھے، آپ نے حضرت علی سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ : آپ کی اولاد میں سے کوئی بھی خلیفہ نہ بنے گا۔

ایک مرتبہ رسول کی مجلس میں خلافت کا تذکرہ ہو رہا تھا تو حاضرین نے کہا کہ : حضرت فاطمہ کی اولاد اس منصب کو سنبھالے گی، آپ نے فرمایا کہ وہ ہرگز برسر اقتدار نہ ہوسکیں گے، البتہ میرے چچا کی اولاد ضرور خلیفہ بنیگی اور حضرت عیسیٰ کے دوبارہ دنیا میں تشریف لانے پر اقتدار ان کو سونپ دے گی۔ (۳۷)

شیعان علی و بنوامیہ کا اجتماع :

جناب غازی عزیر صاحب جنہوں نے اس موضوع پر بہت اچھی روشنی ڈالی ہے وہ آگے تحریر کرتے ہیں کہ اس سیاسی انقلاب کے دور میں جب بنوعباس اور شیعہ دعاۃ کے مابین اقتدار پر قبضہ کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی تھی اور قریب تھا کہ بنوعباس کو خلافت کا منصب مل جائے تو شیعہ دعاۃ بنوامیہ کے جاہل اعوان وانصار سے جا ملے اور ان کے تعاون سے بنوعباس کی مذمت میں احادیث گھڑنے لگے۔ (۳۸)

---

(۳۷) فتنۂ انکار حدیث کا نیا روپ (۳/۳۵۰) (۳۸) فتنۂ انکار حدیث کا نیا روپ (۳/۳۵۱)

ان حدیثوں میں سے کچھ یہ ہیں :

بنی عباس کی طرف سے میری امت پر بڑی تباہی آئیگی، یہ لوگوں کو سیاہ لباس پہنائیں گے، اللہ تعالیٰ ان کو آگ کا لباس پہنائے گا۔

بنوعباس کے جھنڈے جب خراسان سے دکھائی دیں تو وہ اسلام کو مٹادیں گے، جوان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگا ان کو قیامت کے دن میری شفاعت نصیب نہیں ہوگی۔ (۳۹)

اس تمام صورت حال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح سے لوگوں نے اپنی سیاست کو چمکانے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے نام کو اس میں شامل کیا اور جھوٹی جھوٹی باتوں کو رسول کی جانب منسوب کیا۔

جناب غازی عزیر صاحب فرماتے ہیں کہ ''دوسری اور تیسری صدی کے دوران بڑی تخریب کاری ہوئی اور روایت سازی کی ایسی وبا پھیلی کہ اصل ونقل میں فرق کرنا دشوار ہوگیا، بلاد عراق وخراسان احادیث سازی کے بڑے مراکز تھے، جہاں منافقین، ملحدین اور سبائی ذہن رکھنے والے افراد نے بڑی ڈھٹائی سے اپنا کاروبار چمکایا اور بڑی بے دردی کے ساتھ اس مقدس ورثۂ نبوی کو داغدار کردیا۔'' (۴۰)

وضع حدیث میں خوارج کا کردار :

خوارج : خارج کی جمع ہے، جس کا معنی ہے نکلنے والا، اس سے مراد وہ جماعت ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت سے نکل گئی اور ان کے خلاف بغاوت کی، ان کا یہ کہنا تھا کہ :

۱ - جنگ جمل میں جن مسلمانوں کو شکست ہوئی، جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، ان کے بچوں اور عورتوں کو لونڈی وغلام کیوں نہیں بنایا گیا؟

۲ - حکمین کے حکم کو کیوں قبول کیا گیا جب کہ حکم صرف اللہ کا ہوتا ہے؟

۳ - حضرت علی نے امیر معاویہ سے معاہدہ تحریر کرتے وقت اپنے نام سے ''امیر المؤمنین''

---

(۳۹) مصدر سابق (۳/ ۳۵۲) (۴۰) فتنۂ انکار حدیث (۳/ ۳۵۳)

کیوں ہٹایا؟

۴ - خلافت آپ (حضرت علی) کا حق تھا، پھر اس کے لیے آپ نے حکمین کو کیوں متعین کیا اور کیوں قبول کیا؟

ان سب کا معقول اور مدلل جواب حضرت علی نے ان کو دے دیا لیکن پھر بھی ایک جماعت اپنی ضد پر اڑی رہی۔ (۴۱)

یہ لوگ حضرت علی کا ساتھ چھوڑ کر مقام ''حروراء'' میں اکٹھا ہوئے تھے اس لیے ان کو ''حروری'' بھی کہا جاتا ہے، ایسے ہی ''مارقہ'' (نکلنے والی جماعت) اور ''نواصب'' (حضرت علی سے عداوت رکھنے والے) بھی کہا جاتا ہے، آگے چل کر ان میں مختلف فرقے ہوئے، بنیادی طور سے تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ :

فتنۂ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے کے مسلمان سچے اور قابل اعتماد ہیں، البتہ اس کے بعد کے لوگ جن میں خود حضرت عثمان اور حضرت علی اور حکمین اور اصحاب جمل اور تمام لوگ جو تحکیم سے رضامند تھے سب کے سب کافر اور مرتد تھے۔ (۴۲)

ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی فرماتے ہیں کہ : ان کے تقریباً تمام فرقے ختم ہو گئے صرف ایک فرقہ ''فرقہ اباضیہ'' باقی ہے۔ (۴۳)

سلطنت عُمان جس کی راجدھانی مسقط ہے، فی الحال یہاں پر ان کی حکومت قائم ہے۔

حدیث رسول کے گھڑنے میں ان خوارج کا کوئی کردار ہے کہ نہیں؟ اس سلسلے میں بعض اہل علم کا یہ خیال ہے کہ انہوں نے بھی کچھ حدیثیں گھڑی ہیں، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان کے یہاں صداقت پائی جاتی تھی، دوسرے بدعتی فرقوں کے مقابلے میں کذب بیانی ان کے یہاں نہیں تھی، لہٰذا وضع حدیث کا کام ان سے بہت کم سرزد ہوا ہے۔

---

(۴۱) الفرق بین الفرق ص ۷۸-۷۹

(۴۲) مصدر سابق ص ۷۳، نیز دیکھیے دراسات فی الحدیث النبوی (۱/ ۲۲)

(۴۳) دراسات فی الحدیث النبوی (۱/ ۲۳)

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی فرماتے ہیں کہ ''بعض متقدمین علماء کا خیال ہے کہ خوارج نے بھی حدیثیں گھڑی ہیں لیکن بہت معمولی مقدار میں۔'' (۴۴)

ان حضرات نے ان کے حدیث گھڑنے پر عبداللہ بن لہیعہ کے ایک قول سے استدلال کیا ہے، جس میں یہ ہے کہ عبداللہ بن لہیعہ فرماتے ہیں کہ : ایک خارجی شیخ نے مجھ سے کہا کہ اپنے دین کی باتیں ذرا دیکھ کر لینا، اس لیے کہ "كنا إذا هوينا أمراً صيّرناه حديثاً" (۴۵) ہم اگر کسی چیز کی خواہش کرتے تو اس کو حدیث رسول بنا کر پیش کر دیتے تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ خوارج نے وضع حدیث کا عمل بالکل نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر سباعی فرماتے ہیں کہ اگر چہ بعض متقدمین علماء کا خیال ہے کہ'' خوارج نے بھی حدیثیں وضع کی ہیں لیکن بہت معمولی مقدار میں، میں نے کتب موضوعات میں بہت تلاش وجستجو کی لیکن کوئی روایت بطور مثال بھی ایسی نہیں ملی جس کو کسی خارجی نے وضع کیا ہو اور نہ اس سلسلہ میں کوئی واضح علمی دلیل ہی موجود ہے بلکہ علماء کے اقوال اس کے برعکس ہیں۔'' (۴۶)

ڈاکٹر عجاج خطیب نے بھی تقریباً اسی طرح کی بات کہی ہے اور خوارج کے وضع حدیث پر جو دلیل منقول ہے اس کو ضعیف قرار دیا اور رجحان ظاہر کیا کہ اس اثر میں "شيخ من الخوارج" کی بجائے "شيخ من الرافضة" کا ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔ (۴۷)

ڈاکٹر عمر فلاتہ نے بھی اسی قول کو راجح قرار دیا ہے، انہوں نے ابن لہیعہ کے قول پر تفصیلی کلام کیا ہے اور خوارج کے سلسلہ میں علماء کے اقوال کو تحریر کیا ہے، ان اسباب کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جن کی بنا پر خوارج جھوٹ نہیں بولتے تھے، ان کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے :

'' عبداللہ بن لہیعہ سے منقول اثر ''إنا كنا إذا هوينا أمراً جعلناه حديثاً'' مختلف الفاظ سے مروی ہے، یوسف بن فرج، ابو نُعیم حلبی اور اسحٰق بن بُہلول کی ایک روایت میں "عن عبدالله بن يزيد المقرئ عن عبدالله بن لهيعة سمعتُ شيخاً من الخوارج تاب

---

(۴۴) السنۃ ومکانتہا ص ر ۸۲ (۴۵) السنۃ ومکانتہا ص ر ۸۲-۸۳

(۴۶) مصدر سابق (۴۷) السنۃ قبل التدوین ص ر ۲۰۵

ورجع وهو يقول : إن هذه الأحاديث دين فانظروا عمن تأخذون دينكم" کے الفاظ ہیں۔" (۴۸)

نیز فرماتے ہیں کہ ''یوسف بن فرج کا ترجمہ دستیاب نہ ہوسکا، لیکن ابونُعیم حلبی متکلم فیہ ہیں، اس لیے راجح اسحٰق بن بہلول کی دوسری روایت ہے، جس میں "رجل من أهل الخوارج" کی بجائے "رجل من أهل البدع" ہے۔ (۴۹)

ان کی موافقت محمد بن احمد بن جنید دقاق نے بھی کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ'' میں نے عبداللہ بن یزید المقرئ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''ایک بدعتی جوتائب ہوگیا تھا، وہ اس طرح سے کہہ رہا تھا'' "اُنظروا هذا الحديث عمن تأخذونه . . ." (۵۰)

ان روایات پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابن لہیعہ سے جو قول منقول ہے، وہ مختلف طرح سے وارد ہوا ہے اور جس روایت میں "رجل من أهل البدع" ہے وہی روایت اصل ہے۔ (۵۱)

جنہوں نے "رجل من أهل الخوارج" کہا ہے انہوں نے روایت بالمعنی کیا ہے اور "رجل من أهل البدع" کو "رجل من أهل الخوارج" کہہ دیا ہے۔

یہی حال عبیداللہ بن عمرو رقی کی روایت کا ہے، جنہوں نے ایک دوسرے واسطہ سے جو "عبدالکریم الجزری عن ابن لهيعة" کے واسطے سے منقول ہے "رجل من أهل الخوارج" پر موافقت کی ہے۔

اور غالب گمان یہ ہے کہ "رجل من أهل البدع" سے مراد "روافض" ہیں نہ کہ "خوارج"۔

چنانچہ خطیب بغدادی نے حماد بن سلمہ کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ "حدثني شيخ لهم

---

(۴۸) الموضوعات (۱/۳۸-۳۹) (۴۹) الکفایۃ ص/۱۲۳

(۵۰) مقدمۃ المجروحین (۱/۸۲)، الموضوعات (۱/۳۸) (۵۱) الوضع (۱/۲۳۵)

یعنی من الرافضة" مجھ کو رافضہ کے ایک شیخ نے یہ بات بتائی ہے کہ جب ہم کسی چیز کو اچھا سمجھتے تو اس کو حدیث بتا کر بیان کرتے تھے۔" (۵۲)

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کا خیال ہے کہ دونوں خبریں ضعیف ہیں لہٰذا ان سے استدلال درست نہیں اور نہ ہی خوارج کی جانب وضع حدیث کا منسوب کرنا ہی درست ہے کیوں کہ جس دلیل پر اعتماد کر کے ان پر اس کا الزام لگایا گیا تھا وہ خود قابل قبول نہیں۔

ڈاکٹر عمر فلاتہ مزید تفصیل بتاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ خوارج کا اثر وضع حدیث میں نہیں ہے، اس لیے کہ :

۱ - موضوعات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

۲ - خوارج عموماً صرف قرآن سے استدلال کرتے ہیں، سنت سے استدلال نہیں کرتے لہٰذا اس کا گھڑنا ان کے لیے بے مصرف ہے۔

۳ - ان کا نظریہ ہے کہ مرتکب کبیرہ کافر ہوتا ہے اور جھوٹ گناہ کبیرہ ہے لہذا حدیث گھڑنے والا اور جھوٹ بولنے والا خارجی رہ ہی نہیں جائے گا۔

۴ - وہ اپنے موقف میں اتنے شدید ہوتے ہیں کہ حجت و دلیل سے زیادہ تلوار پر اعتماد کرتے ہیں۔

۵ - یہ خالص دیہاتی تھے، تہذیب و تمدن سے بالکل عاری تھے، لہٰذا تملق، چاپلوسی اور جھوٹ کی عادت ان کی تھی ہی نہیں۔

۶ - علماء اہل سنت نے ان کے صدق بیانی کی شہادت دی ہے اور ان پر اعتماد کیا ہے۔ (۵۳)

امام ابوداود فرماتے ہیں کہ "بدعتیوں میں خوارج سے زیادہ صحیح حدیث کسی کی نہیں ہوتی۔" (۵۴)

---

(۵۲) السنۃ قبل التدوین ص/۲۰۵، الوضع والوضاعون (۱/۲۳۵)

(۵۳) الوضع فی الحدیث (۱/۲۳۷) (۵۴) الکفایۃ ص/۱۳۰

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ''ہم خوارج کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ تجربے سے یہ ثابت ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔'' (۵۵)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ''خوارج دین سے خارج ہونے کے باوجود صادق ترین ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے ان کی روایت کو اصح الحدیث قرار دیا ہے۔'' (۵٦)

معلوم یہ ہوا کہ خوارج کا حدیث گھڑنے میں کوئی کردار نہیں ہے۔

وضع حدیث میں زنادقہ کا کردار :

کلمۂ ''زندقہ'' ''زندیق'' سے ماخوذ ہے جو فارسی کلمہ ہے، عربی زبان میں اس کا استعمال ''الحاد و بے دینی'' کے معنی میں ہوتا ہے۔

صاحب قاموس فرماتے ہیں کہ ''باور کیا جاتا ہے کہ ثنویہ کی ایک جماعت ہے، یا یہ وہ لوگ ہیں جو نور و ظلمت کے قائل ہیں، یا وہ لوگ ہیں جو اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان نہیں لاتے بلکہ کفر کو چھپا کر ایمان کا اظہار کرتے ہیں، یا یہ ''زن دین'' سے معرب ہے جس کا معنی ہے ''عورت کا دین۔'' (۵۷)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ''زند'' جس کا معنی تاویل و تفسیر ہوتا ہے سے ماخوذ ہے، لہٰذا یہاں زندقہ کا مطلب ہوگا ''تاویل فاسد'' جو فطری حدود سے خارج ہو، اور زنادقہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم اور سنت رسول میں ایسی فاسد تاویلات کرتے ہیں جو اسلامی اصولوں کے منافی ہوتی ہیں۔ (۵۸)

علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ "هم المبطنون للكفر المظهرون للإسلام..." یہ وہ لوگ ہیں جو بباطن کافر اور بظاہر مؤمن ہوتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو کسی دین کو نہیں مانتے بلکہ دین کی توہین کرتے ہیں اور بظاہر اپنے آپ کو دین دار بتاتے ہیں تاکہ لوگوں کو گمراہ کریں۔

---

(۵۵) السنۃ قبل التدوین ص ر ۲۰۴۔۲۰۵، بحوالہ منہاج الاعتدال ص ر ۴۸۰

(۵٦) الوضع فی الحدیث (۱ر ۴۳۷۔۴۳۸) بحوالہ المنتقی من منہاج الاعتدال

(۵۷) ترتیب القاموس (۲/۴۸۱) (۵۸) الوضع فی الحدیث (۱ر ۲۲۰)

انہی لوگوں میں سے حارث کذاب ہے، جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، انہی میں سے محمد بن سعید مصلوب، مغیرہ بن سعید کوفی اور عبدالکریم بن ابی العوجاء ہیں۔ (۵۹)

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ ''یہ لوگ مختلف شہروں میں جاتے تھے اور اہل علم کا بھیس بنا لیتے تھے اور بڑے بڑے علماء کی جانب نسبت کر کے حدیثیں گھڑتے تھے تا کہ لوگوں کے دلوں میں دین کے سلسلے میں بدظنی پیدا کر دیں۔'' (۶۰)

واقعہ یہ ہے کہ جب دین اسلام کا انتشار ہوا اور مسلمانوں کو فارس اور روم پر غلبہ ملا تو اس میں وہ بارسوخ افراد بھی شامل ہو گئے جو ان سابقہ حکومتوں میں بڑے محترم، معزز اور صاحب امر تھے، یہ لوگ بظاہر اسلام لے آئے لیکن اس کو دل سے قبول نہ کیا بلکہ اس کے خلاف ریشہ دوانی کرنے لگے اور اس کے لیے انہوں نے سنت رسول کو اپنا نشانہ بنایا اور اپنے آپ کو مختلف شعبوں میں اور مختلف سیاسی پارٹیوں میں شامل کر لیا، کوئی اہل بیت اور حضرت علی کی محبت کا اظہار کرتا، تو کوئی صاحبِ دین، زاہد و صوفی بن کر لوگوں کو دھوکہ دیتا، تو کوئی فلسلفہ اور حکمت کے نام پر دین کو برباد کرنے میں لگا ہوا تھا، یہ ایسی ہذیانی باتیں گھڑتے تھے جن کو سن کر باشعور شخص دم بخود ہو جائے اور اس کا دینی مزاج متزلزل ہو جائے، مثلاً ان کا گھڑنا کہ ''إن الله خلق خيلاً فأجراها فعرقت فخلق نفسه'' (۶۱) اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کو پیدا کیا پھر اس کو دوڑایا تو وہ پسینہ سے شرابور ہو گیا، اسی پسینہ سے اللہ نے اپنے آپ کو پیدا کیا۔

یہ کس قدر تخریبت اور کس قدر حماقت پر مبنی ہے! ایک معمولی بچہ بھی بتا دے گا اور اس میں کس قدر تضاد ہے اور کس قدر خلاف عقیدہ ہے! ادنیٰ فرد بھی جانتا ہے، یہ تو بالکل وہی عقیدہ ہے جو ہندوستان کے ایک طبقہ کا ہے، جس میں خالق اور مخلوق کی تعیین ہی نہیں ہوتی، برہمہ اور وشنو دونوں میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ اس نے دوسرے کو پیدا کیا۔

---

(۵۹) فتح المغيث (۲/۳۰۰) (۶۰) المجروحين (۱/۶۳)

(۶۱) الموضوعات الكبرىٰ ۱/۱۰۵، اللآلی المصنوعة (۱/۳)

ان بد باطنوں کی ٹولی چوں کہ مختلف شکلوں میں تھی، اس لیے انہوں نے مختلف ابواب میں حدیثیں گھڑیں، عقیدہ، عبادات، اخلاقیات اور معاملات وغیرہ میں سے کوئی باب نہیں چھوڑا، ان کی کوشش عموماً یہ ہوتی تھی کہ ایسی حدیثیں رسول کی جانب منسوب ہوکر منظر عام پر آئیں جو عقلاً محال ہوں اور خلاف مشاہدہ وتجربہ ہوں تاکہ لوگوں کو دین کے تعلق سے مشکوک کیا جائے، یا کم ازکم حیران وپریشان کیا جائے، اس طرح سے وہ اپنی ذہنی عیاشی کو سکون دیتے تھے، چوں کہ یہ امراء وحکام سے قریب تر بھی ہوگئے تھے اور مختلف مناصب پر فائز تھے لہٰذا یہ کام بلاخوف وخطر کرتے تھے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے تھے، یہاں تک کہ خلفاء وامراء کو وقتاً فوقتاً اس میں مداخلت کرنی پڑی۔

چناں چہ خلیفہ مہدی نے اس کے لیے ایک خاص دیوان قائم کیا، جس میں ان کے نامور علماء کو سزائیں دی گئیں، انہی میں سے عبدالکریم بن ابوالعوجاء تھا، جس نے چار ہزار حدیثوں کے گھڑنے کا اعتراف کیا اور بقول اس کے یہ سب حدیثیں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے سے متعلق تھیں، اس کو بصرہ کے گورنر محمد بن سلیمان بن علی نے قتل کروایا۔ (۶۲)

انہی میں سے بیان بن سمعان النہدی ہے جو الوہیت علی کا قائل تھا اور جس نے نبوت کا بھی دعوی کیا۔

اور مغیرہ بن سعید بھی تھا جسے خالد بن عبداللہ قسری نے قتل کرکے جلوادیا۔ (۶۳)

انہی میں سے محمد بن سعید مصلوب ہے جس کو ابوجعفر منصور نے سولی پر لٹکادیا تھا۔ (۶۴)

ابن لہیعہ کہتے ہیں کہ ''ایک شخص بیٹھا رورہا تھا، میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے لوگوں کے معاملات میں چار ہزار حدیثیں گھڑ کر داخل کردی ہیں، اب سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کروں؟'' (۶۵)

---

(۶۲) الموضوعات (۱/۳۷) (۶۳) المجروحین ۱/۶۳، توضیح الافکار (۲/۷۵)

(۶۴) السنۃ ومکانتہا ص/۸۵ (۶۵) المجروحین (۱/۶۳)

ایک شخص نے خلیفہ مہدی کے سامنے چار ہزار حدیثیں گھڑنے کا اعتراف کیا جو لوگوں میں منتشر ہو چکی تھیں۔ (۶۶)

حماد بن زید کہتے ہیں کہ زنادقہ نے چودہ ہزار حدیثیں گھڑی ہیں۔ (۶۷)

ایک زندیق محمد بن سعید کا تو یہ کہنا تھا کہ ''کوئی بھی اچھی بات ہو تو اس کے لیے سند گھڑ لینے اور رسول کی جانب منسوب کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔''

امام عُقیلی نے "محمد بن خالد عن أبيه" کے واسطے سے یہ نقل کیا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ یہ کہا "لا بأس إذا كان كلام حسن أن تضع له إسنادا" (۶۸) یعنی اگر کوئی اچھی بات ہو تو اس کے لیے سند گھڑ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

کبھی کبھی یہ لوگ کسی صحیح حدیث کا مذاق اڑانے کے لیے یا اس کی اہمیت گھٹانے کے لیے اسی کے ہم مثل روایت گھڑ لیتے جیسے کہ ابن راوندی نے کیا ہے، اسی نے "الباذنجان لما أكل له" کی روایت یعنی بیگن جس مقصد کے لیے کھایا جائے اس کے لیے فائدے مند ہے۔ "ماء زمزم لما شرب له" کے مقابلہ میں گھڑی ہے، آب زم زم جس مقصد کے لیے پیا جائے سود مند ہے۔ اسی طرح سے "إذا روي عني حديث فاعرضوا على القرآن" والی روایت یعنی جب مجھ سے کوئی حدیث بیان کی جائے تو اس کو قرآن پر پیش کرو۔ کو بھی اس نے "أوتيت الكتاب ومثله معه" والی روایت یعنی مجھ کو کتاب اور اس کے اسی کے مانند دیا گیا ہے۔ کے مقابلہ میں گھڑ لیا ہے۔ (۶۹)

ان لوگوں نے جس بھاری مقدار میں حدیثوں کے گھڑنے کا اعتراف کیا ہے اور عوام میں ان کے منتشر ہونے کا دعویٰ کیا ہے، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی دین سے بیزار کرنے کی ایک تدبیر تھی، ورنہ حدیثیں جس مقدار میں گھڑی گئی ہیں، علماء نے ان سب کو جمع کیا ہے، ان کے گھڑنے

---

(۶۶) الموضوعات (۳۸/۱) (۶۷) فتح المغیث (۳۰۰/۲)

(۶۸) تاریخ الضعفاء ۱۷/۴، الموضوعات (۴۲/۱) (۶۹) الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ ص ۱۱۹

والے کا نام یا مشتبہ شخص کو بھی بتا دیا ہے اور ان کے موضوع ہونے کا اعلان کیا ہے اور کتابوں میں ان کو تحریر کرلیا ہے، اگر تمام موضوعات کو اکٹھا کرلیا جائے تو بھی اتنی بڑی مقدار نہیں ہوتی جس کا دعوی انہوں نے کیا ہے، چہ جائے کہ حلال وحرام سے متعلق اتنی حدیثیں ہوں، بلکہ اگر صحیح اور موضوع دونوں کو اکٹھا کرلیا جائے تو بھی حلال وحرام سے متعلق اتنی حدیثیں نہیں ہوسکتیں، اس سے اس رجحان کو تقویت ملتی ہے کہ یہ بھی حدیثوں سے مشکوک کرنے کا ایک طریقہ تھا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک حدیث کی کئی سندیں انہوں نے گھڑی ہوں اور اس طرح سے ان میں سے ہر ایک کو ایک حدیث شمار کیا ہو جیسے کہ پہلے ائمہ محدثین اس طرح سے حدیثوں کی تعداد شمار کرتے تھے حالاں کہ یہ امکان اتنا واضح نہیں جتنا پہلے کا ہے کیوں کہ ان کا اصل مقصد لوگوں کو حدیث سے متنفر کرنا تھا نہ کہ کثرت سند بتانا، جب کہ علماء کثرت سند کو اس لیے ذکر کرتے تھے تاکہ اس کی صحت وقوت میں اضافہ ہو جائے۔

جو لوگ جھوٹے اور بے دین ہوتے ہیں ان کو ہانکنے اور ڈینگ مارنے میں کیا لگتا ہے، ممکن ہے اپنی جماعت سے حصول انعام کی خاطر اس طرح مبالغہ آرائی سے کام لیتے رہے ہوں۔

ڈاکٹر عمر فلاتہ فرماتے ہیں کہ ''اتنی بڑی تعداد کا اعتراف کرنا بھی حقیقت میں لوگوں کو دین سے بدظن اور حدیث سے متنفر کرنے کی ترکیب ہے، جب یہ امن وامان میں رہتے تھے تو حدیثیں گھڑتے تھے اور جب خوف کی حالت میں رہتے تو اس طرح کی باتیں اڑاتے تھے، ان لوگوں نے یہ دعوی کیا ہے کہ انہوں نے بڑی مقدار میں حلال وحرام سے متعلق حدیثیں گھڑی ہیں حالاں کہ اگر کتب موضوعات کو دیکھا جائے تو پوری حدیثیں اس تعداد کو نہیں پہنچتی چہ جائیکہ حلال وحرام سے متعلق اتنی حدیثیں ہوں۔'' (۷۰)

ان کی گھڑی ہوئی بعض حدیثیں یہ ہیں :

۱ - ''إن نفراً من اليهود أتو االنبى ﷺ فقالوا : من يحمل العرش؟

(۷۰) الوضع فی الحدیث (۱/۲۲۲)

فقال : تحمله الهوام بقرونها"

کچھ یہودی نبی ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے پوچھا : عرش کون اٹھائے ہوئے ہے؟ آپ نے کہا کہ پتنگے اپنی سینگوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

بطور استہزاء اس طرح سے حدیث گھڑی گئی ورنہ پتنگے تو انتہائی کمزور مخلوق ہیں اور پھر ان کی سینگیں کہاں ہوتی ہیں اور کیا اللہ تعالیٰ مخلوق کا محتاج ہے؟

۲ - "اِن اللّٰه اشتکت عینه فعادته الملائکة"۔

اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں تکلیف ہوئی تو فرشتوں نے اس کی عیادت کی۔

۳ - "ینزل ربنا عشیة عرفة علی جمل اَورق..."

عرفہ کی شام کو اللہ تعالیٰ خاکستری رنگ کے اونٹ پر سوار ہو کر آسمان سے نازل ہوتا ہے اور پیدل چلنے والوں سے معانقہ کرتا ہے اور سواروں سے مصافحہ کرتا ہے۔

۴ - "اِن اللّٰه لما خلق الحروف فسجدت الباء و وقف الاَلف"

جب اللہ تعالیٰ نے حروف کو بنایا تو "ب" نے سجدہ کیا اور "الف" کھڑا رہ گیا۔

یعنی اسی وجہ سے "الف" تحریر میں کھڑا دکھائی دیتا ہے اور "ب" آڑا دکھائی دیتا ہے۔

۵ - "النظر اِلی الوجه الجمیل عبادة"

خوبصورت چہروں کو دیکھنا عبادت ہے۔ (۷۱)

اس طرح سے خرافات گھڑتے تھے اور دین کا مذاق اڑاتے تھے اور لوگوں کو حیرانی میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔

لیکن الحمد للہ ائمہ محدثین کی کاوشوں نے ان کی تمام کوششیں ناکام بنادیں اور سب کی گرفت کی، یہ گرفتار حدیثیں اور ان کے گھڑنے والے قیدی انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

☆☆☆

---

(۷۱) السنۃ ومکانتہا ص ر ۸۴

۲ - وضع حدیث کے دینی اسباب

دین حنیف جسے اللہ رب العالمین نے اپنے آخری رسول ﷺ کے آخری دور میں مکمل کر دیا اور رسول نے اسے اپنی امت تک بالکل اسی طرح پہنچا دیا، یہ دین صاف ستھرے ماحول میں پرورش پاتا رہا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دور اول تک ہر قسم کی ریشہ دوانیوں سے پاک رہا، لیکن جب مسلمانوں میں اختلافات رونما ہونے لگے اور شہادت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا خوں چکا واقعہ رونما ہوا، خلفاء کی گرفت عوام پر کچھ کمزور ہونے لگی، دوسری طرف خلافت اسلامیہ کا رقبہ وسیع تر ہو گیا اور بہت سے وہ لوگ بھی دین میں شامل ہو گئے جن کے دلوں میں ایمان کو مکمل جگہ نہیں ملی تھی، روح اسلام کو وہ سمجھ نہیں سکے تھے، ان میں سے کچھ وہ لوگ بھی تھے جو بڑے جاگیردار یا حکام تھے، لہٰذا ان لوگوں کے دلوں میں حکومت سازی کا خیال آنے لگا، جس کے لیے انہوں نے مختلف طریقے اپنائے، انہی میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ رسول کے نام کو کسی نہ کسی طرح اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے، چناں چہ رسول کے نام سے منسوب کر کے کچھ ایسی باتیں عوام میں پیش کی جانے لگیں، جن کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے نہیں تھا اور اس طرح وضع حدیث (حدیث گھڑنے) کا سلسلہ شروع ہوا، پھر اس میں اضافہ ہونے لگا، اہل علم نے حدیث رسول کی پاسبانی کی اور اس طرح کے گڑھنے والوں اور ان کی گڑھی ہوئی روایتوں کی گرفت کی اور امت کو اس سے آگاہ کیا۔

آگے چل کر وضع حدیث کے محرکات واسباب مختلف طرح کے ہونے لگے، یہاں انہی اسباب ومحرکات پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالی گئی ہے :

کچھ لوگوں نے دین کی خدمت اور اس کی تائید کے لیے یہ کام کیا، کچھ نے

مذہب و متعلقین مذہب کی بالا دستی قائم کرنے اور ان کی فضیلت اجاگر کرنے کے لیے سرگرمی دکھائی، کچھ نے اپنی بدعت کو ترجیح دینے کے لیے یہ کام انجام دیا، کچھ اور لوگ بھی اس زمرے میں ہیں جو ان سے ملتے جلتے ہیں، جن کی تفصیل اس طرح ہے :

زاہدانِ قوم :

دین کی تائید اور اس کی خدمت سمجھ کر جن لوگوں نے حدیث گھڑنے کا کام کیا، اس میں ان تنگ نظر زُہاد کا بڑا دخل رہا ہے جو ہر ایک کو اپنی طرح عابد و زاہد دیکھنا پسند کرتے تھے، دین کے سلسلے میں ذرہ برابر کوتاہی کو جرمِ عظیم تصور کرتے تھے، خلاف شرع عمل ان کو برداشت نہیں ہوتا تھا، لہٰذا انہوں نے فضیلت و فضیحت کی ایسی حدیثیں گھڑیں جن سے مسلمانوں کو کارِ خیر کی رغبت دلائی جائے اور کارِ شر سے روکا جائے۔

یہ لوگ حقیقت میں خدا ترس، شریعت کے انتہائی پابند، متقی و پرہیزگار اور نیک و صالح ہوا کرتے تھے، ماحول اور معاشرے میں یہ لوگ انتہائی محترم اور معزز سمجھے جاتے تھے، لوگ ان سے دعائیں لیتے تھے اور ان کی دل آزاری کو اپنے لیے باعث ہلاکت سمجھتے تھے، لیکن یہ لوگ عجیب غفلت میں مبتلا ہو گئے، لوگوں کو دین کی طرف راغب کرنے کے لیے تھوک کے حساب سے ایسی پاور فل حدیثیں گڑھیں کہ جن کو سن کر انسان پھڑک اٹھتا تھا، معمولی کارِ خیر پر اجرِ عظیم، سارے گناہوں کی مغفرت، ہزاروں حورعین اور لاکھوں محلات کی بشارت دیتے تھے؛ اور معمولی غلطی پر وعید شدید، جہنم کا آخری گڑھا دکھا دیتے تھے اور اس کے لیے ہمیشہ کے لیے جنت کا دروازہ بند کر دیتے تھے، بعض لوگوں نے تو اس طرح کی حدیثیں گڑھنے کا اعتراف بھی کیا ہے۔

چناں چہ ابوعِصمہ نوح بن اَبی مریم سے جب اہل علم نے یہ سوال کیا کہ ''فضائل قرآن سے متعلق جو حدیثیں آپ ''عکرمہ عن ابن عباس'' کے واسطے سے بیان کرتے ہیں، کیا بات ہے کہ عکرمہ کے دوسرے شاگرد وہ حدیثیں بیان نہیں کرتے اور نہ ہی ان کو اُن کا علم ہے، آپ اس طرح کی روایات کرنے میں اپنے ساتھیوں میں منفرد کیوں ہو گئے؟ تو انہوں نے جواب دیا: میں

نے دیکھا کہ لوگ ابوحنیفہ کی فقہ اور واقدی کی مغازی کو بہت اہمیت دینے لگے، جتنا انہیں پڑھتے ہیں قرآن کو نہیں پڑھتے، لہٰذا قرآن کریم کی تلاوت اور تعلیم و تعلم کی جانب رغبت دلانے کے لیے یہ حدیثیں میں نے خود اپنی طرف سے بیان کی ہیں۔''

حالاں کہ ابوعصمہ مَرو کے قاضی اور امام ابوحنیفہؒ اور ابن اسحاقؒ کے شاگرد تھے اور امام ابوحنیفہ کی زندگی میں قضاء پر مامور تھے، اور اپنے اس عمل کو کارِ خیر بھی سمجھتے تھے، حالاں کہ یہ حدیث، تفسیر، فقہ اور دیگر علوم کے جامع تھے، جس کی وجہ سے انہیں ''نوح الجامع'' کہا جاتا تھا۔ (۱)

امام ابن حبانؒ اور امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے سچائی کے علاوہ سب کچھ جمع کر لیا تھا۔ (۲)

اس واقعے کو جو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس میں ابوعمار راوی مجہول ہیں، امام سخاوی کہتے ہیں کہ امام حاکم کی سند صحیح ہوگی تب ہی انہوں نے اس واقعے کو ذکر کیا ہے۔ لیکن اگر یہ نسبت غلط بھی ہو تو بھی گھڑنے والے کا مقصد واضح ہے۔

اسی طرح مؤمل بن اسماعیل عدَوی نے بعض مشائخ سے فضائل قرآن سے متعلق اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ایک طویل روایت سنی تو انہوں نے اپنے استاد سے اس کے راوی کا نام پوچھا، پتہ چلا کہ وہ ''مدائن'' میں رہتے ہیں، جب وہ ان کی تلاش میں ''مدائن'' پہنچے اور ان سے ملاقات ہوئی اور اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ایسے آدمی کا نام بتایا جو ''واسط'' کے رہنے والے تھے، مؤمل بن اسماعیل مدائن سے واسط گئے، وہاں پتہ چلا کہ ان سے وہ حدیث بیان کرنے والے ''بصرہ'' کے ایک بزرگ ہیں، یہ اس روایت کی تحقیق کے لیے پھر واسط سے بصرہ گئے، وہاں یہ پتہ چلا کہ ''عبّادان'' کے کسی بزرگ نے یہ روایت سنائی ہے، مؤمل فرماتے ہیں کہ جب میں ان سے ملا تو وہ مجھ کو ایک بڑے کمرے میں لے گئے، جہاں

---

(۱) الموضوعات (۱/۱۴۱)، فتح المغیث (۱/۳۰۳۔۳۰۴) دیکھیے المدخل ص/۱۹

(۲) فتح المغیث (۱/۳۰۳۔۳۰۴)

صوفیوں کی ایک بڑی جماعت تھی، درمیان میں ایک قد آور بزرگ تھے، انہوں نے کہا : انہی بزرگ نے یہ روایت مجھ کو بتائی ہے، جب میں نے ان سے پوچھا کہ یہ روایت آپ نے کس سے سنی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا : جب میں نے یہ دیکھا کہ لوگ قرآن سے بے رغبتی اختیار کر رہے ہیں تو میں نے خود اپنی طرف سے یہ حدیثیں گڑھ لیں تا کہ لوگ قرآن کی طرف متوجہ ہوں۔ (۳)

ان بزرگوں کی گڑھی ہوئی روایتوں کو دوسرے حضرات نے جو رطب و یابس تفسیر کے نام پر جمع کرتے تھے، ان موضوع روایتوں کو اپنی کتابوں میں تحریر کر دیا، واحدی، ابن مَردُویہ، ابو اسحاق ثعلبی، زمخشری اور بیضاوی وغیرہ کی تفسیروں میں اس طرح کی روایات بھری پڑی ہیں، بلکہ زمخشری نے تو حد کر دی کہ ان موضوعات کو جزم کے ساتھ بیان کیا، جس کی وجہ سے ان موضوعات کا خوب انتشار ہوا۔ (۴)

اسی طرح سے مَیسرَہ بن عبدِ ربّہ نے قرآنی سورتوں کی فضیلت میں حدیثیں گڑھی ہیں، جس کا اقرار خود انہوں نے کیا ہے، چنانچہ جب عبدالرحمٰن بن مہدیؒ نے ان سے ان روایتوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا ''میں نے خود ہی انہیں گڑھا ہے اور ان کے ذریعہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاتا ہوں۔'' (۵)

یہ اتنے بزرگ تھے کہ امام سیوطیؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: یہ بہت عظیم نوجوان تھے، انتہائی زاہد اور خواہشات دنیا سے دور رہنے والے تھے، ان کی وفات پر بغداد کے سارے بازار بند ہو گئے تھے، اتنے بزرگ، باعزت اور مشہور ہونے کے باوجود حدیثیں گڑھتے تھے۔ (۶)

انہی بزرگوں اور صاحب زہد و تقویٰ میں سے ابوداود نخعی بھی ہیں جو قیام لیل اور صیام نہار کے پابند تھے بلکہ اس کار خیر میں اپنے ہم عصروں سے آگے تھے، لیکن اس کے باوجود بھی حدیثیں گڑھتے تھے۔

---

(۳) فتح المغیث (۱/ ۳۰۴) (۴) مصدر سابق (۵) المجروحین (۱/ ۶۴)

(۶) تاریخ بغداد (۵/ ۷۹)، تدریب الراوی (۱/ ۲۸۳)

انہی میں سے ابو بشر احمد بن محمد فقیہ ہیں، جو اپنے زمانہ میں سنت کے شدید تر عامل اور دفاع عن السنۃ کے علمبردار تھے، سنت کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف انتہائی سخت گیر تھے، لیکن پھر بھی حدیثیں گڑھتے تھے۔

انہی لوگوں میں سے وہب بن حفص ہیں جنہوں نے بیس سالوں تک دنیاوی معاملے میں کسی سے گفتگو نہ کی لیکن اس کے باوجود سفید جھوٹ بولتے تھے، حدیثیں گڑھنے میں ماہر تھے۔ (۷)

سادہ لوح حضرات :

ان میں سے کچھ سادہ لوح اور بھولے بھالے بدھو ہوتے تھے جن پر زہد کا ایسا غلبہ ہوتا تھا کہ ہمیشہ عالم بالا میں رہتے تھے، یہ مرفوع کو موقوف اور موقوف کو مرفوع بنا دیتے تھے، نیز کم علم ہونے کی وجہ سے کسی سے جو بھی سنتے تھے اس پر یقین کر لیتے اور اسے دوسروں سے بیان بھی کرتے تھے، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں امام یحیٰ بن سعید قطانؒ فرماتے ہیں: صالحین سے بڑھ کر جھوٹا میں نے کسی کو نہیں پایا۔ (۸)

امام مسلمؒ کہتے ہیں کہ ان کی زبانوں سے جھوٹ کی اشاعت ہوتی تھی حالاں کہ یہ خود گڑھتے نہیں تھے بلکہ بے ساختہ ان کی زبان سے یہ باتیں جاری ہو جاتی تھیں۔ (۹)

خانقاہی صوفیاء :

ان زاہدوں میں سے ایک جماعت ایسی ہے جسے زاہد کی بجائے راہب کہنا زیادہ مناسب ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو خانقاہوں میں نام نہاد رہبانیت کی زندگی گذارتے ہیں، یہ اصحاب کشف وکرامات ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس میں اس طرح مگن رہتے ہیں کہ اپنے قرب وجوار سے بے خبر رہتے ہیں مگر دور دور کی خبر رکھتے ہیں، کشف وکرامات اور ہا، ہو، حق کے ذریعہ ایسی بلندی پر پہنچنے کا یقین رکھتے ہیں جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں، یہ اپنے آپ کو ایسے

---

(۷) تدریب الراوی (۲۸۳/۱) (۸) المجروحین (۶۷/۱) (۹) مقدمہ مسلم (۹۵/۱)

مقام پر پہنچے ہوئے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جہاں تکالیف، عبادات، روزہ، نماز اور حقوق کی ادائیگی سب ان پر سے ختم ہو جاتے ہیں، ان کو اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور کبھی کبھی تو یہ ایسے دَم دار ہو جاتے ہیں کہ ساری خدائی ان کے تابع ہو جاتی ہے، جب چاہیں اللہ سے ملاقات کر لیں اور جب مرضی ہو عرش پر پہنچ جائیں، اگر ضرورت محسوس کریں تو رسول اللہ ﷺ کو مع خلفاء بلا لیں، یہ وہ شترِ بے مہار ہیں جن پر کسی کی کوئی گرفت نہیں، ان کے شیطانی خواب، بکھرے ہوئے ذہن کے پریشان کن خیالات ان کی نگاہ میں الہام کا درجہ رکھتے ہیں اور وہی ان کی شریعت ہوتی ہے۔

ایک صوفی صاحب سے کسی نے دریافت کیا کہ امام عبدالرزاق صنعانیؒ سے حدیثیں سننے نہیں چلیں گے؟ اس نے جواب دیا: جو براہ راست رزّاق (اللہ) سے سنتا ہے وہ عبدالرزاق سے کیا سنے گا؟ (۱۰)

کرّامیہ :

وضع حدیث میں غوطہ لگانے والی ایک جماعت کرامیہ کی ہے جو ابوعبداللہ محمد کرام کی جانب منسوب ہے، یہ پہلے ایک عابد و زاہد تھا، بعد میں احمد بن عبداللہ جُویباری کا ساتھی بن گیا اور اس کی موافقت میں حدیثیں گڑھنے لگا، اس کی جماعت نے فضائل اعمال، ترغیب و ترہیب میں بہت حدیثیں گڑھی ہیں، یہ حدیث گڑھنے کو جائز، کار خیر اور قابل فخر کارنامہ سمجھتے تھے، جیسا کہ علامہ ابن صلاح نے ذکر کیا ہے۔ (۱۱)

وہ اس سلسلے میں کٹ حجتی کرتے ہوئے یہ بھی کہتے تھے کہ ہماری دروغ گوئی رسول اللہ ﷺ کی موافقت کے لیے ہے نہ کہ آپ کی مخالفت میں۔ لہذا بقول ان کے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث "من كذب عليّ متعمدا فليتبوأ مقعده من النار" (۱۲) میں جو

---

(۱۰) فتنۂ انکار حدیث کا نیا روپ (۳/۳٦٦) (۱۱) دیکھیے مقدمہ ابن صلاح ص ر ۹۰

(۱۲) بخاری (۱۰۷)، مقدمۂ مسلم (۱/٦٦)

وعید ہے، ہم اس کے مستحق نہیں ہیں، ہم آپ کی مخالفت میں نہیں بلکہ آپ کی تائید میں حدیث گھڑتے ہیں، "کذب علیّ" کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو کاہن، ساحر، مجنوں وغیرہ کہا جائے یا آپ کی مخالفت اور توہین میں کوئی بات کہی جائے۔ (۱۳)

"من کذب" والی روایت کے بعض الفاظ اس طرح وارد ہیں "من کذب علی لِیُضلّ به الناس فلیتبوأ مقعدَه من النار" یعنی جو شخص لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے میری جانب جھوٹ منسوب کرے تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اس روایت سے بھی یہ لوگ استدلال کرکے یہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ ہدایت پر لانے اور انہیں نیک و بزرگ بنانے کے لیے یہ کام کرتے ہیں لہٰذا اس وعید میں شامل نہیں۔

حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ "لیضلّ به الناس" کا اضافہ اس حدیث میں صحیح نہیں، ہوسکتا ہے انہی لوگوں نے اپنے لیے یہ اضافہ کیا ہو، رسول اللہ ﷺ کا قول "من کذب علیّ" عام قاعدہ ہے جو جملہ عقائد، عبادات، معاملات اور دین کی جزئیات کو شامل ہے، خواہ بشارت سے متعلق ہو یا وعید سے، ترغیب سے متعلق ہو یا ترہیب سے، اس کے مقابلے میں ضعیف اور ناقابل اعتبار حدیثوں سے استدلال کرنا قابل قبول نہیں۔

اگر اس کو صحیح بھی فرض کرلیا جائے تو بھی یہ ان کے مقصد پر دلالت نہیں کرتی کیوں کہ "لِیُضل" میں جو "لام" ہے وہ "لام تعلیل" نہیں بلکہ "لام عاقبت" ہے، یعنی سبب بتانے کے لیے نہیں بلکہ انجام بتانے کے لیے ہے، مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولنے کا انجام گمراہی ہے، جس کا خاتمہ جہنم پر ہے خواہ وہ کسی بھی مقصد کے لیے بولا جائے۔ (۱۴)

رسول کی شریعت مکمل اور جامع ہے، اس میں کسی اضافے اور کسی کی تائید کی کوئی گنجائش نہیں، لہٰذا اگر چہ کوئی غلط بات رسول کی جانب بھلے گمراہ کرنے کے لیے نہ گڑھی جائے پھر بھی نتیجہ وہی ہے، کیوں کہ یہ خود ایک بڑی گمراہی ہے کہ رسول کی بتائی ہوئی باتوں کو مسلمان اپنے لیے

---

(۱۳) المجروحین (۱/۶۴) (۱۴) فتح المغیث (۱/۳۰۶۔۳۰۷)

ناکافی سمجھے "من رغب عن سنتی فلیس منّی" (۱۵) جو میری سنت سے بے نیازی برتتا ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں، اسی پس منظر میں آپ نے بتائی تھی۔

ان متنوع قسم کے زہاد نے فضائل سے متعلق بہت دھوم دھام سے حدیثیں گڑھی ہیں ،شاید ہی کوئی عبادت ہو جسے چھوڑا ہو، کسی نے۔ بزعم خُویش۔ قرآن کی خدمت اور لوگوں کو اس کی طرف رغبت دلانے کا بیڑا اٹھایا، چنانچہ انہوں نے ہر ہر سورت سے متعلق باتیں بنالیں، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ساری فضیلتیں جو رسول اللہ ﷺ نے تلاوت قرآن سے متعلق بتائی تھیں وہ ان کو کم پڑنے لگیں، لہٰذا ان میں اضافہ ضروری سمجھا، اسی طرح کا کام ابوعصمہ اور مَیسرہ بن عبدربہ نے کیا تھا۔

کسی نے نماز سے متعلق اپنا کرشمہ دکھایا، وہ پنج وقتہ نمازیں جن کو اللہ نے اس امت کے ہر مکلف پر فرض عین قرار دیا ہے اور جس کے بارے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ "یہ بھی زیادہ ہیں ان کا ادا کرنا مشکل ہوگا"، یہ ان کے لیے کافی نہ ہوئیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "صلاۃ الفیہ" اور "صلاۃ رغائب" جیسی پاور فل نمازیں وجود میں آئیں جن کو سن کر انسان پھڑک اٹھتا ہے اور حورعین کے خیالی جھرمٹ میں مگن ہو جاتا ہے، پھر اس کو نماز پنج وقتہ ہیچ نظر آنے لگتی ہیں حالاں کہ ان کا مقصد لوگوں کو نمازی بنانا تھا لیکن تدبیریں الٹی ہوگئیں، بے نمازیوں کی کثرت ہوگئی اور کیوں نہ ہو! ان لوگوں کی گڑھی ہوئی اس حدیث کو سنیں اور سر دھنیں :

"جو شخص جمعہ کی رات کو آٹھ رکعت نفلی نماز (جس کی مخصوص صفت ہے) پڑھے گا تو تمام فرض نمازیں جو اس نے چھوڑی ہیں، سب معاف!! مزید یہ کہ سارے گناہ بھی معاف، خواہ وہ کیسے بھی ہوں، پھر ہر رکعت کے بدلے جنت میں سجا سجایا ایک مکمل شہر، ہر آیت پر ایک ہزار حور عین منتظر راہ، جنت میں داخلہ بلا حساب و کتاب اور رسول اللہ ﷺ سے خواب میں ملاقات بھی ہوگی۔" (۱۶)

---

(۱۵) بخاری (۶۷۷۴)، مسلم (۱۴۰۱) (۱۶) الموضوعات الکبریٰ (۲/۱۳۵)، الوضع (۱/۲۶۸)

ذرا غور کیجیے کہ ان کی بنائی ہوئی آٹھ رکعتیں اتنی طاقتور ہیں کہ تمام پنج وقتہ فرض نمازوں کو برخاست کرسکتی ہیں!

ایسے ہی تھوک کے حساب سے ہر موضوع پر گل افشانی کی ہے، اس طرح کے لوگ حقیقت میں شریعت کے لیے انتہائی مضر اور آستین کا سانپ ہوتے ہیں، ان کے ضرر رساں ہونے کی مختلف وجہیں ہیں :

۱ - ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی بزرگی، تقویٰ اور سیرت وسلوک کی وجہ سے عوام کی نگاہوں میں انتہائی معتمد، محترم اور باعزت ہوتے ہیں، عوام فوراً ان کی باتوں کو قبول کر لیتے ہیں اور ان کو صحیح دین وشریعت سمجھتے ہیں۔ (۱۷)

۲ - دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ وضع حدیث کا کام اجر وثواب سمجھ کر کرتے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ لوگوں کو خیر کی طرف راغب کرنا اور شر سے روکنا کار خیر ہے گرچہ باطل اور موضوع حدیثوں ہی کے واسطے سے کیوں نہ کیا جائے، حالاں کہ یہ خیال باطل ہے۔

۳ - موضوع احادیث میں معمولی معمولی کاموں پر اتنا عظیم اجر وثواب بتایا جاتا ہے کہ اس کو سن کر انسان اسی میں لگ جاتا ہے، ان فضائل کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ اصل فرائض وواجبات کی کوئی فکر ہی نہیں رہ جاتی۔

اسی طرح ان میں معمولی معمولی غلطیوں پر اس قدر خوفناک اور بھیانک سزائیں ہوتی ہیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں گرچہ وہ غلطی شریعت کی نظر میں معمولی ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح ان میں شریعت کی کھلی مخالفت ہوتی ہے اور اس کی متعین کی ہوئی سزائیں معمولی نظر آتی ہیں۔ (۱۸)

یہی وجہ ہے کہ اہل علم نے اس طرح کے زُہاد سے لوگوں کو متنبہ کیا ہے اور ان کو دین کے لیے انتہائی نقصاندہ بتایا ہے۔

---

(۱۷) مقدمۂ ابن صلاح ص/۹۰، تدریب الراوی (۱/ ۲۸۲)

(۱۸) الوضع فی الحدیث (۱/ ۲۶۴)

مبتدعین :

بدعتیوں میں سے ایک جماعت وہ ہے جو شریعت رسول کو اپنے لیے ناکافی سمجھتی تھی اور دین میں طرح طرح کا اضافہ کرتی تھی، بدعتیوں کی اس جماعت نے بھی وضع حدیث میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، آج جو بدعتیں دین کے نام سے رائج ہیں، اِنہی مبتدعین کی دین ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ آج مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ اسی کو دین سمجھتا ہے بلکہ اسی بدعت پر ان کی پیداوار ہوئی ہے، وہ اس سے ذرا بھی ہٹنا پسند نہیں کرتے، ان بدعتیوں نے اپنی بدعات کو رواج دینے کے لیے ان کی تائید میں بہت حدیثیں گڑھی ہیں حالاں کہ حق تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی روایات سنی بھی نہیں چاہیے، ائمۂ دین نے اصول حدیث میں جو ضوابط بتائے ہیں اس اعتبار سے ایسے بدعتی کی روایت ناقابل اعتبار ہوتی ہے جو اپنی بدعت کا داعی ہو یا ایسی روایت بیان کرتا ہو جو اس کی بدعت کو تقویت پہنچاتی ہو۔ (۱۹)

اس قاعدے کے اعتبار سے بدعتیوں کے جتنے علماء جو بدعتوں کی طرف دعوت دیتے ہیں، وہ اہل علم کے یہاں ناقابل اعتبار ہوتے ہیں اور ان کی بات مردود ہوتی ہے، پھر بھی جاہلوں کی جماعت میں یہ بدعتی انتہائی مقبول و محترم ہوتے ہیں اور ﴿ وَإِن يَقُولُوا تَسمعْ لِقَولِهِم كأَنَّهُم خُشُبٌ مُسَنَّدَة ﴾ (منافقون : ۴) کی زندہ تصویر ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی باتیں، لن ترانیاں اور تقریریں بڑی لچھے دار ہوتی ہیں اور اپنے شیطانی وسوسوں سے عوام کو سیدھی راہ سے پھیرتے رہتے ہیں، سنت رسول سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی اس پر اعتراض کرتے ہیں اور باطل تاویلات کے ذریعے اس سے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں، ائمۂ دین کی تقلید کا دم بھرتے ہیں لیکن ان کے طریقے پر عمل کرنے سے کتراتے ہیں اور ان کی باتوں کو بالکل مسترد کردیتے ہیں، آپ ائمۂ دین اور محدثین عِظام کے حالات کا اگر مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ بدعتیوں کے تعلق سے ان کا موقف کتنا سخت ہے، لیکن بعض مسلمانوں نے جہالت کو اپنا شعار بنالیا ہے،

---

(۱۹) علوم الحدیث ص ر ۱۰۳

سلف صالحین صحابہ وتابعین کے نقش قدم کو چھوڑ کر بدعتیوں کی گھڑی ہوئی روایتوں کو اپنا دین بنالیا ہے، والعیاذ باللہ۔

ان بدعتیوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے وقتاً فوقتاً جھوٹ بولنے اور حدیثیں گھڑنے کا اقرار کیا ہے، کسی نے پشیمانی وندامت کے طور پر کیا تو کسی نے خوف کے عالم میں کیا، انہی بدعتیوں میں سے ایک جماعت روافض کی ہے جو ایک طرف سیاست بازی میں اس طرح جکڑے ہوتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کی طرف جھوٹ منسوب کرنے میں ذرا بھی شرم وعار محسوس نہ کرتے تھے اور دوسری طرف اپنے من پسند وخود ساختہ دین اور بدعتی عقیدے کی طرف رغبت دلانے کے لیے حدیثیں گڑھتے تھے۔

اسی جماعت میں سے کذاب اعظم مختار بن عبید ثقفی ہے جس نے نبوت تک کا دعویٰ کرڈالا، پھر بھی آل بیت (شیعہ) کا دوست رہا، یہی ان کا اصل امام ہے جو خود بقول رسول ﷺ "بین یدی الساعۃ دجالون کذابون قریبامن ثلاثین" (۲۰) میں سے ایک ہے، یہ دوسروں تک کو حدیثیں گڑھنے کی دعوت دیتا تھا اور اس پر بڑا لالچ بھی دیتا تھا، جس کی مثال اس واقعہ میں موجود ہے:

''ایک مرتبہ مختار ثقفی کذاب نے ایک شخص کو دعوت دی اور ان سے یہ کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کرکے میرے لیے ایک حدیث بیان کرو جس میں اللہ کے رسول ﷺ یہ کہہ رہے ہوں کہ: ''میرے بعد مختار بن عبید خلیفہ ہوگا جو میرے بیٹے حسین کے قتل کا بدلہ لے گا'' اس کے عوض میں تم کو دس ہزار درہم، ایک جوڑا وجامہ اور ایک خادم وسواری سب دوں گا، انہوں نے اس عمل سے انکار کردیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کرکے میں کچھ کہوں یہ ممکن نہیں۔'' (۲۱)

اگرچہ انہوں نے اس برے عمل سے انکار کردیا لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ کس طرح سے جری ہوتے تھے، خودتو حدیثیں گڑھتے ہی تھے اور دوسروں کو بھی اس پر ورغلاتے تھے۔

---

(۲۰) بخاری (۳۶۰۹)، مسلم (۲۹۲۳) (۲۱) الموضوعات الکبریٰ (۳۹/۱)

انہی میں سے جابر بن یزید جُعفی شیعی بھی ہے جو کبھی امام ابوحنیفہؒ کا استاذِ حدیث بھی رہ چکا تھا اور جس کے بارے میں خود امام صاحب نے فرمایا تھا کہ ''جابر جعفی سے بڑا جھوٹا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔'' (۲۲)

یہ شخص کہتا تھا کہ میرے پاس ابھی چالیس ہزار حدیثیں ایسی ہیں، جنہیں میں نے بیان نہیں کیا ہے۔ (۲۳) کبھی یہ کہتا تھا کہ میرے پاس علم کے پچاس ہزار ابواب ایسے ہیں جن کو میں نے ابھی تک بیان نہیں کیا ہے۔ (۲۴)

انہی میں سے محمد بن قاسم طالقانی ہے، امام حاکم کہتے ہیں کہ یہ رؤساءِ شیعہ میں سے ہے، جو اپنے عقیدے کے مطابق حدیثیں گھڑتا تھا۔

اسی طرح سے محمد بن شجاع ثلجی ایسی حدیثیں گڑھتا تھا جن سے بظاہر تجسیم کا اثبات ہوتا تھا اور انہیں محدثین کی طرف منسوب کر دیتا تھا۔ (۲۵)

عبداللہ بن یزید مُقری نے ایک بدعتی کو کہتے سنا ''ان حدیثوں کو دیکھ لو کہ کس سے لے رہے ہو، اس لیے کہ جب ہم کوئی عقیدہ بنا لیتے تو اس کے لیے حدیث بھی گھڑ لیتے تھے۔'' (۲۶)

مؤیدینِ مذہب :

وضاعین (حدیثیں گڑھنے والے) کی ایک جماعت ایسی ہے جنہوں نے اپنے مذہب کی بالادستی قائم کرانے اور اپنے مسلک کو دوسروں سے بہتر بتانے کے لیے اس کی تائید میں حدیثیں گڑھیں، اولاً تو مسلمانوں نے ایک بنیادی غلطی یہ کی کہ دین کو مذاہب و مسالک میں بانٹ لیا جس کا خمیازہ آج انتشار و تفرقہ بازی کی شکل میں مسلمان بھگت رہے ہیں، مزید برآں یہ کہ اس غلطی کو درست ثابت کرنے کے لیے رسول اکرم ﷺ کی ذات کا سہارا لیا، جب کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تفرقہ مٹانے کے لیے تھی نہ کہ تفرقہ بازی کے لیے لیکن ان لوگوں نے

---

(۲۲) میزان الاعتدال (۱/۳۸۰) (۲۳) الموضوعات (۱/۳۹)

(۲۴) میزان الاعتدال (۱/۳۸۰) (۲۵) تنزیہ الشریعہ ص ۱/۱۱ (۲۶) الموضوعات (۱/۳۸)

مذہب کی تائید کرنے والی حدیثوں کو گڑھا اور ان کو رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کر دیا، مذہب میں اس قدر غلو کیا کہ صحیح احادیث کو ترک کر کے ان موضوعات کا سہارا لیا تا کہ مذہب کا بول بالا رہے، دنیا بھر کے مناظرات، مجادلات، مباحثات اور تفرقہ بازی اس پر روشن دلیل ہے۔

ان لوگوں نے وضعِ حدیث میں دو محاذ قائم کر رکھے تھے: ایک تو اپنے ائمہ اور علماء کی فضیلت میں حدیثیں گڑھنا اور دوسرے مذاہب کے ائمہ اور علماء کی فضیحت اور رسوائی بیان کرنے کے لیے حدیثیں گڑھنا، تو دوسرا محاذ اپنے علماء کے فتاوٰوں اور ان کے اقوال کی تائید میں حدیثیں گڑھنا، حالانکہ مقلدین کی جماعت تمام ائمہ کو برحق مانتی ہے اور ان میں سے کسی ایک کی تقلید کو ضروری قرار دیتی ہے، یہ کیا بوالعجبی ہے کہ امت کے ایک فرد کو منتخب کر کے اس کو ایک جہت کا امام بنالیا جائے پھر اس کو برحق سمجھا جائے، پھر اس کی فضیلت میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جائیں اور اس کے لیے رسول ﷺ کی ذات کا سہارا لیں، اس کے برخلاف دوسرے امام منتخب کی توہین کے لیے حدیثیں گھڑ جائیں اور پھر مذہب کے نام پر مخاصمت کی جائے جو قتل وغارت گری اور حرام خون بہانے تک پہنچ جائے، مخالف جماعت کو برباد کرنے کے لیے کفار ومشرکین سے مدد لی جائے (والعیاذ باللہ) ہماری تاریخ میں اس طرح کے بدنما داغ موجود ہیں اور آج مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ایک قرآن، ایک رسول، ایک دین اور شریعت ہوتے ہوئے بھی وہ سب کچھ کرتے ہیں جو نہیں کرنا چاہیے۔

پہلی قسم کے وضاعین میں سے ایک شخص مامون بن احمد ہرَوی حنفی ہے، جس پر اس قدر حنفیت غالب ہوگئی تھی کہ اپنے انجام سے غافل ہوگیا اور "من کذب علی..." کی وعید میں شامل ہوکر یہ جملہ گڑھا اور رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کر دیا کہ ''میری امت میں ایک آدمی ہوگا جس کو ابوحنیفہ کہا جائے گا وہ میری امت کا چراغ ہوگا۔'' جب اس پر بھی حنفیت کی گرمی نہ بجھی تو دوسرا جملہ بھی گھڑ لیا ''میری امت میں ایک شخص ہوگا جس کا نام محمد بن ادریس ہوگا وہ

میری امت کے لیے ابلیس سے بھی زیادہ ضرر رساں ہوگا۔'' (۲۷)

حنفیوں کو یہ بات اتنی پسند آئی کہ اس موضوع روایت کی بنیاد پر آج تک سارے حنفی علماء اپنی تقریروں اور خطبوں میں امام ابوحنیفہؒ کے نام کے ساتھ ''سراج امت'' کا لقب ضرور لگاتے ہیں اور اس طرح عملی طور سے یہ تمام لوگ اس جھوٹے کے مؤید اور اس کے گناہ میں مشترک ہیں، اسی کے ساتھ "مَن روی عنی حدیثاً وهو یری انه کذب فهو أحد الکاذبین" (۲۸) کے نمونے ہیں۔

محمد زاہد کوثری نے تو اس نازیبا حدیث کی صحت ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جو غلوِ مذہب کا کرشمہ ہے۔

دوسری قسم میں بطور مثال محمد بن عُکاشہ کرمانی کو دیکھ لیجیے، جب ان سے کسی نے کہا کہ بعض لوگ نماز میں رکوع سے پہلے اور اس کے بعد ''رفع یدین'' کرتے ہیں، (یہ عمل ان کے مذہب کے خلاف تھا) لہٰذا اپنے مذہب کی تائید کے لیے یہ حدیث گڑھ ڈالی "من رفع یدیه فی الرکوع فلا صلاة له" (۲۹) جو شخص رکوع میں رفع یدین کرتا ہے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

مامون بن احمد ہروی نے بھی ٹھیک اسی طرح کی روایت گھڑی ہے۔ (۳۰)

اسی طرح سے بہت سے مؤیدین مذہب نے جاہلوں میں یہ مشہور کر دیا کہ ''صحابۂ کرام ایمان لانے کے بعد بھی بتوں سے اتنی محبت کرتے تھے کہ حالت نماز میں بھی بغل یا منہ میں بت چھپا کر رکھتے تھے تو اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں رفع یدین کرنے اور آمین کہنے کا حکم دیا۔

اس طرح کی بے ہودہ باتیں محض تائید مذہب کے لیے صحابہ کی جانب منسوب کر دی گئی ہیں جو بہتان عظیم اور اِفک مُبین ہے، ممکن ہے کہ اس طرح کی باتیں رافضیوں کی جانب سے اڑائی گئی ہوں جو صحابۂ کرام کے دشمن ہیں، مؤیدین کو یہ لقمۂ تر نظر آیا، انہوں نے اسے اچک لیا اور

---

(۲۷) الموضوعات ۲/ ۴۸، اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ (۱/ ۴۵۷)

(۲۸) مقدمہ مسلم (۱/ ۶۲) (۲۹) الموضوعات الکبریٰ (۱/ ۴۳)

(۳۰) الموضوعات (۲/ ۹۷)

اسے اپنے مقلدین کے حلق میں ڈھکیل دیا۔

اور لطف تو یہ ہے کہ ان کے بنائے ہوئے یہ بت ایسے چالاک ہوتے تھے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ''اللہ اکبر'' کہنے سے اور رفع یدین کرنے سے نہیں گرتے تھے بلکہ صرف رکوع سے پہلے وبعد میں کرنے سے گرتے تھے یا پھر آمین کہنے سے چھٹکتے تھے، سبحان اللہ قربان جایئے اس عقل پر ، اس کی تردید کے لیے مزید کسی چیز کی حاجت نہیں۔ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین پر چھپی ہوئی چیز نہ گرے صرف رکوع کے وقت ہی گرے۔

رسول اکرم ﷺ کی مبارک حدیث اس موقع پر یاد آتی ہے جس میں آپ نے یہ فرمایا تھا کہ ''تمہارے آمین کہنے اور ایک دوسرے کو سلام کرنے سے یہودیوں کو بہت جلن ہوتی ہے۔'' (۳۱) ہیثمی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

علامہ ابن الجوزی نے اسی قسم کے لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وضاعین'' کی دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنے مذہب کی تائید میں حدیثیں گھڑتے تھے، شیطان نے ان کو بہکا دیا تھا کہ یہ ان کے لیے جائز ہے۔

قوم سالمیہ کے بارے میں اس طرح کی بات منقول ہے، امام سخاوی کہتے ہیں کہ یہ فرقہ بصرہ اور اس کے قرب وجوار میں کافی مشہور تھا۔ (۳۲)

اس تفرقہ بازی کا ایک خطرناک نتیجہ یہ بھی ہوگیا کہ جب کوئی شخص اپنے مذہب سے متعلق حدیثیں گھڑتا تو مخالف مذہب والا بھی مقابل کو خاموش کرنے کے لیے یا اپنے مذہب کی ترجیح اور اس کو صحیح قرار دینے کے لیے حدیثیں گھڑتا تھا، اس طرح ردِ عمل کے طور پر بھی اصحابِ مذاہب نے حدیثیں گڑھنے کا کام کیا ہے، مثلاً یہ حدیث جو رفع یدین کی تائید میں کہی گئی ہے "لكل شيىء زينةٌ وزينة الصلاة رفع اليدين عند كلّ تكبيرة" (۳۳) ہر چیز کے لیے ایک زینت ہوتی ہے اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے وقت رفع یدین کرنا ہے۔

---

(۳۱) ابن ماجہ (۸۵۶)، مسند احمد (۶/۱۳۵)

(۳۲) الموضوعات (۱/۳۸)، فتح المغیث (۱/۳۰۱) (۳۳) الموضوعات (۲/۹۹)

یہ کام کرنے والے یقیناً قابل ضرر تھے اور ان کا یہ عمل قابل مذمت ہے لیکن وہ لوگ بھی کچھ کم نہیں جو اس طرح کی گڑھی ہوئی روایتوں کا اپنا مستدل مانتے ہیں اور مذہب کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے ان کا سہارا لیتے ہیں۔

یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ بڑے بڑے مفتیان اور مشائخ اس طرح کی روایتوں کے حکم سے واقف نہیں اور لاعلمی میں اس سے استدلال کرتے ہیں، اور اگر خدانخواستہ یہی بات ہے تو بقول شاعر

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند　　در جہل مرکب ابدالدہر بماند

(جو جاہل ہونے کے باوجود بھی اپنے آپ کو عالم سمجھے تو وہ ہمیشہ جہالت ہی میں رہے گا)

کے مصداق ہیں، حدیث کا حکم جانے بغیر اس سے استدلال کرنا اندھیرے میں ہاتھ مارنے کے مترادف ہے۔

اہل رائے ومفتیان قوم :

مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جن کو اہل رائے کہا جاتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو مسائل کا استنباط رائے اور قیاس سے کرتے تھے اور غیر وقوع ومفروضہ مسائل کے جواب دینے میں طبع آزمائی کرتے تھے، امیر صنعانیؒ فرماتے ہیں کہ ''جہاں اہل رائے مطلقاً استعمال ہو تو اس سے مراد حنفیہ ہوتے ہیں۔'' (۳۴)

یہ لوگ اس سلسلے میں اور ایک قدم آگے بڑھ گئے اور یہاں تک قیاس کر ڈالا کہ ''اگر کسی حکم پر قیاس دلالت کرتا ہو تو اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی جانب کی جاسکتی ہے اور اس میں یہ کہا جاسکتا ہے "قال رسول اللہ ﷺ" بلفظ دیگر قیاس کے موافق روایت گھڑنا جائز ہے۔

ابن عراق کتانی فرماتے ہیں ''اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ان اہل رائے کی کتابوں میں ایسی حدیثوں کی بھرمار رہتی ہے جس کے متون (الفاظ) خود گواہی دیتے ہیں کہ یہ موضوع

---

(۳۴) توضیح الافکار (۱/۷۷)

اور گھڑی ہوئی ہیں، اس لیے کہ یہ عموماً فتاوی کے مشابہ ہوتے ہیں اور ان کی کوئی سند نہیں ہوتی ہے۔" (۳۵)

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ یہ مُتفقّہ (بہ تکلف فقیہ بننے والے) حضرات جنہوں نے یہ جائز قرار دے دیا ہے کہ جس پر قیاس دلالت کرے اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی جانب کی جاسکتی ہے اقسام وضاعین میں انتہائی ضرر رساں ہیں جس طرح سے زہاد ہوتے ہیں۔" (۳۶)

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عوام کو فتاوے دیتے ہیں، دینی اعتبار سے ان کی رہنمائی کرتے ہیں اور لوگوں کا ان پر اعتماد ہوتا ہے، مگر جب رہبر ہی رہزن بن بیٹھے تو قافلے کا لٹ جانا یقینی ہوتا ہے۔

حد تو یہ ہے کہ ان مفتیان میں سے بعض ایسے بھی ہوئے ہیں جن کو فتوی صادر کرتے وقت اگر کوئی دلیل نہیں ملتی تو فوراً اپنے فتوے کے مطابق حدیث گھڑ لیتے تھے۔ (۳۷)

صاحب "تنقیح" اور اس کے شارح فرماتے ہیں کہ "کذابین کی ایک جماعت وہ ہے جو اپنے فتاویٰ پر دلیل کے لیے مجبور ہوتے ہیں تو ان کے لیے حدیثیں گھڑھ لیتے ہیں، جیسے ابوالخطاب ابن دِحیہ کی جانب اس طرح کی بات منسوب ہے۔"

ابن نُقطہ فرماتے ہیں کہ "یہ شخص علم وفضل سے متصف تھا لیکن ایسی چیزوں کا دعویٰ کرتا تھا جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی تھی۔" (۳۸)

ابراہیم بن ابی یحییٰ سے کسی نے سوال کیا کہ ایک شخص نے ایک بُنکر کو دھاگا دیا، کپڑا بننے کے بعد کچھ دھاگا بچ گیا، بُننے والا کہتا ہے کہ میرا حق ہے اور بنوانے والا کہتا ہے کہ میرا ہے، تو یہ دھاگا کس کو دیا جائے؟ اس نے فوراً ہی حدیث گھڑ لی کہ "اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اگر اس شرط پر دیا تھا کہ بچا ہوا واپس کرے گا تو اس کا ہوگا ورنہ بننے والے کا ہوگا۔" (۳۹)

---

(۳۵) تنزیہ الشریعۃ ص۱۱/۱ (۳۶) فتح المغیث (۳۰۹/۱)
(۳۷) فتح المغیث (۳۰۲/۱) (۳۸) توضیح الافکار (۷۷/۲) (۳۹) الموضوعات (۴۲/۱)

مُناظرین :

انہی لوگوں سے ملتی جلتی ایک جماعت مناظرین کی ہے جو۔ بقول ان کے۔ تلاش حق کے لیے مناظرے و بحث ومباحثہ کرتے ہیں، حالاں کہ عملاً اپنے قول کی برتری ثابت کرنے کے لیے پوری قوت صرف کرتے ہیں حتی کہ گالی گلوچ، فسق وفجور اور پھر لاٹھی چارج اور ملاکمہ کی بھی نوبت آجاتی ہے۔

ایسے لوگ جب بحث ومباحثے میں ناکام ہونے لگتے ہیں تو مدمقابل کو زیر کرنے کے لیے حدیثیں گھڑ کر ان سے استدلال کرنے لگتے ہیں۔ (۴۰)

عمر بن مسلم کہتے ہیں کہ میں عبدالعزیز بن حارث تمیمی کے ساتھ بعض مجالس میں حاضر ہوا ، ان سے فتح مکہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا وہ صلحاً تھا یا جبراً؟ تو انہوں نے کہا کہ جبراً، ان سے پوچھا گیا کہ اس پر کیا دلیل ہے؟ تو فوراً ایک سند گھڑ کر اس پر ایک حدیث چسپاں کردی کہ ''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحابۂ کرام میں فتح کے بارے میں اختلاف ہوگیا کہ وہ صلحاً ہے یا جبراً؟ تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: یہ جبری فتح ہے۔''

عمر بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا ''یہ کیسی حدیث ہے؟ تو انہوں نے کہا : اصلاً یہ حدیث نہیں ہے، مقابل کو ہرانے کے لیے میں نے فوراً ہی گھڑ لی تھی۔'' (۴۱)

اسی طرح محمد بن اسحاق بن حرب لؤلؤی کی جانب منسوب ہے کہ وہ مناظرے میں بروقت حدیثیں وضع کرلیتا تھا۔ (۴۲)

اسی طرح ہندوستان میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء اور اس وقت کے علماء سے قوالی سننے کے جواز اور عدم جواز پر مناظرہ ہوا تو انہوں نے رسول ﷺ کی جانب منسوب کرکے یہ کہہ دیا کہ ''آپ نے قوالی سننے سے منع کیا ہے'' ان لوگوں نے جواب میں یہ کہا کہ تم کو حدیث رسول سے کیا مطلب، امام صاحب کا قول پیش کیجیے۔

☆☆☆

---

(۴۰) الفوائد المجموعۃ ص ۴۲۷ (۴۱) الوضع (۲۸۱/۱)، بحوالہ تاریخ بغداد (۴۶۱/۱۰)

(۴۲) لسان المیزان (۶۶/۵)

۴ - وضعِ حدیث کے ذاتی اسباب

حدیث گھڑنے کا چوتھا بنیادی سبب انسان کے اپنے ذاتی فائدے سے متعلق ہے، چوں کہ ذاتی فوائد مختلف طرح کے ہوتے ہیں اس لیے ان کے مختلف ذیلی اسباب ہوتے ہیں، جن کے تحت مختلف مفہوم کی حدیثیں گھڑی گئی ہیں۔ ان اسباب میں سے ایک اہم سبب شہرت طلبی ہے۔

شہرت طلبی :

شہرت طلبی کا عمل عام طور سے کم علمی اور کم ظرفی کی وجہ سے ہوتا ہے، جب انسان احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کا اظہار چاہتا ہے تو اس کے لیے بہت کچھ تدبیریں کرتا ہے، انہی تدبیروں میں سے ایک تدبیر حدیثیں گھڑنا بھی ہے، ایسے لوگ حدیث رسول مع اسناد گھڑ کر یہ باور کرانا چاہتے کہ انہوں نے وہ علم حاصل کر لیا ہے جو ان کے ہم مثلوں کے پاس نہیں ہے اور ان کے پاس ایسی سندیں ہیں جو دوسروں کے پاس نہیں، اسی طرح یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ وہ بڑے بڑے اہل علم کی صف میں کھڑے ہیں، انہی لوگوں میں سے ابراہیم بن الیسع بن ابی حیہ، حماد بن عمرو نصیبی، بُہلول بن عبید اور اصرم بن حوشب وغیرہ ہیں۔ (۱)

خاص طور سے کم پڑھے لکھے خطبا ہر دور میں اس میں ملوث رہے ہیں، وہ محض واہ واہی حاصل کرنے کے لیے بے بنیاد باتوں کو عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں، تا کہ عوام یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ حضرت مولانا نے تو ایسی بات بتائی ہے جو آج تک کسی عالم نے نہیں بتائی، غالباً وہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے

---

(۱) الموضوعات الکبریٰ (۱/۴۳)، تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ ص/۱۵

جو ایسی حدیثیں سنائیں گے جنہیں نہ تو تم نے سنا ہوگا نہ تمہارے باپ دادا نے سنا ہوگا۔'' (۲)

نواب صدیق حسن صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''کچھ ایسے علم ناشناس تھے جنہوں نے محدثین کی شہرت اور عزت کو دیکھا تو ان کے دل میں (بلا علم کے) محدث بننے کی خواہش پیدا ہوئی اس کے لیے انہوں نے حدیثیں گھڑنا اور بیان کرنا شروع کر دیا، انہی لوگوں میں سے ابوالبختری، وہب القاص، سلیمان بن عمرو نخعی، حسین بن علوان اور اسحاق بن نجیح مُلطی وغیرہ ہیں، جن کا عام شغل وعظ و نصیحت کرنا تھا۔'' (۳)

نیز فرماتے ہیں کہ اسباب وضع میں سے یہ بھی ہے کہ مدعی مخاطب کے سامنے اپنے آپ کو بڑا عالم ظاہر کرنے کے لیے کسی بھی حدیث کے بارے میں جس کا علم اس کے پاس نہیں ہے، صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم لگا دیتا ہے اور اس کی تخریج کے لیے ایسی کتابوں کا حوالہ دیتا ہے جو نادر الوجود ہیں، اس سے عوام کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس کی اطلاع ایسی کتابوں پر ہے جس کی اطلاع مخاطب کو نہیں حالاں کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے یہ حدیث اس کے سماع پر گذری بھی نہ ہو، سامعین دھوکہ کھا کر اس طرح کی گھڑی ہوئی بات سن کر بیان بھی کرنے لگتے تھے اور اس طرح یہ روایتیں پھیلتی رہتی تھیں۔ (۴)

گداگری و قصہ گوئی :

گداگری کا پیشہ انتہائی بدترین پیشہ ہوتا ہے، شریعت نے گداگری کی بڑی مذمت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ ''جو گداگری کا پیشہ اختیار کرتا ہے' قیامت کے دن اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا۔'' (۵)

اس سے انسان کی غیرت اور خودداری مردہ ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود سب سے زیادہ گداگری مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، اس میں ایک قوم تو ایسی ہے جو اس کو اپنا پیشہ سمجھتی ہے،

---

(۲) مقدمہ مسلم (۱/۱۲)، مقدمہ کامل (۱/۵۶) (۳) الحطۃ فی ذکر الصحاح الستہ ص/۱۱۹

(۴) الحطۃ ص/۱۲۱۔۱۲۲ (۵) بخاری (۱۴۷۴)، مسلم (۱۰۴۰)

لوگوں سے ان کا ربط بڑا مضبوط ہوتا ہے، ان کا اپنا حلقہ ہوتا ہے، ان کا طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اس لیے ان کو ہر طرح کی باتیں بنانی بھی خوب آتی ہیں، ان گداگروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں :

۱- ایک وہ لوگ ہیں جو عوام کو قصہ کہانی سناتے اور وعظ و نصیحت کرتے ہیں، بظاہر ان کا یہی پیشہ ہوتا ہے مگر پس پردہ یافت کا جذبہ ہوتا ہے اور اس کے ضمن میں لوگوں سے وصولیابی کے راستے بھی ہموار کرتے رہتے ہیں۔

۲- دوسرے وہ لوگ ہیں جو عام گداگر ہوتے ہیں قصہ گو یا واعظ نہیں ہوتے لیکن اپنے مقصد کی باتوں میں موضوعات کو شامل کر لیتے ہیں۔

پھر ان لوگوں میں کچھ تو ماہر وضاع ہوتے ہیں جو خوب حدیثیں گھڑتے ہیں، جن میں بڑی لمبی لمبی اور دلچسپ باتیں ہوتی ہیں، کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اس طرح کی موضوعات کو خوب یاد رکھتے ہیں اور رواج دیتے ہیں۔

پہلی قسم کے لوگوں کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے لیکن اس کی سند پر امام ذہبی نے کلام کیا ہے، اس میں ایک راوی ابراہیم بن عبدالواحد بکری ہے جس نے اس کو روایت کیا ہے، ان کے ترجمے میں اس روایت کو امام ذہبی نے منکر قرار دیا ہے۔ (٦)

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ مقام ''رصافہ'' کی مسجد میں امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن مَعین بیٹھے ہوئے تھے، ایک قصہ گو گداگر وہاں آیا جس نے انہی دونوں حضرات کے واسطے سے ایک بڑی لمبی چوڑی حدیث گھڑ کر سنائی، جو ''لا إلٰـه الا الله'' کی فضیلت پر چالیس صفحات پر مشتمل تھی، حدیث بیان کر چکنے کے بعد عطیات جمع کرنے کے لیے اس نے اپنی چادر پھیلائی تو یہ دونوں اس کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ ''یہ روایت آپ نے ہم لوگوں سے کب سنی ہے؟ ہم نے تو ایسی روایت کبھی بیان ہی نہیں کی! اس نے جواب دیا: میں سنتا تھا کہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن

---

(٦) میزان الاعتدال (۱/ ۴۷)

معین بہت بے وقوف ہیں جس کا اندازہ مجھ کو اس وقت ہوا، کیا دنیا میں تمہارے علاوہ اور کوئی احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نہیں ہیں، پھر ان کا مذاق اڑاتے ہوئے چل دیا۔ (۷)

ایسے ہی ایک واقعہ علامہ ابن حبان نے رقہ اور حران کے درمیان ''تاجران'' کی مسجد کا ذکر کیا ہے کہ ''ایک گداگر واعظ آیا اور مسلمانوں کی حاجت پوری کرانے والے کی فضیلت میں بڑی طویل روایت ابوخلیفہ کے واسطے سے سنائی، جب میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ''ہم جیسے لوگوں سے چنیں چناں کرنا بڑی بے ادبی ہے۔'' (۸)

اس طرح کا کام کرنے والوں میں ابوسعید مدائنی کافی مشہور تھا۔

اسحاق بن راہویہ جو امام بخاری کے استاذ تھے، ان کے پاس ایک فقیر آیا تو انہوں نے اس کو گداگری سے منع کیا اور کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ "لا تحلُّ الصّدقةُ لِغَنِيِّ ولا لـذي مِـرّةٍ سوِيٍّ" (۹) ''غنی اور تندرست کے لیے صدقہ جائز نہیں ہے'' تو اس نے کہا کہ ''اللہ کے رسول ﷺ نے کام کرنے اور محنت مشقت کرنے سے منع کیا ہے، پھر عجیب وغریب سند پڑھی جو اس طرح تھی "حدّثنا ابن عبدالله الصادق الناطق، عن أقتبير، عن بتناخ، عن أفشين، عن بان سان، عن ياز ماز، عن سيماء الصغير، عن سيماء الكبير، عن عجيف بن عنبسة، عن رعلمج ابن عم امير المؤمنين انّه قال : " العمل شؤم وتركه خير تقعد تهني خير من اَن تعمل تفني"

ابن راہویہؒ نے جب یہ سنا تو انکو ہنسی آ گئی اور غصہ ٹھنڈا ہو گیا، انہوں نے کہا: اور اس طرح کی پرلطف باتیں سناؤ، چنانچہ اس نے بہت ساری اسی طرح کی گھڑی ہوئی روایتیں ان کو سنائیں۔ (۱۰)

---

(۷) المجروحین (۱/۸۵)، الموضوعات الکبریٰ (۱/۴۶)

(۸) المجروحین (۱/۸۶)، الموضوعات (۱/۴۷)

(۹) ابوداؤد (۱۶۳۴)، ترمذی (۶۵۲)، وقال حسن، نسائی (۵/۹۹)، ابن ماجہ (۱۸۳۹)

(۱۰) المجروحین (۱/۸۷-۸۸)

ان میں بعض ایسے بھی ہوتے تھے جن کی ماحول ومعاشرے پر سخت گرفت ہوتی تھی، عوام کے دل میں ان کی اتنی اہمیت ہوتی تھی کہ ان کے خلاف زبان کھولنا عوام سے لڑائی کے مترادف ہوجاتا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں جو امام شعبی کے ساتھ پیش آیا، وہ اپنے زمانے میں عراق کے سب سے بڑے محدث اور عالم تھے، وہ خلیفہ عبدالملک کی طلب پر شام جارہے تھے، مقام ''تدمُر'' پر جمعہ کی نماز کے لیے ٹھہرے تھے، مسجد میں ایک باریش بزرگ تشریف فرما تھے، وہ لوگوں کو حدیثیں سنا رہے تھے، انہوں نے ایک حدیث یوں ذکر کی کہ'' اللہ تعالیٰ نے دوصور بنائے ہیں اور ہر صور میں دودوبار پھونکے گا'' امام شعبی کو یہ سن کر ضبط نہ ہوسکا، انہوں نے کہا کہ ''اللہ کے بندے! اللہ سے ڈرو، غلط سلط حدیث مت بیان کرو، اللہ نے صرف ایک صور بنایا ہے، جس میں دوبار پھونکا جائے گا، اس نے عوام کو ان کے خلاف بھڑکا دیا اور کہا کہ یہ بڑا فاسق انسان ہے اور مارنا شروع کردیا، لوگ ان کے اوپر ٹوٹ پڑے، بڑی منت سماجت کے بعد فرصت ملی۔ (۱۱)

امراء وحکام کو خوش کرنا :

انہی دنیاوی اغراض میں سے حدیث گھڑنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ اس کے ذریعے سے امراء وحکام کو خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کے ذریعہ شاباشی اور عطیات حاصل کرتے اور اپنا مقام بناتے تھے، ہر دور میں اس قسم کے لوگ پائے جاتے تھے جو چاپلوسی کو اپنا وسیلہ بناتے تھے یعنی بظاہر محبت اور عزت کا اظہار کرتے تھے اور دل میں ذاتی مفاد مخفی ہوتا تھا، یہ لوگ ہر زمانے میں امت کے لیے نقصان دہ تھے اور رہیں گے، ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا بہت ضروری ہے جو ذاتی مفاد کی خاطر امت کے مفاد کو قربان کردیتے ہیں۔

جن لوگوں نے اس مقصد کے لیے حدیثیں گھڑی ہیں ان میں غیاث بن ابراہیم نخعی کا واقعہ کافی مشہور ہے، جو خلیفہ مہدی عباسی (محمد بن منصور والد ہارون رشید) کے ساتھ پیش آیا، خلیفہ کو

---

(۱۱) السنۃ قبل التدوین ص ر ۲۱۰ منقول از تحذیر الخواص من اکاذیب القصاص، ص ر ۵۱،

کبوتر بازی کا بڑا شوق تھا، جب یہ مہدی کے پاس آیا تو وہ کبوتر بازی کر رہا تھا، کسی نے اس سے کہا کہ امیر المؤمنین کو کوئی حدیث سناؤ، اس نے فوراً ہی ایک صحیح حدیث کے ساتھ ایک لفظ گھڑ کر مہدی کو خوش کرنے کے لیے سنایا، اس لیے کہ اس گھڑے ہوئے لفظ میں کبوتر بازی کی اجازت رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ملتی تھی، یہ صحیح حدیث ہے "لا سبقَ اِلا فی نَصلٍ اَو خُفٍّ اَو حافِرٍ" (۱۲) جس کا مطلب یہ ہے کہ ''مقابلہ آرائی صرف نیزہ بازی، گھوڑ سواری اور اونٹ دوڑانے میں جائز ہے'' اس حدیث میں اس نے ''اَوجناح'' کا لفظ بڑھا دیا یعنی پرندہ اڑا کر بھی کھیل کرنا جائز ہے۔

حالانکہ مہدی اس کی کذب بیانی کو سمجھ گیا، پھر بھی بطور عطیہ اسے ایک ہزار درہم دیے جانے کا حکم دیا، جب وہ چلا گیا تو خلیفہ نے کہا : اس نے مجھ کو خوش کرنے کے لیے ''اَوجناح'' کے لفظ کا اضافہ کیا ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ جھوٹا شخص ہے، چوں کہ میں اس حدیث کے گھڑنے کا سبب بنا لہٰذا میں آج سے اپنا یہ عمل چھوڑتا ہوں اور کبوتروں کو ذبح کر دینے کا حکم دیا، اس کے بعد غیاث کو کبھی یاد بھی نہ کیا۔ (۱۳)

اسی کے ہم مثل ایک واقعہ خطیب بغدادی نے ابوالبختری قاضی کے متعلق ذکر کیا ہے جو ہارون رشید کے زمانے میں قاضی تھا، ایک مرتبہ وہ ہارون کی مجلس میں آیا، وہ اس وقت کبوتر بازی کر رہا تھا، اس نے کہا : اس سلسلہ میں کوئی حدیث معلوم ہو تو سناؤ، ابوالبختری نے فوراً ایک حدیث حضرت عائشہؓ کے واسطے سے گھڑی کہ "اَن النبیَ ﷺ کا ن یطیرُ الحمام" (۱۴) (رسول اللہ ﷺ۔ نعوذ باللہ۔ کبوتر بازی کرتے تھے)

---

(۱۲) ابواود (۲۵۵۷)، ترمذی (۱۷۰۰)، نسائی (۲۲۶/۶)

(۱۳) تاریخ بغداد (۳۲۴/۱۲)، المجروحین (۶۶/۱)، الموضوعات الکبریٰ (۴۲/۱)

(۱۴) تاریخ بغداد (۴۸۴/۳)، فتح المغیث (۳۰۲/۱)

یہ سن کر ہارون کو بہت غصہ آیا اور کہا کہ ''میرے سامنے سے ہٹ جا، اگر تو خاندان قریش کا نہ ہوتا تو میں تجھے معزول کر دیتا۔'' ویسے اس طرح کے واقعات نادر ہیں۔

دوستوں کی تائید :

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی جھوٹے شخص نے اپنے کسی دوست یا ساتھی کی تائید اور اس کی جانب سے دفاع کرنے کے لیے حدیث گھڑی ہے، جیسا کہ محمد بن عبدالواحد نے کیا تھا، جب اس کے دوست محمد الجوہری نے ایک روایت گھڑی تو بعض اہل علم نے اس پر نکیر کی تو اس کے دوست محمد بن عبدالواحد اصبہانی نے اس کی تائید میں دوسری حدیث گھڑی جو اس کی گھڑی ہوئی روایت کی تائید میں تھی۔ (۱۵)

پیشہ یا تجارت کو فروغ دینا :

کچھ ایسے لوگوں نے بھی حدیثیں بنانے میں شرکت کی ہے جو کسی پیشہ یا تجارتی کاروبار سے منسلک تھے، اس سے ان کا مقصد اپنے پیشہ کو فروغ دینا اور اپنے کاروبار کو چمکانا تھا۔

کاروبار سے متعلق حدیث گھڑنے میں محمد بن حجّاج لخمی کافی شہرت رکھتا تھا، اس نے "هـــريســـه" (کوفتہ جس میں گوشت کے ساتھ گیہوں کوٹ کر ملایا گیا ہو) کے بارے میں یہ حدیثیں گھڑیں :

"أطعمَني جِبريلُ الهريسةَ لِأشدّ بِها ظهرِى لِقيامِ الليل" (۱۶) جبرئیل نے مجھ کو کوفتہ کھلایا تا کہ قیام اللیل کے لیے پیٹھ مضبوط ہو جائے۔

"أتيتُ بِالهريسةِ فأكلتُها فزادت فِي قوّتى قوةُ اَربعين وفى نِكاحى نكاحُ أربـــعيـــن" (۱۷) میرے پاس کوفتہ لایا گیا میں نے اس کو کھایا تو میری طاقت اور قوت باہ

---

(۱۵) الموضوعات (۲/ ۸۳۔۸۴)، الوضع فی الحدیث (۱/ ۲۶۳)

(۱۶) الموضوعات الکبریٰ (۳/ ۱۷) (۱۷) الموضوعات الکبریٰ (۳/ ۱۶)

میں چالیس گنا اضافہ ہو گیا۔

اسی طرح فضالہ بن حسن ضَمّی نے جو عطر فروش تھا یہ حدیث گھڑی "ما عُرض على النبي ﷺ طيبٌ فردّه" (۱۸) رسول پر جب خوشبو پیش کیا گیا تو آپ نے واپس نہیں کیا۔

ایسے ہی ہناد بن ابراہیم نسفی نے تربوز کی فضیلت کے متعلق حدیث گھڑی کہ "إن الله بارکَ علیها (علی البطّیخ) وعلیٰ من أکلها، ماءُ ها رَحمة وحلاوتُها مثل حلاوة الجنة" (۱۹) اللہ نے تربوز اور اس کے کھانے والے کو برکت دیا۔ اس کا پانی رحمت اور اس کی مٹھاس جنت کی مٹھاس کی طرح ہے۔

اسی طرح سے بے شمار حدیثیں جو مسور، بیگن، انار، انگور، میتھی، جرجیر اور فالودہ وغیرہ کے بارے میں وضع کی گئی ہیں۔

لگتا ہے جو جس طرح کی چیز بیچتا تھا وہ اس کی فضیلت میں کچھ نہ کچھ گھڑ لیتا تھا، یا جو پیشہ اختیار کرتا تھا اس کی فضیلت میں کچھ نہ کچھ گھڑ لیتا تھا مثلاً یہ حدیث "عمل الأبرارِ مِن أمتي الخياطة وأعمال الأبرار من النساء الخياطة والمغزل" (۲۰) میری امت کے نیک لوگوں کا کام سلائی کرنا اور خواتین کا کام سلائی کرنا اور چرخہ چلانا ہے۔

ذاتی انتقام :

انسان کی طبیعت کے بارے میں اللہ رب العالمین کا فرمان ہے کہ "انسان جزع فزع کرنے والا بنایا گیا ہے، جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے۔" (المعارج : ۱۹۔ ۲۰) اللہ رب العالمین نے اس کو ذم کے سیاق میں بیان کیا ہے اور ایسا نہ کرنے پر اہل ایمان کی تعریف کی ہے۔

پھر بھی انسان (خاص طور سے صاحبِ تقویٰ و صاحبِ علم) کو جہاں صبر و تحمل کی

---

(۱۸) لسان المیزان (۴/۴۳۵)

(۱۹) الموضوعات (۲/۲۸۶) (۲۰) الموضوعات الکبریٰ (۲/۵۳۴)

ضرورت پڑتی ہے وہاں صبر کا دامن چھوڑ دیتا ہے اور حد سے تجاوز کر جاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ یہ جہالت کا پتلا ہے، بہت اونچی اونچی ڈگریوں والے اہل علم کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ علمی مراکز میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے مسائل اوران کی گفتگو سے جذبات میں آکر لڑنے بھڑنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں، پھر ایک دوسرے کی انتقامی کارروائی پورے معاشرے کو اپنی چپیٹ میں لے لیتی ہے۔

اسی ذاتی انتقام اور جذباتیت نے حدیث رسول گھڑنے میں بھی اپنا کردار ادا کیا ہے، مثال کے طور پر ایک صاحب تھے سعد بن طریف اسکاف، ان کے بچے کو مدرس نے ماردیا، جس کی وجہ سے وہ روتے ہوئے ان کے پاس گیا، انہوں نے رونے کا سبب پوچھا تو بچے نے اپنے معلم کی شکایت کی کہ انہوں نے مارا ہے، چناں چہ ان کی پدرانہ شفقت انتقامی جذبے سے لبریز ہوگئی اور کہا کہ ''میں ان ملاؤں کو رسوا کر کے چھوڑوں گا، چنانچہ ایک حدیث گھڑ دی "معلموا صبیانکم شرارکم" (۲۱) تمھارے بچوں کو تعلیم دینے والے سب سے برے ہوتے ہیں۔

فریب خوردہ حضرات :

کچھ ایسے بھی لوگ اس میں ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر حدیث تو نہیں گھڑی مگر غلطی سے رسول ﷺ کی جانب ایسی بات منسوب کردی جو آپ کی بات نہیں تھی۔

ایسے ہی اور کچھ حضرات ہیں جنہوں نے خود ایسا کام نہ کیا بلکہ ان کے ساتھ کے لوگوں نے ان کو دھوکہ دیا اوران کی صحیح حدیثوں میں باطل چیزیں ملا دیں، یہ اس کو سمجھ نہ سکے اور اسے بھی اپنی روایت سمجھ کر بیان کرنے لگے جو بہت بڑی غفلت تھی چناں چہ اس طرح کے لوگوں کی روایت موضوعات میں شامل ہوگئی، جیسا کہ حماد بن زید کے ساتھ ہوا، ان کا ربیب عبدالکریم بن ابی العوجاء تھا جو بہت بڑا جھوٹا اور مکار تھا، اس نے ان کی روایتوں میں موضوعات کو داخل کردیا، جن کو وہ سمجھ نہ سکے۔ (۲۲)

---

(۲۱) المجروحین (۱/۶۶)، الموضوعات (۱/۴۲)، فتح المغیث (۱/۳۰۲)

(۲۲) الموضوعات (۱/۱۰۰)

ایسے ہی سفیان بن وکیع کے ساتھ ان کے کاتب قرطمہ نے کیا۔ (۲۳)

اور عبداللہ بن صالح کاتب لیث بن سعد کے ساتھ ان کے ایک پڑوسی نے کیا تھا۔ (۲۴)

ایسے ہی عبداللہ بن ربیعہ مصیصی اپنے ایک نالائق فرزند کی وجہ سے متہم ہو گئے، جس نے ان کی حدیثوں میں خرد برد کر دی تھی۔

کچھ ایسے بھی حضرات تھے جو کسی آفت، یا بیماری، یا بڑھاپے کی وجہ سے اپنا حافظہ کھو بیٹھے تھے، یا کتابیں ضائع ہو گئیں، یا بینائی ختم ہو گئی جس کی وجہ سے مذاکرہ نہیں کر سکے اور یادداشت کمزور ہو گئی، اس حال میں انہوں نے جب روایت بیان کی تو ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں اور ان کی روایتیں مشکوک و مرفوض ہو گئیں۔ (۲۵)

یہ اقسام عموماً مخفی ہوتی ہیں اس لیے ان کا ضرر بھی مخفی ہوتا ہے کیوں کہ اس کا معلوم کرنا سب کے بس کی بات نہیں، صرف بڑے بڑے حفاظ و ائمۂ حدیث ہی کر سکتے ہیں۔ (۲۶)

الحمدللہ اب یہ کام کوئی مشکل نہیں رہ گیا، بڑے بڑے حفاظ حدیث اور ائمۂ جرح و تعدیل نے اپنی اس ذمہ داری کو مکمل طرح سے ادا کیا، اس طرح کی گھڑی ہوئی یا غلطی یا بھول یا غفلت کی وجہ سے جو بھی حدیثیں تھیں سب کو بتا دیا، منظر عام پر لے آئے اور تحریری شکل میں سبب کے ساتھ ان کو جمع کر دیا، موضوعات پر جو تصانیف ہیں وہ اس سلسلے میں کافی مفید ہیں۔

سب سے زیادہ نقصان دہ :

ان کذابین اور وضاعین میں سے سب سے زیادہ نقصان دہ وہ لوگ تھے جو مفتیان دین، واعظین اور زہاد تھے، اس لیے کہ یہ لوگ معاشرے میں انتہائی محترم سمجھے جاتے تھے، لوگ ان کی باتوں پر اعتماد کرتے تھے، ان کے تقوی و پرہیز گاری کے معترف تھے، ان سے دعائیں کراتے

---

(۲۳) تنزیہ الشریعۃ ص ۱/۱۵ (۲۴) المجروحین (۱/۷۷)

(۲۵) الموضوعات (۱/۱۰۰)، فتح المغیث (۱/۳۰۹)

(۲۶) فتح المغیث (۱/۳۰۹)

تھے، ان لوگوں کی عظمت اور ماحول پر اثر کا یہ عالم تھا کہ ''نوح الجامع'' جنہوں نے فضائل قرآن سے متعلق حدیثیں گھڑی ہیں جب ان کا انتقال ہوا تو بغداد کے بازار بند ہو گئے تھے، یہ انتہائی زاہد اور تارکِ دنیا تھے۔

ایسے ہی ابوداود نخعی جو محدثین کے یہاں حدیثیں گھڑنے میں شہرت رکھتے ہیں، طول قیام و کثرتِ صیام اور تقوی و پرہیز گاری میں بھی شہرت رکھتے تھے۔

ابوبشر احمد بن محمد فقیہ اپنے زمانے میں سنتِ رسول ﷺ کے بڑے مُدافع اور مخالفین سنت پر بڑے شدید تھے لیکن وضع حدیث کرتے تھے۔

وہب بن وہب انتہائی بزرگ تھے، دنیاوی گفتگو کرتے ہی نہیں تھے لیکن حدیثیں گھڑتے تھے۔

لہٰذا جب بھی یہ حضرات کوئی حدیث گھڑ کر لوگوں کو سناتے تھے تو وہ اس کو فوراً قبول کر لیتے تھے، بنابریں موضوع حدیثوں کی نشر واشاعت میں ان کا بڑا کردار رہا۔ (۲۷)

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ ''وضاعین میں سب سے زیادہ قابل ضرر اہل زُہد ہیں اس لیے کہ عوام کو ان پر بڑا اعتماد ہوتا ہے، ان میں بظاہر خیر کی علامتیں پائی جاتی ہیں، لہٰذا لوگ ان کی باتوں کو فوراً قبول کر لیتے تھے۔'' (۲۸)

ماحول پر ان لوگوں کا اتنا گہرا اثر تھا کہ محدثین کو کبھی کبھی ان کی طرف سے ایذا رسانی کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا، جیسا کہ امام شعبی کے واقعہ سے ظاہر ہے۔

انہی لوگوں میں وہ بھی شامل ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر حدیث نہیں گھڑی لیکن کسی دوسرے شخص کی وجہ سے دھوکہ کھا گئے، یا جو مُختلط ہو گئے ان کا بھی ضرر شدید ہے اس لیے کہ ان کی گھڑی ہوئی حدیثوں کا معلوم کرنا اور ان کا نکالنا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہے۔ (۲۹)

---

(۲۷) تدریب الراوی (۱/ ۲۸۳) (۲۸) مقدمۂ ابن الصلاح ص/ ۹۰

(۲۹) فتح المغیث (۱/ ۳۰۹)

دوسری قسم کی جو اصناف ہیں جیسے زنادقہ وغیرہ تو ان لوگوں کی حدیثیں ایسی ہوتی تھیں کہ جن کے بُطلان کو ایک غبی شخص بھی سمجھ سکتا تھا، یہی حال رافضی، مجسمہ اور قدریہ وغیرہ کی روایتوں کا ہے۔ (۳۰)

جن لوگوں نے سیاسی بنیاد پر حدیثیں گڑھی ہیں، ان کی روایتوں کا تعلق حلال وحرام یا احکام سے نہیں بلکہ زیادہ تر شخصی فضائل سے ہے لہٰذا ان کا ضرر دوسروں کے مقابلے میں کم ہے۔

☆☆☆

---

(۳۰) فتح المغیث (۳۰۹/۱)

۴ - وضع حدیث میں عصبیت کا کردار

عصبیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے کسی قریبی شخص کو تعاون ومدد کے لیے بلائے، ظالم ہو یا مظلوم، صاحب "اللسان" فرماتے ہیں کہ "العصبية والتعصب : الحماية والمدافعة" عصبیت وتعصب کا مطلب ہے : حمایت کرنا اور مدافعت کرنا۔

عصبیت کا معنی اگر چہ اپنے قریبی سے تعاون اور اس سے دفاع ہوتا ہے خواہ ظالم ہو یا مظلوم لیکن اس کا اطلاق بے جا تعاون پر ہوتا ہے گویا کہ متعاون کی طرف سے تعاون یا دفاع کرنے والا اس کا عصبہ (خاندانی فرد) ہے۔

یہ عصبیت انتہائی بری بلا ہے، یہ انسان کو ظالم اور مظلوم، حق وناحق اور خیر وشر میں فرق کرنے سے روک دیتی ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو بدبودار چیز قرار دیتے ہوئے "دَعُوها فإنّها مُنتِنة" (۱) کہہ کر اس سے باز رہنے کا حکم دیا ہے لیکن انسان کی ظالمانہ طبیعت اس سے باز نہ رہ سکی، اس نے زندگی کے ہر میدان میں اس کا بھرپور مظاہرہ کیا، حتی کہ خود حدیث رسول کو اسی عصبیت سے داغدار بنا دیا، جس چیز سے آپ نے منع کیا تھا، اسی کو حدیث رسول گھڑنے کے لیے استعمال کیا۔

جن عصبیات نے حدیث رسول کے لیے اپنے آپ کا استعمال کیا، ان میں مذہبی عصبیت، قومی عصبیت، علاقائی عصبیت اور زبانی عصبیت خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مذہبی عصبیت کے متعلق گفتگو دینی عصبیت میں گذر چکی ہے، جہاں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ کس طرح سے لوگوں نے اپنے مذہب ومسلک، دینی آراء، افکار ونظریات کی تائید میں حدیثیں گھڑی ہیں، مثال سے اس کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے، اس لیے یہاں پر دیگر عصبیات کا

---

(۱) بخاری (۴۹۰۵)، مسلم (۲۵۸)

نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔

لیکن سب سے پہلے تعصب وتنگ نظری کے اسباب پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسباب تعصب :

ان عصبیات کے پس منظر کے بارے میں شیخ غازی عزیر حفظہ اللہ نے اپنی کتاب ''فتنۂ انکار حدیث کا نیا روپ'' میں اظہار خیال کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے :

۱ - خلافت بنوعباسیہ کا قیام خراسانی اور فارسی لوگوں کے تعاون سے وجود میں آیا، خراسان شیعیت کا گہوارہ تھا۔

اہل فارس حکومت کو اپنی جاگیر ووراثت سمجھتے تھے لہٰذا انہوں نے بنوامیہ کو اہل بیت کا غاصب سمجھ لیا اور بزور قوت اس کو بنی عباس میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی، جس سے مسلمانوں میں عناد، نفرت، تعصب وتنگ نظری نے جنم لیا۔

۲ - دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل فارس کو دور جاہلیت میں قوم عرب پر غلبہ تھا، بنوامیہ کے دور میں وہ مغلوب ہو کر ان کے آزاد کردہ غلام بن گئے، اہل عرب کی حکمرانی ان پر شاق گذری اس لیے وہ بنوامیہ کے سیاسی حریف بن گئے۔

پھر جب بنوعباس کا غلبہ ہوا تو انہوں نے اہل فارس کی بھرپور مدد کی، ان کو اعلیٰ مناصب ومقامات سے نوازا، یہاں تک کہ ان کو قوم عرب پر برتری حاصل ہوگئی، عربوں کو زیر کرنے کے لیے انہوں نے ان کے خلاف مختلف محاذ کھول دیے اور ان کے خلاف صف آرا ہوگئے، اشعار اور خطبوں میں ان کا مذاق اڑایا جانے لگا، ان کی فضیحت اور ہجو میں کتابیں لکھی گئیں، اپنی اسی برتری کو قائم رکھنے کے لیے انہوں نے فارس، فارسی زبان، اہل فارس اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں بے شمار حدیثیں گھڑ ڈالیں، جس پر ان کا کوئی مؤاخذہ کرنے والا بھی نہ تھا، اسی کے پس منظر میں مختلف عصبیات نے جنم لیا۔ (۲)

---

(۲) فتنۂ انکار حدیث کا نیا روپ (۳/ ۳۸۳)

ڈاکٹر عمر فلاتہ فرماتے ہیں کہ ''بعض خلفاء بنو امیہ اور خلفاء بنو عباسیہ کا بعض قبیلوں کو بعض پر فوقیت دینا، بعض قوموں کو بعض پر ترجیح دینا، بعض کو مناصب عطا کرنا اور بعض کو محروم رکھنا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلی، قومی اور شعوبی عصبیت نے جنم لیا اور ہر گروہ والوں نے اپنے دعوے کی تائید میں حدیثیں گھڑ لیں۔'' (۳)

قوم عرب وعجم دونوں نے مل کر یہ کام کیا کہ ایک دوسرے کی فضیحت اور اپنی فضیلت کو اجاگر کرنے کے لیے وضع حدیث کا سہارا لیا، چنانچہ اس طرح کی حدیثیں وجود میں آئیں جن سے کسی کی فضیحت یا فضیلت کا اظہار ہو مثلاً :

''اَحِبّوا العربَ لثلاثٍ لأنی عربی و کلام اَھل الجنة عربی والقرآن عربی'' (۴) عربوں سے تین چیزوں کی وجہ سے محبت کرو اس لیے کہ میں عربی ہوں، اہل جنت کی زبان عربی ہے اور قرآن عربی میں ہے۔

ڈاکٹر عجاج خطیب فرماتے ہیں کہ ''بنی امیہ نے حکومتی معاملات میں عربوں پر اعتماد کیا جس کی بنا پر بعض لوگوں کو عربوں اور عربیت پر ناز ہو گیا اور وہ دوسرے غیر عربی مسلمانوں (جن کو موالی کہا جاتا تھا) کے سلسلے میں غیر اسلامی نظریہ رکھنے لگے، لہٰذا وہ مساوات کے خواہاں ہوئے جس کی وجہ سے مختلف بغاوتیں ہوئیں جن کا انہوں نے ساتھ دیا۔'' (۵)

قومی عصبیت :

قوم اور قومیت کی بنا پر فخر ومباہات اگرچہ شرعاً ممنوع ہے، اللہ رب العزت نے فضیلت اور فخر کی بنیاد تقویٰ کو قرار دیا ہے اور یہ ارشاد فرمایا کہ ﴿وجعلناکم شُعوباً وقبائلَ لِتعارَفوا اِنّ اَکرمکم عنداللهِ أتقاکُم﴾ (حُجرات : ۱۳) ہم نے تم کو قوموں اور قبیلوں میں پہچان کے لیے تقسیم کیا ہے (فخر ومباہات کے لیے نہیں) یقیناً اللہ کے یہاں سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

---

(۳) الوضع فی الحدیث (۲۶۱/۱)

(۴) الموضوعات (۴۱/۲)، اللآلی المصنوعۃ (۴۴۲/۱) (۵) السنۃ قبل التدوین ص/۲۰۸

اور اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ "یا أیها الناس ألا إن ربکم واحد وأن أباکم واحد ألا لا فضلَ لعربيٍ علیٰ عجميٍ إلا بالتقویٰ" (۶) انسانو تمھارا رب ایک ہے تمھارا باپ ایک ہے خبردار کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت صرف تقوی ہی کی بنیاد پر ہے۔

لیکن انسانوں نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فخر ومباہات اور اظہار فضیلت کے لیے دوسری چیزوں پر اعتماد کیا، اسی میں سے قومیت بھی ہے، اس قومیت کو اتنا بڑھاوا دیا گیا کہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا، ان کی حکومتیں برباد ہوگئیں اور پھر ان میں اتنی دوری ہوگئی کہ صنعت وحرفت کی بنیاد پر قوم اور خاندان بٹ گئے، ایک صنعت والا مسلمان دوسری صنعت وحرفت والے مسلمان سے رشتۂ ازدواج میں منسلک نہیں ہوسکتا۔

اسی قومیت کو بڑھاوا دینے اور اس کی بنیاد پر فضیلت کا اظہار کرنے کے لیے لوگوں نے حدیثیں تک گھڑ ڈالیں اور ان کو رسول کی جانب منسوب کر دیا، مثلاً :

"مجھ کو سوڈانیوں سے دور رہنے دو، کالے صرف پیٹ اور شرمگاہ کے لیے ہوتے ہیں۔" (۷)

"سود وہنود سے سات پشت تک بچو۔" (۸)

'سوڈانیوں کو اپناؤ اس لیے کہ ان میں تین افراد جنت کے سرداروں میں سے ہیں: لقمان حکیم، شاہ حبشہ نجاشی اور بلال۔ (۹)

"جنت میں سوڈانیوں کی چمک ایک ہزار سال کی مسافت سے نظر آئے گی۔" (۱۰)

"مجھ کو جو عجم سے خصوصی وابستگی ہے' تمہارے ساتھ نہیں۔"

"ترکوں کا ظلم بہتر اور عربوں کا عدل معیوب ہے۔" (۱۱)

جس طرح قومیت نے وضع حدیث میں کردار ادا کیا ہے، اسی طرح سے قبائلی حمیت کا بھی اس میں بڑا دخل رہا ہے اور بہت سی حدیثیں اس سے متعلق وضع کی گئی ہیں، مثلاً :

---

(۶) مسند احمد (۵/۴۱۱)، الصحیحہ (۲۰۰۷) (۷) اللآلی المصنوعۃ (۱/۴۴۳)، الفوائد المجموعۃ ص/۴۱۴

(۸) الفوائد المجموعۃ ص/۴۱۷ (۹) اللآلی المصنوعۃ (۱/۴۴۸)

(۱۰) الفوائد المجموعۃ ص/۴۱۷ (۱۱) فتنۂ انکار حدیث کا نیا روپ (۳/۳۸۵)

''ایک شخص کا قتل ہوگیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ اس کو اپنی رحمت سے دور رکھے وہ قریش سے نفرت کرتا تھا۔'' (۱۲)

''انصار کی تکریم کرو، انہوں نے اسلام کی پرورش ویسے ہی کی ہے جیسے پرندوں کی ان کے گھونسلے میں ہوتی ہے۔'' (۱۳)

''انسانوں میں سب سے بہتر عرب والے ہیں اور عرب والوں میں سب سے بہتر قریش والے ہیں اور قریش میں سب سے بہتر بنو ہاشم ہیں، عجم میں سب سے بہتر فارس والے ہیں اور سودان میں سب سے بہتر نوبہ والے ہیں۔'' (۱۴)

وطنی عصبیت :

وطن کی محبت فطری امر ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہجرت کرنے کے بعد بھی مکہ کی آب وہوا، وہاں کے پہاڑوں اور چشموں کا تذکرہ کرتے رہتے تھے، ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو بیماری کی حالت میں مکہ کا تذکرہ کرتے اور اس سے محبت کا اظہار یوں کرتے :

ألا ليت شعرى هل أبيتنّ ليلةً   بِوادٍ وحَولى إذخر وجليل

وهل أردن يوماً مياه مجنّة   وهل يبدون لى شامة وطفيل

کاش کہ میں ایسی وادی میں رات گذارتا جہاں میرے اردگرد اذخر اور جلیل گھاس ہوتی !

اور کاش کہ میں کسی دن مجنہ کے چشمے پر حاضری دیتا اور شامہ اور طفیل پہاڑیوں کا دیدار کرتا)

تو اللہ کے رسول ﷺ نے دعا کی کہ ''اے اللہ! ان کے دلوں میں مدینہ کی محبت مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ڈال دے۔'' (۱۵)

لیکن اس جذبۂ حب وطن کو بنیاد بنا کر اظہار فضیلت کرنا اور فخر ومباہات کرنا بری بات ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سارے مقامات ایسے ہیں جن کی فضیلت مسلّم ہے اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت شدہ ہے، خاص طور سے حرمین ،قبلۂ اول، یمن اور شام کی فضیلتوں کا ذکر مختلف

---

(۱۲) الموضوعات الکبریٰ (۱/ ۴۲)، اللآلی المصنوعۃ (۱/ ۴۴۳)

(۱۳) الفوائد المجموعۃ ص ر ۴۱۳   (۱۴) الفوائد المجموعۃ ص ر ۴۱۴   (۱۵) بخاری (۵۶۵۴)

احادیث میں ہے۔

چوں کہ انسان نے وطن کو فخر ومباہات کا ذریعہ بنایا اس لیے کوئی اپنے وطن کی توہین برداشت نہیں کرتا، اگر کوئی کسی کے وطن میں عیب نکالتا ہے تو مدمقابل بھی اس کے وطن میں عیوب تلاش کرتا ہے اور اپنے وطن کی فضیلت بیان کرتا ہے، بہت سارے اہل علم نے اپنے وطن کی تاریخ مرتب کی ہے جس میں وہاں کے اہل علم اور ارباب کمال شخصیات کا تذکرہ محض اس لیے کیا ہے تاکہ اس جگہ کی فضیلت کا اظہار کیا جائے۔

علامہ ابوالقاسم سہمی نے ''تاریخ جرجان'' کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میں نے یہ دیکھا کہ بہت سارے اہل علم اپنے یہاں صحابہ کی آمد، امراء وحکام منتخب ہونے، علماء اور محدثین کے وجود سے فخر ومباہات کرتے ہیں، لہٰذا میں نے بھی سوچا کہ ''جرجان'' کے علماء ومحدثین اور اہل علم کا ایک مجموعہ تیار کیا جائے۔'' (۱۶)

اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے بہت سارے لوگوں نے اپنے وطن کی فضیلت اور مخالف کے وطن کی فضیحت کے لیے حدیث گھڑنے کا سہارا لیا اور ان گھڑی ہوئی حدیثوں کے ذریعہ وطن کا نام روشن کیا جو حقیقت میں وطن اور اہل وطن کی بدنامی کا باعث بنا، خاص طور سے ان شہروں کے متعلق حدیثوں کا وجود ہوا جو سیاسی اعتبار سے ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتے، مثلاً:

''چار شہروں: مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور دمشق' کا تعلق جنت سے ہے اور چار شہروں: قسطنطنیہ، طبرانیہ، انطاکیہ اور صنعاء' کا تعلق جہنم سے ہے۔''

''اِسکندریہ، عسقلان اور قزوین کے دروازے جنت کے ہیں جو دنیا کی طرف کھلتے ہیں اور جدہ کی فضیلت ان پر ویسے ہی ہے جیسے بیت اللہ کی فضیلت دیگر مکانات پر ہے۔''

''ابلیس عراق میں آیا، وہاں اس کا کام چل گیا، جب شام میں آیا تو بھگا دیا گیا، یہاں تک کہ میسان پہنچا، پھر مصر میں داخل ہوا، وہاں پر انڈے اور بچے دیے اور اس کی صلاحیت منتشر ہوگئی۔'' (۱۷)

---

(۱۶) تاریخ جرجان (۳/۴) (۱۷) الموضوعات (۲/۵۱، ۵۲، ۵۸)

اسی طرح سے خراسان کے شہر: مرو، طالقان، شاش، بخاریٰ، سمرقند، طوس، خوارزم، جرجان اور قوس وغیرہ کے بارے میں تھوک کے حساب سے بڑی دلچسپ حدیثیں گھڑی گئی ہیں، جن کا تذکرہ " اللآلی المصنوعة ۱/۴۵۹ اور تنزیه الشریعة المرفوعة ۲/۴۶ " وغیرہ کتب موضوعات میں موجود ہے۔

لسانی عصبیت :

کچھ لوگوں کو اپنی زبان پر بڑا ناز وغرور ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے آپ کی فضیلت بیان کرتے ہیں یا دوسروں کی زبان کی توہین کرتے ہیں۔

زبان کی فضیلت وفضیحت میں گھڑی ہوئی روایتوں کا نمونہ کچھ یوں ہے :

"اللہ تعالیٰ جب ناراض ہوتا ہے عربی زبان میں وحی نازل کرتا ہے اور جب خوش رہتا ہے تو فارسی زبان میں وحی کا نزول کا کرتا ہے۔" (۱۸)

"اللہ کے نزدیک مبغوض کلام (زبان) زبان فارسی ہے، زبان خوزی شیطان کی زبان ہے، جہنمیوں کی زبان بخاری ہے اور اہل جنت کی زبان عربی ہے۔" (۱۹)

"وہ لوگ جو عرش کے اردگرد ہیں ان کی زبان فارسی ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی ایسی چیز کا نزول فرماتا ہے جس میں آسانی ہوتی ہے تو فارسی میں نزول ہوتا ہے اور جب سختی وشدت کی چیز ہوتی ہے تو عربی میں نازل فرماتا ہے۔" (۲۰)

مذہبی عصبیت :

اس سلسلے کی گفتگو "مؤیدین مذہب" میں گذر چکی ہے۔ (۲۱)

☆☆☆

---

(۱۸) الموضوعات (۱/۱۱۰)

(۱۹) الأباطیل والمناکیر (۲/۲۶۰)، تنزیه الشریعة (۱/۱۳۷)

(۲۰) تنزیه الشریعة (۲/۱۳) (۲۱) دیکھیے صفحہ ۲۹۲

دفاعی عمل

۱- کذابین کی نشان دہی وتحریری بیان :

محدثین عظام کی بے بہا خدمات حدیث اور تحفظ سنت نبوی کا یہ ایک عظیم باب ہے، جس کے ذریعہ سے حدیث پاک کو ہر قسم کی رخنہ اندازیوں سے پاک کر دیا گیا ہے اور جن لوگوں نے یہ ناپاک کوشش کی ان کی گرفت ہر دور میں اور ہر حال میں کر لی، کسی بھی شکل میں گھس پیٹھ کرنے والوں کو اس معنی میں کامیابی نہ مل سکی کہ ان کی گھڑی ہوئی بات اس طرح سے حدیث رسول میں داخل ہو گئی ہو کہ اس کی گرفت نہ کی جا سکے۔

اس تفصیل کے ساتھ ان لوگوں کا حلیہ بیان کیا اور ان کی شناخت واضح کر دی کہ قیامت تک یہ شناخت برقرار رہے گی، حدیث گھڑنے والوں کے نام ونسب، گاؤں اور قبیلے، حالات زندگی، وضع قطع اور سیرت وسلوک پر ایسی روشنی ڈالی جس کی مثال نہیں ملتی، حتی کہ یہ بھی بتادیا کہ کس نے کون سی روایت گھڑی ہے، ان کے مقاصد کیا تھے، ان کی کتنی قسمیں ہیں، کس نے کس موضوع کی روایت گھڑی، کس مقام پر گھڑی، سب کی وضاحت کر دی، وہ لوگ جنہوں نے دین کی دشمنی میں یہ کاوش کی ان کی مصنوعہ روایات کی نوعیت کیا ہے، جنہوں نے دین کی خدمت اور کارِ خیر سمجھ کر یہ کام انجام دیا ان کی باتیں کس موضوع سے متعلق تھیں، کس نے سیاسی مقاصد کے لیے یہ کام کیا، کس نے (فقہی) مذہب کی تائید میں کیا، کس نے تعصب وتنگ نظری کی بنا پر یہ غلط کام کیا، کون سی جماعت اس میں سرگرم رہی، کون سے افراد اس میں نامور ہوئے، کس مقام کے لوگ اس میں ماہر ہوئے اور کن سے سہواً ایسا عمل سرزد ہوا، سب واضح کر دیا اور تمام معلومات کو کتابوں میں تحریر کر دیا، بقول علامہ حالی ؎

نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا

جماعت کی نشاندہی :

جماعتی بنیاد پر ان کی نشان دہی کرتے ہوئے امام ابن سیرین (ت ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں کہ "ینظر إلی أھل السنة فیؤخذ حدیثھم وینظر إلیٰ أھل البدع فلا یؤخذ حدیثھم" (۱) حدیث کو قبول کرنے کے سلسلہ میں یہ دیکھا جاتا تھا کہ اہل السنۃ کون ہیں اور اہل بدعت کون ہیں، اہل سنت کی روایت قبول کی جاتی اور بدعتیوں کی روایت چھوڑ دی جاتی تھی۔

اہل بدعت اپنی کذب بیانی کی وجہ سے قابل اعتماد نہیں رہ گئے تھے اس لیے ان کی روایتوں سے اجتناب کیا جاتا تھا، روافض (شیعان علی) سے خصوصی طور سے اجتناب کیا جاتا تھا کیوں کہ یہ اس کار شر میں شہرت یافتہ ہو چکے تھے حتی کہ ان کے بارے میں خود حضرت علی یہ کہتے تھے کہ "قاتلھم اللہ أی علم أفسدوا" (۲) اللہ ان کو برباد کرے! کس علم کو انہوں نے برباد کیا!

صِلہ بن زُفر مختار کے بارے میں کہتے ہیں کہ "قاتل اللہ المختار أی شیعة أفسدوا وأی حدیث شانوا" (۳) اللہ تعالیٰ مختار کو ہلاک کر دے کس جماعت کو اس نے برباد کر دیا اور کس حدیث کو خراب کر ڈالا۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ''شیعہ کے علاوہ ہر عادل سے روایت کرو۔'' (۴)

امام مالک رافضہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''ان سے روایت مت کرو کیوں کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔'' (۵)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ ''رافضہ سے زیادہ شہادت زور دینے والا میں نے کسی کو نہیں پایا۔'' (۶)

---

(۱) مقدمہ صحیح مسلم (۱/۸۴) (۲) مقدمہ مسلم (۱/۸۳)
(۳) الشجرۃ ص/۲۷ (۴) الکفایۃ ص/۱۲۶
(۵) السنۃ قبل التدوین ص/۱۹۷ (۶) الکفایۃ ص/۱۲۶

زنادقہ کے بارے میں حماد بن زید فرماتے ہیں کہ ''انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر بارہ ہزار حدیثیں گھڑی ہیں۔'' (۷)

امام مالک قدریہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''ان سے حدیث نہیں پڑھی جاسکتی۔'' (۸)

ایوب سختیانی قُصاص کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''قصاص اور واعظین ہی نے حدیثوں کو برباد کیا ہے۔'' (۹)

ابوعبدالرحمٰن سُلمی فرماتے ہیں کہ ''ابوالاحوص اور شقیق کے علاوہ واعظین کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا۔'' (۱۰)

حسن بصری فرماتے ہیں کہ ''خواہش پرستوں کی مجلسوں میں شرکت نہ کرو اور نہ ہی ان سے حدیث پڑھو۔'' (۱۱)

اس طرح سے ائمۂ حدیث اور ماہرین جرح وتعدیل نے مختلف جماعتوں کے بارے میں جو تجربہ حاصل کیا، جو کچھ دیکھا اور قابل اعتماد لوگوں سے سنا اس کو بیان کر کے ان سے حدیث رسول پڑھنے اور ان کی مجلسوں میں شرکت کرنے سے منع کیا ہے کیوں کہ یہ لوگ حدیث رسول میں افتراء پردازی کرتے تھے، جماعت کی جماعت اس میں مشہور تھی۔

اگر چہ یہاں عمومی طور سے جماعتی بنیاد پر ان کا تذکرہ ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر کیا گیا ہے پھر بھی ان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو بدعت، خواہش پرستی اور مخصوص منہج سے متعلق رہنے کے باوجود بھی ایسا نہیں کرتے تھے، ہر عموم میں کچھ نہ کچھ خصوص ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ائمہ حدیث نے جماعتی بنیادوں پر معرفت اور مشاہدہ کی وجہ سے عمومی قواعد بتادیئے ہیں لیکن اہل بدعت اور اہل اہواء کی روایتوں کو افراد کی بنیاد پر اور نوعیت بدعت کی بنیاد پر کچھ شرائط کے ساتھ قبول بھی کیا ہے۔

---

(۷) الکفایۃ ص ر ۱۲۶، اللآلی المصنوعۃ (۲ر ۴۲۸) (۸) مصدر سابق ص ر ۱۲۴

(۹) السنۃ قبل التدوین ص ر ۱۹۷ (۱۰) مقدمہ صحیح مسلم (۱ر ۱۰۰) (۱۱) الشجرۃ ص ر ۲۱

اگر بدعتی کی بدعت کفر تک نہیں پہنچاتی ہے اور وہ اپنی بدعت کی طرف دعوت نہیں دیتا یا ایسی روایت نہیں سناتا ہے جو بدعت سے متعلق ہے تو اس کی روایت مقبول ہوتی ہے۔ (۱۲)

امام علی بن مدینیؒ نے غالباً اسی جانب اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے کہ ''اگر تمام اہل بصرہ کو قدر کی بنیاد پر اور تمام اہل کوفہ کو تشیع کی وجہ سے ترک کردیا جائے تو بہت ساری (صحیح) حدیثیں ختم ہوجائیں گی۔'' (۱۳)

افراد کی نشاندہی :

جس طرح جماعتی بنیاد پر ائمہ جرح وتعدیل نے مختلف جماعتوں کے بارے میں ان کی کارکردگی کی وضاحت کردی ہے اسی طرح سے افراد کی بھی نشان دہی کردی ہے، ان کا حکم اور ان کی حیثیت واضح کردی ہے، اس طرح کے لوگ عدم قبول کے کس دائرے میں آتے ہیں بتادیا ہے، اس وضاحت کے سلسلہ میں نہ تو انہوں نے کوئی جانب داری دکھائی، نہ کسی قرابت وصداقت کا خیال کیا، نہ ہی دوستی اور دشمنی کی پرواہ کی، نہ کسی فرد وجماعت کے دباؤ میں آئے، نہ استاذ وشاگرد کا خیال کیا، نہ رشتہ وقرابت کا لحاظ رکھا، اس لیے ان کا فیصلہ مبنی برانصاف ہوتا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ اپنے استاذ حدیث جابر بن یزید جُعفی کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا میں نے کسی کو نہ دیکھا، جب بھی میں اپنے رائے وخیال سے کوئی چیز ان کے پاس لاتا تو ضرور کوئی نہ کوئی حدیث اس مسئلہ میں لے آتے۔'' (۱۴)

امام شعبی اپنے استاذ حارث اعور کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''بڑا جھوٹا آدمی تھا۔'' (۱۵)

امام ابوداود اپنے بیٹے کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''وہ کذاب ہے۔'' (۱٦)

حالاں کہ دیگر ائمہ نے اس کو قبول نہ کیا کیوں کہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں، علامہ ابن عدی فرماتے

---

(۱۲) مقدمہ ابن الصلاح (۱۳) الکفایۃ ص/ ۱۲۵

(۱۴) المجروحین (۱/ ۲۰۹)، میزان الاعتدال (۱/ ۳۸۰)

(۱۵) مقدمہ صحیح مسلم (۱/ ۹۸) (۱٦) میزان الاعتدال (۲/ ۴۳۳)

ہیں کہ ’’ وہ اصحاب حدیث کے یہاں مقبول ہیں، رہی ان کے والد کی بات تو پتہ نہیں کہ ان کو کیا وجہ سمجھ میں آئی۔‘‘ (۱۷)

زید بن ابی اُنیسہ اپنے بھائی کے بارے میں کہتے ہیں کہ ’’میرے بھائی یحییٰ بن ابی اُنیسہ سے روایت قبول نہ کرو۔‘‘ (۱۸)

علی بن مدینی اپنے والد کے بارے میں کہتے ہیں کہ ’’وہ قابل قبول نہیں، وہ ضعیف ہیں۔‘‘ (۱۹)

امام شُعبہ اپنے داماد۔ جو ان کی کفالت کررہے تھے۔ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ’’حسان بن حسان میرے داماد ہیں، میں ان سے ڈرتا بھی ہوں لیکن وہ حافظ حدیث نہیں۔ (لہٰذا ان سے روایت قبول نہ کرو)

امام یحییٰ بن مَعین اپنے دوست علی بن قرین کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ’’وہ کذاب ہے۔‘‘ (۲۰)

یہ ائمہ کرام کی صداقت وامانت داری کی زندہ مثال ہے۔

بدترین سندیں (أوھی الأسانید) :

ایسے ہی ان سندوں کا بھی پتہ بتادیا جن میں موجود تمام راوی ناقابل اعتبار ہیں، ایسی سندوں کو "أوھــی الأسـانیـد" (کمزورترین سند) کہاجاتا ہے، ان سندوں میں ایک ناقابل اعتبار راوی دوسرے ناقابل اعتبار راوی سے روایت کرتا ہے، مثال کے طور پر ان سندوں کو دیکھیے :

علی بن ابی طالبؓ کی جانب منسوب سند : عـمرو بن شمر، عن جابر الجعفی ،عن الحارث الأعور، عن علی رضی الله عنه۔

---

(۱۷) مصدر سابق (۱۸) مقدمہ صحیح مسلم (۱۲۱/۱)

(۱۹) تہذیب التہذیب (۱۷۶/۵) (۲۰) التاریخ (۷۷/۱)

اَنس بن مالکؓ کی جانب منسوب سند : داود بن محبر بن قحذم، عن أبيه، عن أبان بن أبي عياش، عن أنس رضي الله عنه۔

ابوہریرہؓ کی طرف منسوب باطل سند : السری بن اسماعيل ،عن داود بن يزيد الأودی، عن أبيه ، عن أبي هريرة رضي الله عنه۔

ایسے ہی مختلف شہروں کی مشہور باطل سندوں کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔ (۲۱)

حدیث رسول گھڑنے میں جو لوگ شہرت یافتہ تھے ان کو خاص طور سے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا، بقول علامہ ابن جوزی کچھ مشہور کذابین یہ ہیں :

وہب بن وہب قاضی محمد بن سائب کلبی محمد بن سعید مصلوب
ابوداود نخعی اسحاق بن نجیح مُلطی غیاث بن ابراہیم نخعی
مغیرہ بن سعید کوفی احمد بن عبداللہ جُو یباری مامون بن احمد ہروی
محمد بن عُکاشہ کرمانی محمد بن قاسم طالقانی۔ (۲۲)

امام نسائی فرماتے ہیں کہ ''مشہور کذابین چار ہیں :

مدینہ میں : ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ اسلمی

بغداد میں : محمد بن عُمر واقدی

خراسان میں : مقاتل بن سلیمان

شام میں : محمد بن سعید مصلوب۔'' (۲۳)

انہی مشہور کذابین میں :

حارث اعور اور محمد بن زیاد یشکُری ہیں جن کی گھڑی ہوئی روایتیں جُو یباری، ابن عُکاشہ اور محمد بن تمیم کی روایتوں کو ملا کر تقریباً دس ہزار ہوتی ہیں۔ (۲۴)

---

(۲۱) معرفۃ علوم الحدیث لِابن الصلاح (۵۶-۵۷)، الباعث الحثیث (۲۳-۲۴)، جرح وتعدیل (۴۳-۴۴) (۲۲) الموضوعات (۱/۴۷)

(۲۳) الموضوعات (۱/۴۸)، الحِطّۃ ص/۱۲ (۲۴) الفوائد المجموعۃ ص/۴۲۶

سات مشہور کذابین کو امام سلفی نے نظم میں یوں ذکر کیا ہے :

حدیث ابن نسطور ویسر ویغنم　　　وإفک أشج الغرب ثم خراش

ونسخة دینار ونسخة تربة　　　أبی هدبة القیسی شبه فراش (۲۵)

یعنی جعفر بن نسطور، یسر بن عبداللہ، یغنم بن سالم مولیٰ علی کی حدیثیں اور اشج مغربی اور خراش الطحان کی مفتریات، دینار بن عبداللہ ابو مکیس اور ہدبہ قیسی کی کتابیں پتنگوں کی مانند ہیں یعنی ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس طرح کے لوگوں کے بارے میں معلومات نسلاً بعد نسل شاگردوں کے ذریعہ سے اور پھر تحریری دستاویز کے ذریعہ سے امت تک پہنچادی اور قیامت تک کے لیے حدیث رسول کو ان وضاعین اور ان کے ہم خیالوں سے پاک کر دیا، اس طرح تحفظ سنت کا سلسلہ تا قیامت ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے امام ابن جوزی فرماتے ہیں کہ ''سنت رسول میں اضافہ کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے علماء کو وجود بخشا، جنہوں نے ان کی غلط بیانی کی نشان دہی کی، صحیح کی وضاحت اور قبیح کی فضیحت کی، ان بزرگ ہستیوں سے کوئی زمانہ خالی نہ رہا۔'' (۲۶)

(اور ان شاء اللہ نہ خالی رہے گا)

۲۔　کتب ضعفاء رجال :

اس طرح کے راویوں اور ان کے مشابہ لوگوں کے سلسلہ میں جن کتابوں میں معلومات جمع کی گئی ہیں ان کو ''کتب ضعفاء الرجال'' کہا جاتا ہے، ان کتابوں میں کذابین اور وضاعین کے ساتھ ساتھ کسی بھی طرح سے ضعیف راوی بھی ذکر کیے گئے ہیں، جن میں ان کے بارے میں تفصیلی معلومات بآسانی مل سکتی ہیں۔

کتب ''ضعفاء الرجال'' کتب ''أسماء الرجال'' کی ایک اہم کڑی ہے، کتب

---

(۲۵) حاشیہ تنزیہ الشریعۃ ص ۱/۴۶　(۲۶) الموضوعات (۱/۳۱)

ضعفاء رجال کی تالیف پر اہل علم نے بڑی توجہ دی ہے، متون حدیث کے بعد فنی اعتبار سے سب سے زیادہ توجہ اسی پر دی گئی ہے، انواع کتب جرح وتعدیل میں اس قسم کو سبقت بھی حاصل ہے اور کثرت بھی، ابتدائی مرحلہ میں جب اس طرح کی کتابیں تحریر کی جانے لگیں تو ان میں معلومات کافی مختصر ہوا کرتی تھیں، یہ کتابیں اس فن کی بنیادی کتابیں ہیں، اس کے بعد پھر ان میں تنوع وتوسع کیا گیا اور ایسی کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں حالات زندگی کے بارے میں کچھ اضافہ کیا گیا، ان کی حدیثیں بطور نمونہ تحریر کی گئیں اور سب سے اہم کام یہ کیا گیا کہ ائمہ جرح وتعدیل نے ان کے بارے میں جو شہادت دی تھی خواہ اس کا تعلق خوبی سے ہو یا خامی سے، ان شہادات کو صحیح سندوں کے واسطے سے نقل کر دیا، جن کو مؤلفین نے اپنے اساتذہ سے سنا تھا اور پھر ان کے اساتذہ نے جن سے سن کر یہ بات بتائی تھی، اس طرح یہ بھی واضح کر دیا کہ کس امام فن نے کیا کہا ہے اور اس قول کی بنیاد کیا ہے۔

اس کے بعد آخری مرحلے میں جو کتابیں تصنیف کی گئیں ان میں تمام معلومات کو جو ان مؤلفین کو مل سکیں اس طرح کے راویوں کے بارے میں کھرا کھوٹا سب ذکر کر دیا، اس مرحلہ کی کتابوں میں سندوں اور کثرت احادیث کو بطور اختصار حذف کر دیا گیا اور ان کتابوں کا حوالہ دے دیا گیا جن میں یہ معلومات بذریعۂ سند موجود ہیں، یہ عمل انتہائی دقت اور انتہائی دیانت داری کے ساتھ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام راویان حدیث کی زندگی روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے۔

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ ''جرح وتعدیل کی کتابیں تصنیف کی گئیں تو تمام راویوں کے حالات کو قلمبند کر دیا گیا اور ہر ایک کو اس کا صحیح مقام عطا کیا گیا اور یہ وضاحت کر دی گئی کہ وہ کون ہے جو ستون کی طرح ثابت قدم اور ثقہ ہے، وہ کون ہے جو ثقاہت میں تندرست نوجوان کی مانند ہے، وہ کون ہے جو پابند شریعت ہونے کے باوجود لیّن ہے، وہ کون ہے جس کی مثال اس بیمار کی طرح ہے جس کی صحت کی امید کی جا سکتی ہے، وہ کون ہے جو دائمی مریض ہے، وہ کون ہے جس کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہو چکے ہیں جو ہلاکت کے قریب اور ساقط الاعتبار ہے۔'' (۲۷)

---

(۲۷) المتکلمون فی الرجال ص ر ۹۲۔۹۳، جرح وتعدیل ص ر ۳۸۹

اس سلسلہ میں جو کتابیں تحریر کی گئیں ان کا تذکرہ کتابوں کی فہرست بنانے والوں نے کر دیا ہے، بڑے بڑے ائمہ فن کے تراجم میں بھی اس فن پر تحریر کردہ کتابوں کا ذکر ملتا ہے، زیادہ تر کتابیں مخطوطات کی شکل میں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، بہت ساری کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا ذکر ملتا ہے لیکن ان کے وجود کا پتہ نہیں، البتہ اس سلسلہ کی جو اہم کتابیں ہیں وہ مطبوع ہیں، اس فن سے متعلق کتابوں کے بارے میں تفصیلات راقم کی دوسری کتاب ''جرح وتعدیل'' میں (جو اردو زبان میں ہے) موجود ہے، جہاں پر ان کتابوں کا مختصر تعارف، طرز تحریر اور طریق استفادہ بھی دستیاب ہے۔ (۲۸)

فی الحال یہاں محدثین وائمہ دین کی خدمات کا احساس دلانے اور تحفظ سنت میں ان کی کارکردگی کا نمونہ دکھانے کے لیے کچھ تالیفات کا ذکر کیا جاتا ہے :

اس فن کی ابتدائی اور مختصر معلومات رکھنے والی کتابوں میں

امام بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) کی تالیف "الضعفاء الصغیر"

امام ابو اسحاق جوزجانی (متوفی ۲۵۹ھ) کی "الشجرة فی أحوال الرجال"

اور امام ابوزرعہ عبدالکریم رازی (متوفی ۲۶۴ھ) کی "الضعفاء والمتروکون" کافی اہم کتابیں ہیں۔

انہی کے نہج پر لکھی جانے والی دیگر کتابوں میں امام نسائی (متوفی ۳۰۳ھ) کی "الضعفاء والمتروکون" اور امام دارقطنی (متوفی ۳۸۵ھ) کی "الضعفاء والمتروکون" ہیں۔

نیز "المغنی فی ضعفاء الرجال" اور "دیوان الضعفاء" کافی اہم کتابیں ہیں، یہ دونوں کتابیں امام ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کی تالیف ہیں۔

متوسط معلومات دینے والی کتابوں میں مندرجہ ذیل کتابیں انتہائی اہم اور مشہور ہیں :

---

(۲۸) ص/ ۴۳۷۔ ۴۵۴

امام ابوجعفر عُقیلی (متوفی ۳۲۲ھ) کی کتاب "تاریخ الضعفاء"

امام ابوحاتم ابن حبّان (متوفی ۳۵۴ھ) کی کتاب "المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین"

امام ابواحمد بن عدی (متوفی ۳۶۵ھ) کی کتاب "الکامل فی ضعفاء الرجال"

امام ابن جوزی (۵۹۷ھ) کی کتاب "الضعفاء والمتروکون" ہیں۔

مفصل معلومات دینے والی کتابوں میں سب سے اہم کتاب امام ذہبی کی تالیف "میزان الاعتدال" ہے، نیز اس کی تکمیل خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ) کی تالیف "لسان المیزان" ہے۔

خاص وضاعین کی معرفت کے لیے ایک اہم کتاب "الکشف الحثیث عمن رُمی بوضع الحدیث" ہے، جو سبط ابن العجمی (متوفی ۸۴۱ھ) کی تالیف ہے، امام ابن عراق نے "تنزیه الشریعة" کے مقدمہ میں "متهمین و کذابین" کو حروف معجم پر مرتب کر کے ذکر کیا ہے، جن کا انتخاب انہوں نے "میزان الاعتدال" "المغنی فی الضعفاء" "ذیل المیزان" "لسان المیزان" اور "موضوعات ابن الجوزی" سے کیا ہے، جب سبط ابن العجمی کی کتاب انہیں ملی تو اس میں سے بھی کچھ اضافہ کیا، اس میں تقریباً (۱۷۷۱) تراجم ہیں۔ (۲۹)

ایسے ہی کتاب "قانون الموضوعات والضعفاء" ہے جو محمد طاہر پٹنی ہندی (متوفی ۹۸۶ھ) کی تالیف ہے، یہ "تذکرة الموضوعات" کے ساتھ مطبوع ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ جرح وتعدیل کی دیگر عمومی کتابیں اور "کتب تواریخ" ہیں، جن میں عام راویوں کے حالات ہوتے ہیں یا کسی خاص شہر یا خاص کتاب کے راوی ہوتے ہیں، ان میں اگر اس طرح کے راوی ہوتے ہیں تو ان کا ترجمہ ملتا ہے۔

---

(۲۹) تنزیہ الشریعۃ ص/ ۱۸-۱۹

یہ وہ متنوع کتابیں ہیں جو ان علماء ربانیین کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جن کو ''علماء محدثین'' کہا جاتا ہے، اس سے اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ محدثین نے تحفظ سنت کی خاطر کتنی عظیم خدمات انجام دی ہیں جو صرف دفاع عن السنۃ ہی نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب بھی ہے۔

۳- موضوعات کی نشان دہی و تحریری دستاویز :

ایک طرف کذابین کی گرفت اور ان کی نشان دہی کی گئی، ان کے حالات کو ریکارڈ کیا گیا، ان کے بارے میں معلومات کو تحریری شکل میں جمع کیا گیا تو دوسری طرف ائمہ کرام نے ان موضوع روایتوں کی بھی فہرست تیار کر دی جن کا اختراع و ایجاد کذابین کے دماغوں نے کیا تھا، ان باتوں کا تعلق عقیدہ سے ہو یا احکام سے، اخلاقی باتیں ہوں یا معاملاتی، فضیلت سے متعلق ہوں یا فضیحت سے، سیاست بازوں کی چال بازیوں کا نتیجہ ہوں یا دین داروں کے حد پرواز کا، بزرگوں کا عطا کیا ہوا ہو یا فسادیوں کا، ہر دور کے اہل علم نے ان حدیثوں کو اپنے شاگردوں کو بتایا کہ یہ کس جماعت کی فنکاری یا کس فرد کی تیشہ زنی ہے بر سر عام کہا، کس پس منظر اور کس مقصد کے لیے یہ کام کیا طشت از بام کیا۔

ہوا یوں تھا کہ راویان حدیث خاص طور سے ضعفاء و کذابین کی معرفت کے لیے جو کتابیں تحریر کی گئی تھیں جب ان میں ان لوگوں کا تذکرہ آیا تو ساتھ ساتھ وہ حدیثیں بھی نمونہ کے طور پر تحریر کر لی گئیں، اس سلسلہ میں سب سے اہم کارکردگی دوسرے مرحلہ کی کتابوں کی ہے جس کا تذکرہ کذابین کی نشان دہی میں گذر چکا ہے، ان کتابوں میں امام عُقیلی کی تاریخ ضعفاء، امام ابن حبان کی مجروحین، امام ابن عدی کی کامل اور اس کے مکملات کافی اہم ہیں۔

یہ روایتیں ان کتابوں میں بذریعہ اسناد مدوّن کی گئیں، لہٰذا یہی کتابیں موضوع روایتوں کا بنیادی مخزن ہیں، ان کے علاوہ دیگر فنون کی کتابوں مثلاً ''کتب ترغیب و ترہیب، کتب تواریخ، کتب بلدان، کتب احادیث مشتہرہ علی الالسنہ، کتب تفسیر اور کتب سیَر'' وغیرہ میں بھی اس طرح کی روایتیں داخل تھیں، ان تمام کتابوں سے ان حدیثوں کو جمع کر کے جدید ترتیب پر مرتب

کردیا گیا، جن میں ان حدیثوں کے بارے میں تفصیلات درج کردی گئیں، ان کے ہم معنی روایتوں کو بھی جمع کردیا گیا، اس طرح جدید طرز کی کتابیں تیار کردی گئیں، ان کتابوں کو کتب ضعفاء حدیث یا کتب موضوعات کہا جاتا ہے، کتب ضعفاء رجال اور کتب ضعفاء حدیث یہ دونوں قسم کی کتابیں ان کاوشوں کا نتیجہ ہیں جن کو ائمہ دین نے تحفظ سنت کے لیے انجام دیا تھا۔

ان کتابوں کا مقصد تحریر ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ امت اسلامیہ کو اس بات سے آگاہ رکھا جائے کہ اصلی دین کیا ہے اور نقلی کیا ہے، وہ کسی ایسی چیز کو سنت سمجھ کر نہ قبول کرلیں جو حقیقت میں سنت سے دور ہے، جن کو عمداً یا سہواً رسول کی جانب منسوب کردیا گیا ہے۔

محدثین وائمہ کی کوششوں سے دین تو صاف ستھرا اصلی شکل میں موجود رہا البتہ عوام الناس جو عموماً دین سے بیگانہ ہیں ان کو قصہ کہانی ومصنوعی باتیں زیادہ ہی پسند ہیں، دھوم دھام، ہُو ہا، نعرہ بازی اور جذباتی باتوں میں جو مزہ ملتا ہے وہ صاف ستھری باتوں، سنجیدہ اور حقیقت پسندانہ گفتگو میں نہیں ملتا لہٰذا آج بھی ملت اسلامیہ کا بہت بڑا طبقہ ان موضوعات کا خوگر اور ان کا دلدادہ ہے، تصنع وتکلف، بے سر وپیر کے واقعات اور قصہ کہانی سننے کے لیے جوق در جوق امڈ پڑتے ہیں لیکن سنجیدہ گفتگو اور رسول کی سیدھی سادھی باتیں سننے کے لیے کوئی رغبت نہیں رکھتے الا ماشاء اللہ، حقیقت یہ ہے کہ یہ جہالت کی سب سے بڑی نشانی اور گمراہی کی دلیل ہے۔

کتب ضعفاء حدیث :

چشمۂ سنت نبوی کو صاف وشفاف رکھنے اور امت کو گمراہی سے بچانے کے لیے ضعفاء حدیث میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ بھی کافی متنوع ہیں، کچھ ابواب وعناوین پر مرتب ہیں، کچھ حروف معجم پر مرتب ہیں، کچھ کافی مختصر ہیں، ان کتابوں میں جو حدیثیں تحریر کی گئی ہیں عموماً ان میں حوالہ بھی دے دیا گیا ہے کہ یہ روایت کس کتاب سے ماخوذ ہے یا بذریعہ اسناد اس کو نقل کیا گیا ہے۔

علامہ معلّمی فرماتے ہیں کہ ''متقدمین نے موضوعات میں مخصوص کتابیں نہیں تحریر کی تھیں البتہ حدیثوں کے بارے میں ان کی وضاحت کتب علل، کتب رجال، کتب تواریخ، کتب ضعفاء

رجال وغیرہ میں موجود تھی، اسی طرح سے جو مخصوص نسخے وضع کیے گئے تھے ان کی بھی صراحت پائی جاتی تھی، جیسے کتاب العقل، اربعین وَدعانیہ وغیرہ، جن کا تذکرہ امام شوکانی نے کتاب کے آخر میں کیا ہے۔" (۳۰)

امام شوکانی نے نسخ موضوعہ کا تذکرہ کتاب المناقب کے خاتمہ کے بعد کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں :

نسخ مکذوبہ (جھوٹ کے پلندے) :

الأربعون الودعانية کا ذکر کیا ہے جس کو ابن ودعان نے اس کے واضع زید بن رفاعہ سے سرقہ کیا تھا۔ (۳۱)

اس کے علاوہ دیگر نسخوں میں کچھ یہ ہیں :

صحيفه أبان بن أبي عياش،

نسخة إبراهيم بن هدبه ابو هدبه وقاص،

نسخة أحمد بن إسحاق بن إبراهيم بن نبيط بن شريط عن أبيه عن جده،

كتاب داود بن محبر بن قحذم جس کو میسرہ بن عبدربہ نے "كتاب العقل" کا نام دیا تھا، اس کا سرقہ داود بن محبر نے کیا، پھر اس سے عبدالعزیز بن ابی رجاء نے چوری کی، پھر سلیمان بن اسحاق نے چرایا اور ہر ایک نے اس میں اپنی گھڑی ہوئی سند لگالی۔

نسخة سمعان بن مهدی

كتاب المناهي

جس کو عباد بن کثیر ثقفی نے جتنی منہیات کی روایتیں تھیں سب پر من گھڑت سند لگا کر تیار کیا تھا۔

نسخة بختری بن عبيد

نسخه حماد بن عمر نصيبي جس نے وصایا علی سے متعلق حدیثیں گھڑی ہیں۔

---

(۳۰) الفوائد المجموعۃ ص / ۵ (۳۱) مصدر سابق ص / ۴۲۳

ان کے علاوہ اور بہت سارے نسخے ہیں جن کو کذابین نے گھڑا ہے، ان کو ائمہ فن نے اپنی کتابوں میں ان کے تراجم میں ذکر کیا ہے۔

الاَباطیل والمناکیر والصحاح والمشاهیر :

البتہ فنی تصنیف کی ابتداء امام جوزقانی نے کی ہے، علامہ معلمی فرماتے ہیں کہ میرے علم کے مطابق فن موضوعات میں سب سے پہلی تالیف حافظ حسین بن ابراہیم جوزقانی (متوفی ۵۴۳ھ) کی ہے۔ (۳۲)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن پریوائی نے "اباطیل" کے مقدمہ میں اس سے پہلے دو کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، ایک کتاب ابوسعید بن علی النقاش (متوفی ۴۱۴ ہجری) کی ہے اور دوسری کتاب "تذکرة الموضوعات" ابوالفضل محمد بن طاہر قیسرانی (متوفی ۵۰۷ ہجری) کی ہے۔ (۳۳)

علامہ کتانی نے الاباطیل کا نام "الموضوعات من الأحادیث المرفوعات" بتایا ہے۔ (۳۴)

کچھ لوگوں نے اس کو "الضعیفة" سے بھی موسوم کیا ہے۔ دیکھیے مقدمہ محقق۔

یہ کتاب دو جلدوں میں جامعہ سلفیہ سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی حفظہ اللہ کی تحقیق سے مطبوع ہے، مصنف کا منہج یہ ہے کہ انہوں نے ہر باب میں پہلے صحیح حدیثوں کو ذکر کیا ہے پھر اس کے مخالف جو روایتیں ہیں ان کو ذکر کا ہے اور ان پر وضع کا حکم اسی بنیاد پر لگا دیا ہے۔

چوں کہ یہ کتاب اس فن کی پہلی کتاب تھی اس لیے بعد میں آنے والوں نے اس سے اپنی تالیفات میں استفادہ کیا ہے، ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کتاب کی ''تقدیم'' میں فرماتے ہیں کہ ''کتاب الاباطیل فن موضوعات میں قدیم ترین تالیف ہے، اس لیے بعد میں آنے والوں کے لیے مرجع کی حیثیت اختیار کی، اسی پر ابن جوزی، سیوطی، ابن عرّاق وغیرہ نے جنہوں نے

---

(۳۲) الفوائد المجموعة ص ر ۵ (۳۳) الاباطیل (۱ ر ۲۳) مقدمہ محقق

(۳۴) الرسالة المستطرفة ص ر ۱۱۱

موضوعات میں کتابیں تحریر کی ہیں اعتماد کیا ہے۔ (۳۵)

بعض اہل علم نے اس کتاب پر تنقید کی ہے اور اس منہج کو کسی حدیث کے موضوع قرار دینے پر مبالغہ آرائی کہا ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام جوزقانی نے اپنی کتاب میں حدیثوں پر بطلان کا حکم صحیح حدیثوں سے متعارض ہونے کی بنیاد پر لگادیا ہے حالاں کہ ان میں جمع ممکن ہے، ان کا یہ عمل ناقابل قبول ومردود ہے۔ (۳۶)

حالاں کہ امام جوزقانی نے صرف متعارض ہونے پر یہ حکم نہیں لگایا ہے بلکہ اس حدیث میں جو مجروح یا وضاع راوی ہیں ان کو حکم کے لیے بنیاد بنایا ہے، مخالف روایتوں کو بطور تائید پیش کیا ہے، بطور مثال ''کتاب الایمان'' کی پہلی اور دوسری روایت جہاں سے اصل کتاب شروع ہے، ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع اور باطل ہے، یہ احمد بن عبداللہ جویباری کی موضوعات میں سے ہے، وکان خبیثاً دجالاً من الدجاجلة۔ (۳۷)

اگر انہوں نے کہیں ایسا کیا ہے اور وہاں حدیثوں میں توفیق، نسخ یا ترجیح ہو سکتی ہے تو یقیناً اس بنیاد پر حکم لگانا ضابطہ کے خلاف ہے لیکن اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں قسم کی روایتیں کم از کم مقبول ہوں۔

بہرحال یہ کتاب فن موضوعات کی پہلی فنی تصنیف ہے جو انتہائی مفید ہے، اس کے بعد جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے کچھ مشہور کتابیں یہ ہیں :

الموضوعات لابن الجوزی :

یہ کتاب علامہ ابن الجوزی (متوفی ۵۹۷ ہجری) کی تالیف ہے جو اس فن کی انتہائی مشہور کتاب ہے جس کو مؤلف نے بعض طلبہ کی طلب پر اور صورت حال کے پیش نظر تحریر کیا ہے،

---

(۳۵) الاباطیل تقدیم بر کتاب (۱/۷)

(۳۶) الاصابہ (۱/۵۰۰) نیز دیکھیے الاباطیل مقدمۂ محقق (۱/۹۹) (۳۷) الاباطیل (۱/۱۸)

خود آپ کا بیان ہے کہ ''فقہاء کا موضوعات کو بنیاد بنانا، واعظین کا اس کی طرف رغبت کرنا اور زاہدین کا انہیں عبادت سمجھنا عام عادت بن چکی ہے لہذا ان موضوعات کا ذکر کرنا اور ان کی وضاحت کرنا ضروری تھا۔'' (۳۸)

جن روایتوں کا موضوع ہونا بالکل واضح تھا ان کو چھوڑ دیا ہے یا جو بڑے بڑے نسخے موضوعہ تھے جن کی ایک ایک روایت کئی کئی صفحات پر مشتمل تھی ان کو چھوڑ دیا ہے تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ (۳۹)

کتاب ایک نفیس مقدمہ سے شروع ہوتی ہے جس پر محقق کی طویل تقدیم بھی ہے جو ۲۸ر صفحات پر مشتمل ہے، مؤلف کا مقدمہ ص/۲۹ سے ص/ ۱۰۴ پر محیط ہے، اصل کتاب ''کتاب التوحید'' سے شروع ہوتی ہے، پھر پوری کتاب عناوین پر مرتب ہے، کتاب تین جلدوں میں مطبوع ہے، ہر جلد کے آخر میں موضوعات کی فہرست بھی تحریر ہے جس سے کافی آسانی ہو جاتی ہے۔

اس کتاب پر بعض اہل علم نے نقد بھی کیا ہے، حافظ علائی اور احمد بن ابی المجد سیف فرماتے ہیں کہ چوں کہ انہوں نے وضع کا حکم لگانے کے لیے ضعفِ رواۃ پر زیادہ اعتماد کیا ہے اسی لیے ان کے یہاں حکم میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ (۴۰)

حالاں کہ علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ کا حکم صرف ضعف رواۃ پر منحصر نہیں اس سلسلہ میں انہوں نے اپنا منہج واضح کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''ہماری کتاب میں بعض حدیثیں ایسی ہیں جن کے موضوع ہونے میں شبہ نہیں، لیکن اصل واضع کا پتہ نہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ سند میں بظاہر راوی ثقہ ہیں لیکن متن حدیث موضوع، مقلوب یا مدلّس ہو، اس پر فیصلہ بڑا مشکل ہوتا ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف سند کا اعتبار نہیں کیا بلکہ متن کا بھی اعتبار کیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ حکم لگانے میں وجہت نظر کا فرق ہوتا ہے، انہوں نے ایک قاعدہ بھی اس سلسلہ میں یہ دیا ہے کہ ''کل حديث رأيته يخالف المعقول أو يناقض الأصول فاعلم

---

(۳۸) الموضوعات (۲۹/۱) (۳۹) (۳۵/۱) (۴۰) تنزیہ الشریعۃ (۱۰/۱)

أنـه مـوضـوع" (۴۱) ہر وہ حدیث جو عقل کے خلاف ہو یا اصول کے مخالف ہو تو جان لو کہ وہ موضوع ہے۔ اصول کے مخالف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مشہور کتب احادیث میں نہ ہو۔ (۴۲)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''انہوں نے بعض ساقط راویوں کے تفرد کو دیکھا اس بنیاد پر متن پر حکم لگا دیا جب کہ متن دوسری سندوں سے بھی مروی ہے جس کی اطلاع ان کو نہیں ہوئی، لہٰذا اس کتاب میں موضوع کے علاوہ کچھ منکر و ضعیف بلکہ بعض حسن روایتیں بھی شامل ہو گئی ہیں البتہ اکثر حدیثیں موضوع ہیں۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ ''اس میں تقریباً تین سو روایتیں ایسی ہیں جو موضوعات میں شامل کرنے کے لائق نہیں۔'' (۴۳)

محقق کتاب شیخ عبدالرحمٰن محمد عثمان فرماتے ہیں کہ ''امام ابن الجوزی کی رائے اس سلسلہ میں قابل اعتبار ہے، ان کی دلیل وہیں موجود ہے اور ایسے مدلولات ہیں جن کا تقاضہ آپ کے قول کی حجت چاہتا ہے۔'' (۴۴)

اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مختلف لوگوں نے اس کا اختصار کیا ہے، انہی میں سے امام سیوطی بھی ہیں جنہوں نے اس کی تلخیص کی ہے اور جو موضوعات کے لائق نہیں ہیں ان کو متابعات وشواہد کی روشنی میں واضح کر دیا، اسی کتاب کا نام انہوں نے "اللآلی المصنوعة" رکھا ہے۔ جس کا تعارف یہ ہے۔

اللآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة :

یہ کتاب امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ ہجری) کی تالیف ہے، امام سیوطی رحمہ اللہ نے فن موضوعات میں مختلف کتابیں تالیف کی ہیں، جس میں سے زیادہ تر امام ابن الجوزی کی کتاب سے متعلق ہیں، انہی میں سے یہ کتاب بھی ہے۔

---

(۴۱) الموضوعات (۱۰۶/۱) (۴۲) تدریب الراوی (۲۷۷/۱)

(۴۳) الرسالة المستطرفة ص ۱۱۳ (۴۴) الموضوعات (۲۳/۱)

اس کتاب میں آپ نے علامہ ابن الجوزی کی طویل سندوں کو حذف کر کے ان مؤلفین کی کتابوں کی سندوں سے شروع کیا ہے جن سے ابن الجوزی نے روایت نقل کی ہے، اس طرح اس کتاب کو مختصر کر دیا ہے اور اس کی تنقیح کر دی ہے، جن روایتوں کے بارے میں موضوع نہ ہونے کی گنجائش تھی ان کی وضاحت کر دی ہے، حدیثوں پر کلام کرنے کے لیے جو اضافہ کیا ہے اس کی ابتداء ''قلتُ'' سے اور انتہاء ''واللہ اعلم'' پر ہے۔ (۴۵)

ابن الجوزی کے جو مصادر تھے ان میں تاریخ ابن عساکر کا اضافہ بھی کیا ہے، امام سیوطی کے تعقبات کی بنیاد متابعات وشواہد پر ہے جن کی بنیاد پر وہ امام ابن الجوزی کی تائید یا مخالفت کرتے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہو گیا ہے کہ امام ابن الجوزی نے جس نقطہ کو بنیاد بنا کر حکم لگایا ہے امام سیوطی نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ (من افادات شیخنا دکتور سعدی ہاشمی)

علامہ معلّمی یمانی فرماتے ہیں کہ ''بہت سارے متابعات وشواہد جن کا تذکرہ امام سیوطی نے کیا ہے جب میں نے ان کا تتبع کیا تو ان میں سے اکثر و بیشتر ایسی ساقط الاعتبار خبریں ملیں جو مذکورہ خبر کو طاقت دینے کی قوت نہیں رکھتیں۔'' (۴۶)

نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ ''ائمہ محدثین کبھی کسی متن پر منکر کا حکم لگا دیتے ہیں حالاں کہ بظاہر سند سالم ہوتی ہے پھر جو علت ذکر کرتے ہیں وہ علت بظاہر غیر قادح ہوتی ہے لیکن وہ اسی معمولی علت کو نکارت کے لیے کافی سمجھتے ہیں کیوں کہ جب متن پر نکارت ظاہر ہے تو اگر چہ علت بظاہر قادح نہیں پھر بھی وہ اس کو علت سمجھتے ہیں۔ اگر چہ راوی سب ثقہ ہوں۔ یہ مانتے ہوئے کہ اس طرح کا خلل ہو جانا ثقات سے بھی ممکن ہے یہ ندرت کے طور پر ہو سکتا ہے۔'' (۴۷)

ایک جگہ یہ بھی فرمایا کہ ''متاخرین کے یہاں اس سلسلہ میں بہت تساہل پایا جاتا ہے۔'' (۴۸)

---

(۴۵) اللآلی المصنوعۃ (۱/۲) (۴۶) الفوائد المجموعۃ ص/۴

(۴۷) الفوائد المجموعۃ ص/۸-۹ (۴۸) مصدر سابق ص/۴

تنزیه الشریعة المرفوعة عن الأخبار الشنیعة الموضوعة :

یہ کتاب علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن عراق کنانی (متوفی ۹٦۳ ھ) کی تالیف ہے، جو اس فن کی ایک جامع اور مفید کتاب ہے، کتاب کی ابتدا ایک مختصر مگر انتہائی جامع مقدمہ سے کی ہے، اس کے بعد کچھ کذاب اور وضاع راویوں کی فہرست ہے جن کی تعداد ''۱۷۷۱'' ہے، پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس کی ترتیب سابقہ دو کتابوں کی ترتیب پر ہے۔

اس کتاب میں ابن الجوزی کی "الموضوعات" اور امام سیوطی کی کتابوں کا نچوڑ جمع کر دیا ہے، خود مؤلف نے بہت ساری موضوعات کا اضافہ چودہ مزید مصادر سے استفادہ کر کے کیا ہے، ہر کتاب کو کتاب الفضائل کے علاوہ تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے، پہلی فصل میں ان روایتوں کو ذکر کیا ہے جن کو ابن الجوزی نے موضوع کہا ہے اور سیوطی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

دوسری فصل میں ان حدیثوں کو ذکر کیا ہے جن میں سیوطی نے اختلاف کیا ہے۔

تیسری فصل میں امام سیوطی کے اضافوں کا ذکر کیا ہے۔

کتاب الفضائل کو ابواب پر اور ہر باب کو فصل پر تقسیم کر دیا ہے۔

امام سیوطی نے " اللآلی " کے آخر میں کتاب الجامع کے تحت مختلف مفہوم کی حدیثوں کو جمع کیا تھا، ابن عراق نے اس کتاب کی ان حدیثوں کو جو سابقہ کسی عنوان میں درج ہو سکتی تھیں درج کر دیا ہے بقیہ کو باقی رکھا ہے۔

حدیث کے ذکر کرنے کے بعد اس کے مخرج اور صحابی کی تصریح کر دی ہے، پھر اس کی علت بتا دی ہے، مختلف مصادر کے لیے اشارات کا استعمال کیا ہے جو کتاب کے مقدمہ میں مذکور ہے۔ (۴۹)

دیگر کتابیں :

ان کتابوں کے علاوہ کچھ اور مشہور کتابیں ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں :

---

(۴۹) دیکھیے مقدمہ تنزیہ الشریعہ (۱/۴)

ذیل الموضوعات :

جس کو "الزیادات علی الموضوعات" کہا جاتا ہے، اس میں علامہ ابن الجوزی سے چھوٹی ہوئی روایتوں کو ذکر کیا ہے، حالاں کہ ابن الجوزی نے بہت ساری حدیثوں کو جن کا موضوع ہونا واضح تھا جان بوجھ کر چھوڑ دیا تھا۔

النکت البدیعات علی أحادیث الموضوعات :

یہ ابن الجوزی کی کتاب کا اختصار اور اس پر تعقیب ہے، پھر اس کا اختصار التعقبات علی الموضوعات ہے۔ اس کو اطراف کے طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔

القول الحسن فی الذب عن السنن :

مسند امام احمد اور سنن وغیرہ کی کچھ روایتیں ابن جوزی کی موضوعات میں مذکور ہیں اس کتاب میں ان کا دفاع کیا گیا ہے، جس میں صحیح بخاری "نسخہ حماد بن شاکر" کی ایک حدیث، صحیح مسلم کی ایک حدیث، مسند احمد کی اڑتیس حدیثیں، سنن ابی داود کی نو، سنن ترمذی کی تیں، نسائی کی دس، سنن ابن ماجہ کی تیں اور مستدرک حاکم کی ساٹھ روایتیں ہیں۔ (۵۰)

القول المسدد فی الذب عن المسند الامام أحمد : اس میں حافظ ابن حجر نے بھی مسند احمد کی روایتوں کا دفاع کیا ہے۔

الذب الأحمد عن مسند الامام أحمد : یہ علامہ البانیؒ (متوفی ۱۴۲۰ھ) کی تالیف ہے جس میں عبدالقدوس ہاشمی نامی شخص کے خرافات کا رد ہے۔

المغنی عن الحفظ والکتاب بقولهم لم یصح شیء فی هذا الباب : عمر بن بدر موصلی (متوفی ۶۲۳ ھ)

تحذیر الخواص عن اکاذیب القصاص : یہ امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی ایک اور مشہور کتاب ہے۔

---

(۵۰) تذکرۃ الموضوعات ص ر ۴

ألاسرار المرفوعة فی الأحادیث الموضوعة : ملاعلی قاری (متوفی ۱۰۱۴ھ)

الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعة : یہ امام شوکانی (متوفی ۱۲۵۰ھ) کی تالیف جو کافی مشہور ہے، اس کے بارے میں مؤلف کا کہنا ہے کہ جس کے پاس یہ کتاب ہے یوں سمجھو کہ اس کے پاس تمام مؤلفین کی کتابیں جمع ہیں۔'' (۵۱)

علامہ عبدالحی لکھنوی فرماتے ہیں کہ ''اس میں بہت سی ایسی حدیثیں شامل کر دی گئی ہیں جو موضوع نہیں ہیں۔'' (۵۲)

الآثار المرفوعة من الأحادیث الموضوعة : شیخ عبدالحی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ)

اللولوء المرصوع فیما قیل لا أصل له او بأصله موضوع : ابوالمحاسن محمد بن خلیل قاوقجی (متوفی ۱۳۰۵ھ) کی تالیفات ہیں۔

اور یہ سلسلہ الحمدللہ اب تک جاری ہے، اس طرح سے تحفظ سنت کا عمل بھی ساتھ ساتھ جاری ہے۔

اس سلسلہ کی سنہری کڑی علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات ہیں جو موجودہ دور میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں، آپ کی تحریر کردہ کتابوں میں :

"سلسلة الأحادیث الضعیفة والموضوعة وأثرها السیء فی الأمة" کافی مشہور ومفید اور مثالی تالیف ہے، اسی طرح سے "ضعیف الجامع الصغیر وزیاداته" اور دیگر کتب حدیث کا جو تصفیہ صحیح وضعیف کو الگ کر کے کیا ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اگرچہ موضوعات کی تعداد ان میں بہت کم ہے۔ (۵۳)

کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں صرف ایک ہی مفہوم یا ایک مسئلہ وباب سے متعلق موضوعات اکٹھا کی گئی ہیں، جیسے :

---

(۵۱) الفوائد المجموعة ص ر ۴ (۵۲) الرسالة المستطرفة ص ر ۱۴۴

(۵۳) فن موضوعات میں تالیفات معلوم کرنے کے لیے'' الرسالة المستطرفة ص ۱۱۱۔۱۱۵، الاباطیل والمناکیر ۱ر ۲۳۔۲۷ مقدمہ محقق) کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

أحاديث معراج

قلائد المرجان فی الحديث الوارد كذباً فی بادنجان

أداء ما وجب فی بيان وضع الوضاعين فی رجب

تبيين العجب فيما ورد فی شهر رجب (۵۴)

۴ - کذابین پر دباؤ امراء وحکام سے توجہ طلبی :

ایک طرف یہ تمام تر کوششیں جاری تھیں تو دوسری طرف حدیث گھڑنے والوں کی تلاش اور جستجو بھی جاری تھی، ان کے خلاف طاقت کا استعمال، ڈرانا، دھمکانا، عدالت میں پیش کرنا، امراء وحکام سے شکایت کرنا اور عوام کو اس طرح کے لوگوں کے دروس سے دور رہنے کی سفارش کرنا، ان کو درس میں شرکت سے روکنا، کذب بیانی کو بتانا بھی موضوع روایتوں سے معاشرہ کو پاک و صاف کرنے کے لیے اس طرح کا دیگر عمل بھی برابر جاری رہتا تھا۔

امام شعبی، امام شعبہ، سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، عبدالرحمٰن بن مہدی، یحیٰی بن سعید قطان، علی بن مدینی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، ابوزرعہ اور ابوحاتم الرازی رحمہم اللہ جیسے ائمہ فن نے اپنی زندگی کو اس کاز کے لئے وقف کر رکھا تھا، کذابین کی گرفت اور ان کے خلاف کاروائی کرنے میں ان حضرات نے بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے کذابین ان سے خوف کھاتے تھے اور جہاں ان کو دیکھتے تھے وہاں سے روپوش ہونے کی کوشش کرتے تھے یا اپنے کام سے توبہ کرتے تھے۔

ان ائمہ نے حدیث گھڑنے والوں کو اپنی مہم میں کبھی کامیاب نہ ہونے دیا، یہی وجہ ہے کہ ان جھوٹوں کی گھڑی ہوئی روایتیں گرفت میں آگئیں اور ان لوگوں کی کذب بیانی علماء اور اہل علم پر ہی واضح نہیں ہوئیں بلکہ عوام میں بھی واضح ہوگئیں، ان پر بھی عیاں ہوگیا کہ کون عالم صادق ہے اور کون کاذب و فاسق ہے یہ الگ بات ہے کہ بہت سی جگہوں پر کذابین کے لئے عوام کی طرف

---

(۵۴) (تنزیه الشريعة تقديم محقق)

سے مروت ونرمی کا برتاؤ بھی ہوا ہے۔

امام شعبیؒ جب ابوصالح صاحب تفسیر کے پاس سے گذرتے تھے تو ان کا کان گرم کرنے لگتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ تیرا ستیاناس ہو تجھ کو قرآن پڑھنا نہیں آتا اور تو قرآن کی تفسیر بیان کرتا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر امام شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث پہچانی بھی نہ جاتی یہ بعض جھوٹوں کے پاس آکر ان کو دھمکیاں دیتے کہ اگر حدیث گھڑنے اور گھڑی ہوئی روایتوں کو بیان کرنے سے باز نہ آؤ گے تو حاکم وقت کے پاس شکایت کردوں گا۔ (۵۵)

ایک دن عبدالملک بن ابراہیم نے امام شعبہ کو دیکھا کہ وہ غصہ کی حالت میں بہت تیزی سے جارہے ہیں، انہوں نے پوچھا کہ : ابو بسطام کیا بات ہے (ابو بسطام امام شعبہ کی کنیت ہے) انہوں نے ان کو اپنے ہاتھوں میں اینٹ دکھا کر کہا کہ جعفر بن زبیر کی خبر لینے جارہا ہوں کیوں کہ سنا ہے کہ وہ حدیث گھڑتا ہے۔ (۵٦)

امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے عیسیٰ بن میمون کو جھوٹی روایت بیان کرتے ہوئے سنا تو اس پر بھڑک گئے اور بہت خفا ہوئے تو اس نے ان سے معذرت کی اور وعدہ کیا کہ اب دوبارہ ان کو کبھی بیان نہیں کروں گا۔ (۵۷)

ابوالولید طیالسی کا بیان ہے کہ میں نے معلیٰ بن ہلال کو دیکھا کہ وہ کچھ اپنی گھڑی ہوئی روایتیں بیان کررہا تھا تو میں نے اس سے کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان سلطان فیصلہ کریں گے، یعنی وہ اس مسئلہ کو حاکم کے سامنے پیش کرنے جارہے تھے، لوگوں نے ان سے بہت سفارش کی کہ معاف کردیجیے، حاکم کے پاس نہ جایئے تب انہوں نے اس کو چھوڑا۔ (۵۸)

حماد بن مالک مالکی بڑا جھوٹا آدمی تھا وہ ایک مرتبہ جھوٹی روایتیں بیان کررہا تھا، اس کے

---

(۵۵) السنۃ قبل التدوین (۲۳۰) (۵٦) حلیۃ الاولیاء (۱۵۰/۷)، السنۃ قبل التدوین

(۵۷) السنۃ قبل التدوین (۲۳۰) (۵۸) تہذیب التہذیب (۲۴۲/۱۰)

پاس سے عمرو انماطی کا گذر ہوا، انہوں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا کہ تم کو یہاں سے جانے نہ دوں گا جب تک تمہارے خلاف عدالت میں شکایت کر کے مقدمہ نہ درج کرادوں، اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور قسم کھائی کہ آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا، انہوں نے اس سے ایک تحریری حلف نامہ بھی لیا اور اس پر شہادت بھی لی۔ (۵۹)

حمزہ زیات کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مرۃ ھمدانی نے حارث اعور سے جو کذاب آدمی تھا کچھ جھوٹی حدیثیں بیان کرتے ہوئے سنا تو اس سے یہ کہا کہ تو یہیں ٹھہر میں آتا ہوں یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر گئے اپنی تلوار اٹھائی اور باہر آنے لگے، حارث سمجھ گیا کہ کچھ خطرہ ہے لہٰذا وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ (۶۰)

خضر بن یسع فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ امام شعبہ کو دیکھا وہ سخت گرمی میں چہرے پر کپڑا ڈالے ہوئے جارہے تھے میں نے ان سے پوچھا کہ اس قدر دھوپ اور گرمی میں آپ کہاں جارہے ہیں، انہوں نے کہا کہ ایک شخص کے خلاف مقدمہ دائر کرنے جارہا ہوں کیوں کہ وہ حدیث گھڑتا ہے۔ (۶۱)

ابراہیم بن حسن کا بیان ہے کہ میرے پاس مغیرہ بن سعید رافضی کذاب آیا اور مجھ سے اپنی قرابت داری کا اظہار کیا اور اپنے مطلب کی بات کہی اور بات کرتے ہوئے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا تذکرہ آیا تو اس نے ان پر لعنت بھیجی تب میں نے کہا کہ "یا عدو اللہ أعندی، فخنقه خنقاً أدلع لسانه" اے اللہ کے دشمن کیا میرے سامنے اس طرح کی باتیں کرتا ہے اور اتنا زور سے اس کا گلا دبایا کہ اس کی زبان باہر آ گئی۔ (۶۲)

ابوالعباس سراج، محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امام بخاری کی مجلس میں موجود تھا

---

(۵۹) المحدث الفاصل (۳۱۷) (۶۰) مسلم (۹۹/۱)

(۶۱) حلیۃ الأولیاء (۱۵۰/۷)، الموضوعات الکبریٰ (۴۸/۱)

(۶۲) میزان الاعتدال (۱۶۱/۴)

ان کے پاس محمد بن کرام کا خط آیا جو ایک حدیث کے بارے میں معلومات چاہتا تھا وہ حدیث مع سند اس میں اس طرح مذکور تھی : "سفیان ، عن الزهری، عن سالم ، عن أبیه عن النبی ﷺ الایمان لایزید ولا ینقص " امام بخاری نے خط پڑھ کر اس کی پشت پر یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ : "من حدث بهذا استوجب الضرب الشدید والحبس الطویل " جو یہ روایت بیان کرتا ہے وہ سخت پٹائی اور طویل قید کا مستحق ہے۔ (۶۳)

اصل میں احمد بن عبداللہ جویباری حدیثیں گھڑتا تھا اور اچھی سندیں لگا کر محمد بن کرام کو دیتا تھا وہ اس کی نشر و اشاعت کرتا تھا اس روایت میں بھی اس کی کارکردگی تھی جس میں اس نے یہ گھڑا کہ ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں ہے۔

امراء اور حکام کی توجہ :

کذابین سے دفاع ان کی سعی باطل پر قدغن لگانے اور ان کو اپنی کارکردگی سے روکنے کے لیے محدثین نے ایک اہم کوشش یہ بھی کی کہ امراء و حکام سے ان کی شکایت کی ، اس کی کئی ایک مثالیں کذابین کی گرفت کے موضوع میں گذر چکی ہیں۔

امراء و حکام نے ان کی سرزنش کی ، ان سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ،، امراء و خلفاء چوں کہ ملت کے پاسبان ہوتے ہیں ، لہٰذا دین کی حفاظت کے سلسلہ میں ان پر بھی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ، دین کے بہت سارے معاملات حکومت کے بغیر حل نہیں ہوسکتے ، بے راہ رؤں کی سرزنش ان پر حد و تعزیر کا اجرا انہیں کے ہاتھوں ہوسکتا ہے۔

جب اس طرح کے لوگوں کی شکایت امراء و ذمہ داران حکومت کے پاس پہنچائی جاتی ہے تو عموماً وہ اپنی ذمہ داری نبھانے کی کچھ نہ کچھ کوشش کرتے ، فتنہ وضع حدیث کی ابتداء حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں سر اٹھا چکا تھا جس کی سرکوبی کی بنیاد بھی آپ ہی نے رکھی ، چنانچہ قوم کے سرغنہ عبداللہ بن سبا یہودی جس نے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ کی جانب کذب بیانی سے

---

(۶۳) الاباطیل والصحاح والمناکیر (۱/۱۹-۲۰)

باتوں کو منسوب کرنا شروع کر دیا اور پھر حدیث رسول میں یہ عمل شنیع کرنے لگا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہ صرف اپنی خفگی کا اظہار کیا بلکہ زمین کو اس کے بوجھ سے ہلکا کر دیا، آپ اس کے بارے میں کہتے تھے کہ "مالي ولهذا الخبيث الأسود" (۶۴) مجھ سے اس کلوٹے خبیث کا کیا تعلق۔

نیز یہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ قیامت سے قبل تیس کذابین ہوں گے یہ ان میں کا ایک ہے، اس نے اپنے ہم خیالوں کے ساتھ ماحول کو کذب بیانی سے برباد کر رکھا تھا، لہٰذا آپ نے اس سرغنہ کو مدائن کی جانب شہر بدر کر دیا اور کہا کہ جس شہر میں میں رہتا ہوں اس کو وہاں نہیں رہنا ہے، بالآخر جب یہ باز نہ آیا تو پوری جماعت کے ساتھ سپرد نار کر دیا۔ (۶۵)

حضرت ابن عباس جو آپ کی طرف سے بصرہ کے والی تھے جب ان کو پتہ چلا تو انھوں نے یہ فرمایا کہ اگر میں ہوتا تو جلانے نہیں دیتا کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جلانے سے منع کیا ہے، آپ نے فرمایا کہ "من بدل دينه فاقتلوه" (۶۶) گویا کہ حضرت ابن عباس بھی اس کے قتل پر راضی تھے صرف طریقہ قتل پر اختلاف تھا، اس لیے کہ یہ طریقہ رسول ﷺ کی سنت کے مطابق نہیں تھا، غالباً حضرت علیؓ کو یہ روایت معلوم نہ تھی ورنہ وہ بھی جان بوجھ کر ایسا نہ کرتے۔

ان گھڑنے والوں میں سے جماعت زنادقہ کے تعلق سے دیگر امراء کی کارکردگی کافی نمایاں ہے، اس لیے کہ الحاد، زندقہ بے دینی ہے پھر اس پر طرہ یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ کی جانب سے گھڑ گھڑ کر باتیں منسوب کرتا اور دین سے لوگوں کو نفرت دلاتا، اس کے علاوہ مملکت اسلامیہ سے بھی ان کو نفرت تھی کیوں کہ ان کا مزاج باغیانہ تھا، لہٰذا زنادقہ کے تعلق سے امراء و حکام کافی سرگرم رہے، اور فتنہ کو دبانے اور زنادقہ کا قلع قمع کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

---

(۶۴) لسان المیزان (۳/۲۸۹) (۶۵) مصدر سابق

(۶۶) بخاری استتابۃ المرتدین (۶۹۲۲)

حتیٰ کہ خلیفہ مہدی نے تو باقاعدہ ان کی سرکوبی کے لیے ایک وزارت قائم کر رکھی تھی، اس کے وزیر کو صاحب زنادقہ کہا جاتا تھا اس وزارت کا مقصد زنادقہ کا استیصال تھا، خلیفہ مہدی نے اپنے بیٹے موسیٰ ھادی کو زنادقہ کے ختم کرنے کی وصیت بھی کی تھی اور ھادی کو ان کی اسلام دشمنی سے آگاہ کیا تھا، ھادی نے یہ عہد کیا تھا کہ اگر میں زندہ رہا تو اس فرقہ کو مٹا کر رہوں گا کسی کو زندہ نہ چھوڑوں گا، ان کے بعد ہارون و مامون نے بھی زنادقہ کا تعاقب کیا، خلیفہ معتصم نے اپنے سپہ سالار ہی کو زندقہ کی وجہ سے قید و بند میں ڈالا یہاں تک کہ وہ ختم ہو گیا۔ (٦٧)

شیخ غازی عزیر فرماتے ہیں کہ امراء کی یہ کارکردگی بظاہر صرف وضع حدیث کے لیے نہ تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اندر اسلامی سلطنت کے خلاف بغاوت کی بو پائی جاتی تھی نیز یہ محاربین و مرتدین کے ضمن میں آتے تھے، حدیث گھڑنا ایک ضمنی بات تھی۔ (٦٨)

امراء و حکام نے جن لوگوں کو اس سلسلہ میں قتل و صلب کیا ان میں سے کچھ یہ بھی ہیں:

بیان بن سمعان	حارث بن سعید	عبدالکریم بن ابی العوجاء
مغیرہ بن سعید	محمد بن سعید مصلوب	غیلان بن مسلم دمشقی

خالد بن عبداللہ قسری نے بیان بن سمعان، مغیرہ بن سعید اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا۔ (٦٩)

امام ذھبی بھی بیان بن سمعان کے بارے میں کہتے ہیں کہ مدعی نبوت اور الوہیت علی کا قائل تھا۔ (٧٠)

مغیرہ بن سعید بھی مدعی نبوت تھا۔ (٧١)

عبدالملک بن مروان نے حارث بن سعید کو مدعی نبوت ہونے کی وجہ سے تختہ دار پر لٹکا دیا تھا۔ (٧٢)

---

(٦٧) فتنہ انکار حدیث کا (٣٨٩/٣-٣٩٠) (٦٨) فتنہ انکار حدیث (٣٩٠/٣)
(٦٩) المجروحین (٦٣/١)، میزان الاعتدال (٣٥٧/١) (٧٠) میزان ٣٥٧/١
(٧١) میزان (١٦١/٤) (٧٢) میزان الاعتدال (٤٣٤/١)

والی بصرہ محمد بن سلیمان بن علی نے عبدالکریم بن ابی العوجاء کو قتل کردیا اس کا قتل خلیفہ مہدی کے دور میں ہوا۔ (۷۳)

خلیفہ ابوجعفر نے محمد بن سعید مصلوب کو صولی پر چڑھایا (۷۴) اس کا یہ کہنا تھا کہ "لا بأس اذا کان کلا ما حسنا أن تضع له اسنادا" (۷۵) کوئی بھی اچھی بات ہو تو اس کے لیے سند گھڑ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ھشام بن عبدالملک نے غیلان بن مسلم، دمشقی کو قتل کیا۔ (۷٦)

زنادقہ کے تعلق سے یہ لوگ جس طرح سرگرم تھے دوسروں کے بارے میں ویسی سرگرمی نہیں تھی، اگر یہ بھرپور سرگرمی دکھاتے تو ہر چہار جانب سے وضع حدیث کا کاروبار نہ چلتا بلکہ بہت سارے کذاب ایسے بھی تھے جو بعض خلفاء کو خوش رکھنے کے لیے حدیث گھڑتے تھے، مثلاً غیاث بن ابراہیم خلیفہ مہدی کے لیے مقاتل بن سلیمان بلخی خلیفہ ابوجعفر کے لیے وھب بن وھب بختری ہارون رشید کے لیے۔ (۷۷)

اس لیے بہت سے خلفاء کے دلوں میں ان کی طرف سے نرمی پائی جاتی تھی شیخ غازی عزیز نے اس نقطہ کی جو وضاحت کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

اگر یہ خلفاء وضاعین کے اعدام (خاتمے) میں اس قدر مستعد ہوتے تو ان کے دور اقتدار ہی میں جھوٹے صوفیاء، زاہدوں، قصہ گو اور واعظوں وغیرہ کو کبھی ہمت نہ پڑتی کہ وہ حسب منشاء حدیث گھڑ کر انہیں مشتہر کرسکیں، حقیقت یہ ہے کہ امراء ہی کی نرمی نے انہیں اتنا دلیر بنا دیا تھا، مثال دیتے ہوئے مزید فرمایا کہ :

جب غیاث بن ابراہیم نے خلیفہ مہدی کو خوش کرنے کے لیے کبوتر بازی کے متعلق حدیث

---

(۷۳) تدریب الراوی (۱/ ۲۸۴)، تنزیہ الشریعۃ (۱/ ۱۱)

(۷۴) میزان الاعتدال (۳/ ۵٦۲) (۷۵) مصدر سابق

(۷٦) لسان المیزان (۴/ ۴۲۴)

(۷۷) الوضع والوضاعون (۱/ ۲۷۰-۷۱)

گھڑی تو حقیقت جاننے کے باوجود اس کو سزا نہیں دی بلکہ اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

اور جب مقاتل بن سلیمان نے مہدی سے بنو عباس کی فضیلت میں حدیث گھڑنے کی پیشکش کی تو اس کو کوئی سزا نہیں دی۔

اور جب ابوالبختری نے ہارون رشید کو جھوٹی حدیث سنائی تو بس اتنا کہا کہ : اگر تو قبیلہ قریش سے نہ ہوتا تو تجھ کو قضاء سے معزول کر دیتا، معلوم یہ ہوا کہ دفاع وضع کا عملی اور نظری کام محدثین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ (۷۸)

☆☆☆

(۷۸) فتنہ انکار حدیث کا نیا روپ (۳/۲۹۰)

فتنہ انکار حدیث کا دفاع

﴿إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون﴾ (الحجر : ۹)

بیشک ہم نے ذکر (شریعت) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

دلائل اتباع سنت :

اللہ کے رسول ﷺ کو جو پہلی ہدایت غار حراء میں ملی تھی وہ بلفظ "اقــرا" تھی، اس ﴿اقرا باسم ربک الذی خلق﴾ (العلق : ۱) اُس رب کے نام پڑھو جس نے وجود بخشا اس "اقرا" سے پہلے وہاں ایک اور "اقرا" بھی موجود ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا اپنا گھر بار چھوڑ کر غار حراء میں عبادت کے لیے جانا، حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آمد اور اللہ کے رسول ﷺ سے یہ کہنا کہ "اقرا" پڑھو، اور رسول اللہ ﷺ کا یہ جواب دینا کہ "ما أنا بقاری" میں پڑھنا نہیں جانتا۔ وہ منظر ہے جس کو اگر یہ کہہ کر حذف کر دیا جائے کہ یہ حدیث رسول ہے قابل قبول نہیں، یا یہ خبر واحد ہے، جو ظنی ہوتا لہٰذا قابل اعتماد نہیں ہوسکتا ہے کہ بعض کی عقل بھی ماری جائے اور یہ اس کی سمجھ میں نہ آئے، لہٰذا نا قابل اعتبار ٹھہرائے تو قرآن کریم کا وجود اور اس کا نزول، اس کا ثبوت بھی برقرار نہیں رہتا، لہٰذا جب تک پہلے اقــرا (حدیث رسول) کو تسلیم نہ کیا جائے گا تو دوسرے اقرا جو "اقرا باسم ربک الذی" میں ہے اس کا تسلیم کرنا ناممکن ہوگا۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سنت رسول کے بغیر قرآن کا تصور ناممکن ہے اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سنت رسول کا وجود قرآن کے وجود پر مقدم ہے، ان میں سے کسی ایک کے انکار سے دوسرے کا انکار خود بخود لازم آئے گا، اسی مفہوم کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے : "لن تضلوا ما مسکتم بھما کتاب اللہ وسنة رسولہ" (۱) جب کتاب وسنت کو پکڑے رہو گے ہرگز ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے۔ یہ دونوں (کتاب وسنت) قیامت تک جدا نہیں ہو سکتے۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ میں قرآن کو تو مانتا ہوں حدیث کو نہیں، صرف قرآن ہمارے لیے کافی ہے حدیث رسول کی ضرورت نہیں، اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ کوئی یہ کہے کہ میں سورج کو تو مانتا ہوں لیکن روشنی سورج کی ہے اس کو نہیں مانتا ہوں۔ قرآن کو مانتا ہوں لیکن اس کی روشنی پھیلانے والی کرنوں (حدیث رسول) کو نہیں مانتا۔

قرآن کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسی قرآن میں جس کو آپ پر چالیس سال کی عمر میں نازل کیا گیا تھا تقریباً چالیس مقامات پر حدیث رسول کی اہمیت، آپ کی سنت وسیرت، آپ کے اقوال وافعال آپ کے فیصلے آپ کے بیان ووضاحت کی حیثیت وحقیقت واضح کر دی گئی ہے حدیث کے انکار سے بیک قلم ان سب کا انکار لازم آتا ہے۔

اللہ رب العالمین نے کہیں یہ کہا کہ ﴿وما ینطق عن الھویٰ إن ھو إلا وحی یوحیٰ﴾ (النجم : ۲-۳) آپ اپنی خواہش سے گفتگو نہیں کرتے جو آپ کہتے ہیں وہ وحیٔ الٰہی ہے۔

تو کہیں ﴿إن أتبع إلا ما یوحی إلی﴾ (الانعام : ۵۰) میں نہیں اتباع کرتا ہوں مگر اس چیز کی جو میری جانب وحی کی گئی۔ اور ﴿لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوة حسنة﴾ (الاحزاب : ۲۱) تمھارے لیے رسول کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے۔ ﴿وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا﴾ (الحشر : ۷) جو تم کو رسول دیں اس کو لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رُک جاؤ۔ ﴿فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم﴾ (النساء : ۶۵) آپ کے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ آپ کو

---

(۱) موطا (۸۹۹/۲) بلاغا، نیز دیکھیے صفحہ ۲۷

اپنے اختلافی مسائل میں فیصل نہ بنالیں۔ ﴿ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث﴾ (الاعراف : ۱۵۷) ان کے لیے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتے ہیں۔ ﴿وأنزلنا إلیک الذکر لتبین للناس مانزل إلیهم﴾ (النحل : ۴۴) بیشک ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تاکہ آپ منزل کی وضاحت کردیں۔

اگر رسول کی رسالت، قرآن کی ہدایت، قیامت تک باقی رہنے والی ہے تو آپ کے فیصلے، آپ کا عطا کرنا، آپ کا بیان کرنا اور آپ کی ساری ہدایتیں قیامت تک برقرار رہیں گی، اگر کوئی یہ سوچے کہ آپ کے فیصلے اور آپ کی باتیں آپ کی زندگی تک کے لیے تھیں تو لازمی طور سے ﴿وما آتاکم الرسول﴾ ''جو رسول تم کو دیں'' کی زندگی بھی ختم ہے۔ ﴿فإن تنازعتم فی شیٔ فردوه إلی الله والرسول إن کنتم تومنون بالله والیوم الآخر﴾ (النساء : ۵۹) ''اگر کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کی جانب لوٹا دو۔'' کا وجود بھی مٹ جائے گا۔ اللہ کی طرف معاملات میں تنازعات کو لوٹانے کی شکل کیا ہو سکتی ہے، ظاہر ہے کہ یہاں دنیاوی نظام کی طرح اللہ کا دربار، کچہری، کورٹ، عدالتیں وغیرہ قائم نہیں، نہ کہیں جبرئیل امین کی آفس ہے نہ داروغہ جہنم کا ہیڈ کوارٹر، تو اللہ کی طرف تنازعات کو کیسے لوٹایا جائے؟

اس کا مطلب یہ ہے جس کو صحابہ کرام نے سمجھا کہ اپنے مسائل کو قرآن کی روشنی میں حل کیا جائے ٹھیک اسی طرح سے رسول کی طرف لوٹانے کا معاملہ ہے، رسول کی موجودگی میں مسائل کو آپ کی طرف لوٹا کر حل کریں اور آپ کی عدم موجودگی اور وفات کے بعد سنت رسول کی طرف لوٹا کر حل کریں دونوں پر لوٹانے کا طریقہ ایک جیسا ہے۔

مذکورہ چند اور ایسی بہت ساری قرآنی آیات کی وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہے کہ سنت رسول بے حیثیت ہے، سنت کے بغیر مسائل حل کرلیں گے تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے ایسے لوگ بلاشک وشبہ وہ صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

اگر سنت رسول کو سیرت رسول کے آئینہ میں دیکھا جائے تو اس سے بھی یہ سبق واضح طور سے ملے گا، بے شمار مقامات پر صحابہ کرام اور امت کو یہ دعوت دی ہے کہ مجھ کو دیکھو میں کیا کر رہا ہوں اسی طرح تم بھی کرو "صلوا کما رأیتمونی اصلی" (۲) اور "خذوا عنی مناسککم" (۳) اسی طرح کا مظہر ہے جس میں امت کو یہ حکم ہے کہ میرے عمل کو دیکھو اور اسی کے مطابق عمل کرو۔

"علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین" (۴) میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔ اور "فمن رغب عن سنتی فلیس منی" (۵) جو میری سنت سے اعراض کرے گا اس کا تعلق مجھ سے نہیں۔ میں یہ واضح پیغام موجود ہے کہ سنت کے بغیر ایمان نا تمام اور ہدایت بعید تر ہوتی ہے ہر خطبہ میں آپ ﷺ اس پیغام کی تکرار کرتے تھے "فإن خیر الحدیث کتاب الله وخیر الهدی، هدی محمد ﷺ (۶) یقیناً سب سے بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت رسول کی ہدایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب کوئی معاملہ یا مسئلہ درپیش ہوتا تو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے حالانکہ قرآن کریم ان کے پاس موجود تھا، آپ کو کہیں نہیں ملے گا کہ انہوں نے (صرف) قرآن کا مراجعہ کیا ہو بلکہ وہ سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد جب کوئی معاملہ پیش آتا تو وہ جس طرح قرآن کی طرف رجوع کرتے تھے اسی طرح سنت رسول کی طرف رجوع کرتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے جو انہوں نے دادی کی وراثت کا مسئلہ اٹھنے پر کیا تھا کہ "میں کتاب اللہ میں تمہارے لیے کوئی حصہ نہیں پاتا اور سنت رسول میں کیا ہے مجھ کو علم نہیں۔" (۷)

---

(۲) بخاری (۶۳۱) (۳) مسلم (۱۲۹۷) (۴) ابوداؤد (۴۶۰۷)، ترمذی (۲۶۷۶)
(۵) بخاری (۴۷۷۶)، مسلم (۱۴۰۱) (۶) مسلم (۸۶۷) (۷) موطاء (۲/۵۰۳)

پھرانہوں نے سنت رسول کو تلاش کیا جب آپ کو دادی کی وراثت والی روایت مل گئی اور مکمل تحقیق واطمینان کرلیا، فوراً اس کو نافذ کردیا اور اس کو قانونی حیثیت حاصل ہوگئی، دیگر صحابہ کی زندگی میں بھی یہ بالکل عیاں ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والی روایت جس میں انہوں نے حدیث رسول کو کتاب اللہ کہا ہے وہ اس مسئلہ میں نص صریح ہے۔ ''لعن اللہ الواشمات'' والی جو روایت ہے اس کے ضمن میں انہوں نے کہا کہ جو چیز کتاب اللہ میں ہے اس کو میں کیوں نہ مانوں ایک عورت نے کہا یہ چیزیں (جو لعنت آپ نے بھیجی ہے) یہ کتاب اللہ میں موجود نہیں ہے، ہم نے قرآن مجید پڑھا ہے قرآن میں ایسا کچھ نہیں، انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے غور سے نہیں پڑھا کیا تمہیں اس میں یہ آیت نہیں ملی ﴿وما آتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا﴾ (الحشر : ۷) ''جو تم کو رسول دیں اس کو لے لو اور جس سے منع کریں رُک جاؤ۔'' اس نے کہا کہ ہاں یہ تو موجود ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے تو اس پر لعنت بھیجی ہے۔ (۸)

گویا کہ صحابہ کرام کا یہی مزاج تھا اور وہ قرآن وسنت کو ایک مقام دیتے تھے، اور اس کے تلازم کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان تمام چیزوں کی تفصیل سنت کی اہمیت میں گزر چکی ہے۔

ترکِ سنت کا مزاج کیسے بنا :

پھر جب رسول اللہ ﷺ کا زمانہ گزر گیا، صحابہ کرام کا ابتدائی دور چل رہا تھا، امت میں انتشار وافتراق پیدا ہوا جو ابتدائی دور میں بالکل سیاسی تھا، اختلافات کا دار مدار سیاست تھی جو جماعتیں سیاسی اور سازشی تھیں ان میں سب سے پہلی پارٹی خوارج کی تھی جو اپنے مزاج اور عقل کے مطابق قرآن کی تفسیر کرتے تھے، خروج کی وجہ سے خارجی اور باغی قرار پائے۔ ان کا اس وقت کسی شرعی مسئلہ کا اختلاف نہ تھا، نہ کوئی فروعی معاملہ تھا نہ اصولی دوسری پارٹی شیعان علی کی تھی۔

---

(۸) بخاری (۴۸۸٦)

ایک کا مسئلہ یہ تھا کہ ہم کسی صورت میں خلیفہ رابع حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیں گے، اس لیے کہ ہماری سمجھ اور ہمارے مزاج میں یہ آتا ہے کہ خلیفہ نے قرآن کو حکم نہیں تسلیم کیا، انسانوں کو حکم مانا!!

دوسرے کا مسئلہ یہ تھا کہ ہم ہر صورت میں خلیفہ کے ساتھ رہیں گے خواہ خیر ہو یا شر غالباً اس کی وجہ یہ تھی تا کہ اپنی تمام سازشوں اور ریشہ دوانیوں پر پردہ ڈال سکیں، انہوں نے اپنے لیے شیعانِ علی کا خطاب پسند کیا۔

جب دو جماعتیں مسلمانوں سے الگ ہوگئیں تو خود بخود تیسری جماعت بھی بن گئی یہی جماعت اہل سنت والجماعت یا جمہور کے نام سے معروف ہوئی، جو ان لڑائیوں اور انتشار کو فتنہ سے تعبیر کرتی تھی اور ان سے دور رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتی، انھیں میں سے ایک پارٹی وہ تھی جو حضرت عثمانؓ کے خون کے بدلے کو لے کر الگ ہو چکی تھی۔

آگے چل کر جب ان لوگوں کو اپنی سیاست چمکانے کی ضرورت پڑی اور اپنے نظریے سے عوام کو قریب کرنے کی حاجت ہوئی، اس زمانہ کا مزاج وماحول دین پسندی پر تھا، لہٰذا ان سیاسی پارٹیوں نے اپنے آپ کو دینی رنگ میں ڈھالنا شروع کر دیا، احادیث رسول اور کتاب اللہ کی من مانی تاویل اور خود پسند تفسیر کرنے لگے جن کی باقیات آج بھی موجود ہیں۔ عقیدہ میں خرابی پیدا ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری آیتیں اور ساری حدیثیں جو ان کے عقیدہ اور مفاد سے ٹکراتی تھیں اس کا انکار شروع کر دیا، یا من مانی مفہوم بنالیا۔

بصرہ میں معبد جہنی نام کا ایک شخص پیدا ہوا جس نے تقدیر کا انکار کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام روایتیں اور آیتیں جو اثبات تقدیر کے بارے میں وارد ہیں عملاً اس کا انکار ہوا۔

اس طرح کا مزاج کوفہ اور بصرہ سے پنپا، یہیں سے کچھ لوگوں کے ذہن ودماغ میں غالباً یہ بات پیدا ہوئی کہ لاؤ ہم اپنے مسائل کو صرف قرآن ہی کے ذریعہ سمجھیں جیسا کہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ جو بصرہ میں تھے ان کے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آیا، ایک شخص نے آکر ان سے یہ

کہا کہ ہم کو قرآن کے ذریعہ ہی جواب دیجیے، انہوں نے کہا کہ تم اور تمہارے ساتھی سب قرآن پڑھتے ہیں نا؟ کیا اس میں نماز، روزے کی تفصیل ہے؟ کیا اس میں زکوٰۃ کے مسائل کی تفصیل موجود ہے؟ اس نے کہا "أحییتنی أحیاک اللّٰہ" (۹) آپ نے ہم کو زندگی عطا کی اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

اسی طرح سے امیہ بن خالد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بعض نماز کا تذکرہ قرآن میں ملتا ہے، بعض کا نہیں تو ایسی صورت میں ہم کیا کریں انہوں نے جواب دیا کہ ہم دور جاہلیت سے گزر رہے تھے کچھ بھی نہیں جانتے تھے تو اللہ نے ہمارے درمیان رسول بھیجا، انہوں نے ہماری رہنمائی کی ہم کو نماز کا طریقہ بتایا اس کے اوقات اور تفصیل بتائی لہٰذا ہم ویسے ہی کرتے ہیں جیسے کہ رسول کو دیکھا۔ (۱۰) لہٰذا آپ سنت رسول ﷺ میں تلاش کریں اس میں سب کچھ مل جائے گا۔

اس طرح کے جو نادر واقعات ہوئے حقیقت میں وہ انکار سنت نہ تھا وہ اسی میں احتیاط سمجھتے تھے تاکہ دین میں دوسری باتیں نہ آجائیں اور یہ کوفہ اور بصرہ کے ماحول کا شاخسانہ تھا۔

اس دور میں جن لوگوں نے بھی کسی بھی حدیث کو ترک کیا اس کی بنیاد عموماً انکار پر نہ تھی اور نہ اس وجہ سے تھی کہ کتاب وسنت میں بحیثیت تشریع فرق ہے، کسی نے بھی صراحت کے ساتھ یہ نہ کہا کہ یہ سنت رسول ہے اور یہ قرآن ہے، لہٰذا ہم قرآن کو مانیں گے اور سنت کو نہیں مانیں گے۔

ہاں اتنا ضرور ہے کہ جو حدیثیں ان کے مزاج کے خلاف تھیں کسی نہ کسی بہانہ ان کو ترک کیا۔

خوارج نے فضائل اہل بیت سے متعلق حدیثوں کو تسلیم نہ کیا اور اس کے لیے ضابطہ بنایا۔

روافض نے فضائل صحابہ سے متعلق حدیثوں سے دامن جھاڑا۔

معتزلہ اور جہمیہ نے احادیث صفات کو قبول نہ کیا۔

قدریہ نے ان حدیثوں کو جو ان کے عقل میں نہیں آتی تھیں ان کے قبول کرنے میں پس وپیش کیا۔

---

(۹) المستدرک (۱/۱۰۹-۱۱۰) (۱۰) المستدرک (۱/۲۵۸) وقال رواتہ ثقات ووافقہ الذھبی

بعض بزرگوں نے صحابہ کرام میں بعض کو فقیہ اور بعض کو غیر فقیہ بنا کر ان سے آنکھیں بند کر لیں۔

اور ہر ایک نے اپنے قول کے لیے کٹ حجتی اور تکلف سے کام لیا۔

کسی نے تحکیم کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر مسئلہ کھڑا کیا، تو کسی نے خلافت کو بنیاد بنا کر اختلاف کیا، کسی نے عقل کو معیار کل سمجھ لیا، کسی نے احادیث میں متواتر اور آحاد میں فرق کر کے خبر آحاد کو باطل قرار دیا، کسی نے اس کو ظنی مان کر ان سے پیچھا چھڑایا کسی نے عقیدہ اور احکام میں استدلال کے لیے حدیثوں میں فرق کیا تو کسی نے اس کی تاویل کی مثلاً یہ کہا کہ "یـــد" سے مراد قبضہ وقدرت ہے اور جہاں پر سمیع وبصیر کی بات ہے اس سے مراد صفت سمع وبصر نہیں بلکہ اس سے مراد علم ہے، اس طرح صفات باری تعالیٰ سے متعلق احادیث سے دست بردار ہو گئے۔

ان لوگوں نے صراحت سے یہ نہیں کہا کہ یہ سنت رسول ہے اور وہ قرآن ہے ہم سنت کو تو نہیں مانتے البتہ قرآن کو مانتے ہیں حالانکہ اس کا لازمی نتیجہ وہی نکلتا ہے لیکن اتنی جرأت وجسارت ان لوگوں نے نہیں کی کہ علی الاعلان منکر حدیث بن جائیں اور صرف قرآن کو ہی دین وشریعت سمجھیں۔

لیکن جب جہمیہ ومعتزلہ پر زوال آیا، خوارج کا دنیا سے خروج ہوا تو بہت سارے عقیدے اور سنت سے متعلق گمراہ کن خیالات ان کے ساتھ ختم ہو گئے، اس دور کے علماء ومحدثین اور خدام شرع متین کو اللہ نے توفیق دی جنہوں نے ان تمام شکوک وشبہات اور ان کے تمام دلائل کا مسکت جواب دیا جس سے ان کا قلع قمع ہو گیا، اور جو اس مزاج وفکر کے پیشوا تھے وہ مطمئن ہو گئے، امام شافعی، امام بخاری، امام احمد بن حنبل، علامہ ابن قتیبہ اور امام طحاوی رحمہم اللہ کی تحریریں اس پر شاہد عدل ہیں۔

انکارِ سنت :

تقریباً بارہ سو سال کا عرصہ گزر گیا صورت حال تقریباً اسی طرح برقرار رہی، اس طرح کے

لوگوں کا وجود جو سنت کا کسی طرح سے انکار کرتے تھے باقی نہیں رہا سوائے ایک پارٹی کے جس کو شیعان علی کہا جاتا تھا جنہوں نے اپنا راستہ ہی بالکل الگ بنالیا۔

دین کے دشمنوں نے جب اس کو ایک طویل مدت تک پھلتا پھولتا دیکھا اور طویل صلیبی جنگوں میں شکست خوردہ ہو گئے تو انہوں نے یہ سوچا کہ مسلمانوں کو ہتھیار اور طاقت کے ذریعہ کمزور نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا ان کو ان کے دین سے دور کر دیا جائے، اس زمانہ میں اسی کو غزوہ فکری یا فکری یلغار کہا جاتا ہے جس میں دشمنان اسلام بہت ہی منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کے فکر کو بدلنے میں لگ گئے، ان کے امراء وسلاطین، علماء اور قائدین کو نشانہ بنایا، اس کے لیے صلیبیوں اور یہودیوں نے مل کر ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں انتہائی ہوشیار، عیار اور زیرک لوگوں کو شامل کیا، دین اسلام کو سیکھنے کے لیے ان کو عرب ممالک میں بھیجا جنہوں نے انتہائی محنت سے دین کو سیکھا اور اپنے مقصد کے لیے زمین ہموار کرنے کا جائزہ بھی لیتے رہے۔ المعجم المفہرس جیسی کتاب انہوں نے اسی مقصد کے لیے تیار کی تھی کہ احادیث رسول میں شکوک وشبہات پیدا کئے جائیں اور اس میں سے اعتراض کی چیزیں نکالی جائیں۔ ﴿فأما الذين في قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاويله﴾ (آل عمران : ۷) یعنی جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے لگتے ہیں تاکہ فتنہ پروری اور تاویل کریں۔

انہوں نے تحقیق اور آزادی رائے کے نام پر کھل کر آوارگی رائے کا مظاہرہ کیا، وہ اصول وضوابط جو معتزلہ اور جہمیہ کے وضع کردہ تھے، احادیث اور آیات شریفہ پر جو عقلی اعتراضات کیے گئے اور جن کے جوابات بارہ سو سال پہلے دیے جا چکے تھے جن کتابوں کا وجود بھی ختم ہو رہا تھا مکتبات کے تہ خانوں سے اس کو طشت ازبام کیا اور وہ کتابیں جو ان کے سروں پر تھیں جن میں ان کے جوابات تھے ان سے آنکھیں بند کر لیا، مزید یہ کہ اپنی ضرورت اور مزاج کے مطابق کاٹ چھانٹ کر کے ان کے نصوص کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھال لیا، اور اس کو اپنے ذہن ودماغ کی اپج بتایا، علمی امانت داری کو بالائے طاق رکھ دیا، بڑی بڑی ڈگریاں لگا کر اسلامیات کے پروفیسر بننے اور بنانے لگے اور۔

''اوخویشتن گم است کرا رہبری کند'' وہ خود گمراہ ہے دوسروں کو کیا راستہ دکھائے گا۔ کی زندہ مثال بنے۔

انہیں مستشرقین میں ایک نام گولڈزیہر کا ہے جو مستشرقین کا قبلہ اور شیخ المشائخ ہے جس نے دراسات اسلامیہ کے نام سے کتاب تحریر کی جو ان کے نزدیک انجیل مقدس کا درجہ رکھتی ہے اس کے شاگردوں، ساتھیوں اور صلیبی صیہونی کمیٹیوں نے ان کی بھرپور مدد کی، ہر طرح کے آرام وآسائش کا انتظام اور ہر طرح سے ان کا ساتھ دیا، بڑے بڑے وزراء اور حکام کے مساوی ان کی تنخواہیں مقرر کی گئیں ان کی زندگی کا معیار شاہانہ ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ بہت بلند وبالا ہو گیا۔

اس مادی دنیا اور ظاہری طمطراق سے مسلم علماء ودانشوروں کو اپنی طرف راغب کیا، ان کو احساس کمتری کا شکار بنا دیا گیا، بعض علماء ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے نقش قدم کو اپنا اسوہ اور آئیڈیل بنایا ان کے فکر سے ہم آہنگ ہو گئے۔

انہیں لوگوں میں محمد عبدہ اور احمد امین جیسے نامور لوگ بھی تھے حتی کہ سید رشید رضا جیسی باکمال شخصیت بھی وقتی طور سے بہک گئی توفیق صدقی، ابوریہ، صالح ابوبکر، ابراہیم ادہم وغیرہ نے ان لوگوں کا ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ ''چیلا شکر ہو گئے'' کے مقولہ کا مصداق بن گئے۔ توفیق صدقی نے بارہ سو سال سے اب تک متفق علیہ حکم کی خلاف ورزی کی، اجماع امت سے منہ موڑ لیا اور صراحت کے ساتھ سنت کا انکار کیا، ان شخصیات سے دیگر لوگوں کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ (۱۱)

کچھ نامور شخصیات جو برصغیر میں پائی جاتی تھیں جن کا شمار دانشوروں میں ہوتا تھا اور ہوتا ہے۔ وہ بھی اس فکر سے متاثر ہو گئے، ان لوگوں نے بھی سنت وشریعت کو پرکھنے کا وہی پیمانہ استعمال کیا جو مستشرقین نے بنا رکھا تھا اور مصر جیسے علمی ملک میں جامعہ ازہر کے سایہ میں یہ پیمانہ آزمایا جا رہا تھا، اس عقلیت اور جدیدیت نے برصغیر کو اپنے لیے سرسبز میدان بنا لیا۔

مرزا غلام نے تو پوری شریعت کو خیر آباد کہہ دیا اور خود نبی بن بیٹھا۔

---

(۱۱) السنۃ ومکانتہا : ص ر ۳۲، زوابع فی وجہ السنۃ ص ر ۶۷

سرسید احمد (متوفی ۱۸۹۸ء) نے قرآن کی من مانی تفسیر کی، سنت کو پرکھنے کا وہی پیمانہ لیا جس کو مستشرقین نے قدریہ جہمیہ اور معتزلہ سے چرایا تھا، اور جس کو اہل سنت کے بازار میں بیچ رہے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے مشاہدات، نیچر اور عقل پرستی کی بنیاد پر جملہ معجزات نبوی کا انکار کر دیا، عذاب قبر، معراج، جن و ملائک کا انکار اور تاویل کی، حالانکہ یہ صرف سنت کا انکار نہیں بلکہ نصوص قرآن اور بدیہیات کا انکار ہے، ان کے رفیق مولوی چراغ علی (متوفی ۱۸۹۵ء) نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔

توفیق صدقی کے سُر سے سُر ملا کر پہلی بار برصغیر میں عبداللہ چکڑالوی نے کھلے لفظوں میں سنت کا انکار کیا، غلام پرویز، برق جیلانی، تمنا عمادی کی پارٹی نے اس کی تائید کی، غلام احمد پرویز نے "جمعیۃ القرآن" کے نام سے ایک مجلس قائم کی جس کا مقصد انکارِ سنت کا پرچار کرنا اور قرآن کا کافی ہونے کو ثابت کرنا تھا۔

حالانکہ ان میں سے بعض لوگوں نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا تھا، توفیق صدقی، سید رشید رضا اور برق جیلانی انہیں لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے نشیمن کو جلانے کے بعد بجھانے کی کوشش کی اور سنت کی تائید میں کتابیں لکھیں۔ (۱۲)

حالانکہ ان کا لگایا ہوا پودا پھلنے پھولنے لگا ان میں ذیلی قائدین پیدا ہوئے، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا امین احسن اصلاحی، عنایت اللہ سبحانی، شمس پیرزادہ، شبیر میرٹھی صاحبان نے لپک کر اس جھنڈے کو ہاتھ میں لیا اور اس کو لہرانے لگے۔ ان کے متبعین ان کے گن گانے لگے اور ان کو محدث، مفسر، مجدد کا درجہ دیدیا۔ ہوسکتا ہے آگے چل کر کچھ اور خطاب عطا کریں۔

اپنے اس عمل کے لیے ان حضرات نے ذوق وشوق، تدبر و تعقل، خود پسندی، خوش فہمی اور ذاتی اصولوں کو بنیاد بنایا، اس طرح سنت کی اہمیت گھٹانے کا راستہ ہموار کر دیا۔

☆☆☆

---

(۱۲) أصول التوفيق بين الأحاديث المتعارضة : ص ر ۴۵

منکرین حدیث کے شبہات کا خلاصہ اور اس کا جواب

شبہات :

(۱) حدیث رسول اخبار آحاد کا مجموعہ ہے اور یہ ظنی ہے لہٰذا قابل اعتماد نہیں ہے۔

(۲) قرآن میں سب کچھ موجود ہے ﴿ ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شئ ﴾ (النحل : ۸-۹) ہم نے آپ پر کتاب نازل کیا جس میں ہر چیز کا بیان ہے۔لہٰذا غیر قرآن کی ضرورت نہیں۔

(۳) اللہ نے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، سنت کی نہیں۔

(۴) احادیث رسول کا بڑا مجموعہ ایک دوسرے سے متعارض ہے لہٰذا وہ رسول کی بات نہیں ہو سکتی ہے۔

(۵) حدیث رسول کی تحریر قرآن کی طرح نہیں کی گئی ہے لہٰذا وہ رسول کی بات نہیں ہو سکتی ہے۔

(۶) بعض حدیثیں عقل میں نہیں آتیں، لہٰذا قابل قبول نہیں۔

(۷) سنت وحی الٰہی نہیں۔

(۸) حکم صرف اللہ کا چلے گا رسول کے حکم پر عمل شرک ہے۔

(۹) رسول کی اطاعت صرف رسول کی حیات تک محدود تھی۔

یہ وہ بنیادی اعتراضات ہیں جو ان کے ذہن و دماغ کے لیے سنت پر ایمان لانے سے مانع ہیں حالاں کہ یہ کوئی نئی باتیں نہیں، یہ وہی پرانے ۱۲ رسو سال قبل والے خیالات اور شبہات ہیں، جن کا دندان شکن جواب علماء حق پہلے ہی دے چکے ہیں۔جس کا خلاصہ یہ ہے۔

جوابات :

۱- خبر واحد کا ظنی ہونا :

یہ ایسا اعتراض ہے جس کا جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں "کتاب أخبار الآحاد" اور کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة میں دے کر انکار سنت اور انکار خبر واحد کی تردید کی ہے، اور کتاب وسنت سے اس کا مدلل جواب دیا ہے، امام شافعی نے اپنی مشہور کتاب "الرسالہ" میں انکار سنت کی تردید میں ایک باب قائم کیا ہے۔

یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ خبر واحد کا ظنی ہونا ایک اصطلاحی معاملہ ہے جس کو اصطلاح کی روشنی میں سمجھنا چاہیے نہ کہ اپنے مزاج کے مطابق اور نہ ہی لغوی معنی کے اعتبار سے، وہ بھی مختلف معنی میں سے کسی ایک معنی کو اختیار کرنا بغیر کسی دلیل کے تحکم ہے۔

محدثین نے یہاں جو معنی مراد لیا ہے وہ معنی مراد لیا جائے کوئی دوسرا معنی نہیں، محدثین نے احادیث کی جو تقسیم کی ہے اس کو ذہن میں بٹھانے اور درجات میں فرق کے لیے یہ اصطلاح قائم کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ خبر متواتر علم ضروری کا فائدہ دیتی ہے جب کہ خبر واحد کبھی علم نظری اور کبھی علم ظنی کا فائدہ دیتی ہے۔

علم ضروری : اس علم کو کہتے ہیں جس کے ثبوت کے لیے استدلال کی ضرورت نہ ہو اس کو علم بدیہی بھی کہا جاتا ہے۔

علم نظری : اس علم کو کہتے ہیں جس کے ثبوت کیلیے استدلال کی ضرورت ہو نیز اس کی صحت کے لیے مزید قرینہ موجود ہو۔

علم ظنی : اس علم کو کہتے ہیں جس کے ثبوت کے لیے استدلال کی ضرورت ہو لیکن صحت کے لیے (صحتِ سند کے علاوہ) اور کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ (اس میں یقین کا پہلو راجح اور شبہ کا پہلو مرجوح ہوتا ہے)

خبرآحاد جن میں راویوں کی ثقاہت کے لیے اور کوئی قرینہ نہ ہو اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی علم یقینی ہوتا ہے، اس لیے کہ حدیث کی صحت کے لیے راویان حدیث کے حالات میں بحث ونظر اور استدلال کے بعد ہی حکم لگایا جاتا ہے، علم کی یہ تینوں قسمیں ضروری، نظری، ظنی، علم یقینی کی اقسام ہیں، صرف درجات کا فرق ہے جس طرح سے حدیث صحیح کے درجات ہوتے ہیں، اسی طرح سے یہ علم یقینی کے درجات ہیں درجات کے فرق کو واضح کرنے کے لیے ایک کی تعبیر ضروری سے، دوسرے کی نظری سے اور تیسرے کی ظنی سے کی ہے۔ لہٰذا اخبار آحاد سے جو بھی علم حاصل ہوتا ہے وہ علم یقینی ہی ہوتا ہے، بشرطیکہ بحث ونظر کے بعد وہ ثابت شدہ ہو، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سلفی نے اپنے مقالے میں جس کا عنوان ہے۔ ''حدیث کی تشریعی اہمیت'' اس میں ظن کے معنی پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہ مقالہ چند مقالوں کے ساتھ ''حجیتِ حدیث'' کے نام سے جامعہ سلفیہ بنارس سے مطبوع ہے۔ (۱۳)

لفظ ظن باعتبار معنی مختلف طرح سے استعمال کیا جاتا ہے جو عربی کا کلمہ ہے اور قرآن کریم میں مختلف معانی میں مستعمل ہوا ہے۔

کہیں **بدگمانی** کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے ﴿ یاأیھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ﴾ (حجرات : ۱۲) اے مسلمانوں بدگمانی سے زیادہ تر بچو۔

کہیں **یقین** کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً ﴿ إنی ظننت أنی ملاق حسابیه ﴾ (حاقہ : ۲۰) مجھ کو یقین تھا کہ اپنا حساب ہوگا۔ ﴿ الذین یظنون أنهم ملاقوا ربهم ﴾ (بقرہ : ۴۶) جن کو یقین ہے کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کریں گے۔ ﴿ وظن أنه الفراق ﴾ (قیامہ : ۲۸) اُس کو جدائی کا یقین ہوگیا۔ ﴿ ورأی المجرمون النار فظنوا أنهم مواقعوها ﴾ (کہف : ۵۳) مجرمین نے جہنم کو دیکھا تو ان کو یقین ہوگیا کہ وہ اس میں ڈالے جائیں گے۔

---

(۱۳) حجیت حدیث ص ر ۱۶۳-۱۶۷

کبھی **شک** کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے ﴿ومالھم به من علم إن یتبعون إلا الظن وإن الظن لایغني من الحق شیئا﴾ (نجم : ۲۸) اُن کے پاس بدگمانی کے علاوہ اور کوئی علم نہیں، حالانکہ بدگمانی حق سے بے نیاز نہیں کرتی۔

معنی کی تعیین کے لیے سیاق وسباق اور قرینہ کی ضرورت پڑتی ہے اگر قرینہ کمزور ہو، یا ظن علم ویقین اور صداقت کے مقابلہ میں مستعمل ہو، یا مذمت کے سیاق میں مستعمل ہو تو وہ شک وشبہ کے معنی میں ہوتا ہے۔

اور اگر قرینہ قوی ہو یا تعریف کے سیاق میں ہو تو وہ یقین کے معنی میں ہوتا ہے، قرینہ قوی ہونے کی صورت میں عموماً أنّ یا أن کے ساتھ ہوتا ہے اور کمزور ہونے کی صورت میں عموماً إنّ یا إن کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ (۱۴)

اخبار آحاد کے راویوں پر بحث ونظر، تجربہ اور مشاہدہ کے بعد صحت یا حسن کا جو حکم لگایا جاتا ہے وہ مدح کے سیاق میں ہے، لہٰذا یہاں اس اعتبار سے بھی ظن یقین کے معنی میں ہے۔

اسلام کے ماقبل جتنی بھی شریعتیں آئیں ذرا ان کے واسطوں پر ایک نظر دوڑایئے تو خود بخود مذہب اسلام کی یہ خوبی واضح ہو جائے گی۔

مثلاً : یہودیت کا دارومدار توریت پر ہے، موجودہ توریت کس واسطہ سے آئی ہے اس کی اصل زبان کیا تھی، اس کا ترجمہ کس نے کیا اور کب کیا کسی کو نہیں معلوم۔ (ان جملہ امور سے متعلق اہل علم کا سخت اختلاف ہے)

انجیل جس پر مسیحیت کا دارومدار ہے کب نازل ہوئی، اس کا ترجمہ کس نے کیا، اصل زبان کیا تھی، اس کا معاملہ بھی توریت ہی کی طرح ہے، ان میں تو خبر واحد بھی نہیں جب کہ مستشرقین تو اسی کے متبع ہیں اگر خبر آحاد قابل حجت نہیں تو بلا صفحہ اور بغیر واسطہ سے آیا ہوا دین کیسے صحیح ہو سکتا ہے جب کہ قرآن کہتا ہے ﴿اتخذوا أحبارھم ورھبانھم أربابا من دون اللّٰه﴾ (توبہ : ۳۱) انھوں نے اپنے علما اور عابدوں کو اللہ کے علاوہ رب بنالیا یعنی وہ جیسا کہتے یہ ایسا کرتے۔

---

(۱۴) حجیتِ حدیث ص/ ۱۶۵

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمہ آفتاب را چہ گناہ

اگر چمگادڑ دن میں نہ دیکھ سکے تو اس میں سورج کی روشنی کا کیا قصور!

اگر خبر واحد قابل یقین نہ مانا جائے تو دنیا کا سارا نظام مفلوج ہو جائے گا، قرآن کریم کا معنیٰ ومفہوم اور اس کی تفسیریں بھی قابل قبول نہ ہوں گی اس لیے کہ یہ خبر واحد سے منقول ہیں، ایک عالم جو کہتا اور لکھتا ہے اور منکرین سنت جو تفسیر بتاتے ہیں یہ بھی خبر واحد ہے اس لیے وہ بھی قابل قبول نہیں ہوگی۔

خبر واحد سے متعلق تفصیلی گفتگو انکار خبر آحاد کے دفاع میں آرہی ہے۔ (۱۵)

(۲) کیا قرآن میں سب کچھ ہے؟

چکڑالوی صاحب فرماتے ہیں قرآن کامل ومفصل ہے رسول کی شرح اور عملی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ (۱۶)

قرآن کریم میں سب کچھ موجود نہیں یہ بھی ایک بدیہی امر ہے، اگر اس میں سب کچھ موجود ہے تو پھر منکرین سنت کو تفسیر کی ضرورت کیوں پڑی اور وہ کیوں اس کا معنی ومفہوم اپنی طرف سے بتاتے ہیں۔

اگر اس میں سب کچھ موجود ہے اور وہ (تبیانا لکل شئ) ہے تو پھر اللہ رب العزت نے رسول کے منصب میں یہ کیوں شامل کیا ﴿ وأنزلنا إليک الذكر لتبين للناس مانزل إليهم ﴾ (نحل : ۴۴) ہم نے آپ کی طرف ذکر اُتارا تاکہ جو اتارا گیا لوگوں کے لیے آپ اس کی وضاحت کردیں۔ جب سب کچھ موجود ہے اور ایسے ہی نہیں بلکہ تبیان اور وضاحت کے ساتھ ہے تو پھر اس کے بیان کا کیا مطلب جو رسول کی ذمہ داری قرار دی گئی؟

یقیناً قرآن میں سب کچھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں بنیادی اور کلی باتیں موجود ہیں اور انہیں میں یہ بھی ہے :

---

(۱۵) دیکھیے صفحہ ۳۷۶ (۱۶) مقام حدیث ص/ ۱۴۳

﴿ وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا ﴾ (الحشر : ۷) جو تم کو رسول دیں اس کو لے لو اور جس سے منع کریں رُک جاؤ۔

﴿ وما ينطق عن الهوى إن هو إلا وحي يوحى ﴾ (النجم : ۳-۴) آپ اپنی خواہش سے گفتگو نہیں کرتے جو آپ کہتے ہیں وحی الٰہی ہے۔

﴿ ومن يطع الرسول فقد اطاع الله ﴾ (النساء : ؟) جس نے رسول کی اطاعت کیا تو اس نے اللہ کی اطاعت کیا۔

﴿ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث﴾ (الاعراف : ۱۵۷) لوگوں کے لیے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ دیگر آیتوں پر توجہ کریں جو سنت کی دینی حیثیت میں گزر چکی ہیں۔ واضح ہو جائے گا کہ قرآن میں کیا ہے۔

اگر قرآن میں سب کچھ موجود ہے تو ذرا بتائیں کہ نماز، زکاۃ، روزہ، حج وغیرہ کی تفصیل کہاں ہے؟ قرآن سال کے بارہ مہینوں میں سے چار کو اشہر حرم کہتا ہے ﴿ إن عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهرا منها أربعة حرم فلا تظلموا فيهن أنفسكم﴾ (توبہ : ۳۶) مہینوں کی تعداد اللہ کے یہاں بارہ ہیں ان میں سے چار حرمت کے ہیں لہٰذا ان مہینوں میں اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔ یہ اشہر حرم کون کون ہیں اور قرآن میں کہاں ہیں، اس آیت پر عمل کیسے ممکن ہوگا؟

قرآن کہتا ہے ﴿ إذا نودي للصلوة من يوم الجمعة﴾ (جمعہ : ۹) جب نماز کے لیے جمعہ کے دن ندا دی جائے ندا کے کلمات، وقت، کیفیت اور تعداد کیا ہے اور قرآن میں کہاں ہے؟ جس نداء (اذان) کا اعتبار قرآن نے کیا ہے کیا وہ خبر واحد نہیں؟

۳ - کیا سنت کی حفاظت نہیں ہوئی؟

منکرین سنت کا کہنا ہے کہ اللہ نے حدیث کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لی ہے صرف قرآن کی لی ہے، جواب یہ ہے کہ :

صرف قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے نہیں لی ہے بلکہ ''ذکر'' کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے اور فرمایا ہے کہ ﴿ إنـا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون ﴾ (الحجر : ۹) اس ذکر کو ہم نے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس ذکر سے مراد صرف قرآن ہی نہیں بلکہ پوری شریعت ہے جس کا دار و مدار سنت رسول پر ہے، اللہ رب العزت کو جہاں قرآن کہنے کی ضرورت تھی وہاں اس نے لفظ قرآن کا استعمال کیا ہے جیسے ﴿ و القرآن المجيد ﴾ (ق : ۱) میں کیا ہے، لیکن جہاں لفظ قرآن کے بجائے لفظ "ذکر" استعمال کیا ہے وہ خود اس پر شاہد ہے کہ ذکر سے مراد صرف قرآن ہی نہیں بلکہ مکمل شریعت ہے۔

تاریخ قرآن اور تاریخ سنت کا مطالعہ کر لیجیے یہ بالکل واضح ہو جائے گا کہ قرآن کی حفاظت جن طریقوں سے کی گئی تھی، ٹھیک انہیں طریقوں سے سنت رسول کی حفاظت بھی کی گئی ہے، سب کی حفاظت کا دار و مدار قوت حافظہ پر تھا، اگر چہ دوسرے اسباب مثلاً کتابت اور عمل بھی اس میں شامل رہے۔

اگر بہت زیادہ گہرائی میں جائیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی حفاظت میں کتابت مقدم ہے حافظہ اور عمل موخر ہے، اور یہ اس صورت میں ہوگا جب کہ کتابت قرآن کا مقصد یہ فرض کریں کہ اس سے قرآن کو ضائع ہونے سے بچانا تھا، حالاں کہ یہ مقصد نہیں تھا تفصیل کے لیے تدوین حدیث کا موضوع ملاحظہ کریں۔ (ص ر ۱۰۷)

جبکہ حدیث رسول کی حفاظت میں حافظہ مقدم ہے عمل اور کتابت اس سے موخر ہے جب جمع قرآن کا معاملہ صحابہ کے سامنے آیا تو اس کی اصل وجہ جو حضرت عمر نے بیان کی تھی وہ یہی تھی کہ ''قراء کے بکثرت شہید ہونے سے قرآن کے ضائع ہونے کا مسئلہ آ گیا ہے'' کیا اس وقت کتابت کیے ہوئے اوراق کا علم ان کو نہیں تھا جنہوں نے اس پر اعتماد کا اظہار نہیں کیا اور جب اس کو جمع کیا تب کم از کم دو حفاظ کی شہادت لی۔ (۱۷)

---

(۱۷) بخاری (۴۹۸۶)

کیا یہ حضرات یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ قرآن کی پہلی آیت قابل اعتبار ہے کہ نہیں؟ اور یہ کہ کیا یہ آیت نازل ہوتے ہی تحریر کر لی گئی تھی؟ کیا یہ آیت قوت حافظہ کے بل بوتے محفوظ نہ رہی۔ کیا قرآن کے نسخے زیادہ تھے یا اس کے یاد کرنے والے، کیا سب صحابہ قرآن کو لکھتے تھے اور کیا حدیث رسول کی کتابت رسول اور صحابہ کے زمانہ میں نہیں ہوتی تھی۔ اسی کتاب میں ''تدوین حدیث'' کا مطالعہ کریں، ان شاء اللہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

۴ ۔ کیا سنتِ رسول متعارض ہے؟

حدیث رسول میں (بظاہر) تعارض کا ہونا اگر اس کے غیر مقبول ہونے کی دلیل ہے تو کیا اس طرح کا تعارض قرآن میں موجود نہیں، کیا ﴿ وأنزلنا إليک الذکر لتبين للناس ﴾ (النحل : ۴۴) اور ﴿ ونزلنا عليک الکتاب تبيانا لکل شئ ﴾ (النحل : ۷۹) بظاہر متعارض نہیں، جبکہ ایک جگہ وضاحت کرنے کا حکم ہے اور دوسری جگہ ہر چیز کی وضاحت کے موجود ہونے کا ذکر ہے، اگر اس تعارض کا دفاع اپنی سمجھ میں نہ آئے تو کیا قرآن کریم کو غیر مقبول قرار دے دیا جائے گا؟

معلوم ہونا چاہیے کہ صحیح سنت رسول کبھی متعارض نہیں ہوتی، جو تعارض نظر آتا ہے وہ قاری کے علم کی کمی ہے، امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ علیہ نے اسی بنا پر کہا تھا کہ اگر کسی کو کسی حدیث میں تعارض نظر آئے تو میرے سامنے پیش کرے۔ میں اس کا مفہوم بتاتا ہوں۔ (۱۸)

حدیثوں میں جو بظاہر تعارض نظر آتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے بھی محدثین اور علماء اصولیین نے اصول وضابطہ بتا دیا ہے، اس کو سامنے رکھنے سے یہ مسئلہ بآسانی حل ہو جاتا ہے۔

محکم، مختلف الحدیث کے باب میں ان ضابطوں کی تفصیل اصول حدیث کی کتابوں میں موجود ہے، سب سے پہلے توفیق وتطبیق کی صورت دیکھی جاتی ہے، عام وخاص مطلق ومقید کو اس کے صحیح محمل پر رکھا جاتا ہے ورنہ پھر ناسخ ومنسوخ کے ضوابط کے معیار پر ناسخ ومنسوخ سمجھا جاتا ہے

---

(۱۸) الکفایۃ ص ر ۴۳۳

ورنہ پھر ترجیح کی صورت تلاش کی جاتی ہے جس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ تفصیل ''تعارض کا دفاع'' میں ملاحظہ کریں۔ (ص ر ۴۳۱)

۵ - تحریر سنت کا مسئلہ :

منکرین کا کہنا ہے کہ حدیث رسول کی تحریر، رسول کے زمانہ میں نہیں ہوئی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ قوم عرب کو اللہ تعالیٰ نے جو قوت حافظہ دیا تھا وہ کسی دوسری قوم کو نہیں دیا، یہ لوگ کسی بھی چیز کو محفوظ رکھنے کے لیے کچھ تحریر نہیں کرتے تھے، ان کو اس خداداد صلاحیت پر بجا ناز تھا، کسی بھی چیز کو اس مقصد کے لیے تحریر کرنا وہ اپنے لیے باعث عار سمجھتے تھے، کسی چیز کو لکھنے کا مقصد اس کی اہمیت اور دستاویزی ثبوت کے طور پر ہوتا ہے، سبع معلقہ اور باہمی معاہدات کی تحریریں اس کی مثال ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر لوگ نہ قرآن کریم کو لکھتے تھے اور نہ حدیث رسول کو لکھتے تھے جب کہ قرآن کی پہلی ہی وحی میں ﴿علم بالقلم﴾ کہہ کر استعمال قلم کی ہدایت ہر ایک کے لیے دی گئی تھی، آہستہ آہستہ اس پر توجہ دی جانے لگی، ابتدا میں جن لوگوں نے لکھنا شروع کیا لگتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو قرآن کو لکھتے تھے اور اسی ٹکڑے پر حدیث بھی لکھتے تھے جس پر قرآن ہوتا تھا، لہٰذا آپ کو یہ حکم دینا پڑا کہ قرآن کے ساتھ کچھ اور نہ لکھو بلکہ جو کچھ لکھا ہے سب مٹا دو۔ یہ تاکید اور سختی اس وجہ سے تھی کہ کہیں قرآن وسنت خلط ملط نہ ہو جائیں۔ جو ایسا نہیں کرتے تھے اُن پر کوئی پابندی نہیں تھی، عبداللہ بن عمروؓ حدیثیں تحریر کرتے تھے، بعض لوگوں نے اعتراض کیا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں استفسار کیا۔ آپ نے صرف اجازت ہی نہیں دی بلکہ انتہائی بلیغ انداز میں تحریر کا حکم صادر فرمایا۔

آپ کی اجازت سے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلی کتاب ''الصادقہ'' لکھی، پھر حسب منشاء اس کی تحریر و تدوین ہوئی اور بالآخر خیر القرون میں اس کی تکمیل ہوگئی جس کی تفصیل تاریخ تدوین حدیث میں گذر چکی ہے۔ (دیکھیے صفحہ ۱۰۷)

ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بغیر تحریر کیے ہوئے اگر تحریر کا مقصد حاصل ہو جائے تو تحریر کرنا بے مقصد ہوا۔

۶ - حدیث کا خلاف عقل ہونا :

منکرین کا کہنا ہے کہ بہت ساری حدیثیں عقل کے خلاف ہیں ، اس لیے سب حدیثیں نا قابل اعتبار ہیں کیونکہ صحیح سند کے باوجود جب چند نا قابل قبول ہیں تو دوسری روایتوں کا بھی یہ حال ہوسکتا ہے۔

یہ چیز اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ دین کے سمجھنے کے لیے عقل کبھی بھی معیار نہیں رہی ، اگر دین وشریعت عقل کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی تو انبیاء ورسل کو بھیجنے کی ضرورت نہ پڑتی ، دین کے تعلق سے جن لوگوں نے انبیاء ورسل کی بات نہ مانی وہ کافر اور مشرک رہے اور نہ ماننے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ انبیاء کی باتیں ان کی عقل میں نہیں سما رہی تھیں وہ یہی نہیں سمجھ پاتے تھے کہ آخر باپ دادا کا طریقہ کیوں چھوڑا جائے ان کے سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا تھا کہ مرنے کے بعد کیسے زندہ ہوں گے ﴿من یحیی العظام وهی رمیم﴾ (یٰسین : ۷۸) جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا۔ آج بھی مسلمانوں کی گمراہی اور سنت سے بھٹکنے کی ایک اہم وجہ یہی ہے، ایک گروہ کا سارا دارومدار آج عقل پر ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد جب شیطان کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے اس حکم الٰہی کے مقابلہ میں اپنی عقل کو استعمال کیا، لہٰذا ہمیشہ کے لیے مردود ہو گیا، اور ﴿فاخرج منها فإنك رجيم﴾ (الحجر : ۳۴) کا ٹھپہ اس پر لگ گیا یعنی ”یہاں سے بھاگ جا تو مردود ہے۔“

شریعت پہلے کسی چیز کا حکم دیتی ہے جائز اور ناجائز کی تعیین کرتی ہے پھر اس میں عقل استعمال کرنے کی اجازت دیتی ہے کہ جائز والی چیز کیوں بہتر ہے اور ناجائز والی کیوں بری ہے، اللہ رب العزت نے شرک سے منع فرمایا، توحید کا حکم دیا پھر اس پر طرح طرح سے عقلی دلائل اور

عقل استعمال کرنے کی اجازت دی کہ شرک کیوں برا ہے اور توحید کیوں بہتر ہے۔

اب اگر انسان اس نقطہ پر رک جائے کہ شرک سے کیوں منع کیا گیا بغیر اشتراک کے تو کوئی کام نہیں ہوتا تو اتنا بڑا نظام عالم کیسے چلے گا تو گمراہی آنا ہی آنا ہے، اللہ نے نہ انسان کو اتنا علم دیا ہے اور نہ عقل کہ ہر چیز اس کی عقل میں آجائے۔

دنیا کی کتنی چیزیں ہیں جو روزانہ رونما ہوتی ہیں لیکن وہ عقل میں نہیں آتیں، یا جو لوگ اس کا مشاہدہ نہیں کرتے ان کی عقل میں وہ چیز نہیں آتی، ایک کوا کسی انسان کو قبر کھودنے اور دفن کرنے کا طریقہ سکھائے کیا یہ عقل میں آتی ہے؟ لیکن حقیقت وہی ہے آئے یا نہ آئے ﴿فبعث الله غرابا يبحث في الأرض ليريه كيف يواري سوءة أخيه﴾ (المائدة : ۳۱) اللہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیج دیا جو زمین میں کھود کر کچھ تلاش رہا تھا تاکہ اس کو (قاتل قابیل کو) دکھادے کہ اپنے (مقتول بھائی ہابیل) کی لاش کیسے دفن کرے۔ لہٰذا عقل نقل کے تابع ہے نہ کہ نقل عقل کے ماتحت۔

بہت ساری ایسی چیزیں ہیں جہاں تک عقل پرواز کرنا چاہتی ہے لیکن شریعت اس کو آگے پرواز کی اجازت نہیں دیتی، انسان جب سلسلۂ تخلیق کو سوچتے سوچتے یہاں پہنچ جائے کہ پھر اللہ کو کس نے وجود بخشا تو شریعت کہتی ہے کہ بس آگے نہ بڑھنا، اب اللہ سے پناہ مانگو ورنہ خیریت نہیں۔ (۱۹)

ایسے ہی روح کے بارے میں جب دماغوں نے سوال اٹھایا کہ روح کیا ہے تو مختصر جواب یہ دیا گیا کہ یہ اللہ کا امر ہے تمھارے پاس اتنا علم نہیں ہے کہ تم اس کو سمجھ سکو لہٰذا شریعت کے دائرے میں رہ کر ہی عقل استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۷ - کیا سنت وحی نہیں؟

یقیناً سنت وحی الٰہی ہے، اس پر مکمل گفتگو اہمیت سنت میں گزر چکی ہے۔ (۲۰)

---

(۱۹) بخاری (۳۲۷۶)، مسلم (۱۳۴)　　(۲۰) دیکھیے صفحہ ۳۹

(۸) کیا حکم رسول کی اتباع شرک ہے؟

منکرین کا کہنا ہے کہ حکم صرف اللہ کا ہوسکتا ہے اس کے علاوہ کسی کا حکم نہیں چلے گا۔ غیر اللہ کا حکم ماننا خواہ وہ رسول ہی کیوں نہ ہوں کفر وشرک ہے۔ اللہ کا فرمان ہے ﴿ إن الحکم الا للہ ﴾ (الانعام : ۵۷) یقیناً حکم صرف اللہ کا ہوسکتا ہے۔ (۲۱)

یہ وہی کلمہ ہے جس کو دلیل بنا کر خوارج نے دین سے خروج کیا تھا، آج انہوں نے کوئی نئی بات نہیں کی بلکہ خوارج کے طرز عمل کو اپنایا اور جیسے وہ دین سے خارج اور اس کے باغی بنے، اسی طرح سے یہ بھی انہیں کے حکم میں آگئے۔ "یقرؤن القرآن لا یجاوز حناجرھم" (۲۲) یعنی قرآن پڑھتے ہیں لیکن اس کا اثر بھی نہیں ہوتا۔ کس قدر ان پر فٹ (صادق) آتا ہے، قرآن فہمی سے یہ کس قدر دور ہیں۔

اللہ کا ارشاد ہے ﴿ فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی أنفسھم حرجا مماقضیت ویسلموا تسلیما﴾ (النساء : ۵۶) تیرے رب کی قسم یہ مومن نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ آپ کو اپنے اختلافی مسائل میں فیصل نہ تسلیم کرلیں، پھر آپ کے فیصلہ کے قبول کرنے میں کوئی حرج محسوس نہ کریں اور مکمل طریقے سے قبول کریں۔ ذرا قرآن کے اس اسلوب خطاب کو دیکھو کس قدر توجہ اور تاکید کے ساتھ رسول کے حکم کو تسلیم کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کے تسلیم نہ کرنے والے کو ایمان سے خارج قرار دیا ہے، رسول کے حکم سے ہچکچاہٹ بھی اللہ کو گوارہ نہیں بلکہ اس کو صاف دل سے تسلیم کرنے کا حکم دیا ہے۔

مذکورہ آیت میں ''ک'' خطاب اور ''ت'' خطاب کس قدر مسئلہ میں تخصیص کا حق ادا کرتی ہیں اگر اتنی موٹی بات نہ سمجھ میں آئے تو صاحب قرآن یا اہل قرآن ہونے کا دعوی باطل ہے۔

---

(۲۱) السنۃ فی مواجھۃ الاباطیل بحوالہ : فرقہ اہل القرآن : ص/۹۶

(۲۲) بخاری (۳۴۱۴)، مسلم (۱۰۶۴)

دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿ إنما كان قول المؤمنين إذا دعوا إلى الله ورسوله ليحكم بينهم أن يقولوا سمعنا وأطعنا وأولئك هم المفلحون﴾ (النور : ۵۱) مومنین کو جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے تو وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور اطاعت کیا اور یہی کامیاب لوگ ہیں۔

مذکورہ آیت میں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو ایک قرار دیا گیا ہے، جو شخص رسول کے فیصلہ سے سرتابی کرتا ہے وہ اللہ کے فیصلہ سے منہ موڑنے والا قرار دیا گیا۔ سمع وطاعت کرنے والے کو مومن کہا گیا ہے اور انہیں کو کامیاب قرار دیا گیا ہے، مختلف آیات میں رسول کی اتباع کو واجب قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل مقامِ سنت میں گزر چکی ہے۔ (ص؍ ۲۴ تا ۳۵)

اگر رسول اپنی مرضی سے کچھ کہتے اور حکم دیتے تب تو وہ رسول کا حکم ہو سکتا تھا لیکن ایسا ہے نہیں ﴿قل إنما أتبع ما يوحى إلى من ربى﴾ (اعراف : ۲۰۳) کہہ دیجیے میں اس کی اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کی جانب سے میرے پاس وحی کی جاتی ہے۔ ﴿ وما ينطق عن الهوى إن هو إلا وحى يوحى ﴾ (النجم : ۲-۳) وہ اپنی مرضی سے نہیں بولتے یہ تو وحی الٰہی ہے جو ان کی جانب کی گئی ہے۔ لہٰذا رسول کا عمل اور آپ کا قول سب اللہ کے حکم سے ہے۔ ﴿ إن الحكم الا لله ﴾ (یوسف : ۴۰) فیصلہ صرف اللہ کا ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم میں تین جگہ وارد ہے، سورہ انعام اور سورہ یوسف میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی مرضی اس کی قضا وقدر اور فیصلہ کو ماننا ضروری ہے، اللہ کے فیصلے کے ساتھ رسول کے فیصلے کو ماننے میں کوئی تضاد نہیں اس لیے کہ رسول کے فیصلے اللہ کے فیصلہ سے ماخوذ ہیں اور انہیں فیصلوں پر رسول عمل کرتے ہیں۔ (۲۳)

۹ - کیا رسول کی اطاعت صرف رسول کے زمانہ تک تھی؟

منکرین کا کہنا ہے کہ رسول کی اطاعت صرف رسول کے زمانہ تک محدود تھی۔ (۲۴)

---

(۲۳) السنة فى مواجهة الاباطيل ص؍ ۱۰۹

(۲۴) السنة فى مواجهة الاباطيل ص؍ ۱۱۲، بحوالہ : فرقہ اہل القرآن ص؍ ۱۰۷

اہل عرب کا مقولہ ہے "ما أبعد النجعة" یعنی بہت دور کی کوڑی لائے۔ غالبًا وہ ایسے ہی لوگوں کے لیے بنایا گیا تھا، شاید یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کیا تیر مارا ہے، حالاں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، اسی قسم کی باتیں وہ مرتدین کر چکے تھے جن کا مزاج ان کے مزاج سے ملتا جلتا تھا، ان کا یہ کہنا تھا کہ ہم زکاۃ نہیں ادا کریں گے، ادائے زکاۃ کا فریضہ صرف رسول کے زمانہ تک محدود تھا، ان کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تلوار اٹھالی اور فرمایا "واللہ لو منعوني عقالا کانوا یودونها إلى رسول الله ﷺ لقاتلتهم على منعهم" (۲۵) اگر یہ ایک رسی بھی روکیں گے جس کو رسول کے زمانہ میں دیتے تھے تو میں ان سے جہاد کروں گا۔ اور پھر جانثار صحابہ رسول کو لے کر ایسے لوگوں سے قتال کیا اور ان لوگوں پر ارتداد کی مہر لگادی۔

معلوم ہوا کہ ایسا مزاج رکھنے والوں کے خلاف تمام صحابہ کرام متفق تھے اور ان سے قتال پر ان کا اجماع تھا، حالاں کہ وہاں تو معاملہ صرف ایک مسئلہ کا تھا، ان لوگوں نے تو پورے دین ہی کو ختم کر دیا۔

اور رسول کی رسالت اور نبوت کو جو قیامت تک کے لیے تھی اس کو محبوس کر دیا صحابہ کی نگاہ میں تو ان کا حکم ان سے بدتر ہے۔

ذرا ان کو کوئی بتادے کہ یہ قید زمنی آپ کہاں سے لے کر آئے ایک طرف رسول کا فیصلہ آپ کو قابل قبول نہیں اور دوسری طرف اپنا فیصلہ صادر کر کے رسول کی رسالت کو محصور کرنے کی ناپاک کوشش کیوں کر رہے ہو؟ یہ کیا تضاد بیانی ہے!! یہ تو اللہ کے فیصلہ کے بھی برخلاف ہے۔ اللہ کا یہ فیصلہ ہے ﴿یاأیها الناس إني رسول الله إلیکم جمیعا﴾ (الاعراف : ۱۵۸) اے انسانوں یقیناً میں تم تمام کی جانب اللہ کا رسول ہوں۔ یعنی رسالت تمام لوگوں کے لیے ہے اگر اس کو ایک زمانہ کے لیے محدود کر دیا جائے تو پھر تمام لوگوں کے لیے بھی آپ کی رسالت کیسے عام ہو سکتی ہے؟

---

(۲۵) بخاری (۶۸۵۵)، مسلم (۳۲)

دوسری جگہ اللہ کا ارشاد ہے ﴿ وما أرسلناک إلا کافۃ للناس بشیراو نذیرا﴾ (سبا : ۲۸) یعنی تمام لوگوں کے لیے آپ کو مبشر اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، پھر جب اس کو خاص زمانہ سے محدود کر دیا جائے تو تمام لوگوں کے لیے آپ مبشر اور نذیر کیسے ہوں گے، اور اس خصوصیت کی دلیل کہاں ہے؟

قرآن کا خطاب عام ہوتا ہے ہر زمانہ اور ہر امت کے لیے ہے، ورنہ پھر ﴿ یا أیہا الناس إنا خلقنا کم من ذکر وأنثی ﴾ (الحجرات : ۱۳) اے انسانوں میں نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا کا کیا مطلب ہوگا؟ کیا کسی زمانہ میں انسانی تخلیق کا طریقہ دوسرا ہوگا۔ اگر نہیں تو پھر ﴿ یا أیہاالناس إنی رسول اللہ إلیکم جمیعا ﴾ (الاعراف : ۱۵۸) اے انسانوں یقیناً میں تم تمام کی جانب اللہ کا رسول ہوں۔ کیا رسول کے زمانہ تک کے لیے خاص ہے؟

شریعت میں عام وخاص کے اصول وضوابط ہیں اگر کوئی چیز عام سے خاص کی جاتی ہے تو اس کی دلیل موجود ہوتی ہے اور مخصوص چیز کی تعیین ہوتی ہے اور یہاں ایسی کوئی دلیل نہیں۔

جدید اسباب :

انکار سنت یا استخفاف سنت کے لیے ان قدیم اشکالات کے علاوہ کچھ جدید اسباب بھی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں :

۱ - یورپ سے مرعوبیت :

آج کے دور میں مسلمان کچھ اس قدر احساس کمتری کا شکار ہے کہ اگر اس کے سامنے کوئی انگریزی کا دو کلمہ بھی بول دے تو اس کا ناطقہ بند ہونے لگتا ہے اور اس سے ایسا مرعوب ہو جاتا ہے کہ اگر اس کے دین کے بارے میں وہ کچھ کہتا ہے تو فوراً تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جاتا، اس کے سوٹ بوٹ اور ظاہری طمطراق پر اس کے علم کو قیاس کرتا ہے، کاش کہ اس کو معلوم ہوتا کہ علمی اعتبار سے اس ڈھول میں کتنا پول ہے، ان مستشرقین نے کتنی علمی خیانت کی ہے اور کس قدر خرد برد

کرنے کے عادی ہیں اس کو سب نہیں جانتے، کس قدر افسوس کی بات ہے کہ یورپی اسکالرس اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کے ظاہری ٹھاٹ باٹ اور اونچی اونچی ڈگریوں سے ایک جماعت اس طرح مرعوب ہوگئی کہ تحقیق وتدقیق اور علم وفن کو ان کی وراثت تسلیم کرلیا۔ ان کی ہر بات کو حرف آخر تصور کرلیا اور اس قدر احساس کمتری کا شکار ہیں کہ جب تک ان کی گفتار وتحریر میں کوئی انگریزی کلمہ یا کسی مغربی شخص کا اقتباس نہ ہو تب تک وہ اس کو بے وقعت سمجھتے ہیں اپنی باتوں کو ثابت کرنے کے لیے انہیں کے اقوال اور تحریروں پر بھروسہ کرتے ہیں۔

۲ - اسلامی ثقافت سے لاعلمی :

انکار حدیث یا استخفاف کا مزاج رکھنے والے اپنے اصل منبع ومرکز کو بھول چکے ہیں، اس کا پڑھنا اور سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج دین اسلام کو سمجھنے کے لیے انگریزی تحریروں اور کتابوں کا سہارا لیا جاتا ہے جو مستشرقین، اعدائے اسلام کی تحریر کردہ ہیں اور ان کے بنائے ہوئے اسلامی انسائیکلوپیڈیا ان حضرات کے لیے حرف آخر ہیں ﴿ ذلک مبلغهم من العلم ﴾ (النجم : ۳۰) یہی ان کے علم کی انتہا ہے۔

ان کو اپنی روشن تاریخ یاد نہ رہی، علماء اسلام جنہوں نے اس پودے کی آبیاری کی، جن کی معلومات پر ہزار .P.H.D قربان ہوجائیں تو کم ہے، ان کے علوم، ان کے کارنامے ان بیمار ذہنوں کے لیے فرسودہ ہوچکے ہیں، سنت کی حفاظت کے لیے جو ناقابل فراموش خدمات انجام دیں، علم کا جو ذخیرہ چھوڑا، اصول وضوابط کے جو نمونے قائم کیے سب ﴿ فخلف من بعدهم خلف ﴾ (مریم : ۵۹) کے مصداق بن گئے۔ یعنی لائق سلف کے بعد نالائق خلف آگئے انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ علم وفن، تہذیب وثقافت کی جو روشنی یورپ میں آئی کہاں سے آئی اس کو بھی سوچنے کی زحمت نہ کی، کہ ہمارے اسلاف کا علم کہاں گیا جس سے متاثر ہوکر علامہ اقبالؔ نے کہا تھا ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

آج تعلیم کے نام پر اسلامی مدارس ومراکز میں بھی کھلواڑ ہوتا ہے، اصل تعلیم کتاب وسنت کو چھوڑ کر دیگر علوم پر زور دیا جاتا ہے، سنت کی کتابوں کو بطور تبرک اور برائے نام پڑھا جاتا ہے، فن حدیث کسے کہتے ہیں، جرح وتعدیل واسماء رجال کا فہم حدیث میں کیا مقام ہے، حدیث رسول ہم تک کیسے پہنچی تاریخ حدیث کیا ہے، اور تدوین حدیث کیسے ہوئی؟ حدیث کی صحت میں علل کے معرفت کی حیثیت کیا ہے ان سب علوم سے طلبہ عموماً ناواقف ہیں۔ حدیث کا دورہ کر کے سند فضیلت لی اور کام تمام ہوا۔

۳ - خودنمائی وخودسری :

تیسری وجہ خودنمائی وخودسری ہے جو جہالت کی پیداوار ہے، وہ لوگ جو حقیقت میں علم حدیث سے جاہل ہیں لیکن اپنا نام محققین کی لسٹ میں دیکھنا پسند کرتے ہیں کچھ اوٹ پٹانگ باتیں ہانکتے ہیں۔ موجودہ دور میں چونکہ دین اسلام اور سنت رسول غربت کا شکار ہے، اس پر الزام تراشی بہت آسان ہے، اور ایسے لوگوں کی بہت آؤ بھگت ہوتی ہے، لہٰذا سستی شہرت حاصل کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے ابور یہ جیسے لوگ اسی گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جو علم وتحقیق کے جملہ آداب کو بالائے طاق رکھ کر گمراہی کا نشان راہ بنا، خودسری کا یہ عالم ہے کہ وہ لوگ جو صحیح بخاری کے ب سے بھی واقف نہیں وہ اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور ان محترم ائمہ کا نام اس طرح لیتے ہیں جیسے وہ ان کے خادم ہوں، پھر اس پر داد تحسین کے بھی خواہاں ہیں!!

لہٰذا عرض یہ ہے کہ سنت رسول کے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، جس طرح سے مختلف ادوار میں اس کی حفاظت کی گئی ہے اس کی حفاظت میں کوئی کمی باقی نہیں، اسی طرح محافظین سنت کا قافلہ ہمیشہ اس کی حفاظت کرتا رہے گا۔

اس سلسلے میں تفصیل دیکھنے کے لیے شیخ عبدالرحمٰن معلمی، محمد عبدالرزاق حمزہ، ڈاکٹر عجاج خطیب، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی، شیخ ابوشہبہ، شیخ ابوزہو، شیخ صلاح الدین مقبول، شیخ محمد طاہر حکیم کی تالیفات کا مطالعہ کریں۔

اردو زبان میں دفاعِ سنت کی کتابیں :

حجیت حدیث	مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی اور علامہ البانی
خالص اسلام	مولانا محمد داؤد صاحب راز
صیانۃ الحدیث	مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی
تفہیم اسلام	مولانا مسعود احمد صاحب (B.Sc.)
تدوین حدیث	مولانا مناظر احسن گیلانی
سنت کی آئینی حیثیت	مولانا ابوالاعلی مودودی
علوم حدیث مجموعہ مقالات ترتیب	رفیق احمد سلفی
فتنہ انکار حدیث کا نیا روپ اور	
اصلاحی اسلوب تدبر حدیث	غازی عزیر
جرح وتعدیل (اُردو)	ڈاکٹر اقبال احمد بسکوہری

وغیرہ کی کتابیں مفید ہیں۔ان کے علاوہ اور کتابیں بھی اس موضوع پر مل سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر قائم ودائم رکھے، سنت رسول کا پاسبان ومحافظ بنائے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔آمین

☆☆☆

انکار خبر آحاد کا دفاع

خبر واحد کا تعارف :

علمائے امت کے سامنے پہلی صدی کے ربع اول میں عقیدہ سے انحراف کے چیلنج کا سامنا تھا، شیعہ، خوارج اور قدریہ کا ظہور ہو چکا تھا جن کے عقائد کتاب وسنت سے میل نہیں کھاتے تھے، اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے ایک بڑا چیلنج اس جماعت کا تھا جنہوں نے حدیث رسول سے دامن چھڑانے کے لیے خبر واحد کے قبول کرنے سے انکار کیا اور اس کے لیے یہ شوشہ نکالا کہ خبر واحد ظنی ہوتی ہے اس لیے وہ قابل قبول نہیں۔

یہ ایک ایسا فاسد مزاج تھا جس نے تمام حقیقت کو بالائے طاق رکھ کر ذہنی کج روی اور قلبی وسوسہ پر اعتماد کیا، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام وتابعین کے زمانے میں کسی بھی حدیث رسول کو فرد واحد سے سن کر تمام لوگ قبول کرتے تھے اور اس پر بلاتردد عمل کرتے تھے اس کا موضوع خواہ کچھ بھی ہو، عمل وعقیدہ کے تعلق سے کبھی کسی نے متواتر اور آحاد میں کوئی فرق نہ کیا یہ سلسلہ تقریباً ایک صدی تک جاری رہا اس پر امت کا اجماع ہو چکا تھا اہل سنت کے ساتھ ساتھ، شیعہ، خوارج اور قدریہ بھی اس کو تسلیم کرتے تھے لیکن ایک صدی کے بعد جب معتزلہ کا ظہور ہوا تو انہوں نے اس اجماع اور تعامل کی مخالفت کی اور خبر واحد کے قبول نہ کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ (۱)

اس زمانہ اور اس کے بعد جب اس فتنہ میں تیزی آئی اور اس کا بھیانک انجام انکار حدیث کی شکل میں ظاہر ہونے لگا تو اس دور کے محدثین نے اس فتنہ کا مقابلہ کیا، علمی دلائل اور حقائق کی روشنی میں اس کا قلع قمع کر دیا، لیکن فاسد مزاج سے نکلا ہوا یہ مادہ امت کے بعض حلقوں میں سرایت

---

(۱) الاحکام لابن حزم (۱/۱۰۸)

کرتا رہا، لہٰذا ہر دور میں اس فاسد مادے کو انسانی دماغ سے نکالنے کی ضرورت پڑی اس سلسلے میں محدثین عظام نے ہر دور میں اپنی ذمہ داری ادا کی، اور ان بیمار ذہنوں کا علاج کر کے ان کے دماغ سے انکار خبر واحد کی بیماری کو صاف کر دیا۔

دوسری صدی کی ابتدا سے لے کر چوتھی صدی کے خاتمہ تک حسب ضرورت یہ علاج جاری رہا بالآخر زندہ دل والے صحت یاب ہو گئے، حدیث رسول اور خبر واحد کے انکار اور عدم حجیت کے قائلین تقریباً ختم ہو گئے۔

موجودہ دور میں دشمنان دین نے بارہ سو سال پیشتر بیماریوں کے اسباب وعلل کو دریافت کیا اور اس میں توانائی عطا کی، ان جراثیموں کو مدفون کتابوں سے نکال کر حدیث رسول میں شکوک وشبہات پھیلانے کی سعی مذموم کی، اور ان مسلمان مفکرین کو آلہ کار بنایا جو آزاد خیال تھے، فن حدیث میں قلیل بضاعت تھے البتہ دیگر علوم میں قابل قدر تھے، انہوں نے اپنی آزاد خیالی کی بنیاد پر اعتزال اور تجہم کو فوراً قبول کر لیا جس کا نتیجہ استخفاف حدیث اور انکار حدیث کی شکل میں نمودار ہوا اور آج ہر کس وناکس حدیث رسول پر طبع آزمائی کرنے کے لیے آزاد ہے، کیوں کہ وہ حقیقی علم سے عاری ہے، لہٰذا ان خدمات کو واضح کرنے کی ضرورت پڑی کیونکہ محدثین کرام نے حدیث رسول کی حفاظت کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ سب کافی ہیں، انہیں میں سے ایک اہم خدمت علم مصطلح کا ایجاد بھی ہے جس کا تذکرہ گزر چکا ہے اس علم میں خبر واحد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور یہی اس علم کا محور ہے، جس کو آج لوگوں نے پھر نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے، لہٰذا اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اصطلاح میں خبر آحاد اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں متواتر کی شرطیں نہ پائی جائیں۔ (۲)

اور متواتر اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو عدد کثیر نے روایت کیا ہو جن کا عادتاً جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہو۔ (۳)

---

(۲) نزھۃ ص ر ۲۱ (۳) تیسیر مصطلح الحدیث ص ر ۱۸

یہ متواتر کی عام تعریف ہے لیکن اس بات سے بعض چیزیں واضح نہیں ہوتیں اس لیے اس کے لیے کچھ شرائط کا اضافہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں :

۱ - اس کو عدد کثیر نے روایت کیا ہو۔

۲ - یہ کثرت سند کے ہر طبقہ میں ہو۔

۳ - عادتاً جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہو۔

۴ - خبر کی بنیاد حس پر ہو، عقلی بات نہ ہو (یعنی مشاہد، ملموس یا مسموع پر ہو) (۴)

۵ - اس خبر سے علم یقینی حاصل ہو۔ (۵)

بہت سے حضرات نے عدد کثیر کی شرط سے اختلاف کیا ہے بلکہ علم یقینی حاصل ہونے کو کافی قرار دیا ہے۔ اگر چہ وہ تعداد عدد قلیل ہی کیوں نہ ہو، علامہ ابوالفیض کتانی کہتے ہیں کہ متواتر کے بارے میں تحقیقی بات یہ ہے جس کو محدثین کی ایک جماعت نے قبول کیا ہے کہ متواتر میں عدد کی شرط ضروری نہیں بلکہ اصل اعتماد حصول علم قطعی پر ہے، اگر کسی کو جم غفیر نے روایت کیا ہو لیکن اس سے علم قطعی حاصل نہ ہو تو وہ متواتر نہیں، اور اگر کسی کو کچھ لوگوں نے روایت کیا ہو جس سے علم ضروری حاصل ہو تو وہ قطعاً متواتر ہوگا۔ (۶)

یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ نا قابل اعتبار عدد کثیر کی بہ نسبت قابل اطمینان افراد کی خبر سے علم قطعی کا حصول زیادہ اقرب ہے، خاص طور سے متواتر میں افراد کی کیفیت پر نظر نہیں رکھی جاتی ہے، فاسق و فاجر، کافر و مشرک سب اس میں شامل ہو سکتے ہیں، موجودہ زمانے میں عدد کبیر کا جھوٹ پر اتفاق کرنا کوئی مشکل نہیں بلکہ واقع ہے، آج مغرب سے لے کر مشرق تک یہود و نصاریٰ و مشرکین کا اس جھوٹ پر اتفاق ہے کہ مسلمان دہشت گرد قوم ہے حالاں کہ وہ خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے جو جمہور کا قول ہے کہ متواتر کے لیے

---

(۴) تیسیر مصطلح الحدیث ص ر ۱۹ (۵) نزھۃ ص ر ۱۲ (۶) نظم المتناثر ص ر ۱

کوئی متعین عدد نہیں بلکہ مخبرین کی خبر سے علم یقینی حاصل ہو جائے تو وہ خبر متواتر ہوگا۔ (۷)

نیز فرمایا کہ : اس بنا پر صحیحین کی بہت سی روایتیں علماء کے یہاں متواتر ہیں، اگر چہ غیر اہل علم اس کو نہیں جانتے اور اسی بنیاد پر صحیحین کی روایتوں کے بارے میں علماء قطعی طور سے جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو کہا ہے، یہ اسی تواتر اور امت کے قبول کرنے کی وجہ سے ہے۔ (۸)

علامہ ابوالفیض تھوڑا سا فرق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عدد کثیر سے حاصل ہونے والا علم قطعی تمام سامعین کو حاصل ہوتا ہے اور اگر قرائن سے حاصل ہوا ہے (یعنی ثقہ و صادق عدد قلیل سے حاصل ہوا ہے) تو تمام لوگوں کے لیے علم حاصل ہونا ضروری نہیں۔ (۹) یعنی صرف اہل علم کو ہوگا۔

اس قول کی روشنی میں بہت ساری خبر آحاد سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی متواتر کے حکم میں ہوتا ہے، لیکن چونکہ متواتر کا تعلق فن مصطلح سے نہیں کیوں کہ اس میں سند دیکھنے اور بحث و مباحثہ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ ضرورت خبر آحاد میں پڑتی ہے لہٰذا خبر آحاد میں سب سے زیادہ قوی روایت سند مشہور سے وارد روایت مانی جاتی ہے۔

جن حضرات نے متواتر میں عدد کثیر پر اعتماد کیا ہے اور قابل اطمینان ہونے پر توجہ نہیں دی ہے یہ فقہا کے اصول کے مناسب ہے کیوں کہ ان کے یہاں اس عدد میں کافر و مشرک، فاسق و فاجر سب شامل ہو سکتے ہیں، جب کہ محدثین کے یہاں کسی بھی روایت کے قبول کرنے کے لیے راوی کی عدالت و قابلِ اطمینان ہونا شرط ہے، اس لیے فاسق و فاجر، کافر و مشرک کی روایت مقبول نہیں ہوتی خواہ ان کی تعداد کتنی زیادہ کیوں نہ ہو، ہاں اگر صاحب ایمان صادق و امین نے روایت کیا ہے تو عدد قلیل اور عدد کثیر میں فرق معقول بات ہے، لہٰذا اگر کسی روایت کو قابل اطمینان عدد قلیل کے مقابلہ میں قابل اطمینان عدد کثیر نے روایت کیا ہو تو یقیناً وہ زیادہ قوی ہوگی، لہٰذا اس فرق

---

(۷) مجموع الفتاوی (۱۸/۴۰) (۸) مجموع الفتاویٰ (۱۸/۴۱) (۹) نظم المتناثر ص/۱۰

کو ملحوظ رکھنا چاہیے اسی سے مصطلحات کی حد بندی بھی ہو سکتی ہے اور متواتر و آحاد میں تمیز کی جا سکتی ہے، نیز محدثین وفقہاء کے متواتر میں فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ وہ عدد قلیل و کثیر کیا ہے جس کو متواتر اور آحاد میں حد فاصل کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اس سلسلے میں اگرچہ علما کے اقوال میں کافی اختلاف ہے اور کسی کے پاس کوئی واضح دلیل بھی نہیں ہے، پھر بھی دس عدد کو عدد کثیر مان لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے، بہت سے علماء نے اس کو راجح قرار دیا ہے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے بھی عملاً اسی کو قبول کیا ہے اور علامہ اصطخری کے قول کو دلیل کے طور پر ذکر کیا ہے کہ چونکہ جمع کثرت کا اطلاق کم از کم دس پر ہوتا ہے لہٰذا دس عدد کا معیار ہونا زیادہ پسندیدہ ہے۔ (۱۰)

امام سیوطی نے اپنی کتاب الأزهار المتناثرہ میں کم از کم دس صحابہ یا ان سے زائد عدد سے مروی روایتوں کو متواتر میں شمار کیا ہے۔ (۱۱)

ڈاکٹر محمود طحان فرماتے ہیں کہ " المختار أنه عشرة أشخاص" (۱۲) دس افراد کا ہونا ہی پسندیدہ ہے۔

مذکورہ عدد کو تسلیم کر لینے سے متواتر اور آحاد میں حد بندی ہو جاتی ہے اور بطور اصطلاح یہ مناسب بھی ہے ورنہ بغیر کسی تعیین کے اصطلاح کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔

چونکہ جمع قلت کا اطلاق تین سے نو تک ہوتا ہے اور جمع کثرت کا دس سے اوپر، لہٰذا تین سے نو تک تعداد والی روایت کو مشہور اور دس سے اوپر تعداد والی روایت کو متواتر کہنا معقول بات ہے اس لیے کہ متواتر میں عدد کثیر اور مشہور میں عدد قلیل بنیادی امر ہے، بہت سارے علماء نے مشہور کو اسی انداز میں پیش کیا ہے چنانچہ حافظ ابو عبداللہ ابن مندہ اصبہانی فرماتے ہیں: اگر کوئی راوی کسی سے کوئی حدیث روایت کرنے میں منفرد ہو تو اس کو غریب اور اگر دو یا تین سے روایت کیا ہو تو اس کو

---

(۱۰) تدریب الراوی (۲/۱۷۷) (۱۱) مقدمہ نظم المتناثر ص/۱۷ (۱۲) تیسیر مطلح ص/۱۹

عزیز کہتے ہیں " فاذا روی الجماعة عنهم سمی مشهورا" (۱۳) پھر ان سے اگر ایک جماعت نے روایت کیا ہوتو اس کو مشہور کہتے ہیں۔

امام نووی نے اس کو تقریب میں ذکر کیا ہے، امام سیوطی نے اس کی شرح میں یہ فرمایا ہے کہ ابن صلاح نے ابن مندہ کے قول کی بنیاد پر یہ بات کہی ہے لیکن شیخ الاسلام (حافظ ابن حجر) نے تین یا اس سے اوپر کو مشہور کے لیے خاص کر دیا ہے۔ (۱۴) ظاہر بات ہے کہ تین سے اوپر میں کوئی حد ہوگی اور مناسب یہ ہے کہ وہ نو ہو۔

خبر متواتر کی دو قسمیں ہوتی ہیں، متواتر لفظی اور متواتر معنوی، متواتر لفظی ہو یا معنوی اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس کو اصولیین کے یہاں علم ضروری (بدیہی) کہا جاتا ہے۔

علم ضروری (ان کے یہاں) اس علم کو کہا جاتا ہے جس کے ماننے پر انسان مجبور ہو اور اس کا انکار نہ کر سکے۔ (۱۵)

کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اس سے علم نظری کا فائدہ ملتا ہے۔ اور علم نظری اس علم کو کہا جاتا ہے جو نظر و استدلال سے حاصل ہو (مصدر سابق) جب کہ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس سے کوئی علم نہیں حاصل ہوتا۔ (۱۶)

محدثین کے یہاں خبر متواتر پر گفتگو بہت مختصر ہوتی ہے، محض خبر آحاد کی وضاحت کے لیے اس کا ذکر کیا جاتا ہے، کیوں کہ اس کا تعلق علم اسناد کے مباحث سے نہیں ہے جبکہ علم مصطلح کی گفتگو کا اصل محور سند ہے۔ علم اسناد کے ذریعہ سے حدیث کی صحت اور ضعف کا پتہ لگایا جاتا ہے، جبکہ متواتر خود بخود قابل قبول ہوتا ہے سند کے دیکھنے یا اس کی صحت وضعف پر غور وفکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ (۱۷)

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ : علماء اہل حدیث اس کا (متواتر کا) ذکر نہیں کرتے،

---

(۱۳) مقدمہ ابن الصلاح ص ر ۲۳۲ (۱۴) تدریب الراوی (۱۸۱/۱)

(۱۵) نزھۃ ص ر ۱۴ (۱۶) خبر الواحد وحجیۃ ص ر ۱۱۱ (۱۷) نزھۃ ص ر ۱۶

خطیب بغدادی نے دوسروں کی اتباع میں اس کا ذکر کیا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ان کے فن سے متعلق نہیں اور نہ یہ ان کی روایتوں میں پایا جاتا ہے۔ (۱۸)

متواتر احادیث کی تعداد مذکورہ شرط پر انتہائی مختصر ہے، یہاں تک کہ علامہ ابن صلاح کو یہ کہنا پڑا کہ تفسیر سابق کے حساب سے متواتر نادر الوجود ہے زیادہ سے زیادہ حدیث " من کذب علی متعمدا" متواتر ہو سکتی ہے۔ (۱۹)

حالاں کہ حافظ ابن حجر نے اس دعوے کی تردید کی ہے پھر بھی خبر متواتر کی تعداد بہت زیادہ نہیں، نظم المتناثر جو اس سلسلے کی متاخر کتاب ہے اس میں کل تین سو دس روایتیں مذکور ہیں، حالاں کہ اہل علم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ مقدار تقریباً ایک ہزار تک ہو سکتی ہے، اگر بالفرض اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقریباً ایک ہزار کے علاوہ باقی احادیث رسول جن کی تعداد کئی ہزار ہے سب خبر آحاد ہیں اور متواتر خبر آحاد کے مقابلہ میں انتہائی کم ہے، تو خبر آحاد کے انکار کا مطلب یہ ہوا کہ تقریباً تمام احادیث کا انکار۔

خبر آحاد : ان حدیثوں کو کہتے ہیں جن میں متواتر کی شرطیں نہ پائی جائیں۔ (۲۰)

خبر آحاد کی سب سے پہلی قسم خبر مشہور ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "والثانی وهو أول أقسام الآحاد ماله طرق محصورة بأكثر من اثنين وهو المشهور عند المحدثين سمي بذلك لو ضوحه" (۲۱)

حدیث کی دوسری قسم جو خبر آحاد کی پہلی قسم ہوتی ہے وہ حدیث ہے جس کی سند دو سے زیادہ ہو لیکن متعین ہو، محدثین کے یہاں اسی کو مشہور کہتے ہیں، اس کے واضح ہونے کی وجہ سے اس کو مشہور کہا جاتا ہے۔

محدثین کے یہاں خبر آحاد کی تین قسمیں ہوتی ہیں : جن کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی جاتی ہے۔

---

(۱۸) مقدمہ ابن الصلاح ص ر ۲۴۱ (۱۹) مقدمہ ابن الصلاح ص ر ۲۴۲، نزہۃ ص ر ۱۶

(۲۰) نزہۃ ص ر ۲۱ (۲۱) نزہۃ ص ر ۱۷

مشہور : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے روایت کرنے والوں کی تعداد ہر طبقہ میں کم از کم تین ہو، اور وہ حد تواتر تک نہ پہنچے۔ (۲۲)

عزیز : اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے روایت کرنے والوں کی تعداد ہر طبقہ میں کم از کم دو ہو۔

غریب : اس حدیث کو کہتے ہیں ہیں جس کے کسی طبقہ میں ایک ہی راوی ہو۔ (۲۳)

آحاد : واحد کی جمع یہ تینوں قسمیں جن کو محدثین نے اپنے گفتگو کا محور قرار دیا ہے، انفرادی طور سے خبر واحد کہی جاتی ہیں، یعنی محدثین کی اصطلاح میں مشہور خبر واحد ہے اسی طرح سے عزیز بھی خبر واحد ہی ہے اور غریب بھی خبر واحد ہے۔

ان خبر آحاد کو جن لوگوں نے روایت کیا ہے ہر طبقہ اور ہر دور کے لوگوں کے حالات ان کی ثقاہت و ضبط معلوم کر کے شذوذ و علت دیکھ کر محدثین نے مقبول اور مردود کو الگ الگ کر دیا ہے، اس لیے ان خبر آحاد کی انہوں نے دو قسمیں کی ہیں مقبول اور مردود۔

مقبول : اس خبر کو کہتے ہیں جس میں خبر دینے والے کی سچائی راجح ہو۔

مردود : اس خبر کو کہتے ہیں جس میں خبر دینے والے کی سچائی مرجوح ہو۔

پھر اس مقبول کی ان لوگوں نے دو قسمیں کیا ہے، صحیح اور حسن۔ اور پھر ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہوتی ہیں لذاتہ اور لغیرہ۔

صحیح لذاتہ : اس متصل السند روایت کو کہتے ہیں جس کو عادل، کامل ضبط راوی نے اپنے ہم مثل سے روایت کیا ہو اور وہ حدیث معلل اور شاذ نہ ہو۔

صحیح لغیرہ : اس متصل السند روایت کو کہتے ہیں جس کو عادل خفیف الضبط راوی نے اپنے ہم مثل سے روایت کیا ہو اور وہ حدیث معلل اور شاذ نہ ہو، اور مختلف طرق سے وارد ہو۔

یعنی اگر کسی طبقہ میں کوئی راوی اگرچہ عادل ہو لیکن اعلیٰ معیار کا نہ ہو جس کی وجہ سے ضبط

---

(۲۲) تیسیر مصطلح الحدیث ص ر ۲۲ (۲۳) نزھۃ ص ر ۱۸، ۲۱

میں خلل ہو، لیکن مختلف طرق سے آنے کی وجہ سے وہ خلل رفع ہو جاتا ہے، اور اس کی صحت پر یقین ہو جاتا ہے لہٰذا یہ بھی صحیح کا درجہ پانے کی مستحق ہے۔

حسن لذاتہ : اس متصل السند حدیث کو کہتے ہیں جس کو عادل خفیف ضبط راوی نے روایت کیا ہو اور وہ حدیث معلل اور شاذ نہ ہو۔

یہاں چوں کہ ضبط میں معمولی خلل واقع ہے جس کو دوسری سند سے مدد بھی نہیں ملی لہٰذا اگر چہ راوی امین و صادق ہے اور ضابط بھی ہے پھر بھی احتیاطاً معمولی خلل کی وجہ سے اس کے درجہ کو کچھ کم کر دیا گیا اور اس کی روایت کو صحیح کے بجائے حسن کہا گیا تا کہ یہ فرق معلوم رہے۔

حسن لغیرہ : اس خفیف الضعف حدیث کو کہتے ہیں جو مختلف طرق سے آئے چوں کہ اسباب ضعف راوی میں بہت معمولی ہوتا ہے، لہٰذا جب دوسری سند سے خواہ وہ اسی کے مثل ہی کیوں نہ ہو اس کو تقویت مل رہی ہے تو وہ بھی قبول کے درجہ میں آ جاتی ہے لہٰذا اس طرح کی روایتوں کو حسن کا درجہ دیا گیا ہے البتہ حسن لغیرہ کہہ کر محدثین نے امانت و دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔

یہی وہ چار قسمیں ہیں جو محدثین کے یہاں قابل قبول ہیں۔ درجات میں فرق کے ساتھ۔ اور خبر واحد کی بات ہوتی ہے تو ان مقبول کی قسموں میں سے کوئی ایک قسم مراد ہوتی ہے۔

یہی وہ (مقبول) خبر واحد ہے جس کے ماننے اور قبول کرنے پر جہمیہ کے وجود سے قبل امت کا اجماع تھا۔ جمہور مؤمنین کے یہاں اس کا تسلیم کرنا واجب اور ضروری سمجھا جاتا تھا کیوں کہ دور رسول، دور صحابہ و دور تابعین میں امت کا اسی پر عمل تھا۔ لہٰذا ہر خبر مقبول میں خواہ وہ خبر آحاد کی کسی بھی قسم سے ہو۔ جو مفہوم پایا جاتا ہے چاہے وہ استحباب کا ہو یا وجوب کا امر کا ہو یا نہی کا اس کو تسلیم کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، جس کے دلائل ''سنت کی حیثیت'' میں تفصیل سے گزر چکے ہیں، حافظ ابن حجر نے اس کی تعریف کچھ اس طرح سے کی ہے جس میں اس کا حکم واضح کر دیا ہے وہ فرماتے ہیں : "المقبول: وهو يجب العمل به عندالجمهور" (۲۴) البتہ

---

(۲۴) نزھۃ ص/۲۱-۲۲

احناف نے خبر متواتر اور آحاد کے درمیان مشہور کو ایک خاص قسم قرار دیا ہے اور اس کی تعریف اس طرح کی ہے :

وہ خبر جو اصلاً خبر آحاد (غریب) ہو پھر وہ قرن ثانی وثالث میں متواتر ہو گئی ہو۔

یہ درجہ میں متواتر سے کم ہے لیکن احتجاج میں متواتر کے مثل ہے، اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم طمانینہ (علم اطمینان) ہے اور متواتر سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم یقین ہے۔ جو اس کا انکار کرے گا وہ جاحد ہوگا، اور جو خبر متواتر کا انکار کرے گا وہ کافر ہوگا، اس مشہور کی مثال انہوں نے حدیث مسح علی الخفین اور حدیث رجم زانی سے دی ہے۔ (۲۵)

مشہور کی یہ تعریف محدثین کی تعریف سے میل نہیں کھاتی، کیوں کہ یہ تعریف ایک طرف متواتر کی بلندیوں کو چھورہی ہے تو دوسری طرف خبر غریب پر ٹکی ہوئی ہے، اس طرح یہ اقل عدد اور اکثر عدد کا متضاد مجموعہ ہے۔

محدثین کے یہاں حدیث پر حکم لگانے میں کمزور ترین محل کا اعتبار کیا جاتا ہے، لہٰذا جو روایت اصلاً خبر آحاد ہے تو وہ خبر متواتر نہیں ہوسکتی، یہ " کورک علی ضلع" کی مصداق ہے یعنی بھاری چیز کو کمزور پر رکھنا۔ اس اصول کے اعتبار سے اگر کوئی روایت ابتداء میں متواتر ہو اور بعد میں " سیعود غریباً " کے تحت خبر آحاد بن جائے تو اس کو بھی مشہور کہنا چاہیے، یا کوئی روایت پہلے خبر آحاد ہو اور بعد میں مشہور ہو جائے تو اس کو کیا کہیں گے؟ اس کے لیے جدید اصطلاح کی ضرورت ہوگی۔

نیز اس بنیاد پر کتب احادیث جن کے مؤلفین نے خبر آحاد سے حدیثیں روایت کیں پھر اپنے شاگردوں کو پڑھایا جن کی تعداد ہزاروں میں بھی ہوسکتی ہے، پھر یہ سلسلہ جاری ہے جو حد تواتر تک پہنچا ہوا ہے، تو یہ سب کی سب مشہور ہوں گی، اس بنیاد پر جتنی حدیثیں خبر واحد تھیں کیا یہ سب مشہور نہیں ہوں گی اور کیا ان سے علم طمانینہ حاصل نہ ہوگا اور کیا یہ متواتر کے مثل نہ ہوں گی؟؟ مختلف سوالات کھڑے ہوتے ہیں۔

---

(۲۵) خبر الواحد وحجیۃ ص ر ۱۱۴، ۱۴۹

پھران حدیثوں سے استدلال میں عقیدہ اور احکام کا فرق کیوں ہے؟ اور پھر ایسی صورت میں خبر آحاد کا وجود ہی کہاں رہ گیا؟

لہٰذا اس سلسلہ میں استدلال کے وقت ہر ایک کی اصطلاح کو پہلے سمجھنا چاہیے تاکہ نتیجہ درست رہے ورنہ خلط مبحث سے کوئی فائدہ نہیں، یہاں جب بھی بات خبر آحاد کی ہوگی تو اس میں خبر مشہور شامل رہے گی جو محدثین کے یہاں اسناد کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔

خبر واحد کا افادہ :

خبر واحد سے کون سا علم حاصل ہوتا ہے علم یقینی یا علم ظنی اس سلسلے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں، لیکن اس کے جاننے سے پہلے یہاں ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ محدثین جہاں خبر واحد استعمال کرتے ہیں وہاں اس کی تینوں قسموں میں کوئی ایک قسم مراد ہوتی ہے، لہٰذا خبر واحد مشہور بھی ہوسکتی ہے عزیز بھی ہوسکتی ہے اور غریب بھی ہوسکتی ہے۔

اہل علم نے جہاں خبر واحد کے افادہ پر گفتگو کی ہے وہاں انہوں نے بر سبیل نزول خبر غریب پر گفتگو کی ہے، اگر خبر غریب جو خبر آحاد کی کمتر درجہ کی روایت ہوتی ہے اس سے علم یقینی حاصل ہوسکتا ہے تو خبر عزیز اور مشہور سے بدرجہ اولیٰ یہ علم حاصل ہوگا۔ بہر حال اہل علم کے اہم اقوال کا خلاصہ یہ ہے :

۱ – پہلا قول یہ ہے کہ فرد واحد کی خبر اگر صحیح ہے تو وہ علم قطعی کا فائدہ دیتی ہے۔

یہی امام احمد اور آپ کے اکثر اصحاب، جمہور اہل حدیث اور اہل ظاہر کا قول ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ "إن خبر الواحد العدل یفید القطع إذا صح" (۲۶) کہ فرد واحد کی خبر اگر وہ عادل ہے اور وہ خبر صحیح ہے تو قطعیت کا فائدہ دیتی ہے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ امام مالک، شافعی، اصحاب امام ابوحنیفہ، داؤد بن علی اور ان کے اصحاب کے یہاں خبر واحد علم کا فائدہ دیتی ہے۔ (۲۷)

---

(۲۶) مختصر الصواعق المرسلۃ ۲ / ۳۶۲، خبر الواحد وحجیۃ ص ر ۱۴۷

(۲۷) مختصر الصواعق المرسلۃ ۲ / ۳۶۲، خبر الواحد وحجیۃ ص ر ۱۴۷

ابن خویز منداد نے اپنی کتاب ''اصول فقہ'' میں تحریر کیا ہے کہ وہ خبر جس کو ایک یا دو آدمیوں نے روایت کیا ہے اس سے بھی علم ضروری حاصل ہوتا ہے اس پر امام مالک کا نص موجود ہے۔ (۲۸)

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ : عام فقہاء، اور اکثر متکلمین کا خیال ہے کہ یہ علم کا فائدہ دیتی ہے، البتہ بعض متکلمین کا یہ کہنا ہے کہ علم کا فائدہ نہیں دیتی ہے۔

ان میں سے بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ : اس سے علم کا فائدہ ہر ایک کو حاصل ہوتا ہے، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک کو نہیں بلکہ ماہرین فن کو حاصل ہوتا ہے۔

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''قد يضطر خبر الواحد إلى العلم بصحته إلا أن اضطراره ليس بمطرد ولا في كل وقت ولكن على قدر ما يتهيأ ......'' کبھی کبھی خبر واحد صحت کی وجہ سے علم کے فائدہ پر مجبور ہو جاتی ہے مگر اس کا مجبور ہونا عام نہیں ہوتا اور نہ ہر وقت ہوتا ہے، بلکہ جس قدر انسان مستعد اور تیار ہوتا ہے اسی قدر ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ جس حدیث کو فرد واحد نے فرد واحد سے روایت کیا ہے وہ متصل ہو اور اس کے راوی رسول اللہ ﷺ تک سب عادل ہوں تو اس پر عمل کرنا واجب ہے اور اس کی صحت پر علم [یقینی] بھی واجب ہوتا ہے۔ (۲۹)

علامہ ابوالفیض کہتے ہیں : صحیح یہ ہے کہ اگر عدد کثیر سے علم حاصل ہوگا تو تمام سامعین کو ہوگا اور اگر قرائن سے ہوگا تو تمام کے لیے حاصل ہونا ضروری نہیں۔ (۳۰)

۲ - دوسرا قول یہ ہے کہ خبر واحد ظن کا فائدہ دیتی ہے۔

یہ قول اکثر اصولیین کا ہے، ان کا یہ کہنا ہے کہ ہر سنی ہوئی خبر کی تصدیق نہیں کی جا سکتی لہٰذا اخبار سب ظنی ہوں گے۔ اس لیے کہ راوی بھی ایک مخبر ہے جو کذب اور غلط سے معصوم نہیں، نیز اگر اس سے علم کا حصول ہوتا ہے تو معلومین میں تناقض کا امکان، قرآن و اخبار متواترہ سے نسخ کا جواز، ایک شاہد سے فیصلہ کا وجوب لازم آتا ہے۔ (۳۱)

---

(۲۸) خبر الواحد وحجیۃ ص ر ۱۴۸ (۲۹) خبر الواحد وحجیۃ ص ر ۱۴۷ (۳۰) نظم المتناثر ص ر ۱۰

(۳۱) خبر الواحد وحجیۃ ص ر ۱۱۹

۳ - تیسرا قول یہ ہے کہ یہ اس وقت علم کا فائدہ دیتی ہے جب اس کے ساتھ کوئی قرینہ ہو، مگر انہوں نے علم سے مراد علم نظری لیا ہے۔ یہی قول امام آمدی، ابن حاجب، فخر الدین رازی اور بعض محدثین کا ہے۔ (۳۲)

چنانچہ امام آمدی فرماتے ہیں : "والمختار حصول العلم بخبره إذا احتفت بالقرائن " (۳۳) پسندیدہ بات یہ ہے کہ خبر واحد سے علم حاصل ہوتا ہے اگر اس کے ساتھ کوئی قرینہ ہو۔

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ خبر واحد علم ظن کا فائدہ دیتی ہے اس میں اس صورت میں اختلاف ہے جب کوئی قرینہ نہ ہو لیکن اگر کوئی قرینہ موجود ہو جو اس کو مزید تقویت دیتا ہے یا مشہور و مستفیض ہو تو پھر کوئی اختلاف نہیں۔ (۳۴)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی خبر آحاد قول مختار کے مطابق - اگر قرینہ سے مرتبط ہو تو علم نظری کا فائدہ دیتی ہے، جنہوں نے اس کے خلاف بات کہی ہے وہ لفظی اختلاف ہے۔

یعنی جنہوں نے یہ بات کہی ہے کہ یہ علم کا فائدہ دیتی ہے تو انہوں نے علم کو علم نظری سے مقید کر دیا ہے، اور جنہوں نے علم کا فائدہ دینے سے انکار کیا ہے انہوں نے علم ضروری مراد لیا ہے جو متواتر کا افادہ ہے، لہٰذا دونوں قول میں کوئی اختلاف نہیں۔ (۳۵)

قرائن خبر واحد :

ان قرائن کا ذکر حافظ ابن حجر نے کیا ہے وہ یہ ہیں۔ (۳۶)

۱ - امت کا قبول کرنا :

یعنی اس خبر واحد کو تلقی بالقبول حاصل ہو، جس طرح صحیحین کی روایتیں ہیں جس کو بحیثیت صحت امت نے قبول کر لیا ہے، کیوں کہ یہ دونوں حضرات فن علم حدیث میں عظیم شان والے ہیں۔

---

(۳۲) الاحکام للآمدی (۲/۵۰) (۳۳) الاحکام للآمدی (۲/۳۲) (۳۴) ارشاد الفحول ص ر ۴۹
(۳۵) نزھۃ ص ر ۲۴ (۳۶) شرح نخبۃ ۲۴-۲۷

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ : خبر واحد جس کو تلقی بالقبول (مقبولیت) حاصل ہو وہ جمہور علماء کے یہاں حصول علم کو واجب قرار دیتا ہے، یہی قول امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور امام احمد کے اصحاب کا ہے۔ اسفرائینی اور ابن فورک کا بھی یہی قول ہے۔ اگر چہ سلف کے یہاں اس میں کوئی اختلاف تھا ہی نہیں، خلف میں اصحاب ائمہ اربعہ کے بڑے بڑے فقہاء اور علماء کا یہی قول ہے۔ یہ فی نفسہ ظن کا طریق ہے لیکن اصحاب حدیث کی قبولیت پر اجماع کی وجہ سے قطعی ہو جاتا ہے۔ (۳۷)

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: جس حدیث کو امت نے قبول کیا ہے اور اس کی تصدیق کی ہے اس سے علم یقینی کا فائدہ جمہور امت اولین و آخرین کے یہاں حاصل ہوتا ہے۔ (۳۸)

ویسے حقیقت یہ ہے کہ جتنی بھی صحیح حدیثیں ہیں محدثین اور امت مسلمہ کے یہاں ان کو قبول حاصل ہے، اگر قبول حاصل نہ ہوتا تو وہ اس پر عمل نہیں کرتے۔ جب کہ مقبول کی تعریف جو حافظ ابن حجر نے کی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ وجوب العمل ہوتا ہے، لہذا جتنی روایتیں صحیح ہیں سب کو امت کے یہاں قبول حاصل ہے، بنابریں وہ علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔

۲ - مشہور و مختلف طرق سے مروی ہونا :

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ " ومنها : المشهور إذا كانت له طرق مباينة سالمة من ضعف الرواة والعلل إلخ" (۳۹) انہیں قرائن میں سے یہ ہے کہ حدیث مشہور ہو اور اس کے مختلف طرق ہوں جو راویوں کے ضعف اور علل سے محفوظ ہوں، شیخ ابومنصور بغدادی اور ابن فورک نے اس سے علم نظری کے فائدہ دینے کی صراحت کی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ : وہ حدیث جو مختلف جہات سے مروی ہو تو بعض

---

(۳۷) مجموع الفتاوی (۴۱/۱۸) (۳۸) مختصر الصواعق (۲/۳۷۳)

(۳۹) نزھۃ النظر ص/۲۶

بعض کی تصدیق کرتی ہے، اور جو اس جہات کو جانتے ہیں تو ان کے لیے یہ علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ (۴۰)

۳ - ائمہ حفاظ کے واسطہ سے منقول ہونا :

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ : " ومنها: المسلسل بالأئمة الحفاظ المتقنين حيث لا يكون غريبا......إلخ" انہیں قرائن میں سے یہ ہے کہ حدیث بڑے بڑے ائمہ کرام کے واسطے سے منقول ہو اور وہ غریب نہ ہو، مثلاً وہ حدیث جس کو امام احمد نے امام شافعی سے روایت کیا ہو اور انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہو اور دوسرا راوی بھی اس کے روایت کرنے میں شریک ہو تو سامع کو اس سے علم کا فائدہ ہوتا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ ان حضرات کی جلالت شان، اور وہ صفات جو قبول خبر کو واجب کرتے ہیں ان میں اس اعلیٰ معیار کے ہوتے جو عدد کثیر کے قائم مقام ہوتے ہیں، کوئی بھی شخص جس کو علم سے واسطہ ہے وہ اگر کوئی خبر امام مالک سے بذات خود سنتا ہے تو اس کی صداقت کا اس کو یقین ہو جاتا ہے، پھر کوئی دوسرا شخص اگر اس میں شامل ہو جاتا ہے تو قوت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور بھول چوک کا اندیشہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

نیز فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی ایک ہی حدیث میں تینوں قرائن جمع ہو جاتے ہیں تو اس وقت اس کا قطعی ہونا بعید نہیں۔ (۴۱)

۴ - صحت کے اوصاف کا موجود ہونا :

کسی بھی حدیث کو روایت کرنے والے جب ثقہ اور عادل ہوتے ہیں، اور وہ علل وشذوذ سے محفوظ ہوتی ہے، تو یہ اس امر پر قرینہ ہے کہ وہ روایت قابل قبول اور قابل عمل ہے، اور اس سے علم کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ " إنما وجب العمل بالمقبول منها (من الآحاد) لأنها إما أن يوجد فيها أصل صفة القبول وهو ثبوت صدق

---

(۴۰) مجموع الفتاویٰ (۲۰/۲۵۷-۲۵۸) (۴۱) نزھۃ بالاختصار ص ر ۲۷

السنـاقـل......إلـخ" (۴۲) یعنی جومقبول خبرآحاد ہیں ان پرعمل واجب ہے کیوں کہ جب ان روایات میں قبولیت کی صفت پائی جاتی ہے تو یہ ناقل کی صداقت پرثبوت ہے اور اس ثبوت کے باعث خبر کی صداقت پرظن غالب ہوتا ہے لہٰذا وہ قابل قبول ہوتی ہے۔ اور جب مردود کی صفت پائی جاتی ہے تو یہ خبر کے کذب ہونے پرظن غالب ہوتا ہے، اس لیے کہ ناقل کاذب ہوتا ہے لہٰذا یہ مردود ہوجاتی ہے اور اگر دونوں میں سے کسی پر قرینہ دلالت کرے تو اس کے ساتھ اسے ملحق کردیا جاتا ہے۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ " إن خبر الواحد العدل عن مثله مبلغا عن مثله إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم مقطوع به موجب للعلم والعمل معا" (۴۳) فرد واحد کی خبر اگر وہ عادل ہے اور اسی کی طرح دوسرے راوی بھی عادل ہوں اسی سلسلہ سے وہ رسول تک پہنچے تو قطعی درست ہوتی ہے، علم وعمل کے وجوب کا فائدہ دیتی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: مجرد خبر واحد جس کے صدق پر کوئی دلیل موجود نہ ہو علم یقینی کے لیے مفید نہیں ہوتی، لیکن ان اخبار کے متعلق صدق کے قرائن موجود ہوں مثلاً اس کی سند صحیح ہو مصنف نے صحت کا التزام کیا ہو، امت نے اس التزام کو درست قرار دیا ہو، اور راویوں کی ثقاہت معلوم ہو تو ان حالات میں ایسی اخبار آحاد سے علم یقینی حاصل ہوگا، اور اس پرعمل بھی واجب ہوگا۔ (۴۴)

ان اقوال سے ایک چیز واضح طور سے سمجھ میں آتی ہے کہ جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ خبر واحد اگر صحیح ہے تو وہ علم قطعی کا فائدہ دیتی ہے، اور جنھوں نے یہ کہا ہے کہ قرائن کے ساتھ فائدہ دیتی ہے۔ دونوں تقریباً ایک ہی قول ہے صرف تعبیر میں فرق ہے، کیوں کہ ان قرائن میں صحت کے اوصاف کو شمار کیا گیا ہے، اور جب صحت کے اوصاف پائے جائیں گے تب ہی وہ روایت صحیح ہوگی۔

---

(۴۲) نزھۃ ص/۴۳ (۴۳) الإحکام (۱/۱۱۸)

(۴۴) فتنۂ انکار حدیث کا نیا روپ (۳/۲۰۰) بحوالہ مجموع الفتاوی (۱۸/۴۸)

کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ خبر واحد علم کا فائدہ نہیں دیتی۔ یہ قول جمہور متکلمین، متاخرین فقہاء اور کچھ علماء اہل حدیث کا ہے۔ (۴۵)

پھر ان لوگوں میں سے کچھ کا یہ کہنا ہے کہ علم کا فائدہ تو نہیں دیتی لیکن عمل کا فائدہ دیتی ہے۔ حافظ ابن حجر اور خطیب بغدادی جیسے ماہرین فن بھی اس سے متاثر ہیں، حالاں کہ دونوں کے یہاں خبر واحد موجب عمل ہے، بلکہ حافظ ابن حجر نے اس پر صحابہ وتابعین کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ (۴۶)

خطیب بغدادی نے الکفایۃ ص/۲۵ میں ایک باب قائم کیا ہے کہ "ذكر شبهة من زعم أن خبر الواحد يوجب العلم و ابطالها" ان لوگوں کے شبہات کا ذکر جن کا زعم ہے کہ خبر واحد علم [ظاہر] کو واجب کرتی ہے [نہ کہ علم باطن کو] اور اس کا ابطال۔ آگے فرماتے ہیں کہ "قد ثبت إيجابه تعالى علينا العمل بخبر الواحد" اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر خبر واحد سے عمل کو واجب قرار دیا ہے، پھر اس کے لیے ایک باب قائم کیا ہے: "ذكر بعض الدلائل على صحة العمل بخبر الواحد ووجوبه" (۴۷)

اگر یہ علم کا فائدہ نہیں دیتی تو پھر اس پر عمل کیسے جائز ہوگا جب کہ اللہ کا فرمان ہے ﴿ إن يتبعون إلا الظن ﴾ (نجم : ۲۸) "لہٰذا عمل کا جواز افادہ علم کو لازم ہے۔"

یہ عجیب تضاد ہے کہ علم نہ حاصل ہو اور عمل واجب ہو، حالانکہ عمل سے پہلے حصول علم ضروری ہے امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "واعلم أنه لا إله إلا الله" میں اللہ تعالیٰ نے کہنے اور عمل کرنے سے پہلے حصول علم کو مقدم کیا ہے۔ (۴۸) یعنی جب پہلے علم حاصل ہوگا تب ہی عمل ممکن ہوگا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ خبر واحد موجب عمل ہے لیکن موجب علم نہیں تو آپ نے اس کو برا گردانا اور کہا کہ پتہ نہیں یہ کیا ہے۔ (۴۹)

---

(۴۵) مختصر الصواعق (۲/۳۷۷) (۴۶) فتح الباری (۳/۲۳۴)
(۴۷) الکفایۃ ص/۲۶ (۴۸) بخاری (۱/۱۵۹) (۴۹) مختصر الصواعق (۲/۳۶۳)

امام سرخسی فرماتے ہیں کہ " إن العمل یجب بخبر الواحد و لا یجب العمل إلا بعلم " (۵۰) خبر واحد سے عمل واجب ہو جاتا ہے اور عمل کا وجوب بغیر علم کے نہیں ہوتا۔

نیز بعض خبر آحاد ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی عملی حکم نہیں ہوتا بلکہ اس پر صرف یقین اور اعتقاد رکھنا ضروری ہوتا ہے، جیسے عذاب قبر، سوال منکر ونکیر، رویت باری تعالیٰ وغیرہ۔ اب ایسی صورت میں اس خبر واحد کا جو موجب عمل ہے لیکن موجب علم نہیں تو پھر اس کا کیا فائدہ۔ (۵۱)

ان اقوال کے علاوہ اس سلسلہ میں کچھ مزید اقوال ہیں، ان اقوال کا شمار شیخ ابوالقاسم عبدالعظیم نے اپنے مقالہ میں کیا ہے جو مجموعہ مقالات مسمی '' علوم حدیث مطالعہ وتعارف'' کے ص ر ۱۵ میں مطبوع ہے، اس میں انہوں نے جملہ اٹھائیس اقوال ذکر کیا ہے، حالاں کہ بعض اقوال میں تداخل ہے لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خبر واحد کے افادہ کے تعلق سے کس قدر اختلاف ہے اور کتنے وجہت نظر پائے جاتے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ وہ تمام اقوال جن پر کوئی دلیل موجود نہیں وہ مجرد اقوال ہیں ان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس طرح کے اقوال مسائل کو الجھانے کا کام کرتے ہیں، سلجھانے کا نہیں۔

چوں کہ اس قول پر واضح دلائل موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ خبر واحد علم [علم یقین] کا فائدہ دیتی ہے، لہٰذا یہ ہر جگہ خواہ عقیدہ ہو یا احکام، امر ہو یا نہی، خبر ہو یا انشاء ہر جگہ قابل حجت ہے۔ اس قول کے کچھ دلائل ضمناً اقوال کے بیان میں گزر چکے ہیں چند دلائل اور ذکر کیے جارہے ہیں :

ان دلائل کا ذکر علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے، اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے کیا ہے، آپ نے اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے کہ "ومما یبین أن خبر الواحد العدل یفید العلم أدلة کثیرة" (۵۲) خبر واحد کے مفید علم ہونے پر بہت سارے دلائل ہیں پھر بیس دلائل کا ذکر انہوں نے کیا ہے۔

---

(۵۰) کشف الاسرار (۲/۳۷۱) (۵۱) خبر الواحد وحجیتہ ص ر ۱۵۳

(۵۲) الاحکام فی اصول الأحکام (۱/۱۰۴)، مختصر الصواعق المرسلة (۲/۳۹۴-۴۰۲)

خبر واحد کے افادۂ علم کے بعض دلائل :

۱ - اللہ رب العالمین کا فرمان ہے کہ ﴿ يا أيها الذين آمنوا إن جاء كم فاسق بنبأ فتبينوا أن تصيبوا قوما بجهالة فتصبحوا على ما فعلتم نادمين ﴾ (حجرات : ٦)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق کی خبر قابل قبول نہیں اور فاسق کا ضد عادل ہے۔ لہٰذا عادل کی خبر قابل قبول ہے بلکہ اس آیت میں قطعی طور سے عادل مخبر کی خبر قبول کرنے کا حکم ہے، لہٰذا خبر آحاد کا ناقل اگر ثقہ اور عادل ہے تو اس سے علم کا حصول ضروری ہے اگر اس سے علم کا فائدہ نہ ملتا تو اس میں اس وقت تک تثبت کا حکم دیا جاتا جب تک کہ یقین حاصل نہ ہو۔

۲ - اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ ﴿ فلو لا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم ﴾ (توبہ : ۱۲۲)

لفظ طائفۃ عربی زبان میں فرد واحد کے لیے بھی بولا جاتا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ " ويسمى الرجل الطائفة لقوله تعالىٰ ﴿ وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا ﴾ (الحجرات : ۹) فلوا قتتل رجلان دخلا في معنى الآية" (۵۳) اللہ کے فرمان ﴿ وإن طائفتان من المؤمنين ﴾ کے پیش نظر فرد کو بھی طائفہ کہا جاتا ہے، کیوں کہ اگر دو آدمی بھی قتال کریں تو ان پر یہ آیت صادق آئے گی لہٰذا ہر ایک ان میں ایک طائفہ ہوا۔

لہٰذا اگر فرد واحد کو بھی انذار کے لیے بھیجا گیا تو اس کی بات افادہ علم سے خالی نہ ہوگی اس کی باتوں کو ماننا اور قبول کرنا اس جماعت کے لیے لازم ہے جس میں وہ تفقہ فی الدین حاصل کرنے کے بعد گیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری " فلو لا نفر ......" سے یہ استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ لفظ طائفۃ فرد واحد اور اس سے زائد کے لیے مستعمل ہوتا ہے کسی معین عدد کے

---

(۵۳) بخاری مع الفتح (۱۳/۲۳۱)

ساتھ تو مخصوص نہیں یہ مفہوم ابن عباس وغیرہ سے بھی منقول ہے۔ (۵۴)

اسی طرح سے " فلو لا نفر من كل فرقة" میں لفظ فرقۃ میں کم از کم تین افراد شامل ہوتے ہیں لہٰذا ان میں سے فرد واحد بھی نفر بن سکتا ہے اور اس کی بات حجت بن سکتی ہے۔

اگر بالفرض طائفہ سے مراد دو یا تین یا اس سے اوپر لیا جائے پھر بھی اصول حدیث کے اعتبار سے وہ خبر واحد ہی ہے، معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں خبر واحد کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کا حکم موجود ہے جو حصول علم کو لازم ہے۔ کیوں کہ قرآن ایسی چیز کو ماننے کا حکم نہیں دے سکتا جو موجب علم نہ ہو، ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن شکوک وشبہات پر عمل کی ترغیب دیتا ہے۔

۳ - اللہ رب العالمین کا فرمان ہے کہ ﴿ فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون ﴾ (نحل : ۴۳) ''اگر تم کو نہیں معلوم تو اہل ذکر سے معلوم کرو۔'' پس اگر کوئی شخص کسی عالم سے کوئی مسئلہ دریافت کرے تو اس کا قبول کرنا اس کے لیے ضروری ہوگا، اگر اس کا قبول کرنا واجب وضروری قابل عمل، مفید علم نہ ہوتا تو اس کو سوال کا حکم ہی نہ دیا جاتا، معلوم یہ ہوا کہ فرد واحد کا دین کی باتوں کو بتانا خواہ اس کا تعلق کسی بھی مضمون سے ہو درست اور قابل قبول ہے، اور کوئی بھی چیز اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ علم ویقین کا فائدہ نہ دے۔

۴ - اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ ﴿ يا أيها الرسول بلغ ما أنزل إليك من ربك ﴾ (مائدہ : ٦٧) جو کچھ اللہ نے آپ پر نازل کیا ہے آپ اس کو (بندوں تک) پہنچا دیجیے۔'' نیز اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ " بلغوا عني ولو آية" (۵۵) ہماری باتوں میں سے اگر ایک آیت بھی معلوم ہو تو اس کو دوسروں تک پہنچا دو۔

پھر آپ نے اپنی دعوت کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے مختلف مقامات پر مختلف افراد کو بھیجا جو دین کی تمام باتوں کو - اس کا تعلق کسی بھی شعبہ سے ہو - دوسروں تک پہنچایا۔ اگر یہ

---

(۵۴) بخاری (۳۴۶۱) (۵۵) فتح الباری (۱۳/ ۲۳۴)

قابل عمل نہ ہوتا تو پھر آپ کا یہ حکم دینا اور اللہ کا یہ حکم رسول کو دینا اور پھر رسول کا فرد واحد کو دعوت کے لیے بھیجنا مفید نہ ہوتا، اور مبلَّغ قوم کے لیے یہ چیز حجت نہیں بن سکتی الا یہ کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ ابلاغ اور اتمام حجت ایسی چیز سے بھی ہوتی ہے جو قابل علم وعمل نہ ہو جس کا بطلان واضح ہے، معلوم یہ ہوا کہ جن باتوں کو ثقات نے روایت کیا ہے اگر وہ فرد واحد بھی ہو تو اس سے علم کا فائدہ ملتا ہے اور اس پر عمل واجب ہے۔ اس طرح بے شمار مثالیں اور دلیلیں کتاب وسنت میں موجود ہیں۔

۵ - جن حضرات کا یہ دعویٰ ہے کہ خبر متواتر علم کا فائدہ دیتی ہے وہ بھی ضمناً اس بات کو مانتے ہیں کہ خبر واحد علم کا فائدہ دیتی ہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں کیوں کہ کسی خبر کا متواتر ہونا اسی صورت میں ثابت ہوسکتا ہے جب کوئی ماہر فن احادیث کے طرق کو جمع کرے اور یہ خبر دے کہ فلاں حدیث متواتر ہے، اس فرد واحد کے قول کو یہاں تسلیم کر کے اس حدیث کو متواتر مان لیا جاتا ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ متواتر کے ثبوت کے لیے خبر واحد ہی بنیاد ہے، اور آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ اگر یہ خبر آحاد قابل یقین نہیں تو پھر متواتر کا وجود بھی مشکل ہوگا۔ جس طرح حدیث رسول کے بغیر قرآن کا ثبوت ممکن نہیں اسی طرح سے خبر واحد کے بغیر خبر متواتر کا وجود ممکن نہیں۔

۶ - قرآن کا افادہ بھی اسی خبر واحد پر منحصر ہے، اس لیے کہ اس کا جو مفہوم، مدلول، ترجمہ اور تفسیر کوئی عالم یا مفسر بیان کرتا ہے وہ خبر واحد ہوتی ہے، اگر یہ خبر واحد جو ترجمہ وتفسیر، مدلول ومفہوم کی شکل میں ہے قابل یقین وحجت نہیں تو قرآن کریم سے استفادہ کیسے کیا جاسکتا ہے، کیا اس کے لیے ایک عام آدمی اس کا مکلّف ہے کہ وہ شروط متواتر کو تلاش کرے۔

۷ - دنیا کی ساری تاریخ خبر واحد پر منحصر ہے، سارے معاملات وحوادث کی معرفت، مخابرات کا پھیلا ہوا جال عموماً خبر واحد ہی پر قائم رہتا ہے۔ یہ وہ بدیہیات ہیں جن کا منکر وہی ہوگا جس کو دنیا ومافیہا کی خبر نہیں۔

معلوم یہ ہوا کہ خبر آحاد علم ویقین کا فائدہ دیتی ہے، اور جب وہ علم ویقین کا فائدہ دیتی ہے تو شریعت کے ہر معاملہ میں خواہ اس کا تعلق عقیدہ سے ہو یا احکام سے ہر جگہ مفید وقابل قبول ہوگی۔

خبر واحد کی ظنیت کی حقیقت :

جن لوگوں نے خبر واحد کے ظنی ہونے کی بات کہی ہے اور اس سے مراد شکوک وشبہات اور اٹکل اور بے بنیاد باتیں مراد لیا ہیں ان کا قول قطعی درست نہیں کیوں کہ محدثین نے ظنی کی جو تعبیر کی ہے وہ اصطلاحی تعبیر ہے جنہوں نے شکوک وشبہات اور خدشات کے تمام راستوں کو بند کرنے کے بعد یہ اصطلاح متعین کی ہے، لہٰذا دونوں اصطلاحی ظن میں کافی فرق ہے، اصولیین نے صرف ایک جہت پر توجہ دی ہے اور محدثین نے تمام جہات پر توجہ دی ہے پھر یہ اصطلاح متعین کی ہے۔

اور جن لوگوں نے ظن سے ظن غالب مراد لیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں جو مرجوح پہلو ہے اس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی ہے وہ بھی مناسب نہیں، اس لیے کہ جس چیز کے مرجوح ہونے پر اجماع ہو گیا اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، اگر اس کا اعتبار کیا جاتا تو پھر وہ مرجوح کیسے ہوتا یہ محض ذہنی تفریعات ہیں جو بے سود ہیں، کیونکہ محدثین نے، راویوں کے حالات کو معلوم کیا، ان کی عدالت وثقاہت کو دیکھا، ان کے وہم اور سوء حفظ پر نگاہ رکھی، کس سے کیا غلطی ہوئی، کہاں ہوئی، ان کی ہر روایت کو جانچا پرکھا پھر اس پر حکم لگایا یہ لہٰذا یہ ظن یقین کے معنی میں ہے، اور مرجوح کا پہلو بے بنیاد ہے۔

حالانکہ ذہن اس کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہ لوگ انسان تھے، معصوم نہ تھے، غلطی کا امکان بہر حال عقلاً موجود ہے اور یہ اپنی جگہ پر درست بھی ہے، لیکن جہاں اور جن سے غلطیوں کا امکان تھا یا غلطیاں ہوئیں، محدثین نے ایسے لوگوں کی روایتوں کو پہلے ہی شکوک کے دائرے میں ڈال دیا اور ان کو ترک کر دیا باقی بچیں صرف وہ خبریں یا وہ روایتیں جو غلطیوں سے پاک تھیں، لہٰذا مرجوح کی صحت کا جو امکانی پہلو تھا وہ ختم ہو گیا جس کی کوئی حقیقت نہیں رہ گئی۔

اور اگر اس مرجوح پہلو کا اعتبار کیا جائے تو ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان مرجوحات میں پھر راجح اور مرجوح کا امکان ہے کہ نہیں اگر وہ یہ کہیں کہ اس کا امکان نہیں تو جواب یہ ہوگا کہ پھر مرجوح اول کے اعتبار کا بھی امکان نہیں اور یہ کہیں کہ اس کا امکان ہے تو اس سے دور وتسلسل لازم آئے گا جو محال ہے۔

جو حضرات خبر واحد کو ظنی سمجھ کر شکوک وشبہات کے خانہ میں ڈال دیے ہیں ان کے بارے میں علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ ان سے یہ سوال ہے کہ : کیا ایسا امکان ہے کہ یہ شریعت جو دائمی اور ابدی شریعت ہے اس پر کوئی بھی صاحب ایمان یقینی علم نہیں رکھتا اور کیا اس کا امکان ہے کہ اس مخلوط شریعت کو مسلمانوں میں سے کوئی بھی صاحب ایمان الگ کر دے؟ اگر وہ یہ جواب دیں کہ اس کا امکان نہیں تو یہ ثابت ہو گیا کہ خبر واحد علم کا فائدہ دیتی ہے کیوں کہ تمام مسلمان اس دین کو مانتے ہیں اور اس پر ایمان ویقین رکھتے ہیں تو ان کا اعتماد خبر واحد پر ہی ہوا اور اگر یہ جواب دیں کہ اس کا امکان ہے تو پھر دین اسلام بقول ان کے ناقابل اعتبار ہوا، لہٰذا اس پر عمل محض ظن پر قائم ہو گا جس کا انہیں خود اعتبار نہیں پھر یہ شریعت کا بطلان اور دین سے خروج ہے اور الگ کرنے کا امکان ہے تو اہل علم نے اس کو الگ کر دیا، لہٰذا اس پر یقین ہونا چاہیے اور اگر امکان نہیں تو شریعت غیر محفوظ ہوئی جب کہ اللہ کا فرمان ہے ﴿ إنا له لحافظون ﴾ لہٰذا یہ اس حفاظت سے متصادم ہے۔ (۵٦)

لہٰذا جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ خبر واحد ظن (شک وشبہ) کا فائدہ دیتی ہے ان کا قول درست نہیں، جس کی مختلف وجہیں ہیں۔

۱ - اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان حضرات نے خبر واحد پر حکم لگانے کے وقت اس کی جملہ اقسام کا خیال نہیں کیا، بلکہ خبر واحد کہہ کر خبر غریب مراد لیا ہے، پھر اس کی صحت وعدم صحت کے لیے مخبر کے صادق اور کاذب ہونے میں کوئی تمیز نہیں کیا بلکہ ہر مخبر کی خبر کو اس میں شامل کر لیا پھر اس میں صدق اور کذب کے امکان کا شوشہ نکال کر مشتبہ بنا لیا، حالاں کہ یہاں جس خبر کی بات کی جا رہی ہے وہ اس مخبر کی خبر ہے جو صادق وامین، عادل وضابط ہوتا ہے، جس کی خبر میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی، شک وشبہ اس خبر میں ہوتا ہے جو غیر ثقہ کی طرف سے آتی ہے، عادل کی خبر بغیر تبیین وضاحت کے قبول کرنے کا حکم اللہ کے فرمان ﴿ يا أيها الذين آمنوا إن جاء كم

---

(۵٦) مختصر الصواعق (۳۸۰/۲-۳۸۱)، الاحکام فی اصول الاحکام باختصار (۱۱٦/۱)

فاسق بنباء ﴾ (حجرات : ۶) میں موجود ہے۔

۲ - ان کے قول کے مردود ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے ہوسکتی ہے کہ یہ قول متکلمین اور اصولیین کا ہے جس سے بعد کے کچھ فقہاء اور محدثین متاثر ہوگئے ہیں یہ جمہور محدثین کا قول نہیں، لہٰذا یہاں جمہور محدثین کا قول ہی قابل حجت سمجھا جائے گا اور انہیں کی اصطلاح معتبر سمجھی جائے گی نہ کہ متکلمین فلاسفہ یا اصولیین کی جن میں بعض اعتزال کے علمبردار ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اصول حدیث اور اصول فقہ کی بہت سی باتیں اگر چہ مشترک ہیں لیکن چونکہ دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں اس لیے ہر ایک کی مصطلحات بھی الگ الگ معنی ومفہوم رکھتی ہیں، جب بات حدیث اور محدثین کی ہوتی ہے تو مصطلحات کا وہی مفہوم قابل قبول ہوگا جو محدثین نے بتایا ہے، اور جب بات اصول فقہ کی ہوتی ہے یا متکلمین کی تو ان کی باتوں کو ان کی مصطلحات کے پس منظر میں سمجھنا ہوگا ورنہ دونوں کو خلط ملط کرنے سے صحیح نتیجہ نہیں نکل سکتا، لہٰذا یہاں فیصلہ محدثین کے اصولوں کے مطابق کیا جائے گا اور خبر واحد کی انہوں نے جو تعریف کی ہے یا جو قسمیں کی ہیں اور یقین کے جس معیار کی بات کی ہے وہی قابل قبول ہوگا۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں : جس حدیث کو محدثین علماء نے قبول کیا ہے اور اس کی تصدیق کی ہے اس سے علم یقینی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، یہاں پر متکلمین اور اصولیین کی بات کا کوئی اعتبار نہیں کیوں کہ کسی بھی چیز کے اجماع میں خاص اس چیز کے ماہرین کا اعتبار کیا جاتا ہے دوسروں کا نہیں، مثلاً شرعی احکام پر اجماع میں صرف علماء شریعت کا اعتبار ہوگا، متکلمین، نحاۃ، ادباء، اطباء کا نہیں، اسی طرح کسی حدیث کے صحیح ہونے پر (اور وہ کس علم کا فائدہ دیتی ہے) انہیں لوگوں کا اعتبار ہوگا جو حدیث، اور اس کے طرق وعلل کی معرفت رکھتے ہیں۔ (۵۷)

اور چوں کہ محدثین کے یہاں صحیح خبر آحاد قابل حجت، قابل عمل وقابل یقین ہے، لہٰذا اس سے علم یقینی کا حصول بھی امر متعین ہے۔

---

(۵۷) مختصر الصواعق (۲/ ۳۷۵)، نیز دیکھیے حجیت حدیث (۱۰۹-۱۱۰)

۳ - ان کے قول کے مردود ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ظن کا استعمال عربی زبان میں مختلف معانی کے لیے ہوتا ہے، ظن شبہ کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، اور یقین کے معنی میں بھی ہوتا، حسن ظن کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے قرآن کریم میں یہ لفظ تینوں معنوں میں مستعمل ہے، لیکن جو لوگ خبر آحاد کے علم یقین کے افادہ کے منکر ہے انہوں نے صرف انہیں آیتوں سے استدلال کیا ہے جہاں ظن شک وشبہ کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، دیگر آیتوں سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ظنی چیزوں کا کوئی اعتبار نہیں، شک وشبہ کے معنی میں مستعمل بعض آیتیں یہ ہیں :

﴿ وإن الذين اختلفوا فيه لفی شک منه ما لهم به من علم إلاا تباع الظن ﴾ (نساء : ۵۷)

﴿ إن يتبعون إلا الظن وما تهوى الأنفس ﴾ (نجم : ۲۳)

﴿ وإن الظن لايغنى من الحق شيئا ﴾ (نجم : ۲۸)

ظن بدگمانی کے معنی میں مستعمل ہے، جیسے :

﴿ يا أيهاالذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن، إن بعض الظن إثم ﴾ (حجرات : ۱۲)

ظن یقین کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، جیسے :

﴿ الذين يظنون أنهم ملاقوا ربهم وأنهم إليه راجعون ﴾ (بقرہ : ۴۶)

﴿ إنی ظننت أنی ملاق حسابيه ﴾ (حاقہ : ۲۰)

﴿ استعينوا بالصبر والصلاة وإنها لكبيرة إلا على الخاشعين الذين يظنون أنهم ملاقوا ربهم ﴾ (بقرہ : ۴۶)

﴿ وظن أنه الفراق ﴾ (قیامہ : ۲۸)

﴿ وظنوا أنهم مانعتهم حصونهم ﴾ (حشر : ۲)

﴿ ألا يظن أولئك أنهم مبعوثون ليوم عظيم ﴾ (مطففين : ۴)

﴿ ورای المجرمون النارفظنوا أنهم مواقعوها ﴾ (کہف : ۵۳)

ان استعمالات میں معنی کی تعیین سیاق وسباق اور قرائن سے کی جاتی ہے۔

علامہ محمد اسماعیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ 'ظن' عربی اور اردو دونوں زبانوں میں مستعمل ہے لیکن اردو میں اس کا مفہوم شک، وہم کا ہوتا ہے عموماً مشکوک، موہوم، مظنون وغیرہ الفاظ بصورت مترادف مستعمل ہیں، اور یہی استعمال منکرین سنت کے لیے لغزش کا موجب ہوا، ورنہ عربی زبان میں یہ لفظ بلاقرینہ اس معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ (۵۸)

علامہ راغب فرماتے ہیں کہ "الظن اسم لما يحصل من أمارة متى قويت أدت إلى العلم ومتى ضعفت جدا لم يتجاوز حد التوهم" (۵۹) ظن اس معرفت کو کہتے ہیں جو علامات سے معلوم ہوتی ہے جب یہ علامت قوی ہوتی ہے تو ظن علم ویقین کا فائدہ دیتا ہے اور جب علامت کمزور ہو تو وہم سے کمتر نہیں ہوتی، علامہ ابوالبقا یعیش بن علی (متوفی ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ دو متعارض دلیلوں کا نام ظن ہے، جب راجح قوی ہو تو اسے علم یقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (۶۰)

لہٰذا ظن کے معنی کی تعیین کے لیے سیاق وسباق اور علامات کا دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اگر علامات کمزور ہوں یا سیاق شک وشبہ کا ہو تو ظن وہم کے معنی میں ہوتا ہے۔

اس طرح اگر لفظ ظن علم یقین اور صداقت کے مقابلہ میں مستعمل ہو تو وہم کے معنی میں ہوتا ہے۔

ایسے ہی اگر کسی چیز کی مذمت کے سیاق میں ہو تو شک وشبہ کے معنی میں ہوتا ہے اگر علامات قوی ہوں تو یقین کے معنی میں ہوتا ہے۔

ایسے ہی اگر تعریف ومدح کے سیاق میں مستعمل ہو تو یقین کے معنی میں ہوتا ہے یہی محدثین کے یہاں مراد ہے اور یہی قابل قبول ہے۔

---

(۵۸) حجیت حدیث ص/ ۱۶۳ (۵۹) حجیت حدیث ص/ ۱۶۳، منقول از مفردات القرآن ص/ ۲۱۹

(۶۰) حجیت حدیث ص/ ۱۶۴

علامہ راغب فرماتے ہیں کہ قرینہ قوی ہونے کی صورت میں عموماً أنّ یا أنْ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، اور قرینہ کمزور ہونے کی صورت میں عموما إنّ یا إنْ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جو عموما معدومات میں مستعمل ہوتے ہیں۔ (٦١)

ثقہ ومقبول راویوں کے واسطے سے حاصل ہونے والے علم کے لیے لفظ ظن کا جو استعمال خبر آحاد کے لیے کیا گیا ہے وہ بھی مدح کے سیاق میں ہوتا ہے لہٰذا یہاں بھی ظن یقین کے معنی میں ہے اور قرآن کی جن آیتوں میں ظن کی ممانعت ہے یہ اس سے خارج ہیں۔

نیز یہاں جو قرینہ ہے وہ راویوں کی عدالت اور ثقاہت کا ہے جو انتہائی طاقتور قرینہ ہے ایسی صورت میں ان کی خبر کو ظنی کہنا یقینی مفہوم رکھتا ہے لہٰذا اس اعتبار سے بھی یہاں ظن یقین کے معنی میں ہے۔

ایک چیز اور سمجھنے کی ہے کہ بعض اہل مصطلح نے علم کی جو قسمیں کی ہیں بظاہر اس سے علم کے مراتب میں صرف فرق بتانا مقصود ہے، جس طرح صحیح حدیث کے مراتب ہوتے ہیں بعض کو متواتر بعض کو متفق علیہ، صحیح علی شرط بخاری، صحیح علی شرط مسلم، صحیح علی شرط الشیخین، پھر ان میں بعض کو اصح کہا جاتا ہے حالاں کہ حکما سب صحیح ہیں یہ سب درجات میں فرق کے لیے کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سے علم ویقین کے مراتب ہوتے ہیں ایک کو ضروری دوسرے کو نظری اور تیسرے کو ظنی سے تعبیر کیا جاتا ہے تا کہ ان کے مراتب میں فرق ہو جائے، یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ تعبیر بعض لوگوں کی ہے نہ کی تمام محدثین کی۔

بحث ونظر سے حاصل ہونے والے علم کو نظری کہا جاتا ہے دیگر قرائن سے اس کا درجہ بڑھ جاتا ہے، چوں کہ خبر واحد پر حکم بحث ونظر واستدلال کے ذریعے سے ہی کیا جاتا ہے شذوذ وعلل کی معرفت حاصل کی جاتی ہے تب اس پر صحت کا حکم لگایا جاتا ہے لہٰذا اس کا بھی درجہ اصلا علم نظری ہی کا ہوا چونکہ علم نظری کے لیے ایک امر کا اضافہ کیا جا چکا ہے وہ قرائن کا وجود ہے، اور اسی بنیاد پر وہ

---

(٦١) حجیت حدیث ص/ ۱۶۵

اصطلاح مخصوص ہوگئی اس لیے اس دوسرے علم نظری کو جو قرائن سے خالی ہے اس کا درجہ قدرے کم ہوگیا لہٰذا اس فرق کو واضح کرنے کے لیے اس کو ظنی کہہ دیا گیا ہے۔

علم یقینی کی قسمیں :

علم یقینی ضروری، علم یقینی نظری، علم یقینی ظنی۔

بہت سے اہل علم نے صحت اسناد کو بھی ایک قرینہ بتایا ہے جو ہر صحیح حدیث میں موجود ہوتی ہے چاہے وہ غریب ہو یا عزیز یا مشہور ہو، اگرچہ حافظ ابن حجر نے اس کو قرائن میں شمار نہیں کیا ہے کیوں کہ اس کا وجود ہر مقبول حدیث میں ہوتا ہے جن کی وجہ سے اس سے علم یقینی کا فائدہ حاصل ہوجاتا ہے، اب اگر اس طرح کی روایت کے لیے کسی دیگر امر کا اضافہ ہوجاتا ہے تو اس کا درجہ کچھ نہ کچھ بڑھ ہی جائے گا لہٰذا اہل علم کی اس تعبیر سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے اور محض اس کا نام ظنی رکھ دینے سے اس کو غیر معتبر نہیں سمجھنا چاہیے۔

ایک اور اہم چیز بر سبیل نزول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ شریعت نے بہت سارے مقامات پر ظن کا اعتبار کیا ہے مثلاً محکمہ قضاء شرعی میں قاضی کا جو فیصلہ ہوتا ہے وہ مظنون ہوتا ہے، کوئی ضروری نہیں کہ اس کا فیصلہ صحیح ہو خود رسول نے فرمایا کہ : میں بھی انسان ہوں تم لوگ اپنا فیصلہ میرے پاس لاتے ہو جو اپنی بات کو اچھی طرح سے دلائل کے ساتھ واضح کرلے جاتا ہے اس کے حق میں فیصلہ کردیتا ہوں، ہوسکتا ہے کہ حقیقت میں وہ فیصلہ درست نہ ہو لہٰذا مد مقابل کو چاہیے اگر وہ حقیقت کو جانتا ہے تو میرے فیصلہ کی بنیاد پر اس کو حلال نہ سمجھے۔ (۶۲)

جب رسول کے فیصلہ میں اس کی گنجائش ہے تو دوسروں کا فیصلہ کب قطعیت کا حکم رکھے گا پھر بھی اس فیصلے کو ماننا ضروری ہے۔

شیخ صفی الرحمٰن رحمہ اللہ خصم سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں کہ : آپ ظنی چیز کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں سمجھتے اور قرآن کریم ظن پر دین کے ایک حکم کا دارومدار رکھتا ہے ﴿ فان طلقها

---

(۶۲) بخاری (۷۱۸۵)، مسلم (۱۷۱۳)

فـلا جـنـاح عليهما أن يتراجعا إن ظنا أن يقيما حدود الله ﴾ (بقر : ۲۳۰) یعنی اگر کوئی اپنی بیوی کو دوسرا طلاق دے دے تو رجوع کرنے میں کوئی حرج کی بات نہیں اگر یہ ظن رکھیں کہ دونوں اللہ کے حدود کو قائم کرسکیں گے۔

نیز فرمایا کہ : شہادت دینے کے تعلق سے قرآن کریم نے دو گواہی دینے والوں پر غلط بیانی کے احتمال کو قبول کیا ہے، پھر بھی ان کی گواہی کو مقبول سمجھا ہے۔ ﴿ فـإن عثر عـلـى أنهما استحقا إثما فآخرا ن يقومان مقامهما ﴾ (مائدہ : ۱۰۷)

نیز گواہی کی ایک شق یہ بھی ہے کہ اگر ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو ان کی گواہی کافی ہے جب کہ عورتوں میں دو عدد رکھنے کی وجہ یہ بتائی کہ ﴿ أن تـضـل إحـداهـمـا فتذكر إحداهما الأخرىٰ ﴾ (بقرہ : ۲۸۲) یعنی ایسی گواہی بھی قابل قبول ہوگی جو خود گواہی دینے والے کو یاد نہ ہو بلکہ دوسرا یاد دہانی کرائے، اس قسم کی گواہی یقینیات کے کس درجہ میں آتی ہے جس کو آپ بھی مانتے ہیں، معلوم ہوا کہ قرآن میں نہ صرف ظن کی تعریف کی گئی ہے بلکہ اس پر دین کے بعض احکامات کا دار و مدار ہے، نظامی عدالت کی بنیاد اُسی پر ہے، توبہ و استغفار کرنے والوں کو بخشش کی بشارت دی گئی ہے، پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ظن کی دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ (۶۳)

شیخ غازی عزیر حفظہ اللہ اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

منکرین حدیث کا آیات ظن سے استدلال کرنا بھی قطعا بے جا اور سنگین قسم کا مغالطہ ہے، جن لوگوں نے اخبار آحاد کا انکار کیا ہے ان کے پاس امتناع تعبد پر کوئی قطعی دلیل موجود نہیں بلکہ انہوں نے محض ظنی طور پر ایسا کیا ہے پھر وہ خود آیات مذمت ظن کے حکم میں داخل ہیں۔

نیز فرمایا کہ : خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ اس میں (خبر واحد میں) خطا و نسیان کا عقلی جواز موجود ہے مگر چونکہ عقل اور انسانی فطرت ایک عادل و ضابط و صادق شخص کی خبر، رویت اور شہادت کو قبول کرتی ہے اور مجرد احتمالات عقلیہ کو وسوسہ محض قرار دیتی ہے، پس روایت حدیث کے معاملہ

---

(۶۳) ملخص از انکار حدیث حق یا باطل، ص ر ۱۱-۱۲

میں بھی عرفاً اس قسم کے عقلی احتمالات کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ (۶۴)

علامہ محمد اسماعیل گجرانوالہ رحمہ اللہ نے شیخ عزالدین بن عبدالسلام (متوفی ۶۶۰ھ) کا ایک قول نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

دونوں جہاں کے مصالح کے عمومی ذرائع ظنی ہیں، انسان جتنے اعمال کرتا ہے وہ اسی ظن پر کرتا ہے کہ وہ مقبول ہوں گے اور اس کو نجات مل جائے گی، قرآن نے بھی اس کی تائید کی ہے، دنیاوی کام انجام دینے والے، تجارتی سفر کرنے والے، روزی روٹی تلاش کرنے والے، کسانی کام کرنے والے سب اسی ظن پر کام کرتے ہیں، انسانی جنگیں، ان سے بچاؤ کی تدبیریں، مختلف قسم کے ہتھیاروں کا استعمال، علاج کرانے والے بیمار اسی ظن پر کام کرتے ہیں، غرضیکہ دنیا اس ظن پر قائم ہے اور سارا عمل جاری ہے، اگر ان کو معطل کر دیا جائے تو سارے مصالح معطل ہو جائیں گے، شارع نے بھی اپنے اکثر احکامات کی بنیاد ظن پر رکھی ہے محض اصطلاح کے لیے ظن کا لفظ پسند کیا تو پھر وہ کیوں قابل قبول نہیں۔ (۶۵)

☆☆☆

---

(۶۴) فتنۂ انکار حدیث کا نیا روپ (۳/ ۸۳) (۶۵) حجیت حدیث ص/ ۱۷۰-۱۷۱

خبر واحد کے ظنّی ہونے کے دلائل اور ان کا رد

جن لوگوں نے خبر واحد کو ظنی کہہ کر غیر یقینی اور نا قابل قبول قرار دیا ہے، ان کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں :

۱ - یہ امر بدیہی ہے کہ ہر سنی ہوئی خبر کی تصدیق ممکن نہیں، لہٰذا اس کا اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح سے یہ ممکن نہیں کہ ہر سنی ہوئی خبر کی تصدیق کی جائے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ ہر خبر کا انکار کر دیا جائے، اور اس کی تصدیق نہ کی جائے، لہٰذا امر وسط یہی ہے کہ ہر وہ خبر، جس کا مُخبر قابل اطمینان نہ ہو، اس کی تصدیق نہ کی جائے، اور ہر وہ خبر جس کا مُخبر قابل اطمینان اور قابل اعتبار ہو، اس کی تکذیب نہ کی جائے، بلکہ اس کو تسلیم کر لیا جائے، جس طرح سے جاہل اور عالم برابر نہیں ہو سکتے، جس طرح سے مجرم اور صالح برابر نہیں ہو سکتے، اسی طرح سے صادق و عادل، فاسق و فاجر برابر نہیں ہو سکتے، ہر ایک کا اپنا مقام اور حکم ہوتا ہے، بنا بریں ہر وہ خبر جس کا مخبر صادق و امین، ثقہ اور عادل ہو، وہ قطعاً قابل قبول ہے، اور جس کا مخبر فاسق، فاجر، کاذب اور خائن ہو، وہ مردود ہے، قرآن کریم میں یہی حکم اللہ نے ﴿ اِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوا ﴾ (الحجرات : ۶) میں دیا ہے۔

لہٰذا خبر واحد کا مُخبر چونکہ ثقہ اور عادل ہوتا ہے، اس لیے اس پر یقین رکھنا اور اس کی تصدیق کرنا بھی امر بدیہی ہے۔

۲ - دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ایک مُخبر کی خبر اگر مان لی جائے، تو یہ ممکن ہے کہ دوسرا مُخبر اس کے خلاف خبر دے، اس کو بھی مان لیا جائے، ایسی صورت میں دونوں خبروں کا تعارض لازم آئے گا۔

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی وہی بنیادی بھول ہو رہی ہے کہ مُخبر کی تعیین نہیں، اگر ایک مُخبر جس کی صفت معلوم نہیں یا یہ معلوم ہے کہ وہ فاسق مخبر ہے، اس کے مقابلے میں اگر ثقہ مخبر خبر دے رہا ہے، تو پھر تعارض نہیں ہوگا اس لیے کہ ثقہ کے مقابلے میں غیر ثقہ قابل اعتماد نہیں اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دونوں ثقہ ہیں تو بھی خبر کے تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ تعارض کی صورت میں جمع و توفیق پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

احادیث رسول میں اگر دو مقبول خبروں میں تعارض ہوتا ہے تو یہ حقیقی تعارض نہ ہوگا، بلکہ ظاہری تعارض ہوگا، جو سامع کو نظر آتا ہے، اس کی بنیاد کم علمی اور کم فہمی پر بھی ہو سکتی ہے، اس لیے امام ابنِ خُزیمہ نے فرمایا تھا کہ ''ایسی دو حدیثیں جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہوں اور دونوں صحیح ہوں، تو ان میں تضاد نہیں ہو سکتا، اگر کسی کا ایسا دعویٰ ہے تو میرے پاس لائے۔'' (۱)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ سے منقول ایسی کوئی متضاد حدیث نہیں جس کا کوئی مخرَج نہ ہو۔ (۲)

اس طرح کا تعارض جو ظاہر میں ہوتا ہے اس کو ختم کرنے کے لئے اہل علم نے اصول وضابطے بتا دیے ہیں کہ کس طرح ان میں تطبیق و توفیق کے ذریعے جمع کی جا سکتی ہے، یا ناسخ ومنسوخ کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے، ترجیح کے بہت سارے پہلو نکل سکتے ہیں، جن سے تعارض ختم کیا جا سکتا ہے جس کی تفصیل تشریحی خدمات میں آئے گی۔ (۳)

لہٰذا اس تعارض کے احتمال کے خوف سے ہر خبر کو رد کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے!

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے جس کو احتمال تعارض کے شبہ کی بنیاد پر آپ کی طرف سے رد کیا جاتا ہے، جب کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ ظن قابل اعتبار نہیں ہوتا، تو کسی حقیقت کو اس ظن کی بنیاد پر کہ۔ ایسا ہوگا اور ویسا ہوگا۔ کیسے رد کیا جا سکتا ہے؟ اسی وجہ سے علامہ ابن حزم کو یہ کہنا پڑا کہ لایَجوزُلنا اَن نَترُکَ یقینا بِالشکِ، وَلا اَن نُخالِفَ الحقیقةَ بالظّن وقدْ نهی اللهُ

---

(۱) الکفایہ ص ر ۴۳۲ (۲) الرسالہ ص ر ۲۱۶ (۳) دیکھیے صفحہ ۴۳۱

عنه فقال ﴿إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّن﴾ (۴) (ہمارے لیے یہ درست نہیں کہ یقین کوشک کی بنیاد پر چھوڑ دیں یا حقیقت کی، ظن کی بنیاد پر مخالفت کریں، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے، اور ظن کی اتباع کرنے والوں کی مذمت کی ہے۔

۳ - تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر خبر واحد سے علم یقینی کا حصول مان لیا جائے، تو اس سے خبر متواتر اور قرآن کا منسوخ کرنا درست ہو جائے گا، جو مناسب نہیں۔

یہ شبہ اس بنیاد پر ہوا ہے کہ قرآن یا سنت متواترہ کو خبر آحاد کے ذریعے منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

حالانکہ یہ مسئلہ خود محلِّ نزاع اور مختلف فیہ ہے، پھر یہ دلیل کیسے بن سکتی ہے؟ ایک جماعت اس کے عدمِ جواز کی قائل ہے، تو دوسری جواز کی، علامہ ابن حزم فرماتے ہیں ''صحیح یہ ہے کہ قرآن، سنت کے ذریعے، اور سنت قرآن کے ذریعے، اسی طرح سے قرآن، قرآن کے ذریعے، اور سنت، سنت کے ذریعے منسوخ ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ شریعت کے تمام احکامات خواہ وہ کتاب کی شکل میں ہوں یا سنت کی شکل میں، سب مُنزَّل من اللہ ہیں، جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ لہٰذا دونوں کی حیثیت اس اعتبار سے برابر ہے، تو ایک دوسرے کو منسوخ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔'' (۵)

تحویلِ قبلے کا جو معاملہ ہے اس میں قرآن نے قبلہء اوّل کو منسوخ کیا ہے جس کی تعیین سنت کے ذریعے ہوئی تھی، پھر جب اس پر عمل ہونے لگا تو اس کی حیثیت سُننِ متواترہ کی ہو گئی، اس کو قُبا والوں نے فردِ واحد کی خبر سے منسوخ سمجھا، جس پر ان کی نکیر نہ کی گئی، بلکہ اچھا سمجھا گیا، اسی طرح وصیت کے قرآنی حکم کو " لَاوَصِيَّةَ لِوَارِثٍ" (*) وارث کے لیے وصیت نہیں ہے، کی خبر واحد نے منسوخ کر دیا، لہٰذا سب ایک دوسرے کو منسوخ کر سکتی ہیں۔

---

(۴) خبر الواحد وحجیتہ ص ر ۱۲۴ (۵) خبر الواحد ص ر ۱۲۸

(*) ابوداؤد (۲۸۷۰)، ترمذی (۲۱۲۱)، ابن ماجہ (۲۷۱۳-۲۷۱۲-۲۷۱۳) علامہ البانی نے ارواء الغلیل میں اس کو صحیح کہا ہے (۱۶۵۵)

ویسے بھی مخالفین نے جس چیز کو دلیل بنایا ہے، وہ خود ہی محل نزاع ہے، لہٰذا یہ دلیل بن ہی نہیں سکتی۔ (٦)

ایک اعتراض یہ ہے کہ اگر خبر واحد کو قابل حجت مان لیں، تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ شاہد واحد سے فیصلہ کرنا درست ہوگا، نیز اس کے تزکیے کی ضرورت بھی نہ ہوگی، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ (٧)

اس کا جواب یہ ہے کہ شہادت اور خبر میں مختلف طرح سے فرق ہوتا ہے، اگرچہ دونوں بعض چیزوں میں مشترک ہیں، لہٰذا روایت کو شہادت پر اور راوی (مُخبر) کو شاہد پر قیاس کرنا درست نہیں اور نہ دونوں کو خلط ملط کرنا درست ہے۔

نیز بہت سارے مقامات پر شاہد واحد کی بنیاد پر بھی شریعت میں فیصلہ جائز ہے، لیکن خبر اور شہادت دونوں کو شریعت نے الگ، الگ مقام دیا ہے اور دونوں کو دو چیزیں شمار کیا ہے، اور ان کے مسائل میں فرق کیا ہے، جہاں خبر کی تصدیق کی بات کی گئی ہے، وہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ﴿ یاأیّھا الّذین آمنوا اِن جاء کم فاسقٌ بِنبأٍ فَتَبَیَّنُوا ﴾ (الحجرات : ٦) یہاں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ فاسق مخبر کی خبر قبول نہ کرو یعنی اگر مخبر عادل ہے، تو اس کی خبر کو بغیر وضاحت کے قبول کرلو۔

فردِ واحد کے خبر کی تصدیق ایک تاریخی حقیقت ہے، جس کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے، چنانچہ اللہ کا فرمان ہے ﴿ وَجاءَ رَجلٌ مِن اَقصیٰ المدینۃِ یَسعیٰ قالَ یاموسیٰ اِنّ المَلأَ یأتَمِرُونَ بکَ لِیَقتُلُوکَ فاخرج ﴾ (قصص : ۲۰) شہر کے دوسری جانب سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ فرعونی جماعت تمھارے قتل کا مشورہ کررہی ہے لہٰذا یہاں سے بھاگ جاؤ، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام اس خبر واحد کی بنیاد پر مصر سے نکل گئے اور ان کی جان بچ گئی، یہی نہیں بلکہ ایک خاتون کی خبر بھی قابل قبول ہوسکتی ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں موجود ہے ﴿ فَجاءَتہُ اِحداھُما تَمشِي علیٰ اسْتِحیاءٍ قالَتْ اِنَّ اَبی یَدعُوکَ لِیَجزِیَکَ اَجرَ مَا سَقَیتَ لَنا ﴾ (قصص : ۲۵) ان میں سے ایک شرماتی ہوئی چل کر آئی

---

(٦) خبر الواحد ص ر ۱۳۰ (٧) خبر الواحد ص ر ۱۱۹

اور کہا کہ میرے ابو نے آپ کو بدلا دینے کے لیے بلایا ہے، موسیٰ علیہ السلام اس خاتون کی خبر پر شُعیب علیہ السلام کے پاس گئے، لیکن ایک عورت کی شہادت عام حالات میں قابل قبول نہیں۔

ویسے بھی خبر فی نَفسِہٖ شی مطلوب ہوتی ہے، جب کہ شہادت فی نفسہ مطلوب نہیں ہوتی ہے، یہ مجرّد "بَیّنہ" اور "دلیل" کے طور پر استعمال کی جاتی ہے، تاکہ باہمی نزاع میں فیصلے کے لیے اس کو بنیاد بنایا جائے، اور فریقین کو راضی کیا جائے، نیز شہادت بیّنہ کے لیے طلب کی جاتی ہے، نہ کہ علم کے لیے، یہی وجہ ہے کہ اگر قاضی کے پاس کوئی علم ہے، لیکن شہادت اس کے خلاف ہے، تو قاضی اپنے علم سے فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اگر مطلوبہ شيء بغیر شہادت کے حاصل ہوجائے، تو شہادت کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی، مثلاً کوئی شخص جو مُدّعیٰ علیہ ہو، وہ اپنے اوپر حق کا اقرار کرلے یا اپنے جرم کو قبول کرلے، تو شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، بعض حدود میں جہاں چار شاہدوں کی ضرورت پڑتی ہے، وہاں ایک اقرار اس کے قائم مقام ہوتا ہے، یعنی چار شاہد برابر ہوئے ایک مُقِر کے اقرار کے، اس اقرار کو اگر خبر مانیں، تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مخبر، چار شاہدوں کے بالمقابل ہوسکتا ہے، اور اگر اس کو شہادت مانیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہدِ واحد قابل اعتبار ہوتا ہے، تو پھر مخبر واحد کیوں قابل اعتبار نہیں؟ اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ شہادت کا بدَل ہوسکتا ہے، لیکن خبر کا بدل نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہر مسئلے میں شہادت کی نَوعیت بدلتی رہتی ہے، اور اس کا نصاب بھی بدلتا رہتا ہے، کہیں دو آدمیوں کی شہادت کی ضرورت پڑتی ہے، یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کی ضرورت پڑتی ہے، تو کہیں چار شاہد کی، کہیں مخصوص حالات میں ایک خاتون کی شہادت سے بھی کام چل سکتا ہے، جیسے رَضاعت وعورتوں کے مخصوص حالات، کہیں فردِ واحد کی شہادت بھی قبول کی گئی ہے، جیسے رُؤیت ہلال میں، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے مُقدّمے میں بھی اسی طرح کا اشارہ ہے

﴿فَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا﴾ (یوسف: ۲۶)

اِفتراق کی اتنی ساری کیفیتوں کے ہوتے ہوئے، شہادت اور خبر دونوں کو ایک دوسرے پر

کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مقامات پر دونوں میں مُشابہت پائی جاتی ہے، لیکن اس تشابُہ سے اِشتراک لازم نہیں آتا ہے۔

علّامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے خبر اور شہادت میں فرق کو مختلف طرح سے واضح کیا ہے، نیز فرمایا ہے کہ : اللہ رب العالمین نے دین کی حفاظت کی ذمہ داری لے رکھی ہے، جب کہ ہمارے جان و مال کی حفاظت کی ذمیداری نہیں لی ہے، اسی وجہ سے بہت سارے لوگوں کی جان و مال محفوظ نہیں، لہٰذا ایک مضمون (جس کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہو) کو غیر مضمون (جس کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا گیا ہو) پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ (۸)

نیز حاکم کا فیصلہ اپنے علم کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ شاہد کی بنیاد پر ہوتا ہے، جس پر صدق کا گمان ہوتا ہے، جیسا کہ اِم سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے واضح ہے، جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا : "فَمَن قَضَيتُ بِحقِّ أخِيهِ شَيأ فَلا يأخُذه" (۹) اگر کسی کے حق کا فیصلہ میں نے دوسرے کے لیے کر دیا ہے تو وہ اس کو نہ لے، جب کہ راوی پر حکم، علم کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اِکیس وجہوں سے خبر اور شہادت کے فرق کو واضح کیا ہے۔ (۱۰)

علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ " عموماً مسلمانوں پر دین میں کچھ گھڑنے پر خوف غالب رہتا ہے، شہادتِ زور میں ایسا نہیں ہوتا ہے، نیز کبھی کبھی کسی روایت کے نقل کرنے میں ایک راوی منفرد ہوتا ہے، اگر اس کی روایت قبول نہ کی جائے، تو دین کا ایک معاملہ فوت ہو سکتا ہے، بخلاف انسانی معاملات کے، جس میں فردِ واحد کا حق فوت ہوتا ہے، بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن میں آپسی عداوت ہوتی ہے، جس کی بنیاد پر جھوٹی شہادت دینے میں ہچکچاتے بھی نہیں ہیں، جب کہ روایت میں ایسا نہیں ہوتا۔

---

(۸) خبر الواحد ص / ۱۳۷

(۹) بخاری (۷۱۸۵)، مسلم (۱۷۱۳)

(۱۰) تدریب الراوی (۱ / ۳۳۲ - ۳۳۴) نیز دیکھیے جرح و تعدیل ص / ۱۸۷

اس سے معلوم یہ ہوا کہ روایت اور شہادت میں فرق موجود ہے دونوں کا حکم یکساں نہیں، لہٰذا روایت کے باب میں شہادت کی بات کرنا مناسب نہیں اور خبر واحد کی خبر کو قبول کرنے سے کبھی یہ لازم نہیں آتا کہ شاہد واحد کی بنیاد پر ہر جگہ فیصلہ درست ہے۔

خبر واحد کا عقیدے میں حجت ہونا :

جب یہ بات صاف ہوگئی کہ خبر واحد علم ویقین کا فائدہ دیتی ہے اور جن لوگوں نے اس کو ''ظن'' قرار دیا ہے، یہ محض ایک اصطلاح ہے، اس سے مراد شکوک وشبہات نہیں بلکہ یقین واطمینان ہے، یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ تمام دینی مسائل میں خبر واحد یکساں طور پر مفید اور قابل حجت ہوگی، عقیدے اور احکام میں تفریق کرنا درست نہیں کیوں کہ اس پر کوئی شرعی دلیل نہیں۔

دورِ رسول ﷺ اور دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں شریعت کا مرجع یا تو قرآن ہوتا تھا یا سنت رسول ﷺ اور سنتِ رسول بھی اگر کوئی ایک صحابی سے سنتا اور دوسرے کو سناتا تو وہ اس کو قبول کرتے تھے، ان سے یہ کہیں بھی منقول نہیں ہے کہ انہوں نے عقیدے یا احکام میں اس سلسلے میں فرق کیا ہو، عقیدے میں عددِ کثیر کا مطالبہ کیا ہو، متواتر اور آحاد کا فرق کیا ہو، اس وقت تو ان اِصطلاحات کا وجود بھی نہیں تھا، یہی معاملہ تابعین کے دور میں بھی رہا، سب کا اس پر عملی اجماع رہا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث اگر فردِ واحد بھی بتاتا تھا تو وہ اسے جس طرح نماز، روزے کے لیے حجت مانتے تھے اسی طرح ایمان باللہ ودیگر ایمانیات کے لیے بھی حجت مانتے تھے، اس میں ذرہ برابر کی کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی، اس امر پر ایک سو سال کا عرصہ گذر گیا، پھر جب لوگوں میں اعتزال کا مزاج آیا تو اس قسم کا مزاج رکھنے والوں نے یہ تفریق کی، جو ﴿ وَمَن يُشَاقِقِ الرسولَ مِن بَعدِ ما تَبَيَّنَ لهُ الهُدىٰ وَيَتَّبِعْ غَيرَ سبيلِ المؤمِنينَ ﴾ (نساء : ۱۱۵) یعنی ہدایت واضح ہوجانے کے باوجود بھی رسول کی مخالفت اور مؤمنوں کے راستے سے ہٹنے کا عملی نمونہ تھا۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں ''تمام اہل اسلام ثقہ راوی سے منقول خبر واحد کو قبول کرتے تھے، جتنے بھی فرقے تھے سب کا عمل اسی پر تھا خواہ وہ اہل سنت میں سے ہوں یا خوارج میں سے یا شیعہ اور قدریہ میں سے حتی کہ جب معتزلہ کے متکلمین کا دوسری صدی میں ظہور ہوا تو انہوں نے اس اجماع کی مخالفت کی۔'' (۱۱)

اس کے بعد مختلف فرقے پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے مذہب کی حفاظت اور اپنی اپنی فکر کی نشر واشاعت کے لیے خبر واحد کو تنقید کا نشانہ بنایا حتی کہ فتنہ ءانکار سنت رسول جو اس طرح کے چور دروازوں سے جھانک رہا تھا چودھویں صدی میں صراحت کے ساتھ منظر عام پر آ گیا۔

محافظین سنت نبوی نے اس طرح کے فاسد مزاج کا ہر دور میں علاج پیش کیا، کتاب وسنت کی دلیلوں سے وہ نسخہ ءکیمیا دیا جس نے ہر مؤمن کے دل ودماغ کو شفا دی البتہ جن کے ایمان میں کمزوری تھی، جو سنتِ رسول کے استخفاف اور اس سے بے اعتنائی کے مرض میں مبتلا تھے، اس سے ان کے مرض میں اضافہ ہی ہوا ﴿فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا﴾ (بقرہ : ۱۰) ایسے مریضوں نے طلبِ فتنہ کے لیے ''متشابہات'' کا سہارا لیا اور طلبِ تاویل کے لیے اعتزال کی معزول شدہ عقل پر بھروسہ کیا۔

اس طرح کا مزاج رکھنے والوں کی تردید امام شافعی رحمہ اللہ نے "الرسالة" میں، امام بخاری رحمہ اللہ نے "صحیح بخاری" میں "كتاب أخبار الآحاد" میں، علامہ ابن قتیبہ نے "تاويل مختلف الحديث" میں اور اس دور کے دیگر ائمہ نے کی، ان کے بعد علامہ ابن حزم نے "الاحكام في أصول الاحكام" میں اور علامہ ابن قیم نے "مختصر الصواعق المرسلة" میں کی، دیگر علماء حدیث نے دفاع نبوی پر جو کتابیں تحریر کی ہیں ان میں حسب ضرورت اس موضوع کی وضاحت کی ہے، موجودہ دور میں علامہ محمد اسماعیل سلفی اور علامہ البانی نے اس موضوع کی وضاحت کی شیخ غازی عزیر نے ''فتنہ ءانکارِ حدیث کا نیا روپ'' کی تیسری جلد

---

(۱۱) الاحکام (۱۰۸/۱)

میں خبر واحد کے تعلق سے سیر حاصل گفتگو کی ہے، ڈاکٹر احمد محمد شنقیطی نے ایک کتاب " خبر الواحد و حُجّیتُہ " کے نام سے تالیف کی ہے، علامہ البانی کے رسائل اور مولانا محمد اسمٰعیل سلفی صاحب کے مقالات کا مجموعہ اردو زبان میں "حُجّیتِ حدیث" کے نام سے مطبوع ہیں، جن میں مختلف مزاج رکھنے والوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا گیا ہے، ہمارے ان مضامین میں جہاں بھی اِحالے میں ''حجیت حدیث'' مذکور ہے وہ اسی مجموعے کی جانب اشارہ ہے۔

خبر واحد عقیدے میں بھی حجت ہے، اس کے بعض دلائل مندرجہ ذیل ہیں :

۱ - کتاب وسنت، عمل صحابہ واقوال ائمہ اور ان کے عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے قبول خبر میں کوئی فرق نہیں کیا، بغیر کسی تفریق کے سب کا عمل اس پر رہا ہے، کتاب اللہ کی مندرجہ ذیل آیتیں اس کی تصدیق کرتی ہیں اور ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خبر واحد عقیدہ واحکام ہر جگہ قابل حجت ہے، مثلاً اللہ کا فرمان ہے ﴿ یاأیُّھا الذِّینَ آمَنُوا اِن جائَکُم فاسقٌ بِنباءٍ فَتَبیَّنُوا ﴾ (حجرات : ٦) اس سے معلوم ہوا کہ فاسق کی خبر قابل قبول نہیں لیکن عادل کی خبر قابل قبول ہے اور اس قبول کے لیے عقیدہ واحکام میں کوئی فرق نہیں۔

نیز فرمایا ﴿ فَلولا نَفرَ مِن کُلِّ فِرقۃٍ مِنھُم طائِفۃٌ لِیَتفقَّھُوا فِی الدِّین وَلِیُنذِرُوا قَومَھُم اِذا رَجعُوا اِلیھِم لَعَلّھُم یَحذَرُون ﴾ (توبہ : ۱۲۲)

اس طائفہ میں فرد واحد بھی شامل ہے اور دین میں تفقہ عقیدہ وعمل دونوں کو شامل ہے۔

نیز فرمایا ﴿ فَاسئَلُوا أھلَ الذِّکرِ اِن کُنتُم لَا تَعلمُون ﴾ (نحل : ۴۳) معلوم نہ ہو تو اہل ذکر سے معلوم کرلو۔ اگر کسی نے فرد واحد سے دریافت کیا جو اہل ذکر میں سے ہے تو اس کی بات ماننا ضروری ہے چاہے یہ معلومات عقیدے سے متعلق ہو یا احکام سے۔

اسی طرح یہ فرمان ﴿ یاأیھا الرسولُ بَلّغْ ما أُنزِلَ اِلیک مِن رَّبّک ﴾ (مائدہ : ٦٧) اس تبلیغ میں امت کا ہر فرد ضمناً شامل ہے جس کی وضاحت رسول اللہ ﷺ نے یوں کی ہے ''میری ایک، ایک بات کو لوگوں کو پہنچاؤ۔'' (۱۲) لہٰذا تبلیغ کرنے والا دین کے کسی بھی

---

(۱۲) بخاری (۳۴٦۱)

مسئلے کی تبلیغ کرے خواہ عقیدے سے متعلق ہو یا احکام سے، تو وہ مبلّغ مانا جائے گا۔

اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت اور فرماں برداری، آپ کو فیصل ماننا اور آپ جو کچھ دیں اسے مِن وعَن قبول کرنا وغیرہ کے سلسلے میں جتنی بھی آیتیں وارد ہیں سب ہی عام ہیں، کسی میں عقیدہ واحکام کی تخصیص نہیں، لہٰذا ہر باب میں یہ اطاعت وفرماں برداری قرآن کریم کی ہدایات کی روشنی میں بلاکسی تفریق کے واجب اور ضروری ہے۔

۲ – رسول اللہ ﷺ کی بے شمار حدیثیں اس سلسلے میں موجود ہیں، جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے فردِ واحد آپ کے پاس آتے تھے اور دین کی باتیں معلوم کر کے چلے جاتے تھے اور اپنی قوم کو بتاتے تھے، نیز اللہ کے رسول ﷺ نے مختلف جہات میں فردِ واحد کو دعوت وتبلیغ کے لیے بھیجا، آپ کے پاس وفود بھی آتے تھے جن کو آپ کی باتیں دوسروں تک پہنچانے کا انفرادی حکم ہوتا تھا، جن میں عقیدہ واحکام سب شامل ہوتے تھے، چناں چہ حضرت ضِمام بن ثَعلَبہ رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے تو عقیدۂ رسالت کے متعلق سوال کیا اور کہا ''آپ کے قاصد آئے اور انہوں نے بتایا کہ اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: انہوں نے صحیح کہا۔'' (۱۳) فردِ واحد کی خبر جو عقیدۂ رسالت سے متعلق دی گئی اس کو آپ نے صحیح قرار دیا، یہ نہیں کہا کہ یہ تو عقیدے کا مسئلہ ہے اس میں فردِ واحد کی بات نہیں مانی جائے گی جب تک کہ عددِ کبیر نہ بیان کریں جن کا جھوٹ پر اتفاق ممکن نہیں تب ہی اس کو صحیح مانو۔

وفدِ عبد القیس کو آپ نے عقیدۂ توحید کی باتیں بتائیں اور کہا ''انہیں یاد رکھو اور اپنے پیچھے والوں کو یہ باتیں بتاؤ۔'' (۱۴)

اسی طرح یمن کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ ہماری قوم کو دین کی تعلیم سکھانے کے لیے اپنے کسی آدمی کو ہمارے یہاں بھیجئے، چنانچہ آپ نے ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ (۱۵)

---

(۱۳) مسلم (۱۲) (۱۴) بخاری (۵۳)، مسلم (۱۷)

(۱۵) بخاری (۴۳۴۵)، مسلم (۲۴۱۹)

اور معلوم ہے کہ دین کی تعلیمات میں سب سے پہلے عقیدے کی تعلیم دی جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت فرمایا ''انہیں سب سے پہلے توحید کی دعوت دینا۔'' (۱۶)

یہاں تمام کام فردِ واحد کے ذمے کیے جارہے ہیں، ان کو تبلیغ وتعلیم کا حکم دیا جارہا ہے، عقیدے کی تعلیم، احکام کی تعلیم اور بغیر کسی تفریق کے دین کے ہر مسئلے کی تعلیم کا حکم دیا جارہا ہے، جتنے امراء وحکام کے پاس آپ نے صحابہ کو بھیجا، ہمیشہ فردِ واحد کو بھیجا، جس میں عقیدے کی تبلیغ پہلی ذمہ داری ہوتی تھی۔

لہٰذا از روئے سنت وسیرت خبرِ واحد کو عقیدہ واحکام ہر ایک میں حجت ماننا ثابت ہوا، اس کی مخالفت کرنے والا ﴿ وَمَن يُشَاقِقِ الرسولَ مِن بَعدِ ما تَبَيَّنَ لهُ الهُدىٰ وَيَتَّبِعْ غَيرَ سبيلِ المؤمِنين ﴾ میں شامل ہوگا، کیونکہ یہ تو رسول کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔

۳ - ان احادیث سے صحابہ کرام اور سلف کا طریقہ بھی واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کو جہاں بھیجتے تھے وہ وہاں جاتے اور دین کی تبلیغ کرتے تھے، انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میں تو فردِ واحد ہوں، عقیدے کی بات کیسے بتاؤں، عقیدے کے تعلق سے تو میری تبلیغ قابل قبول نہیں ہوگی؟

اس سلسلے میں علامہ ابن قیم نے جو عظیم گفتگو کی ہے ان کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ ''صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے واضح ہے کہ وہ خبر واحد سے استدلال کے تعلق سے عقائد واحکام میں تفریق کے فلسفے سے ناواقف تھے، کسی بھی صحابی سے عقیدے سے متعلق کوئی بات سنتے تو فوراً تسلیم کر لیتے اور اسے عقیدہ بنا لیتے، بعض اوقات ان کو احادیثِ احکام کے تعلق سے سمجھنے میں اگر کچھ تردد ہوتا تو اس کو معلوم کر لیتے جیسے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی خبر کے تعلق سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی خبر کے تعلق سے عمر رضی اللہ عنہ نے کیا، لیکن عقیدے سے متعلق کسی صحابی نے کسی دوسری روایت سے مدد نہ لی بلکہ وہ سب سے زیادہ ان کی قبولیت، تصدیق اور

---

(۱۶) بخاری (۱۴۵۸)، مسلم (۱۱)

مقتضی کی طرف سبقت کرنے والے تھے۔" (۱۷)

نیز ابن قیم رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا" صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور اہل حدیث واہل سنت ہمیشہ خبر واحد سے اسماء وصفات وتقدیر واحکام کے مسائل پر استدلال کرتے تھے، انہوں نے کبھی اس سلسلے میں احکام وعقیدے میں فرق نہ کیا، یہ فرق متاخرین متکلمین نے کیا ہے۔ جنہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لائے ہوئے احکام اور صحابہ کے اسوہ سے کوئی مطلب نہیں، کتاب وسنت اور عمل صحابہ سے انحراف کرنے والے متکلمین کے اقوال پر ہی بھروسہ کریں گے۔" (۱۸)

ایسے لوگوں کا قول باطل ہے حق یہ ہے کہ خبر واحد شریعت کے ہر باب میں خواہ اس کا تعلق عقیدے سے ہو یا احکام سے، قابل قبول، قابل حجت اور یکساں طور سے مفید علم وعمل ہے۔

طلب دلیل :

۱ - جو لوگ ایسا نہیں مانتے بلکہ اسے غیر مفید اور ناقابل حجت قرار دیتے ہیں، ان لوگوں سے سب سے پہلے یہ مطلوب ہے کہ آخر وہ کون سی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ دلیلیں ہیں جن کی بنیاد پر یہ تفریق کی جاتی ہے کہ خبر آحاد احکامات میں تو قابل حجت ہے لیکن عقیدے میں نہیں کیوں کہ یہ ایک عقیدہ ہے عمل نہیں اور عقیدے کے لیے بقول ان لوگوں کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ دلیلوں کا ہونا ضروری ہے، وہی دلائل یہاں بھی معیار ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس پر کوئی دلیل نہیں محض عقلی وسوسے ہیں، لہٰذا یہ عقیدہ دین میں ایک محدث عقیدہ ہے جو بزبان رسول ﷺ "مَن أحدثَ فِي أمرِنا هذامالَيسَ مِنهُ فَهُوَ رَدّ" (۱۹) کی بنیاد پر مردود ہے۔ (۲۰)

جن دلائل کا ذکر خبر آحاد کے ظنی ہونے کے بارے میں کیا گیا ہے اور جن شکوک وشبہات کا اظہار کیا جارہا ہے اس کی تردید پہلے "خبر آحاد کا ظنی ہونا" کے عنوان کے تحت گذر چکی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں، نص کے مقابلے میں قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔

---

(۱۷) الصواعق المرسلۃ (۲/۳۶۱-۳۶۲)، نیز دیکھیے فتنہ انکار حدیث کا نیا روپ (۲/۱۷۵)

(۱۸) مختصر الصواعق المرسلۃ (۲/۴۱۲) (۱۹) متفق علیہ (۲۰) حجیت حدیث ص ۲۳

۲ - دوسری بات یہ ہے کہ اگر خبر واحد عقیدہ میں قابل حجت نہیں تو احکام شریعت میں کس وجہ سے قابل حجت ہوگی؟ یہ تو عجیب تضاد ہے کہ ایک چیز شکوک وشبہات کے دائرے میں بھی ہے اور قابل عمل بھی، لہٰذا یہ تفریق فی نفسہ باطل ہے، آخر وہ کون سی قطعی دلیل ہے جس کی بنیاد پر یہ تفریق کی گئی ہے اور اس تفریق کا ضابطہ کیا ہے کہ خبر واحد سے کب اور کہاں دین کا معاملہ ثابت کرنا درست ہے اور کہاں درست نہیں، نیز کہاں قطعی علم مطلوب ہے اور کہاں ظنی؟ حقیقت یہ ہے کہ اس سے کوئی چیز ثابت نہیں کی جاسکتی؟ (۲۱)

بہت سارے وہ حضرات جو خبر آحاد کو عقیدے میں حجت نہیں مانتے خود عملاً وہ خبر واحد سے اپنے موقف پر استدلال کرتے ہیں، یہی حال فقہاء کا ہے جہاں مذہب کی کسی بات کی تائید ہورہی ہو وہاں ضعیف حدیث بھی قابل حجت ٹھہر جاتی ہیں اور جہاں موقف کی تائید نہیں ہورہی ہو وہاں صحیح حدیث بھی رد کردی جاتی ہے، ایسے ہی یہ منکرین خبر واحد بھی خبر واحد سے منقول عقیدے جیسے عذاب قبر، سوال منکر ونکیر، رؤیت باری تعالیٰ، حوض کوثر اور پل صراط وغیرہ کو جو عقیدے سے متعلق ہیں، قبول کرتے ہیں۔ (۲۲)

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا مزاج رکھنے والوں کا اصل مقصد ردِ حدیث ہے جو انہوں نے قدریہ ومعتزلہ سے لیا ہے، ان لوگوں کو جب اپنے عقیدے سے متعلق خبر آحاد مل جاتی ہے تو اس سے استدلال کرتے ہیں، مثلاً اہل قدر "كُلّ مَولودٍ يُولَدُ على الفِطرة" (۲۳) سے استدلال کرتے ہیں، رافضہ "اِنک لا تدری ما أحدثُوا بعدَک" (۲۴) سے استدلال کرتے ہیں اور خوارج "سِباب المسلمِ فُسوق وَقِتالُه كُفر" (۲۵) سے استدلال کرتے ہیں۔ (۲۶)

---

(۲۱) خبر الواحد ص ۲۰۳
(۲۲) خبر الواحد وحجیتہ ص ۲۰۹
(۲۳) بخاری (۱۳۸۵)، مسلم (۲۶۵۸)
(۲۴) بخاری (۴۷۴۰)، مسلم (۲۴۷)
(۲۵) بخاری (۴۸)، مسلم (۶۴)
(۲۶) مختصر الصواعق المرسلہ (۲/۴۰۶)

پھر وہ کون سا پیمانہ ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ خبر واحد کو عقیدے میں کب قابل حجت سمجھا جائے اور کب نہ سمجھا جائے؟ اس عمل سے تو یہ ظاہر ہے کہ خود تم کو اپنے عقیدے پر اعتبار نہیں اور تمہارا مقصد صرف حدیث رسول ﷺ سے دامن بچانا ہے، لہٰذا پہلے جو بات گذر چکی کہ خبر واحد یقین کا فائدہ دیتی ہے اس لیے ہر جگہ قابل حجت ہے خواہ عقیدہ ہو یا احکام، یہی تمام متقدمین محدثین اور ائمہ اربعہ کا کہنا ہے، جیسا کہ گذر چکا، اگر اس میں کوئی فرق ہوتا تو ضرور یہ فرق رسول اللہ ﷺ یا صحابہ سے منقول ہوتا۔

۳ - جن لوگوں نے عقیدے اور احکام کا فرق کیا ہے ان کی بنیاد یہ ہے کہ عقیدہ عمل کو شامل نہیں اور عملی احکام عقیدے کو شامل نہیں، حالاں کہ یہ دونوں باتیں باطل ہیں، جس طرح عملی مسائل میں علم اور عمل مطلوب ہوتا ہے اسی طرح علمی مسائل میں بھی علم اور عمل مطلوب ہوتا ہے بس فرق یہ ہے کہ عملی مسائل میں عمل جوارح مطلوب ہوتا ہے اور علمی مسائل میں عمل قلب مطلوب ہوتا ہے، لہٰذا علم وعمل دونوں لازم وملزوم ہیں، اس طرح عقیدہ عمل قلب کو شامل ہے اور عمل جوارح عقیدے کو۔

جتنے بھی احکام شرعیہ ہیں ان میں کوئی نہ کوئی عقیدہ پایا جاتا ہے، مثلاً جب ایک شخص وضو کرتا ہے، نماز ادا کرتا ہے تو اس کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ عمل فرض ہے اور یہ اللہ کا حکم ہے، ورنہ اگر وہ عقیدہ نہ رکھے اور وضو صرف نظافت سمجھ کر کرے، نماز تندرستی اور ورزش کے لیے پڑھے تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ (۲۷)

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ خبر واحد سے ہم حلال وحرام کو تو قبول کر لیں، اس کو آخرت میں نجات کا ذریعہ بنائیں اور اس پر یقین رکھیں لیکن عقیدے کو خبر واحد سے قبول نہ کریں، حالاں کہ بہت سی عملی حدیثیں ایسی بھی ہیں جن میں عقیدہ واضح طور سے مذکور ہوتا ہے، اب اگر کوئی مؤمن وہ عمل کرے لیکن اس میں موجود عقیدے کو قبول نہ کرے تو یہ کس عقل میں آنے والی بات ہے مثلاً

---

(۲۷) حجیت حدیث، ص ۳۹۔۴۰

اللہ کے رسول ﷺ نے تشہدِ اخیر میں یہ دعا پڑھنے کو کہا ہے " اللّٰھمَّ إنّی أعُوذُبِکَ مِنْ عَذابِ القَبرِ وَعَذابِ النّارِ وَمِن فِتنَۃِ المَحیا وَالمَماتِ" (۲۸) اوردعائے جنازہ میں "اللّٰھمَّ أبْدِلْہُ داراً خَیراً مِن دارِہِ وَأھلاً خیراً مِن أھلِہ وَقِہِ مِن فِتنَۃِ القَبرِ وَعذابِ النار" (۲۹) اگر مسلمان یہ دعا کرے لیکن اس پر عقیدہ نہ رکھے تو پھر اس عمل سے کیا فائدہ؟

۴ - اگر کوئی شخص ان حضرات کے قول کے برعکس دعویٰ کرے اور یہ کہے کہ خبرِ واحد عقیدے میں تو حجت ہو سکتی ہے لیکن احکام میں نہیں ہو سکتی، تو اس کی تردید کیسے کریں گے؟ اگر وہ یہ کہے کہ عقیدہ انسان کی ذات سے متعلق ہوتا ہے، اس کا فساد اور نقصان دوسروں تک نہیں پہنچتا، لیکن عمل کا تعلق معاشرے سے ہوتا ہے اس کا فساد دوسروں کو نقصان پہنچا سکتا ہے، مثلاً ایک بدکار اگر زنا کرتا ہے، چوری کرتا ہے، رہزنی کرتا ہے، ظلم وستم کرتا ہے، قتل وغارت گری کرتا ہے تو اس سے پورے معاشرے کو نقصان ہوگا، اس اعتبار سے احکام عقیدے سے اہم ہوتے ہیں، لہٰذا عقیدے کے لیے تو خبرِ واحد حجت ہے لیکن احکام کے لیے نہیں، تو اس کا جواب کیا ہوگا؟ جو جواب آپ دے سکتے ہیں اس کو وہ آپ کی طرف واپس کر سکتا ہے۔

لہٰذا اس بنیادی مسئلے کو سلجھانے کے لیے دلیلوں کی ضرورت ہوگی جس کی دلیل بہتر اور قوی ہوگی اس کی بات مقبول ہوگی، ورنہ مجرد قول سے کچھ حاصل نہیں، جن لوگوں نے دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا ہے، کتاب وسنت، عملِ صحابہ اور اقوالِ ائمہ سے انہی کے قول کی تائید ہوتی ہے، اس سلسلے میں بعض دلائل آگے آرہے ہیں۔ (۳۰)

۵ - ان حضرات کے کہنے کے مطابق عقیدے کے لیے متواتر روایت جو قطعی الثبوت ہوتی ہے، وہی قابلِ قبول ہے، کیا ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ متواتر روایت کی بنیاد خبرِ واحد پر ہے، کیوں کہ کسی بھی حدیث کے تواتر کی خبر کوئی محدث دیتا ہے، پہلے یہ محدث کسی مسئلے کی تمام روایات کے طرق واسانید کو جمع کرتا ہے پھر یہ عقیدہ قائم کرتا ہے کہ یہ متواتر ہے اور پھر اس کی خبر دیتا ہے۔

---

(۲۸) بخاری (۱۳۷۷) (۲۹) نسائی (۴/۷۳)، ابن ماجہ (۱۵۰۰) (۳۰) حجیت حدیث/ص ۴۱

جب ایک محدث کا قول کہ فلاں حدیث متواتر ہے، قابل حجت (جو خبر واحد کے ذریعے سے معلوم ہوئی ہے) ہے اور اس کی بنیاد پر یہ حدیث عقیدے اور احکام دونوں کے لیے قابل حجت ہے، تو ایک محدث یا ایک راوی جس حدیث کو بیان کرتا ہے وہ کیوں شکوک وشبہات کے دائرے میں آ گئی، محدث کے قول کا متواتر کے ثبوت کے لیے قبول کرنا اس امر کو مستلزم ہے کہ اس کی بیان کردہ روایت بھی ہر مسئلے کے لیے قابل حجت ہو، اگر یہاں اس سے وہم اور بھول کا امکان ہے تو یہ امکان متواتر کے سمجھنے میں اور اس کے کہنے میں بھی ہے، پھر کس بنیاد پر ان کا قول تو مقبول ہے لیکن ان کی روایت مقبول نہیں۔

غالباً یہی بنیادی وجہ ہے کہ محدثین نے اپنے اصولوں میں خبر آحاد کو ہی بنیاد بنایا ہے، متواتر اس میں ایک دخیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۶ — کسی بھی دلیل کا قطعی اور ظنی ہونا ایک اضافی امر ہے، کوئی حقیقی صفت نہیں ہے، یہ استدلال کرنے والوں کی حیثیت کے اوپر ہوتا ہے، ایک چیز کسی کے لیے قطعی ہے تو کسی کے لیے ظنی، جب ایک شخص کسی علم سے تعلق رکھتا ہے، اس میں معلومات رکھتا ہے اور مہارت حاصل کرتا ہے تو اس کو اس علم میں قطعی علم حاصل ہوتا ہے، دوسرا شخص جو اس علم کو نہیں جانتا اور نہ جاننے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اس سے عداوت ونفرت رکھتا ہے تو اس کو اس فن میں قطعی علم اور یقین کہاں سے حاصل ہوگا؟ لہٰذا محدثین اور راویانِ حدیث جنہوں نے حدیثِ رسول ﷺ کے حصول، اس کی معرفت، طرق واسانید اور راویوں کے حالات پر اطلاع کے لیے زندگی صرف کر دی، ان کو اس فن میں قطعی علم حاصل ہوگیا، ان کے دلائل سے ان کو یقین کامل حاصل ہوگیا، اب ضروری نہیں کہ دوسروں کو بھی اس پر یقین ہوجائے ﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَّ شِفَاءٌ﴾ (فُصّلت: ۴۴) قرآن کریم صاحبِ ایمان کے لیے ہدایت اور شفا ہے، صاحبِ کفر کے لیے نہیں، کیوں کہ صاحبِ ایمان ہی کو اس پر یقین، اعتماد اور قطعیت حاصل ہے، جو قرآن سے مطلب نہیں رکھتا، اس کو قرآن سے ہدایت بھی نہیں مل سکتی، اس لیے "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" کہا ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ صحیح حدیثیں علم کا فائدہ نہیں دیتیں، کیوں کہ یہ ظنی ہیں'' اس سے وہ اپنی جہالت کی خبر دے رہے ہیں کہ انہوں نے اس خبر کو ان طریقوں سے حاصل نہیں کیا جن طریقوں سے اہل سنت نے حاصل کیا ہے، کسی چیز کو جاننے والا اور نہ جاننے والا یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (زُمر : ۹) (۳۱)

خبر واحد کا مطلق حجت ہونا :

خبر واحد کی حجیت کا انکار کرنے والی ایک جماعت وہ ہے جو یہ کہتی ہے کہ خبر واحد اصل یا فرع (عقیدہ واحکام) کسی میں بھی قابل حجت نہیں، قابل حجت صرف خبر متواتر ہے، یہ قول روافض اور معتزلہ سے تعلق رکھنے والے بعض افراد کا ہے جن کے خیالات سے چند دیگر افراد بھی متاثر ہو گئے تھے۔ (۳۲)

ان لوگوں نے خبر واحد کی ظنیت کو اپنے اس عقیدے کے لیے بنیاد بنایا ہے، نیز بعض کمزور دلائل کا سہارا لیا ہے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں : منکرین کا تیسرا گروہ وہ ہے جو متواتر کو قبول کرتا ہے اور آحاد کو رد کرتا ہے خواہ اس کا تعلق احکام سے ہو یا عقیدے سے۔ (۳۳)

یہ گروہ اس جماعت کے ساتھ اس نقطے پر متفق ہے کہ خبر واحد ظنی ہے اور جس ظنیت کو بنیاد بنا کر ان لوگوں نے عقیدے کے مسائل سے ہاتھ اٹھالیا اور یہ کہا کہ ظنی ہونے کی وجہ سے خبر واحد عقیدے میں قابل حجت نہیں ہے، اسی بنیاد پر ان لوگوں نے یہ کہا کہ یہ ظنی ہے لہٰذا دین کے کسی بھی مسئلے میں قابل قبول نہیں، نہ اصل میں اور نہ فروع میں۔

---

(۳۱) مختصر الصواعق المرسلۃ (۲/ ۴۳۲)، حجیت حدیث/ص ۵۰ (۳۲) خبر الواحد/ص ۲۵۲

(۳۳) مختصر الصواعق (۲/ ۴۳۵)

عقیدے سے متعلق خبر واحد کے منکرین کا رد اور ان کا جواب گذر چکا ہے اور یہ مرکزی نقطہ جسے ان لوگوں نے اپنے عقیدے کے لیے بنیاد بنایا ہے کہ خبر واحد ظنی ہے لہٰذا قابل قبول نہیں، اس کی بھی مکمل وضاحت گذر چکی ہے اور یہ مسئلہ بالکل واضح ہو گیا کہ ظنی ہونے کا مطلب ناقابل اعتبار، مشکوک اور موہوم ہونا نہیں بلکہ یہ یقین کے معنی میں ہے، جس ظن سے قرآن نے منع کیا ہے وہ اس ظن کے دائرے میں شامل نہیں بلکہ اس ظن کے دائرے میں آتا ہے جو پسندیدہ ہے اور جو یقین کے معنی میں آتا ہے، اور جب یہ یقین کے معنی میں آتا ہے تو اس کا دین کے ہر مسئلے میں قابل حجت ہونا بھی یقینی ہے، اس سلسلے میں جن قرآنی نصوص، سنت نبوی، عمل صحابہ اور ائمۂ دین کے اقوال کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے بصراحت یہ ثابت ہوتا ہے کہ امت کو خبر واحد کے قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ قابل یقین و حجت ہے۔

یہ دلائل ان دونوں فریقوں کے لیے کافی ہیں : جو عقیدے میں حجت نہیں مانتے، ان کے لیے بھی اور جو کسی بھی مسئلے میں حجت نہیں مانتے ان کے لیے بھی، لہٰذا ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

پتہ نہیں ان لوگوں کو کس بنیاد پر خبر واحد کے نام سے چڑ ہے، جب کہ خبر متواتر کے وجود کے لیے خبر آحاد کا ہونا ضروری ہے، آحاد کی حیثیت بنیاد کی ہے اور متواتر کی حیثیت فرع کی ہے، جس کی بنیاد کمزور ہوگی اس کی فرع کیسے مضبوط ہو سکتی ہے، اگر یہ خبر آحاد قابل حجت نہیں تو وہ متواتر بھی قابل حجت نہیں ہوگی، جو خدشات یہاں ہیں وہی وہاں بھی ہو سکتے ہیں، اگر خبر آحاد انفرادی طور سے مشکوک اور موہوم ہوگی، شبہات اور ناقابل اعتبار کے دائرے میں آئے گی تو اس کا مجموعہ قابل اعتبار، قابل یقین اور علم بدیہی کے لائق کیسے بن جائے گا؟ اگر خبر آحاد پر زلزلہ آیا تو خبر متواتر جو ان آحاد کے مجموعے کا نام ہے، زمیں بوس ہو جائے گی، لہٰذا خبر آحاد کی اہمیت، افادیت اور قبولیت کو سمجھنا چاہیے۔

منکرین کے دلائل اور جواب :

بہرحال منکرین آحاد نے بزعم خُویش کچھ دلائل کا تذکرہ کیا ہے جن کی حیثیت واضح کر دینا ضروری ہے۔

۱ - ان کی پہلی دلیل قرآن کریم کی وہی آیتیں ہیں جن سے مانعین عقیدہ نے استدلال کیا ہے یعنی ﴿ لا تقفُ مالَیسَ لکَ بہِ علم ﴾ (بنی اسرائیل : ۳۶) ﴿ اِن یتبِعونَ اِلا الظنَّ وَاِنَّ الظنَّ لا یُغنِی مِن الحقِّ شیئاً ﴾ (نجم : ۲۸)

اس استدلال کی کمزوری کو "خبر واحد کی ظنیت کی حقیقت" میں واضح کیا جا چکا ہے، ظن کا معنی و مفہوم کیا ہے، قرآن میں اس کا استعمال کس معنی میں ہوا ہے، محدثین نے اس کا استعمال کس پس منظر اور کس مفہوم میں کیا ہے ؟ یہ سب باتیں گذر چکی ہیں، لہٰذا اعادے کی کوئی ضرورت نہیں، مختصراً یہ سمجھنا چاہیے کہ : مذکورہ آیتوں میں اللہ رب العالمین نے انسانوں کو "جس چیز کی خبر نہیں، اس کی شہادت دینے" سے منع کیا ہے اور "جس چیز کا علم نہیں، اس پر عمل کرنے" سے منع کیا ہے، جیسے کہ مشرکین عرب بغیر علم کے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے۔

ان آیتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر کوئی فردِ واحد خبر لائے تو اس کو رد کر دیا جائے ، قرآن کی دیگر آیتیں فرد واحد کی خبر کی مقبولیت کا حکم دیتی ہیں، قرآن کریم میں جس ظن کی مذمت کی گئی ہے وہ ظن، جہالت، عدم علم، شکوک وشبہات کے معنی میں ہے، جیسا کہ آیت مذکورہ میں ہے، لیکن قرآن ہی میں ظن کی تعریف بھی کی گئی ہے اور اس کو یقین کا معنی دیا گیا ہے، یہ وہ ظن ہے جو علم کی بنیاد پر ہوتا ہے جیسا کہ راویان حدیث علم کی بنیاد پر حدیثیں بیان کرتے ہیں، یہ راویان جو خبریں دے رہے ہیں یہ خود ثقہ، عادل، قابل قبول ویقین ہوتے ہیں اور جن سے خبر سنتے ہیں وہ بھی اسی طرح ثقہ اور عادل ہوتے ہیں، لہٰذا ان کی خبریں علم کی بنیاد پر ہوتی ہیں اسی لیے مقبول اور مفید علم ہیں، یہاں شکوک وشبہات کی گنجائش نہیں لہٰذا قرآن کریم کی وہ آیتیں جو ظن کی مذمت کرتی

ہیں ان پر صادق نہیں آتیں، یہ ان لوگوں پر صادق آتی ہیں جو بغیر علم کے خبر واحد کی حجیت کا انکار کرتے ہیں، راویان حدیث پر تو وہ آیتیں صادق آتی ہیں جو ظن کی تعریف کرتی ہیں اور اسے یقین کا درجہ دیتی ہیں۔

۲ - دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر اس سے فروع (احکام) میں استدلال جائز ہوتا تو اصول (عقیدہ) میں بھی جائز ہوتا اور ہمارے اور آپ کے درمیان اجماع ہے کہ عقیدے میں قابل حجت نہیں، لہٰذا احکام میں بھی نہیں۔ (۳۴)

اس دلیل کا جواب اور اس کی کمزوری ''خبر واحد کے عقیدہ واحکام میں حجت ہونے'' کے تحت گذر چکی ہے اور یہ وضاحت بھی ہو چکی ہے کہ خبر واحد عقیدے (اصول) اور احکام (فروع) دونوں میں یکساں طور پر قابل حجت ہے، اس کے مختلف قرآنی وعقلی دلائل کا تذکرہ بھی گذر چکا ہے، جن لوگوں نے عقیدے اور احکام میں فرق کیا ہے ان کا قول مردود ہے، نیز عقیدے میں خبر واحد کو حجت نہ ماننے پر اجماع نہیں ہے بلکہ یہ چند افراد کا قول ہے، اس پر اجماع کا دعویٰ کرنا باطل ہے، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ نے ان لوگوں کے قول کی تردید کی اور یہ کہا کہ جن لوگوں نے اجماع کے دعوے کی بنیاد پر خبر واحد کو رد کر دیا ہے ان کا قول باطل ہے، امام احمد کہتے ہیں ''جس نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا وہ جھوٹا ہے، یہ تو بشر مُرَیسی اور اَصَم کا دعویٰ ہے۔'' (۳۵)

علامہ ابن قیّم کہتے ہیں ''رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف اجماع کا تصور ہی ناممکن ہے اور نہ ایسا کبھی ہوا ہے۔'' (۳۶)

آں جناب مزید فرماتے ہیں ''ایک گروہ (منکرین خبر آحاد کا) وہ ہے جن کو احادیث کا علم نہیں، اپنے عدم علم کو انہوں نے اجماع کا نام دے دیا ہے اور اسی بنیاد پر بہت سی حدیثوں کو رد کر دیا ہے۔'' (۳۷)

---

(۳۴) خبر الواحد وحجیتہ ص ۲۵۳ (۳۵) مختصر الصواعق (۴۴۰/۲)
(۳۶) مصدر سابق (۳۷) مختصر الصواعق (۴۳۹/۲)

معلوم ہوا کہ ان کا اجماع کا دعوی کرنا باطل ہے، اجماع ان کے دعوے پر نہیں بلکہ اجماع ان کے قول کے برخلاف ضرور ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دورِ رسول ﷺ سے لے کر دوسری صدی ہجری تک بغیر کسی تفریق کے خبر واحد کو صحابہ کرام وسلف صالحین نے قبول کیا ہے، انہوں نے نہ اصول وفروع کا فلسفہ بگھارا اور نہ عقیدہ واحکام میں تفریق کی، یہ تفریق پہلی صدی کے خاتمے کے بعد کی پیداوار ہے۔

۳ - ان حضرات کی ایک دلیل صحابی رسول حضرت ذوالیدین رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے جس میں یہ ہے کہ "اللہ کے رسول ﷺ نے ایک دن چار رکعت والی نماز کو صرف دو ہی رکعت ادا کیا، تمام صحابہ کرام میں صرف حضرت ذوالیدین رضی اللہ عنہ نے یہ سوال کیا: کیا نماز میں کمی کر دی گئی یا آپ بھول گئے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے جواب دیا: نہ میں بھولا اور نہ ہی نماز میں کوئی کمی ہوئی ہے، تب انہوں نے کہا: آپ ضرور بھولے ہیں، تو اللہ کے رسول ﷺ نے وہاں موجود صحابہ سے پوچھا: کیا ذوالیدین صحیح کہہ رہے ہیں؟ بعض صحابہ جن میں ابوبکر اور عمر بھی تھے انہوں نے ان کی تصدیق کی، تو آپ نے دو رکعتیں مزید پڑھیں اور سجدۂ سہو کیا۔

محل شاہد اس طرح سے ہے کہ اگر خبر واحد قابل حجت ہوتی تو آپ دوسروں سے دریافت نہ کرتے بلکہ ان کی بات مان کر نماز مکمل کر لیتے۔

ان حضرات پر اردو کا یہ مقولہ کس طرح صادق آتا ہے "اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی" انہوں نے اپنے اس دعوے پر کہ خبر واحد قابل حجت نہیں ہوتی جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ خود خبر واحد ہے، اگر خبر واحد قابل حجت نہیں ہوتی ہے تو جناب یہ خبر واحد آپ حضرات کے لیے کس طرح قابل حجت ہو گئی؟ بریں عقل ودانش بباید گریست۔

اگر دو صحابہ نے ان کی تصدیق کر دی تو بھی تو یہ خبر متواتر نہیں ہوئی، آحاد ہی کے درجے میں رہی تو پھر یہ کیسے قابل حجت ہو سکتی ہے، اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے دل کو سکون نہیں اور آپ کا دل فطری طور سے خبر واحد کو قابل حجت تصور کرتا ہے تب ہی اس سے استدلال کیا۔

افسوس تو یہ ہے کہ ان حضرات کو رسول اللہ ﷺ کی مکمل زندگی اور آپ کی سیرت میں صرف یہی ایک روایت نظر آئی جسے اپنے موقف کے لیے بطور دلیل پیش کرسکیں، بقیہ وہ تمام روایتیں جن میں آپ نے فرد واحد کی خبر پر اعتماد کیا اور فرد واحد کو خبر دینے کے لیے بھیجا جو ایک دو واقعات نہیں بلکہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں ان پر ان کی نگاہ نہیں پڑی، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلوں میں چور موجود ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات سنت رسول پر عمل کرنا نہیں چاہتے اس لیے خبر واحد کا شوشہ نکال کر عدم اعتماد کا بہانہ بنایا۔

خود مذکورہ روایت دو طرح سے اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے خبر واحد پر اعتماد کیا، پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر خبر واحد قابل اعتبار نہ ہوتی تو اللہ کے رسول ﷺ ذوالیدین کی خبر کو لا پرواہی سے اڑا دیتے اس پر کوئی توجہ نہ دیتے، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ آپ نے اس کا اعتبار کیا اسی لیے آپ نے تصدیق طلب کی اور تصدیق کی ضرورت اس وجہ سے آئی کہ اتنی بڑی تعداد میں سے کوئی کچھ نہیں کہہ رہا ہے خود اللہ کے رسول ﷺ کا علم ان کے علم سے متعارض ہے، آپ نے فرمایا تھا ''نہ تو میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کوئی کمی کی گئی ہے'' لہٰذا یہاں تعارض کا وقوع ہو رہا تھا جس کی تطبیق کی صورت اختیار کرتے ہوئے آپ نے ترجیح کے لیے امر خارجی کا سہارا لیا اور دوسرے لوگوں سے تصدیق کرائی کسی وجہ سے اگر کسی خبر میں شبہ ہو جائے تو تصدیق کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ ذوالیدین کی خبر کی تصدیق اگر دو چار صحابہ نے کر بھی دی تو اس سے یہ خبر متواتر کے درجے کو نہیں پہنچتی بلکہ خبر واحد ہی رہی اور رسول اللہ ﷺ کا نماز مکمل کرنا اصلاً خبر واحد کی بنیاد پر ہی ہوا، لہٰذا منکرین کو چاہیے کہ اس طرح کی حدیثوں پر عمل کرتے ہوئے خبر واحد کو قبول کرلیں اور اس حدیث کو خبر واحد کی حجیت کے لیے دلیل بنائیں۔

خبر واحد کی حجیت پر کتاب، سنت اور سیرتِ صحابہ میں بے شمار دلائل موجود ہیں، ان میں سے بعض کا تذکرہ سابقہ بحثوں میں گذر چکا ہے لہٰذا اعادے کی کوئی ضرورت نہیں، حقیقت پسندی

سے کام لیتے ہوئے اس کو قبول کرنا چاہیے۔

۴ - ان حضرات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعض صحابہء کرام مثلاً ابوبکر صدّیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے خبر واحد کو قبول نہیں کیا، چنانچہ جب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ''جدّہ'' کی وراثت والی حدیث سنائی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی تصدیق تلاش کی، جب محمد بن مَسلَمہ رضی اللہ عنہ نے اس کی تصدیق کی تب اس پر عمل کیا۔ (۳۸)

ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی "حدیث اِستیئذان" کو قبول نہ کیا بلکہ انہیں تصدیق لانے کا حکم دیا۔ (۳۹)

کچھ اور صحابہ سے اس طرح کے واقعات منقول ہیں جن سے ان حضرات نے یہ استدلال کیا ہے کہ صحابہء کرام خبر واحد کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے۔

ان کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں صحابہء کرام کا مقام ہو وہ ان کے قول وعمل کی اہمیت کو سمجھتے ہوں، وہ لوگ اگر ان سے استدلال کریں تو دل اس کو قبول کرتا ہے، لیکن روافض ومعتزِلہ جیسے لوگ جو خبر واحد کی حجیت کے منکر ہیں اور جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے نفرت اور عداوت رکھتے ہیں ان کی حدیثوں کو قابل عمل نہیں سمجھتے اور نہ ہی ان کو قابل اطمینان مانتے ہیں، ایسے لوگ صحابہ کے عمل کی باتیں کریں تو عجیب سا لگتا ہے، ایسے حواس باختہ لوگ جن کا عقیدہ ہی صحابہ کے بارے میں صحیح نہیں تو اتنے اہم مسئلے پر ان سے کس طرح استدلال کر سکتے ہیں یہ عجیب بات ہے ''جس کو صحیح نہ جانو'اس کو دلیل میں پیش کرو۔''

ان لوگوں کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے کہ خبر واحد کی حجیت کے تعلق سے جو واضح دلیلیں صحابہء کرام کی قدم قدم پر موجود ہیں وہ نظر نہیں آتیں لیکن اگر کہیں کوئی ایسا واقعہ پیش آ گیا جس سے کسی صورت سے اپنی بات کی تائید ہو سکتی ہے تو وہ ضرور مل جاتا ہے۔

---

(۳۸) سنن ابی داود (۳/۳۱۶، ۲۸۹۴)، ترمذی (۲۱۰۱)، ابن ماجہ (۲۷۲۴)

(۳۹) موطا (۲/۹۶۴)

مذکورہ واقعات ان کے مدعا پر دلالت بھی نہیں کرتے کیوں کہ صحابۂ کرام نے اگر کبھی کسی کی روایت میں توقف کیا ہے یا تصدیق طلب کی ہے تو اس کی بنیاد یہ نہ تھی کہ خبر واحد قابل حجت نہیں، صحابہ کی زندگی میں حدیثِ رسول پر عمل کرنے کے لیے متواتر اور آحاد کا فرق تھا ہی نہیں تو پھر کس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خبرِ واحد کی بنا پر انہوں نے کسی کی روایت رد کی ہے، اس طرح کے جو واقعات ہوئے ہیں تو ان کا مقصد یہ تھا کہ حدیث رسول کے بیان کرنے میں احتیاط کا درس دیا جائے، اس سے مزید اطمینان حاصل کرنا مقصد تھا خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے یہی کہا تھا ''ایسا نہیں کہ مجھے آپ پر اعتماد نہیں لیکن مجھ کو خوف تھا کہ کہیں اس طرح لوگ غلط بیانی نہ کرنے لگیں۔'' (۴۰)

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے انہوں نے یہ کہا ''میں آپ پر اتہام نہیں لگاتا لیکن میرا مقصد مزید اطمینان حاصل کرنا تھا۔'' (۴۱)

حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث سنی ہے ''جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے؟'' کہا: ہاں، تو حضرت عمر نے کہا: اگر یہ جانتے ہو تو جا کر حدیثیں بیان کرو۔'' (۴۲)

معلوم یہ ہوا کہ مجرّد احتیاط کی بنا پر ایسا کیا جاتا تھا نہ کہ اس بنیاد پر کہ یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد قابل اعتبار نہیں، احتیاط کا درس اس امر پر تھا کہ حدیث رسول کے بیان کرنے میں عجلت پسندی سے کام نہ لیں اور بیان کے وقت بہت محتاط رہیں۔

ایک خاص بات اور ہے وہ یہ کہ ان حضرات نے مذکورہ صحابہ کی روایت کو رد نہیں کیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کی روایت کو بنیاد بنا کر دوسروں سے دریافت کیا گیا تھا ورنہ اگر وہ قابل رد ہوتیں تو اس پر شہادت طلب کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ جب وہ مردود ٹھہری تو دوسرے صحابی کی روایت اس کو مقبول کیسے کر دے گی؟ اگر کسی صحابی نے دوسرے صحابی کی روایت کی تصدیق کر دی تو اس سے

---

(۴۰) مؤطا (۲/۹۶۴) (۴۱) تذکرۃ الحفاظ: ۱/۸

(۴۲) سیر اعلام النبلا (۲/۲۰۳) وفیہ ضعف

یہ روایت متواتر تو نہیں ہوگئی بلکہ خبر آحاد ہی ہے، صحابہ کا اس شکل میں اس کو قبول کرنا اس امر پر شاہد ہے کہ وہ حضرات خبر واحد کو قبول کرتے تھے، اگر کسی صحابی کی روایت کو اس وجہ سے ۔ بقول ان حضرات ۔ رد کر دیا گیا تو اس صورت میں اعتبار دوسرے صحابی کی روایت پر ہوا، ایسی صورت میں فردِ واحد کی روایت پر عمل ہوا، اس سے بھی خبر واحد کے حجت ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

بہت سارے واقعات خود حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی سیرت میں ایسے موجود ہیں جہاں انہوں نے فرد واحد کی روایت کو بلا توقف قبول کیا ہے، شیخ غازی عزیر نے اس طرح کے کچھ واقعات کا ذکر اپنی گراں قدر تالیف میں کیا ہے، اس کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ (۴۳)

اگر حقیقت میں اُسوۂ صحابہ سے محبت ہے اور اس کو قابل استدلال سمجھتے ہیں تو ان کی سیرت کا مطالعہ کریں، ان شاء اللہ ہر چیز واضح ہو جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے کسی بھی صحابی کی روایت کو اس بنیاد پر رد نہیں کیا ہے کہ وہ خبر واحد ہے، بلکہ ان کا کوئی اور مقصد ہوتا تھا جیسے کہ وضاحت ہو چکی ہے۔

☆☆☆

---

(۴۳) فتنہ انکارِ حدیث کا نیا روپ (۴۱/۳۔۶۲)

تعارض کا دفاع

تعارض : دو مقبول حدیثوں کا مفہوم بظاہر ایک دوسرے کے خلاف اور مدِ مقابل ہو تو اسے تعارض کہا جاتا ہے۔

تعادل : بھی اسی معنی میں مستعمل ہوتا ہے لفظی اعتبار سے دو دلیلوں کا ایک دوسرے کے مساوی ہونے کو تعادل کہا جاتا ہے۔

تعارض کا شرعی مفہوم معلوم کرنے کے بعد اس مسلمہ حقیقت کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کتاب وسنت اللہ کی جانب سے نازل کردہ شریعت ہے جس میں کبھی تضاد ومخالفت نہیں ہوسکتی، کیونکہ یہ رب العالمین کی جانب سہو وخطا کی نسبت نسیان کے مترادف ہوجاتا ہے جس سے رب العالمین پاک اور منزہ ہے، ہاں یہ الگ بات ہے کہ انسان کو کبھی دلائل کے سمجھنے میں غلطی یا قصور ہوتا ہے جس سے وہ دلائل کو متعارض سمجھ لیتا ہے۔

ایسی صورت میں اس کی ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ اہل علم وخرد اور متخصصین فن سے رجوع کر کے اس کے سمجھنے کی کوشش کرے یہی ایک صاحب ایمان اور اہل علم کا طریقہ ہونا چاہئے، جب وہ اس طریقہ کو اپنائے گا تو اس کیلئے حق اور درستگی تک پہنچنا آسان ہوجائے گا، صحابہ کرامؓ کا یہی طریقہ تھا، بجائے اس کے کہ دلائل کو مورد الزام ٹھہرا کر اسکو رد کر دیا جائے یا تعارض کی بنیاد پر اس کو جھوٹ اور افتراء سمجھ لیا جائے یہ کم ظرفی اور کم علمی کی دلیل ہے۔

صحابہ کرامؓ کے دور میں یہی قرآن اور یہی سنت رسول ﷺ معمول بہ تھے لیکن کسی نے تضاد یا عدم فہم کی بنیاد پر اس کو رد نہ کیا بلکہ اس کو سمجھنے کی کوشش کی، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے یہ حدیث سنی کہ "من حوسب عذب" جس شخص سے اللہ کے

یہاں حساب کتاب میں چوں چرا کیا گیا، محاسبہ شروع ہو گیا تو سمجھو کہ وہ جہنم رسید ہوا، حضرت عائشہؓ کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ روایت تو شریعت کے دوسرے حکم سے جو کتاب اللہ میں ہے متعارض ہے، کیونکہ کتاب اللہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ﴿ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَاباً يَسِيْرا ﴾ (انشقاق : ۸) عنقریب حساب بہت آسان ہوگا، انہوں نے اس تضاد کے متعلق جو خیال ان کے دل میں آیا تھا اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا آپ نے جواب دیا کہ دونوں الگ الگ مقامات کا معاملہ ہے، آسان حساب کا معاملہ عرض حساب کے وقت کا ہے اور عذاب دیے جانے کا معاملہ تدقیق حساب کا ہے، تدقیق حساب کے وقت جس سے چوں چرا ہوا تو وہ ہلاکت میں جائے گا، ورنہ حساب آسان ہوگا۔ (۱)

اسی طرح جب حضرت حفصہؓ نے یہ حدیث سنی کہ "لا يدخل النار أحد شهد بدرا والحديبية" (۲) جو بدر و حدیبیہ میں شریک تھا وہ جہنم میں نہیں جا سکتا، تو انہوں نے فرمایا کہ قرآن کریم میں تو یہ حکم ہے کہ ﴿ وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ﴾ (مریم : ۷۱) یعنی اس میں (جہنم میں) ہر ایک کو جانا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ آگے ﴿ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوا ﴾ (مریم : ۷۲) بھی ہے یعنی پھر ہم متقیوں کو نجات دیں گے۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ جہنم کے اوپر جو پل صراط ہے اس پر سے گذرنے کو ﴿ وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ﴾ کہا گیا ہے۔ جو متقی ہوں گے ان کو جہنم میں گرنے سے اللہ تعالیٰ محفوظ کر دے گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اصحاب بدر و حدیبیہ کو بھی اس میں گرنے سے محفوظ رکھے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ قرآن میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو مجھکو متعارض نظر آتی ہیں چنانچہ انہوں نے قرآن کریم کی چار آیتوں کو پڑھ کر سنایا جو دیگر چار آیتوں سے متعارض تھیں۔ حضرت ابن عباس نے ان آیتوں کا جو صحیح مفہوم تھا اس کو واضح کر کے یہ فرمایا کہ "لا تختلف عليك القرآن فان كلا من الله" قرآن میں تم کو تعارض نہیں سمجھنا

---

(۱) بخاری (۱۰۳)، مسلم (۲۸۷۶) (۲) مسند احمد (۲۵۲۳۵)، صحیح الجامع (۲۴۸۲)

چاہیے کیونکہ یہ سب کا سب اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

اس اثر کو امام بخاریؒ نے معلقاً ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے اس کو متصل قرار دیا ہے۔ (۳)

یعنی جو چیز اللہ کی جانب سے نازل کردہ ہے اس میں تعارض نہیں ہوتا ہے۔ چونکہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ دونوں اللہ کی جانب سے نازل کردہ ہیں لہذا ان میں تعارض نہیں ہوسکتا، یہی عقیدہ اور یہی فہم صحابہ کرام کا تھا۔

ائمہ دین نے بھی صحابہ کرام کے اس عقیدہ اور اس فہم کو اچھی طرح سمجھا اور ان کے نقش قدم پر عمل کیا اور یہ واضح کردیا کہ حقیقت میں تعارض و تضاد اُحادیث رسول ﷺ میں بھی نہیں ہوتا ہے، ہاں یہ الگ بات ہے کہ سامع یا قاری کو تضاد نظر آتا ہے جو تضاد ظاہری ہوتا ہے حقیقی نہیں ہوتا، احادیث رسول ﷺ کو جس معنی میں ہے اس کے معنی و مفہوم کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ایسا ہوسکتا ہے، توفیق و جمع کی صورت کے خفاء کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے، دیگر اسباب بھی ہوسکتے ہیں۔

اگر دونوں روایتوں کے مفہوم کو ان کے اوقات اور مقامات کو سامنے رکھ کر عموم و خصوص، مطلق و مقید، مجمل و مبین کو دیکھا جائے تو تضاد خود بخود ختم ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''دو ایسی صحیح حدیثیں رسول ﷺ سے منقول نہیں جن میں آپس میں اس طرح کا تضاد ہو کہ وہ ایک دوسرے کے حکم کی نفی کرتی ہوں'' نیز فرمایا کہ ''ایسی کوئی دو حدیثیں مجھکو نہیں ملیں جو رسول اللہ ﷺ کی جانب صحیح سند سے منسوب ہوں اور ان میں ایسا تضاد ہو جس کا کوئی حل نہ ہو۔'' (۴)

اسی طرح کی بات امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے وہ فرماتے ہیں کہ : جناب رسول اللہ ﷺ سے ایسی دو حدیثیں جو آپس میں متضاد ہوں مجھکو نہیں ملیں اگر کسی کو ملی ہوں تو وہ

---

(۳) فتح الباری (۸/۵۵۶) (۴) الرسالۃ (۲۱۶-۲۱۳)

مجھ کو بتائے میں اس میں تطبیق وتوفیق بتا تا ہوں۔ (۵)

خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ : دو متعارض حدیثوں کا ہونا تکلیف (مکلف بتانے) کو باطل کر دیتا ہے جس سے ایک کا صحیح ہونا اور دوسرے کا غلط ہونا لازم آتا ہے، جبکہ اللہ کے رسول ﷺ سے اس میں غلطی کا صدور نہیں ہوتا آپ شریعت کے بیان کرنے میں غلطی سے معصوم ہیں اس پر ائمہ دین کا اتفاق ہے لہٰذا احادیث میں تعارض کا ہونا محال ہے۔ (۶)

اس کے مقابلہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوئے جنھوں نے مجرد عیب جوئی کے لیے اپنے آپ کو حیرانی و پریشانی میں ڈال لیا، معاملہ اور مسئلہ کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ تعارض کیا ہے؟ اس کی قسمیں کیا ہیں؟ تعارض ظاہری و تعارض حقیقی میں کیا فرق ہے؟ حدیث رسول ﷺ میں جب علماء اسلام تعارض کی بات کرتے ہیں تو کون سا تعارض مراد لیتے ہیں؟ یہ سب معلومات ان کے لیے عبث ٹھہری لہٰذا اپنے عقیدہ و اعمال کو برباد کر لیا قدریہ، جہمیہ، معتزلہ وغیرہ اس کی زندہ مثالیں تھیں، جو عقلی گھوڑوں کو دوڑا کر سنت رسول ﷺ سے دست بردار ہو گئے۔ اس قماش کی ایک جماعت وہ بھی ہے جو محض تعارض کا نام سن کر بوکھلا گئی اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ کہہ مارا کہ متضاد دلیلوں کے تسلیم کرنے سے شریعت مجروح ہوتی ہے کیونکہ جب شریعت منزل من اللہ ہے تو اس میں تضاد کیسے ہوگا؟ اگر تضاد پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی جانب صحیح نہیں، اور نہ یہ منزل من اللہ ہے۔

بات بالکل معقول نظر آتی ہے لیکن "کلمۃ حق ارید بہ الباطل" کے مصداق ہے۔ یعنی بات تو حق ہے لیکن باطل مقصد کے لیے ہے، کاش کہ یہ حضرات اس منزل پر پہنچنے کے بعد تھوڑا سا اور قدم آگے بڑھاتے، دل و دماغ میں وسعت لاتے اور جس طرح صحابہ کرام اور علماء امت نے متضاد روایتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اس طرح سمجھتے لیکن ان کو وہ طریقہ پسند نہ آیا۔ انکار حدیث کے لیے جہاں بہت سارے بہانے بنائے اسی میں سے اس کو بھی ایک بہانہ بنایا کہ

---

(۵) الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ر ۴۳۳ (۶) مصدر سابق (۴۳۲-۴۳۳)

روایت باہم متعارض ہے اور تعارض کا صدور رسول ﷺ سے ممکن نہیں لہٰذا متضاد روایتیں مشکوک ٹھہریں، جب یہ مشکوک ہیں تو دیگر روایتیں بھی شک کے دائرہ میں آگئیں۔

لہٰذا علماء اسلام کو ان کے دفاع کیلئے سامنے آنا پڑا جنہوں نے تعارض کا معنی و مفہوم متعین کیا، تعارض کے دور کرنے کے اسلوب جمع و توفیق، معرفت نسخ اور راجح و مرجوح کا اصول دیا، انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ تعارض حقیقی کا وجود ہے ہی نہیں احادیث میں جو تعارض ہے اس کو تعارض ظاہری کہا جاتا ہے، جس میں دفع تعارض کے اصول ثلاثہ کے ذریعہ دفع تعارض ممکن اور آسان ہے، ان ائمہ کرام میں امام شافعیؒ، امام ابن قتیبہؒ، امام طحاویؒ اور دیگر حضرات کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں، جنہوں نے اصول وضوابط کے ساتھ ساتھ متعارضین میں توفیق دے کر عملی ثبوت پیش کیا، اس طرح ان زبانوں کو خاموش کر دیا جو ان کے دور میں احادیث رسول ﷺ پر تضاد، اور نا قابل فہم ہونے کا الزام لگا کر ان سے راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔

موجودہ زمانہ میں مستشرقین کی جماعت جنہوں نے مسلمانوں کو ان کے دین سے بیزار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، شکوک وشبہات کو جنم دیکر ان کو شریعت سے دور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بھی متعارض روایتوں کا سہارا لے کر احادیث رسول ﷺ میں شکوک وشبہات ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مستشرقین کا سردار گولڈ زیھر کہتا ہے ''مسلمانوں کے دین میں کوئی بھی اختلافی مسئلہ خواہ وہ سیاسی ہو یا اعتقادی ایسا نہیں جس کا اعتماد قوی اسناد والی حدیثوں پر نہ ہو۔'' (۷)

اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ روایتیں قابل قبول نہیں، کیونکہ جب اختلافی مسائل میں متضاد روایتیں قوی اسناد کے باوجود قابل قبول نہیں تو دوسری روایتیں جو قوی اسناد سے مروی ہیں وہ بھی اس طرح نا قابل اعتماد ہوئیں۔

اس کے یہاں متضاد قوی اسناد روایتوں کی سوائے غیر معتبر ہونے کے اور کوئی توجیہ نہیں، کیونکہ مقصد ہی میں کجی ہے۔ نہ اس کے یہاں توفیق و تطبیق کی کوئی بات ہے، نہ ناسخ و منسوخ کی

---

(۷) السنۃ ومکانتہا ص ر ۲۰۳

گنجائش ہے، نہ ترجیحات کا کوئی خانہ ہے، نہ مطلق ومقید کی کوئی بات ہے، نہ مجمل اور مبین کی گنجائش نکلتی ہے، نہ محدثین وائمہ کرام کے بتائے ہوئے اصول کی یہاں کوئی ضرورت ہے، نہ وہ کتابیں ان کے ذہن میں آتی ہیں جو اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے تصنیف کی گئی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل مسالک کے یہاں استدلال میں اس طرح کی روایتیں ہیں بلکہ بہت سے متعصبین مسالک نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لیے حدیثیں گھڑ لی ہیں۔ ان کی روایتوں کی گرفت بھی کی جا چکی ہے، اسی طرح ان مختلف مستدل روایتوں کی بھی توجیہ کی جا چکی ہے، بطور مثال علامہ ابن رشد کی کتاب "بداية المجتهد" دیکھ لیں جہاں انہوں نے وجہ اختلاف بتائی ہے مسائل میں ان دلیلوں کا ذکر کے ان کی حیثیت اور ان کے معنی ومفہوم کی وضاحت بھی کر دی ہے، احادیث رسول ﷺ کا پس منظر، شان ورود وکلمات کے شرعی استعمالات، عربی زبان کے پیچ وخم، مجاز، استعارہ، کنایہ وغیرہ جو عربی کے علاوہ اور زبانوں میں بھی موجود ہیں ان کے دیکھنے سے بھی روایتوں میں بظاہر تعارض کو حل کیا جا سکتا ہے جو علمی اصول وضوابط ہیں۔

علماء امت نے اس طرح کا مزاج رکھنے والوں کے لیے جو ضابطہ بنایا ہے اس میں مختلف الحدیث، مشکل الحدیث، تعارض، تعادل، تقابل، جمع وتوفیق، ناسخ ومنسوخ، ترجیح وغیرہ اصطلاحات ہیں جس میں متضاد حدیثوں کی تعیین پھر ایک دوسرے کے مفہوم میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، یہ فن حدیث کا انتہائی اہم موضوع ہے جس کا علم رکھے بغیر حدیثوں پر تضاد کا الزام لگا کر رد کر دینا ناقابل قبول ہے، اس طرح کی افواہیں خود بخود مسترد اور مردود ہوتی ہیں کیونکہ علمی تقاضوں پر پورا نہیں اترتیں۔

اس طرح کے مسائل اصول حدیث اور اصول فقہ دونوں فنون کی کتابوں میں دستیاب ہیں جن کی غیر معمولی تعداد ہے، اس سلسلہ میں راقم کی ایک کتاب عربی زبان میں ہے جس کا نام ہے: "أصول التوفيق بين الأحاديث المتعارضة" جو ابھی طبع نہیں ہو سکی ہے اردو زبان میں بھی

اس کا ایک خلاصہ ہے وہ بھی اب تک مطبوع نہ ہوسکی، ان میں ان تمام مسائل کا تذکرہ ہے جن کی ضرورت یہاں پڑسکتی ہے نیز ان کتابوں کا ذکر بھی ہے جو بطور تطبیقی مثال کے تحریر کی گئی ہیں، مثلا اختلاف الحدیث، تاویل مختلف الحدیث، مشکل الأحادیث والآثار وغیرہ، ان کتابوں کا تذکرہ اورمشہور تالیفات کا تعارف اسی کتاب میں تشریحی خدمات کے باب میں کتب اختلاف حدیث کے زیرعنوان آگے آرہا ہے۔

بعض متعارض حدیثوں کو تطبیقی مثال میں ان کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے جو اصول وضوابط کی کتابیں ہیں، شارحین حدیث نے شرحوں میں بھی جہاں روایتوں میں بظاہر تعارض ہے اس کا حل ذکر کردیا ہے۔ دفاع تعارض سے متعلق مزید معلومات باب پنجم میں مذکورہ عنوان کے تحت ملاحظہ کریں۔

استشراق کا دفاع

حدیث رسول، اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی، راویان حدیث، خدام سنت نبوی کی مشہور و ممتاز شخصیتیں اور حفاظ حدیث پر جس میں بعض صحابہ کرام کی شخصیات بھی شامل ہیں ان کے تئیں استشراق، مستشرقین اور ان کے "مسلم تلامذہ" کی طرف سے بڑی اوچھی حرکتیں کی گئیں ہیں، ان حضرات نے اسلام دشمنی، دنیاداری اور خواہشات نفس کی تسکین کے لئے قلم اٹھایا اور اس کو بے لگام چھوڑ دیا یہی وجہ ہے کہ جن حضرات کی شخصیت بے داغ صاف ستھری شکوک وشبہات سے منزہ اور بالاتر ہے بغیر کسی منطقی دلیل کے ان کو داغدار بنانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، امام زہری رحمہ اللہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو صحابہ کرام میں نامور حافظ حدیث تھے ان کے قلم کی طغیانی کے زد میں آئے۔ علمی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر انھوں نے داد تحسین حاصل کرنا چاہی، اپنے شکوک وشبہات ظن اور تخمین کو قاعدہ کلیہ بنالیا "ہوسکتا ہے ایسا ہوا ہو، ممکن ہے یہ ایسا ہو، شاید ایسی بات رہی ہوگی، فلاں ان کے ساتھ تھے اس لیے ایسا کہا ہوگا، فلاں فلاں کا مخالف تھا اس لیے ایسا کیا ہوگا" اس طرح کے پریشان خیالات کو بنیاد بنا کر فیصلہ کیا۔ اسلام دشمنی اور دنیا طلبی کی خاطر یہ ان کی مجبوری اور ضرورت ہے۔

عرف عام میں جن کو مستشرقین کہا جاتا ہے وہی اس کے روح رواں ہیں، رہے مسلمان مفکرین تو یا تو فریب خوردہ ہیں یا اسلام سے بیزار ہیں، یا نادانستہ طور پر ان کے دام میں آگئے۔ ان کے بیجا اعتراضات شکوک وشبہات کا جواب، دفاع سنت نبوی کے پروانوں نے بہت اچھی طرح سے دیا ہے۔ خاص طور سے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی رحمہ اللہ نے اپنی مختلف تصنیفات میں ان کی بیخ کنی کی ہے ان کے کمزور اور بے وقعت دلائل، غیر منطقی استدلال کو واضح فرمایا ہے، یہ ان کے درمیان

رہے ہیں اس لیے ان کو بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں اس طرح ہر دور میں پاسبان علوم نبوی حدیث رسول ﷺ کی حفاظت کرتے رہے اور کرتے رہیں گے۔ قیامت تک یہ اسی طرح سے تر و تازہ باقی رہے گی جس طرح یوم اول میں تھی۔ اس مقالہ میں مستشرقین کے تعلق سے مختصری گفتگو کرنی ہے۔

مستشرق :

استشراق سے ماخوذ ہے جس کا لغوی معنی ہے ''طلب شرق'' (یعنی طلب علوم شرق) علوم شرق، یا مشرقی علوم، علوم اسلامیہ کو کہا جاتا ہے، یعنی علماء اسلام کے علاوہ جن غیر مسلم اور غیر مشرقی کے لوگوں نے علوم اسلامیہ کو حاصل کیا، اس سے دلچسپی رکھی ان پر اس کلمہ کا اطلاق ہوتا ہے، جنہوں نے بھی مستشرق کی تعریف کی ہے ان کی تعریف کا محور یہی لفظی معنی ہے۔

ڈاکٹر عمر فروخ کا خیال ہے کہ مستشرق علوم اسلامیہ کا وہ مغربی اسکالر ہوتا ہے جو غیر مسلم ہو۔ (۱) مستشرقین کی معرفت کے لیے ان کی کتاب "التبشیر والاستعمار" انتہائی اہم کتاب ہے۔ آنجناب کی اس تعریف میں مغربی اسکالر کی قید غیر مناسب ہے کیوں کہ لفظ استشراق یہ عام کلمہ ہے، مغربی اسکالر کہنے سے تعریف میں خصوصیت آجاتی ہے غیر مغربی اسکالر اس سے نکل جاتے ہیں۔

اس لیے اس سے بہتر تعریف محمد یوسف رامپوری کی ہے جو کہتے ہیں کہ : مستشرق درحقیقت ایسے غیر مشرقی محقق کو کہتے ہیں جو مشرقی علوم و ادب اور معاشرہ وغیرہ میں دلچسپی رکھتا ہو۔ (۲) حالانکہ اس تعریف میں بھی کچھ کسر ہے، کیوں کہ ''غیر مشرقی'' محقق صاحب ایمان بھی ہوسکتا ہے حالانکہ اس کو مستشرق نہیں کہا جاتا، لہذا دونوں حضرات کی تعریفوں میں اگر تھوڑی سی اصلاح کر کے یہ تعریف کی جائے تو زیادہ بہتر ہے :

''مستشرق اس غیر مسلم محقق کو کہتے ہیں جو مشرقی علوم کا اسکالر ہو اس میں ریسرچ کا مدعی

---

(۱) علوم الحدیث ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر ص ر ۱۲۳ (۲) علوم الحدیث ص ر ۱۲۳

ہو۔'' اس تعریف میں دنیا کے کسی بھی گوشے کا رہنے والا غیر مسلم علوم اسلامیہ کا اسکالر شامل ہے اور وہی یہاں مراد بھی ہے استشراق صرف مغرب کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

ویسے استشراق کی بنیاد دراصل اس خفیہ تحریک پر ہے جس کو صلیبیوں اور یہودیوں نے مل کو مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں میں ناکامی کے بعد قائم کیا۔

تاریخ استشراق پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر سباعی رحمہ اللہ عرض کرتے ہیں کہ :

یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یورپین نے کب اور کس زمانہ میں اپنی توجہ علوم شرقیہ کی جانب کی ہے، البتہ یہ مسلم ہے کہ : راہبوں نے اندلس کے ترقی یافتہ دور میں وہاں کے مدرسوں سے مشرقی علوم حاصل کیا اور اس میں ترقی کرتے رہے، عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا، چھ صدیوں تک انہیں علوم پر ان کا تکیہ رہا۔ اٹھارہویں صدی میں مغرب نے عالم اسلام کے استعمار کا آغاز کیا، ان کی جائدادوں، جاگیروں، کتب خانوں اور خاص طور سے مخطوطات پر مکمل قبضہ کرلیا، یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں نادر عربی مخطوطات کی مقدار یورپ میں دو لاکھ پچاس ہزار جلدوں سے متجاوز ہوچکی تھی، ۱۸۷۳ء میں انہوں نے پہلی کانفرنس کی اور پھر مسلسل کانفرنسیں کرتے رہے، مشرقی علوم اور مسلمانوں کے دین وتہذیب وثقافت پر آزادئ رائے کے نام پر برابر حملہ اور اظہار خیال کرتے رہے۔ (۳)

مراحل استشراق :

تحریک استشراق کو تین مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

پہلا مرحلہ : وہ ہے جس میں یہود ونصاریٰ اور ان کے پروردہ حضرات مسلمانوں کے اعتقاد میں وقتاً فوقتاً رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔

دوسرا مرحلہ : وہ ہے جس میں صلیبی جنگوں میں (گیارہویں تا تیرہویں صدی عیسوی میں) ناکامی کے بعد صلیبیوں اور یہودیوں نے منظم دینی تحریک شروع کی جس کی سرپرستی سلطان

---

(۳) استشراق اور مستشرقین کی نقاب کشائی، ترجمہ : جمال احمد مدنی، ص ۱۸

روم اور وہاں کے کلیسا کر رہے تھے جن کو پاپاؤں کی تائید حاصل تھی۔

تیسرا مرحلہ : موجودہ دور کا استشراق ہے جس کا آغاز اٹھارہویں صدی سے ہوا ہے اور اب تک جاری ہے اس مرحلہ کے استشراق کی پہلی کانفرنس ۱۸۷۳ء میں ہوئی تھی جو آج تک برابر جاری ہے۔

اس مرحلہ میں مغربی شہرت یافتہ یونیورسٹیوں میں علوم شرقیہ کی تدریس کے مختلف شعبے قائم کیے گئے، تحقیق، ریسرچ اور آزادی رائے کے نام پر اسلام کو بدنام کرنے کی ہر ممکن کوششیں کی گئیں، ان کے مدرسین نے اپنے لیے جاذب نظر خطابات استعمال کئے، ڈاکٹر، ریسرچ اسکالر، ایڈوائزر، اسپیشلسٹ، اکسپرٹ وغیرہ کہلوانے لگے اور اپنے شعبوں سے اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں دینے لگے، سب سے کامیاب وہ شعبہ سمجھا جاتا تھا جس کا ذمہ دار دین اسلام کا سب سے بڑا مخالف ہو۔ (۴)

مقاصد : ان کے مقاصد حسب ذیل ہیں :

- اسلام کے بارے میں بدگمانی پیدا کرنا۔
- مسلمانوں کو اپنے علماء سے بدظن کرنا۔
- اسلامی معاشرہ اور دین اسلام کی غلط تصویر پیش کرنا۔
- مسلمانوں کی تاریخ مسخ کرنا۔
- اسلامی تہذیب کی غیر حقیقی تصویر کشی کر کے اس کی تحقیر کرنا۔
- کتاب وسنت میں تحریف کر کے حسب منشا مفہوم بنانا۔
- موجودہ دور کے اخلاق وعادات کو دین اسلام کا مظہر سمجھنا۔
- حقیقی اسلامی معاشرہ کو نظر انداز کرنا۔
- اپنے مقصد وفیصلہ کے مطابق غیر معتبر مصادر ومراجع کا استعمال کرنا۔ (۵)

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علوم اسلامیہ کی طلب ان کے یہاں خاص مزاج

---

(۴) علوم الحدیث، ص ر ۹۱۳ - ۹۱۴ (۵) السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی ص ر ۸۸

کی تسکین کے لیے ہوتی ہے جس مزاج کو اپنے حلقوں میں باور کرایا جاتا ہے۔ اس لیے ان کے پاس کوئی خاص منہج اور طریقہ نہیں نہ کسی اصول وضابطہ کی پرواہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جتنی منہ اتنی باتیں نکلتی ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ ان کو جو تھوڑی بہت معلومات مل جاتی ہے۔ اسی کو حرف آخر تصور کرتے ہیں پھر اسی میں ظن وتخمین کے گھوڑے دوڑاتے ہیں، راجح کو مرجوح، مرجوح کو راجح کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں باوقار ومعتمد مصادر صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطاء مالک ناقابل قبول ہوتی ہیں، اور دمیری کی کتاب " حیاۃ الحیوان" جو قصہ اور کہانیوں کا پلندہ ہے وہ قابل قبول اور معتمد ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے جواب کے لیے بھی کوئی اصول وضابطہ نہیں ہوسکتا سوائے اس نقطے کے جس پر ان کا اعتراض ہے اس کا جواب دے دیا جائے، اور ان کی دلائل کا پوسٹ مارٹم کر دیا جائے جو بہت آسان ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی فرماتے ہیں :

ان لوگوں نے علم کو بازیچۂ اطفال تصور کرلیا ہے، ان میں سے جس نے بھی جو علم حاصل کیا اس نے اپنے راہبوں سے کیا، پھر اپنے سر کو پراگندہ خیالات میں ڈبودیا، یا پراگندہ خیالات کو اپنے سر میں اُنڈیل لیا، اور اسے یہ وہم ہوگیا کہ وہ بھی کچھ جانتا ہے، حالانکہ وہ علم سے بالکل کورا اور نابلد ہے، اور جب کوئی مشرق کی کسی زبان کو پڑھ لیتا ہے یا کچھ ترجمہ کر لیتا ہے تو اندھی اونٹنی کی طرح اس میں بھٹکتا رہتا ہے، جب کوئی مشتبہ چیز مل جاتی ہے تو اس میں من پسند پیوند کاری کر لیتا ہے اور جب شک کو یہ یقین میں تذبذب ہوتا ہے تو ظن وتخمین کے گھوڑے دوڑاتا ہے، پھر راجح کو مرجوح اور افضل کو مفضول بنادیتا ہے۔ (۶)

نیز فرماتے ہیں کہ تحقیق ان کے یہاں ایک خیالی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، نیز اسباب وعلل اور حوادث کے گھڑنے میں یہ حد سے متجاوز ہوتے ہیں، درحقیقت وہم وخیال کے علاوہ اس کی کوئی

---

(۶) استشراق اور مستشرقین ص/۱۶-۱۷ مترجم

سند نہیں ہوتی، پھر وہ مشرقی اخلاق وعادات کو اپنے مغربی اخلاق وعادات، اوہام وخیالات پر منطبق کرتے ہیں تو ان کا اسلوب راہِ راست سے بالکل الگ ہو جاتا ہے، ہر ماحول کے کچھ خاص اطوار وعادات ہوتے ہیں جن کے اعتراف سے ان کو یکسر انکار ہوتا ہے، لہٰذا ان کی تحقیق تناقضات کا شکار ہوتی ہے۔ (۷)

ان کے منتشر خیالات و پراگندہ شکوک وشبہات ان کا مبلغ علم ہوتا ہے، اور یہی ان کے دلائل ہوتے ہیں، کوئی مجرد اپنے مخصوص زاویہ سے سوچنے والا عقل کا پجاری ہوتا ہے، کوئی اپنی بدذوقی کے ذوق پر اعتماد کر بیٹھتا ہے اور حدیث رسول کی تصحیح وتضعیف کے لیے اس کو میزان سمجھ لیتا ہے، کوئی خرد برد کرتا ہے کوئی من پسند مفہوم کشید کر لیتا ہے، اس طرح ایک کمپنی کے مانند مشین کے مختلف پرزوں پر جیسے مختلف افراد کام میں لگے رہتے ہیں یہ بھی اسی طرح عمل میں مصروف رہتے ہیں، اپنی ضرورت کے لیے موضوعات کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں، اپنی من پسند بات نہ بنے تو معتمد مراجع مشکوک نظر آتے ہیں یہ قرآن کریم کی آیت کی زندہ مثال ہیں ﴿ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ﴾ (آل عمران : ۷) جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ اور تاویل کے لیے متشابہات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ چونکہ ان کو حکومتوں اور ریاستوں کی سرپرستی حاصل رہتی ہے جمعیتیں اور تنظیمیں ان کی پشت پناہ ہوتی ہیں، اونچی تنخواہیں میسر رہتی ہیں، کام کرنے کے لیے ہر طرح سے میدان دیا جاتا ہے، مصادر ومراجع اور افراد مہیا کیے جاتے ہیں، عیش وآرام کی زندگی میسر ہوتی ہے، عمل کے لیے فراغت اور معاون افراد دیے جاتے ہیں لہٰذا ان کی تالیفات میں علوم اسلامیہ کی نصوص کی کثرت ہوتی ہے جس کو دیکھ کر مشرقی عالم حیران وششدر ہو جاتا ہے اور اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اس لیے آسانی کے ساتھ یہ ''مسلم اسکالروں'' کو گمراہ کر لے جاتے ہیں، کیوں کہ ان کے پاس نہ تو اسلامی علوم کا کوئی خلفیہ ہوتا ہے اور نہ ہی مصادر ومراجع کا علم ہوتا

---

(۷) استشراق ص ر ۶۰

ہے اور نہ ہی علماء اسلام کی کاوشیں ان کے سامنے ہوتی ہیں، خودنمائی کا شوق بھی غالب آجاتا ہے۔ لہٰذا خود سپردگی میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔

مقاصدِ استشراق :

مسلمانوں کے تیئں مستشرقین کے مختلف مقاصد ہوتے ہیں، سیاسی، سامراجی، دینی، معاشرتی، معاشی ہر طرح سے یہ ان پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں اسی حساب سے ان کی جماعتیں ہوتی ہیں ایک جماعت وہ ہے جو علمی مقاصد رکھتی اور یہی زیادہ واضح ہوتے ہیں، پھر ان میں ایک وہ جماعت ہوتی ہے جو مشتبہ علمی کام کرتی ہے، ایک وہ ہوتی ہے جو تحقیقی کام کرتی ہے، تحقیقی کام کرنے والی جماعت پر جب صداقت واضح ہوجاتی ہے تو وہ اس کو بیان بھی کرتی ہے اور قبول بھی کرلیتی ہے، لیکن ایسے لوگ ان کی نگاہ میں طعن وتشنیع اور بائیکاٹ کا شکار ہوجاتے ہیں ان کی باتیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جاتی ہیں، جیسے تھامس آرنالڈ نے جب "الدعوة إلى الاسلام" میں علمی حقائق پر مبنی نتائج کا اعلان کیا تو اس کو مسلمانوں کا چاپلوس قرار دے دیا گیا۔

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو حقیقت سے متاثر ہوکر دائرہ اسلام میں بھی داخل ہوگئے اس طرح ﴿شهد شاهد من أهلها﴾ (یوسف : ۲٦) کے مصداق بن گئے، انہیں میں سے ایک فرانسیسی عالم ''دینیہ'' ہیں جن کا نام ناصر الدین دینیہ ہوا۔

اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے مختلف وسائل استعمال کیے مثلاً :

- محرف کتابیں تحریر کرنا۔
- بلاد اسلامیہ کی معمولی خرابی کو میڈیا کے ذریعہ عام کرنا۔
- دین اسلام کی خوبیوں کو چھپانا اور یہ باور کرانا کہ یہ دین قتل وغارت گری اور تلوار کا دین ہے۔
- جہاد کو ایک خونخوار درندے کی شکل میں پیش کرنا۔

- بلاد اسلامیہ میں ان کے امراء اور حکام کے خلاف نفرت ڈالنا۔
- عالم اسلام میں عیسائی مشنریاں قائم کرنا۔
- یونیورسٹیوں میں اسلامک ریسرچ سینٹر و مرکز قائم کرنا۔
- اسلامی انسائیکلوپیڈیا اپنے مزاج کے مطابق تیار کرنا۔ (۸)

مستشرقین کی تمام تر کوششوں کا خلاصہ اور نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے عقیدہ، رسول اور حدیث رسول ﷺ سے متعلق تذبذب، شکوک وشبہات میں ڈال دیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رسول کی ذات گرامی سے متعلق مختلف کتابیں تحریر کی ہیں، احادیث رسول ﷺ کے سب سے اہم ذریعہ، اسناد حدیث کے متعلق افواہیں پھیلائی ہیں، قیاس آرائیوں اور غیر معقول باتوں کو دلیل بنالیا، مغالطات کے ذریعہ حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

حدیث رسول ﷺ پر تفصیلی بحث کرنے والا شخص (Gold Ziher) ہے جس نے تحقیق اور اظہار رائے کے علمی طریقوں کو بالائے طاق رکھ کر غیر معتبر قصے اور کہانیوں کی کتابوں کو ماخذ بنایا اور یوں تحقیق، صدق وامانت کا جنازہ نکال دیا، متفق علیہ اور موثوق مصادر ومراجع سے اغماض کیا، شذوذ ونوادرات سے کلی اصول بنایا تا کہ اصل مقصد حاصل کیا جاسکے۔ پھر کیا تھا یورپ تو ویسے ہی مسلمانوں کے خلاف جلا بھنا رہتا ہے آناً فاناً اس کی رائے کو انجیل مقدس کا درجہ مل گیا، اور وہ قوم کا پیشوا اور امام بن گیا، اس کی ہر تحریر اور ہر قول ان کے لیے حرف آخر بن گیا، کیونکہ وہ اس کے علاوہ معلومات سے نابلد تھے، لہٰذا ہر ایک کی تحقیق کا مرجع وہی بنا۔

اس نے سب سے پہلے اسلامی علوم سے متعلق کتابیں تحریر کیں چنانچہ اس کی تالیف studiesmuslim (مطالعہ اسلام) جو ۱۸۹۰ء میں تحریر کی گئی ہے سب سے معروف اور معتمد کتاب ٹھہری، اس کی نیابت اور تائید جوزف شاخت نے کی اس نے The Origins of Mohammadam Jurisprudance (اسلامی نظام عدل کا ارتقا) کے نام سے پہلی کتاب

(۸) استشراق اور مستشرقین، ص ۳۵-۳۷

تحریر کی پھر Introduction of Islamic laws کے نام سے دوسری کتاب لکھی جس میں بزعم خویش اسلامی نظام قانون کا تعارف پیش کیا، اس کے بعد مختلف لوگوں نے اسلامی علوم پر خامہ فرسائی کی، ان کے اعمال میں کچھ بہت اچھے کام بھی ہیں جن میں کتب حدیث کی تحقیق وطباعت اوران کا ترجمہ وفہارس قابل قدر عمل ہےاوراس بشارت کا مصداق ہے کہ'' اللہ رب العالمین اپنے دین کی خدمت فاجر شخص سے بھی لے لیتا ہے۔'' (۹)

ان کی تالیف کردہ کتاب "المعجم المفهرس لالفاظ الحديث النبوى" اس کی زندہ مثال ہے جس کوتیس مستشرقین کی ایک جماعت نے مل کر تیار کیا ہے،دوسری کتاب "مفتاح كنوز السنة" ہے جس کا مؤلف رسول ﷺ اورحدیث رسول کا شدید ترین مخالف شخص A.J.Wensink (ارندجان ونسنک) تھا،اس کتاب کواس نے بآسانی حدیث رسول ﷺ کی تلاش کے لیے تحریر کیا تھا، جواب فن حدیث میں بحث وتحقیق کرنے والوں کے لیے معاون کتاب بن چکی ہے۔

اس قوم میں سب سے زیادہ محترم وہ ہوتا ہے جو دین اسلام کا سب سے بڑا مخالف صاحب حقد وحسد ہو، کیونکہ مستشرقین بالعموم یا تو پادری ہوتے ہیں یا استعماری یا یہودی، شاذ ونادر ہی ان کے علاوہ کوئی مستشرق ہوتا ہے۔ (۱۰)

پھر جوجس قدر متعصب اورحاسد ہے وہ اتنا ہی بڑا پیشوااور مقتدی ہوتا ہے۔

ان متعصبین میں کچھ یہ ہیں :

(1) A.J.Arberry **(2) A.Geon** **(3) H.A.R Gibb**

(4) John Magnard **(5) Baron earra de vaux**

(6) M.Zweimer **(7) G.Von Graun baum** **(8) K.Giagg**

مزید معلومات کے لیے دیکھیے : استشراق اورمستشرقین (۱۱)

---

(۹) بخاری (۴۲۰۳) (۱۰) استشراق اورمستشرقین ص/۶۹ (۱۱) ص/۴۰-۴۸

ان لوگوں نے دین اسلام کے خلاف جتھا بنا کر مختلف جہات سے اس پر یلغار کیا اور خصوصی طور سے علماء اسلام کے مفکرین پر توجہ کی ان کو اپنے دام فریب میں جکڑ لیا، وہ بھی انہیں کی بولی بولنے لگے اور انہیں کے مزاج سے سوچنے لگے، ان کی تقلید کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے مسلمان اسکالروں نے کی اور وہ بھی نادانستہ طور سے ان سے متاثر ہو گئے۔ ان کی تحریروں پر اعتماد کیا، اسی کو مستدل بنالیا، استخفاف حدیث وانکار حدیث کا مزاج مسلمان طلبہ میں انہیں کے لٹریچروں سے آیا ہے۔

ان اسکالروں کی سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ یہ دین کی نشر واشاعت کا جذبہ اور تڑپ رکھتے تھے لیکن دین کی اصل معلومات کے مصادر ومراجع تک ان کی رسائی عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے نہ تھی، محدثین عظام اور علماء امت نے حدیث رسول ﷺ کی حفاظت اور اس سے متعلق جو علمی واصولی کام کیا ہے وہ اس سے نابلند تھے، سنت کی دفاع میں جو کتابیں تحریر کی گئیں ان کا صحیح علم ان نوجوانوں کو نہ ہو سکا، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقام ہے دین وشریعت میں اس کی کیا حیثیت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب کیا ہے یہ سب پہلے ہی سے تقلیدی مزاج کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں میں عملاً ثانوی درجہ رکھتا تھا جب مستشرقین اور ان کے ہم نوا لوگوں کی تحریریں ان کو ملیں تو مقام حدیث کا باقی بچا مقام بھی شکوک وشبہات کی زد میں آ گیا، لہٰذا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بھی کتاب پر زبان درازی ان کے یہاں کوئی معنی نہیں رکھتی، آزادیٔ رائے اور اظہار خیال کے نام پر یہ بھی شتر بے مہار بن گئے اور صحیح بخاری جیسی محترم کتابوں پر قہوہ خانوں میں بیٹھ کر بیجا تبصرہ کرنے لگے، بہت ساری احادیث رسول کو برملا اس بنیاد پر رد کرنے لگے جو بقول ان کے، یا ان کے رہنماؤں کے، ان کی عقل میں نہیں آتی ہیں، وہ تمام حدیثیں جو امت کے دل ودماغ میں بارہ سو سال سے بسی ہوئی تھیں جو ان کی عقل میں سمائی ہوئی تھیں، صحابہ کرام سے لے کر آج تک تمام لوگوں کی عقول ان کی غیر معقول عقلوں کے سامنے ہیچ ہو گئیں۔

خصوصاً انیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد جب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ میں دینی رجحان بڑھا تو ان کے ہاتھوں میں اردو زبان میں کچھ تحریریں بڑے معروف اور نامور علماء کی آئیں جو مستشرقین کی تحریروں سے فریب خوردہ تھے ان میں حدیث رسول ﷺ سے بے اعتنائی کی جھلک نمایاں طور سے پائی جاتی تھی اس سے ان کا متاثر ہونا یقینی تھا، صرف متاثر ہی نہیں ہوئے بلکہ ان کے مقلد بن گئے اور ان کی طرف سے جدل وجدال میں لگ گئے اور اس جدید مزاج کے بر خلاف کسی چیز کو قبول کرنے کے بجائے اس کے تئیں بغض وجلن پیدا کر لیا، لہٰذا حق وناحق کی جستجو کا جذبہ بھی ختم ہوگیا، کیونکہ انہوں نے اپنے دلوں میں ان آرائے رجال اور شبہات کو ایسا بیٹھالیا گویا کہ وہی تحقیق کی انتہا ہیں۔

جب دین کی معلومات کیلئے مستشرقین کی تحریر کردہ انسائیکلو پیڈیا پر اعتماد ہو اور حدیث رسول ﷺ سے متعلق یکطرفہ معلومات ہو، جس میں سابقین ائمہ دین ومحدثین کرام کے علوم کی جھلک بھی نہ ہو تو نتیجہ یہی ہوگا، پھر ایسے لوگ اپنے مقابلہ میں کسی کو کیوں خاطر میں لائیں، حالانکہ یہ تو (فوق کل ذی علم علیم) کا خون ہے۔

پھر ایسے لوگ اگر احادیث کے ذخیرہ پر اعتراضات کریں، اس پر زبان طعن دراز کریں اور طوطوں کی طرح رٹے رٹائے جملوں کو دہراتے پھریں، نہ اس سے اکتاہٹ ہو نہ ہچکچاہٹ تو کوئی تعجب کی بات نہیں، جب مزاج میں جمود اور علم میں حصر ہو جائے تو حق وناحق صحیح وغلط کا وجود ہی مٹ جاتا ہے۔

اعتراضات : موجودہ دور میں مسلمانوں میں جن لوگوں نے بھی حدیث رسول ﷺ کا انکار واستخفاف کیا، اس سے لاپرواہی اختیار کی وہ انہیں مستشرقین کی دین ہے۔ ان کے شکوک و شبہات کا تذکرہ دفاعی خدمات کے باب میں گذر چکا ہے۔ (۱۲) جو آٹھ کلیات پر مشتمل ہیں وہیں پر ان کا جواب بھی مذکور ہے، ان شبہات کا خلاصہ یہ ہے :

---

(۱۲) دیکھیے صفحہ ۱۰۷

(۱) احادیث اخبار آحاد ہیں بنابریں وہ ظنی ہیں جو قابل قبول نہیں۔

(۲) قرآن میں سب کچھ موجود ہے لہٰذا غیر قرآن- حدیث- کی ضرورت نہیں۔

(۳) اللہ نے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے حدیث کی حفاظت کی نہیں۔

(۴) احادیث کا بڑا مجموعہ ایک دوسرے سے متعارض ہے لہٰذا وہ رسول کی بات نہیں ہوسکتی۔

(۵) حدیث رسول ﷺ کی تحریر قرآن کی طرح نہیں ہوئی، لہٰذا وہ مشکوک ہے۔

(۶) بعض حدیثیں عقل میں نہیں آتیں۔

(۷) حدیث وحی الٰہی نہیں ہے۔

(۸) رسول کی اطاعت صرف رسول کی حیات تک تھی۔

جواب یہ ہے کہ :

۱ – خبر واحد کا ظنی ہونا اصطلاحی معاملہ ہے اس کا مطلب یقین ہوتا ہے شک وشبہ نہیں۔ ظن کا لفظ قرآن میں متعدد مقام پر یقین کے معنی میں مستعمل ہے مثلاً اہل ایمان کے بارے میں فرمایا : ﴿ الذين يظنون أنهم ملا قوا ربهم ﴾ (البقرہ : ۴۶) یہاں اور ایسے کئی مقامات پر ظن کا معنی شک وشبہ کے معنی میں نہیں ہوسکتا۔ ظن (مشکوک) گمان کے معنی میں اس وقت ہوتا ہے جب حق کے مقابلے میں استعمال ہو۔ اُردو میں لفظی ترجمہ کی بنیاد پر ان لوگوں کو دھوکہ ہوا ہے اس سے پہلے جن لوگوں کو یہ شبہ ہوا تھا، اس کا جواب امام بخاری، امام شافعی اور دیگر اہل علم نے اس وقت بھرپور دلائل کے ساتھ دے دیا تھا جو کتاب اَخبار الا حاد اور کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں موجود ہے۔

۲ – قرآن میں سب کچھ موجود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں بنیادی اور کلی باتیں موجود ہیں جس میں منصب رسول، اور مقام حدیث بھی ہے، اس میں سب کچھ موجود ہونے کا مطلب وہ نہیں ہے جو آپ کے دماغ میں آیا ہے اگر وہ مطلب ہوتا تو پھر رسول کو یہ حکم کیوں دیا

جاتا کہ ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل : ۴۴) ہم نے ذکر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لیے بیان کردیں، اگر قرآن میں سب کچھ موجود ہے تو ذرا بتایئے نماز کا طریقہ، زکاۃ وصیام کے مسائل کہاں ہیں؟

۳ - اگر حدیث رسول کو تعارض کی بنیاد پر رد کیا جاسکتا تو پھر قرآن کریم کی آیت ﴿تبیانا لکل شئ﴾ اور ﴿لتبین للناس﴾ کی وجہ سے کیا قرآن بھی قابل رد ہے؟ اس کی جو توضیح ہے وہی ادھر سے قبول کرلیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ تعارض قرآن وسنت کہیں نہیں ہے یہ صرف علم کی قلت اور عدم معرفت کا نتیجہ ہے کہ سامع وقاری کو بعض چیزیں بظاہر متعارض نظر آتی ہیں۔ ظاہری تعارض کی صورت میں رفع تعارض کے اصول وضوابط ہیں جس کے ذریعہ سے روایتوں میں تطبیق ہوتی ہے، اس میں کچھ ناسخ ومنسوخ بھی ہوتا ہے، کچھ ترجیحات کی بنیاد پر مقبول ہوتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی ایسی حدیث نہیں جس کو متعارض کہہ کر رخصت لے لیا جائے۔

۴ - اس سلسلہ میں راقم کی ایک تالیف عربی زبان میں " أصول التوفيق بين الأحاديث المتعارضة" کا مطالعہ مفید ہوگا، اردو زبان میں بھی ایک تالیف ہے جو ابھی غیر مطبوع ہے۔

۵ - تحریر حدیث کا معاملہ رسول ﷺ کے دور سے شروع ہوچکا تھا اور تیسری صدی تک آکر مکمل ہوگیا اس کی تفصیل اسی کتاب کے ''عملی خدمات'' میں تدوین حدیث کے موضوع میں تفصیل سے دیکھ لیں۔ (۱۳)

۶ - خلاف عقل اگر کوئی حدیث تھی تو اس کا پتہ اہل علم نے قرون فاضلہ ہی میں دے دیا اور بتادیا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں، رسول کی باتیں خلاف عقل نہیں ہوسکتیں، ہاں ایسا امکان ہے کہ بعض باتیں بعض افراد کے سمجھ میں نہ آئیں۔

---

(۱۳) دیکھیے صفحہ ۱۰۷

اگر خلاف عقل کی بات ہے تو ﴿ یسئلونک عن الروح قل الروح من أمر ربی﴾ (اسراء : ۸۵) کا انکار کیا ہوگا؟ یعنی آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کا امر ہے۔ ایسے ہی مشرکین مکہ کی عقل میں عقیدہ آخرت گھستا ہی نہیں تھا وہ کہتے تھے ﴿ من یحیی العظام وھی رمیم ﴾ (یسین : ۷۸) ہڈیوں کو بوسیدہ ہوجانے کے بعد کون زندہ کرے گا؟ تو کیا اس کا انکار درست ہے یا سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ دین کی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کے اسباب وعلل انسانوں کو نہیں بتائے گئے اور اس چکر میں پڑنے سے بہت سی جگہوں پر منع کیا ہے، اس چکر میں پڑیں گے تو کبھی بے داغ رہ ہی نہیں سکتے کیونکہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ جنابت سے پاکی تیمم کرنے سے ہوتی ہے ﴿ أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُواْ مَاءً فَتَيَمَّمُواْ صَعِيداً طَيِّباً﴾ (النساء : ۴۳) عورت سے صحبت کے بعد پانی نہ ملے تو تیمم کرلو، نجاست کہاں سے ہوئی ہے اور تیمم کہاں کیا جاتا ہے؟ ایسے ہی وضوٹوٹنے کے بعد باوضو ہونے کا معاملہ ہے، عقل کو کہاں کہاں تک دوڑاؤ گے، انہیں جیسے لوگوں کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ بتانا پڑا تھا کہ "لو کان الدین بالرای لکان أسفل الخف أولی بالمسح" (۱۴) اگر دین عقل سے معلوم کیا جاتا تو موزہ پر نیچے مسح کرنا اوپر مسح کرنے کے بالمقابل زیادہ مناسب ہے لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موزہ کے اوپر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

لہٰذا دین کے معاملات ومسائل محض عقل کی بنیاد پر نہیں سمجھے جاتے اگر یہی بات ہوتی تو نبیاء ورسل کی ضرورت ہی نہ پڑتی، اور اگر یہی بات ہوتی تو ہر انسان محض عقل کی وجہ سے اللہ کی گرفت میں آجاتا جب کہ گرفت کیلئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل کے ذریعہ حجت قائم کردی ﴿ وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا﴾ (اسراء : ۱۵) ہم عذاب دینے والے نہیں یہاں تک کہ رسول بھیج دیں۔ اللہ نے عقل کو نقل کے تابع کر دیا ہے نہ کہ عقل کو نقل پر فیصل مانا ہے، یہی وجہ

---

(۱۴) ابوداؤد (۱۶۲) ابن حجر نے بلوغ المرام میں حسن اور تلخیص الحبیر میں صحیح کہا ہے۔

ہے کہ قرآن کریم میں جہاں عقل کے استعمال کی بات کہی ہے وہاں سے ایک حکم بتا دیا ہے پھر انسانوں کو اس میں عقل استعمال کرنے کی اجازت دی کہ اللہ کا یہ حکم کس قدر مبنی برحق ہے، آسمان وزمین کی تخلیق، زمین کا خشک ہونا اور پھر ہرا بھرا ہونا ان سب کو توحید باری تعالیٰ اور عقیدہ آخرت کا حکم دینے کے بعد اس کو قبول کرنے کے لیے عقل استعمال کرنے کی ہدایت دی ہے۔ دین کو رد کرنے کے لیے کبھی عقل کی اجازت نہیں دی گئی، بلکہ ﴿ وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ﴾ (اسراء : ۸۵) تم کو تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ کہہ کر خاموش کر دیا گیا ہے۔ عقل کا کوئی معیار اور کوئی کسوٹی نہیں، لوگوں کی عقلیں اپنے اپنے ماحول و معاشرے کی بنیاد پر فیصلہ کرتی ہیں، مغرب کے ماحول میں فسق و فجور، زنا کاری، بے پردگی پسندیدہ امر ہے، ان کی عقل تو عورت کو پردہ میں رہنے کو نہیں قبول کرتی ہے۔ لہٰذا عقل کو نقل پر مقدم نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ پھر تمام مغیبات و دیگر معاملات میں ہر ایک کے عقلی گھوڑے پھسلتے رہیں گے اور ٹھوکریں کھاتے رہیں گے وہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی وجہ سے بعض حدیثوں کو کم فہم لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے منع کیا۔

آخر کون سی وجہ تھی کہ انبیاء، جن و ملک، معجزات، عذاب قبر وغیرہ کا انکار نامور عقلوں نے کیا ہے؟ جو سراسر گمراہی ہے۔

۷ - سنت رسول وحی الٰہی نہیں ہے اس پر کوئی دلیل نہیں، اور کوئی بھی دعوی بغیر دلیل کے قابل قبول نہیں ہوتا، لہٰذا یہ دعوی مردود ہے، سنت رسول کا وحی الٰہی ہونا کتاب و سنت سے ثابت ہے، تفصیل اسی کتاب میں باب اول میں ''حدیث رسول کی تنزیلی حیثیت'' میں دیکھ لیں۔ اللہ کا فرمان ہے ﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴾ (نجم : ۲-۳) رسول من مانی گفتگو نہیں کرتے آپ کی باتیں وحی الٰہی ہیں۔

نیز فرمایا کہ ﴿ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ﴾ (اعراف : ۲۰۳) میں اتباع کرتا ہوں (عمل کرتا ہوں) اس کی جو میرے رب کی جانب سے مجھے وحی کی گئی ہے۔''

۸ – رسول کی اطاعت رسول کے زمانہ تک محدود ہے :

جواب یہ ہے کہ یہ بات رسول ﷺ سے عداوت پر مبنی بات ہے، آپ کو رسول قیامت تک کے لیے بنایا گیا، اور پوری انسانیت ہی نہیں بلکہ جنوں کے بھی آپ رسول ہیں، اگر آپ کی اطاعت کو آپ کے زمانہ تک خاص کر دیا جائے تو آپ کی نبوت میں عموم اور شمول نہیں رہ جائے گا جو آپ کی خصوصی صفت ہے جو لوگ یہ مزاج رکھتے ہیں وہ صحابہ کرام کے فیصلہ کے اعتبار سے خارج از اسلام ہیں جن سے قتال کیا جا سکتا ہے۔

جب مانعین زکاۃ ایک حکم زکاۃ کے ادا کرنے کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ ﴿خذمن أموالهم صدقة﴾ (توبہ : ۱۰۳) کا قرآنی حکم رسول کے زمانہ کے لیے خاص تھا کیونکہ اس میں خطاب رسول ﷺ سے ہے، ایسے لوگوں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جہاد کیا، اگر ایک حکم کو ایک شخص کسی دلیل کی بنیاد پر غلط فہمی میں انکار کرتا ہے تو اس کے خلاف اتنا سخت موقف اختیار کیا جا سکتا ہے تو جو شخص پوری شریعت کو رسول کے زمانہ تک محدود کر دے تو اس کا حکم ان کی نگاہ میں کیا ہو سکتا ہے جب قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے کہ ﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ (اعراف : ۱۵۸) اے انسانو! میں تم تمام لوگوں کیلئے اللہ کا رسول ہوں، تو انسانیت کا کوئی بھی فرد جس زمانہ میں بھی ہوگا رسول کی اطاعت کے بغیر وہ صاحب ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔

لہٰذا اس طرح کی باتیں انتہائی لغو اور نا قابل اعتناء ہیں۔ ایسے احمق لوگ پتہ نہیں کس بنیاد پر عقل وخرد کی باتیں کرتے ہیں۔

پراگندہ خیالات :

ان لوگوں کے کچھ دیگر پراگندہ خیالات یہ ہیں :

- محدثین نے حدیثوں کی صحت کے لیے نقد سند کا خیال تو کیا ہے البتہ نقد متن پر توجہ نہیں دی، اس قسم کا الزام بعض مفکرین علماء اسلام نے بھی لگایا ہے جن کا یہ کہنا ہے کہ نقد داخلی کا

اہتمام تو کیا گیا مگر نقد خارجی کا نہیں۔

نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ محدثین عظام کی جو کاوشیں ہیں ان کو انہوں نے نہ دیکھا نہ سمجھا اور اپنی جہالت کا پرچار کر دیا، کیونکہ نقد حدیث کے لیے جو علم اور جو قواعد بنائے گئے ہیں ان کو ''علم اصول حدیث'' کہا جاتا ہے، اسی کو ''علم درایۃ الحدیث'' کا بھی نام دیا گیا ہے، نیز دیگر نام بھی ہیں، اس علم کی بنیاد دو چیزوں پر ہے جس کو سند و متن کہا جاتا ہے اور اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے : "هو علم يعرف به أحوال السند والمتن" اصول حدیث ایسے علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے سند اور متن کے حالات معلوم کیے جاتے ہیں۔

یہاں پر محدثین نے جس طرح حدیث پر نقد کے لیے سند کو بنیاد بنایا ہے اسی طرح سے متن کو بھی بنیاد بنایا ہے، پھر یہ دعویٰ کرنا کہ محدثین نے نقد متن میں کوتاہی کی ہے یہ من گھڑت بات ہے جو لاعلمی یا تجاہل عارفانہ ہے۔

اگر محدثین متن کا تنقیدی جائزہ نہ لیتے تو وہ متن پر نکارت کا حکم کیسے لگاتے؟ کسی بھی روایت کو شاذ کیوں قرار دیتے متن پر اضطراب کا حکم کیسے لگاتے؟ جبکہ اس کی سند بظاہر صحیح رہتی ہے۔ یہ حکم متن پر نقد ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

دفاعی خدمات کے باب میں اسی کتاب میں جہاں وضع حدیث سے دفاع پر گفتگو ہے وہاں معرفت وضع کے جو قواعد علماء امت نے بنائے ہیں اس میں از روئے سند معرفت وضع کی علامتیں از روئے متن کے مقابلہ میں کم ہیں۔ (۱۵) پھر یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ محدثین نے متن پر توجہ نہیں کی ہے؟

محدثین نے سند و متن پر بھرپور توجہ کر کے ہی حدیث کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ کیا ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ وہ اصحاب علم و معرفت کی ساتھ ساتھ صاحب ایمان تھے اور سمع وطاعت کے خوگر تھے حدیث رسول ﷺ کو دین سمجھتے تھے اس لیے اس کی صحت کے جتنے طریقے ممکن

---

(۱۵) دیکھیے صفحہ ۲۰۲، ۲۱۱

تھے عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق ان کو استعمال کیا۔ وہ تم جیسے لوگوں کی طرح دل میں پہلے ہی سے فیصلہ کر کے حکم نہیں لگاتے تھے، کیونکہ ان کو صحیح دین کی معرفت درکار تھی۔

چونکہ مستشرقین کا ایک خاص مقصد ہے لہٰذا حدیث پر ان کا تحقیقی عمل کیڑے نکالنے کے لیے ہوتا ہے، بغض وحسد اور نفرت پہلے ہی سے دلوں میں جگہ بنا چکی ہے، لہٰذا ان کا نتیجہ اسی طرح کا رہے گا، اگر یہ لوگ بھی صاف دل سے ان خدمات کو دیکھتے اور علمی اصولوں پر کاربند ہوتے تو اس طرح کی غیر معیاری باتیں نہ کرتے بلکہ حقیقت واضح کرتے جیسا کہ انہیں کے بعض ساتھیوں نے کیا ہے۔

آخر بعض محدثین کا یہ قول کہ ''حدیث رسول ﷺ دن کی طرح روشن ہوتی ہے۔ جس کو انسان خود سمجھ سکتا ہے اور اس پر تاریکی بھی ہوتی ہے جس کو دیکھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ حدیث رسول نہیں۔'' (۱۶) یہ نقد متن نہیں تو پھر کیا ہے؟

ایک دوسرے محدث کا یہ کہنا ہے کہ : جب تم دیکھو کہ حدیث عقل کے مخالف منقول سے متعارض اور اصول سے متضاد ہے تو سمجھ لو کہ یہ موضوع ہے۔ (۱۷)

اگر محدثین نے متن حدیث پر نقد نہیں کیا تو اس طرح کی حدیثوں پر علامہ ابن الجوزی نے جو حکم لگایا ہے نیز اسی طرح سے بے شمار روایتوں پر جو حکم لگایا ہے اور ان کو موضوعات میں شمار کیا ہے آخر وہ کیسے ممکن ہوا؟

یہ موضوع حدیث : "شكوت إلى جبرئيل رمد عيني فقال لي أنظر إلى المصحف" یعنی میں نے جبرئیل سے آنکھ آنے کی شکایت کی تو انہوں نے اس کا علاج یہ بتایا کہ مصحف دیکھو درست ہو جائے گی۔

علامہ ابن الجوزی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مصحف کہاں تھا کہ اس کو دیکھتے، پتہ چلا کہ یہ ''حدیث'' رسول کی بات نہیں ہو سکتی۔ (۱۸)

---

(۱۶) الموضوعات الکبری (۱/ ۱۰۳) (۱۷) الموضوعات الکبری (۱/ ۱۰۶)

(۱۸) دفاع عن السنة ورد شبہ المستشرقین والکتاب المعاصرین، د محمد بن محمد، ص/ ۴۲

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ حدیث کی نوعیت کیا ہے بعض روایتیں جن کا تعلق صفات سے ہے یا جو غیبیات سے متعلق ہیں جن میں جنت کی وسعت کا ایسا تذکرہ جو انسان کے تصور میں نہیں آسکتی، اس طرح کی روایتوں پر متن دیکھ کر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

بعض روایتیں ایسی ہیں جن میں حقیقی معنی مراد لینا ممکن نہیں، مجازی معنی مراد لیا جا سکتا ہے، دیکھنے یا پڑھنے والا جب اس کو حقیقی معنی میں لے گا تو وہ محال نظر آئے گی، ایسی روایتوں پر صرف متن دیکھ کر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

کبھی روایت میں کوئی معجزاتی بات ہوتی ہے جو بظاہر درست نہیں نظر آتی اس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ (۱۹)

ان تمام تر دقیق جزئیات کو سامنے رکھ کر محدثین نے نقد متن کے اصول بنائے ہیں جہاں تک ان تعصب زدہ حضرات پہنچ بھی نہیں سکتے۔

ان کی لن ترانیوں میں سے ایک بے ہنگم بات یہ بھی ہے کہ :

- احادیث رسول ﷺ قدیم اسلامی معاشرہ میں سیاسی اور معاشرتی ارتقاء کا نتیجہ تھیں۔ (۲۰)

عرض یہ ہے کہ احادیث رسول ﷺ کسی معاشرہ کی پیداوار نہیں اور نہ ہی کسی سیاسی و سماجی ارتقاء سے اس کا کوئی تعلق ہے، جن لوگوں نے اس طرح کی باتیں کی ہیں، وہ دین اسلام کی تاریخ سے یا تو کورے ہیں یا تجاہل عارفانہ برت رہے ہیں اور یہی اغلب ہے۔ دین اسلام اللہ رب العالمین کا دیا ہوا نظام ہے جو کامل اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں امت اسلامیہ کے صف اول کے افراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک پہنچ چکا تھا اس کو رب العالمین اپنے آخری رسول جناب محمد ﷺ کو عطا کیا، بذریعہ وحی، الہام والقاء و منام نازل فرمایا (جس کی ابتداء رسول محترم کے غار حرا میں قیام سے ہوتی ہے جہاں اور جس پس منظر میں

---

(۱۹) مصدر سابق (۴۳-۴۴) (۲۰) علوم الحدیث ص/۹۱۹

قرآن کریم کی سب سے پہلی آیتیں ﴿اقراء باسم ربک الذی خلق﴾ (العلق : ۱) نازل ہوئی ہیں اور تیئیس سالہ زندگی میں اس کی تکمیل ہوئی ہے جس کی رب العالمین کی جانب سے شدید نگرانی بھی ہوتی ہے، جہاں کوتاہی یا غلطی ہوتی ہے اس کی اصلاح بھی ہوجاتی ہے اور تنبیہ بھی، ﴿ولو تقول علینا بعض الأقاویل﴾ (الحاقۃ : ۴۴) کی دھمکی بھی دی جاتی ہے، یعنی اگر ہمارے خلاف کوئی بات رسول بھی گھڑ لیں تو اُن کی گرفت کی جائے گی اور شہ رگ کاٹ دی جائے گی۔ پھر اس کی تقریبی تکمیل ﴿الیوم أکملت لکم دینکم﴾ (مائدہ : ۳) یعنی آج تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کردیا۔ سے ہوتی ہے جس کا مکمل خاتمہ "اللھم الرفیق الأعلیٰ" (۲۱) پر ہوئی جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا آخری کلمہ تھا۔

رسول محترم کی وفات سے قبل آپ کے زمانے میں دین وشریعت کی تمام کلیات وجزئیات آپ کی ہدایتیں صحابہ کرام کے علم میں آچکی تھیں وہ اسی کی روشنی میں آپ کے زمانے میں اور اس کے بعد اپنے دور میں عمل کرتے تھے۔ یہی وہ دور ہے جو دین اسلام کی سب سے اہم تعبیر وتشریح کا دور ہے۔

دین اسلام اپنی تمام کلیات وجزئیات کے ساتھ کتاب وسنت کی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ مخاطبین کو پہنچادی گئی تھیں جس کا انہوں نے حجۃ الوداع کے موقع پر اقرار بھی کیا تھا، جب آپ نے یہ عرض کیا کہ "ألا ھل بلغت" کیا میں نے دین کی باتیں آپ لوگوں تک پہنچادی؟ سب نے بیک زبان عرض کیا "قالوا نعم" آپ نے پیغام پہنچادیا اور امانت تبلیغ ادا کردی، پھر آپ نے موجود حضرات کو آئندہ آنے والے لوگوں تک پہنچانے کا حکم بھی دیا اور فرمایا "فلیبلغ الشاھد الغائب" (۲۲) موجود حضرات غیر موجود لوگوں تک میرا پیغام پہنچادیں۔ پہنچانے والوں کو فضیلت عطا کی، جانتے ہوئے نہ بتانے والوں کو جہنم میں "الجم بلجام من النار" (۲۳) جو علم کو چھپائے گا تو اس کو آگ کا لگام لگایا جائے گا۔ کی دھمکی بھی دی،

(۲۱) بخاری (۴۴۶۳) (۲۲) بخاری (۱۲۲۵،۲۵۵۱)

(۲۳) ابوداؤد (۳۶۵۸)، ترمذی (۲۶۵۱) وقال : حسن صحیح۔ ابن ماجہ (۲۶۱)

اس طرح دین کو چھپانا جرم عظیم قرار پایا۔

یہ امر بھی ہر ایک کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ کوئی بھی دین کا مسئلہ جو دور رسول ﷺ و دور صحابہ رضی اللہ عنہم سے موافقت ومماثلت نہیں رکھتا اجماع وقیاس میں نہیں آتا۔ وہ مسلمانوں کے یہاں بدعت اور دین میں اضافہ قرار دیا گیا ہے جو مردود اور ناقابل قبول ہے۔ "من أحدث فی أمرنا هذا مالیس منه فهو رد'' (۲۴) جس نے ہمارے اس دینی معاملہ میں کچھ نئی چیز داخل کی تو وہ مردود ہے۔ پھر تسلسل کے ساتھ عمل، تدریس، تبلیغ، حفظ، تحریر وغیرہ کے ذریعہ اس کی نشر واشاعت ہوتی رہی، پھر یہ کہنا کہ یہ سیاسی وسماجی معاشرہ کے ارتقاء کا نتیجہ ہے کذب وافتراء کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

اگر یہ کسی ارتقاء کا نتیجہ ہوتا تو پوری دنیا میں جہاں جہاں مسلمان موجود ہیں وہاں کے ماحول موسم وضروریات کے اعتبار کا خیال کرتے ہوئے اس طرح کی چیزوں کا وجود ہوتا، حالانکہ اس طرح کی کوئی بات نہیں۔

پھر ان کا اتفاق اس طرح نہیں ہوتا کہ اس میں معنی ومفہوم میں کوئی تضاد نہ ہو عبادت کے طور طریقے میں فرق نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں، اقصائے مشرق کا مسلم فرد الاعمال بالنیات پڑھتا ہے تو اقصائے مغرب کا مسلمان بھی وہی پڑھتا ہے اور کہتا ہے۔ صلوۃ، زکاۃ، صیام اور حج جس طرح جزیرۃ العرب میں ارکان اسلام سمجھے جاتے تھے اسی طرح خراسان وماوراء النہر میں بھی سمجھے جاتے تھے۔

اگر اس کو سمجھنا ہے تو تاریخ سنت سے متعلق تحریر شدہ علمی کتابوں کا مطالعہ کریں، ان شاء اللہ تمام مسائل واضح اور شکوک وشبہات رفع ہو جائیں گے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ یہی حضرات کبھی اس کے صریح مخالف باتیں اڑاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ حدیث رسول ﷺ عجمی سازش کا نتیجہ ہے؟ ایں چہ بوالعجبی است

---

(۲۴) بخاری (۲۶۹۷)، مسلم (۱۷۱۸)

عجمی سازش کا ابتکار :

حدیث رسول ﷺ پر یہ انتہائی عجیب وغریب اعتراض ہے، شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے اپنے مقالات میں اس بدبودار عجمی سازش قرار دیتے ہوئے اس کو اس کے برے انجام تک پہنچا دیا ہے اور عرض فرمایا ہے کہ ''یہ ناممکن الوقوع ہے۔'' جو چند علم وعقل کے یتامیٰ کا پیدا کردہ ہے، حقیقت اور واقعے سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اس کا سراغ ملتا ہے بلکہ معترضین خود عجمی (مغربی) سازش کا شکار ہیں۔ (۲۵)

آپ نے مختلف جہات سے اس شبہہ کی کمزوری اور اس اعتراض کا جواب دے کر خود ان کی سازش کی نقابِ کشائی کردی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ انکشاف دوسری اور تیسری صدی میں کسی کو نہ سوجھا یہ عجیب بات ہے کہ زمانہ تدوین پر بارہ صدیاں گذر گئیں لیکن کسی کو خبر نہ ہوسکی اس کا الہام پرویزی ٹولہ کو ہوا جن کو فن حدیث سے کوئی لگاؤ نہیں، حالانکہ اس وقت اسلام دشمنوں کی کمی نہ تھی نیز کسی بھی سازش کے ثبوت کے لیے ٹھوس اور واضح دلائل کی ضرورت پڑتی ہے ان کے پاس محض ظن وتخمین ہے۔

یہ فسانہ ''طلوع اسلام'' کے دفتر میں بیٹھ کر چند آوارہ مزاج فرنگی نما یتیم العلم لوگوں نے گھڑا ہے مشاہدات یہ بتاتے ہیں کہ ائمہ حدیث کو حکومتوں کے جبر وتشدد کا نشانہ بنایا گیا، علماء حکام کے درباروں سے ہمیشہ دور رہتے تھے جس کا اعتراف خود ان کو بھی ہے، پھر اگر یہ ان امراء وحکام کی سازش میں شریک ہوتے تو ان کے ظلم وتشدد کا سامنا ان کو نہ کرنا پڑتا اور نہ ہی یہ درباروں کے مخالف ہوتے، نہ ہی قید وبند کی مشقتوں کو برداشت کرتے، نہ ان کے کوڑے کھاتے۔ عجمی شوشہ نکالنے والوں کے لیے طلوع اسلام کا دفتر نہیں بلکہ بریلی کا مینٹل ہاسپٹل ہونا چاہیے۔

علوم اسلامیہ کی سب سے پہلی درسگاہ حجاز ہے جہاں سے اس کا سرچشمہ جاری ہوا اور عرب سے عجم تک پہنچ گیا پھر اس میں عجمی سازش کا دخل کیونکر ہوا، پھر ان علماء ومحدثین اور ائمہ دین میں

---

(۲۵) مقالات حدیث ص؍۲۲۴

سب کے سب عجمی تو نہیں تھے بلکہ خالص عربی تھے وہ اس سازش میں کیونکر شریک ہو گئے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا بڑا حادثہ ہو جائے پورا دین عجمی سازش کا شکار ہو جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور سارے عرب وعجم اس جرم پر خاموش رہیں اور اس پر بارہ صدیاں گذر جائیں یہ تو عجوبہ زمانہ ہے کہ کسی کو خبر نہ ہو، پھر ان کو اچانک یہ خبر کیسے پہنچ گئی؟؟؟

مسلمانوں کا برتاؤ مفتوح قوموں کے ساتھ برادرانہ اور مساویانہ تھا، ذمیوں کے ساتھ ان کا سلوک بھائیوں کی طرح تھا پھر وہ کیونکر انتقامی جذبہ کے تحت اتنا بڑا کارنامہ انجام دیتے؟ کسی بھی انقلاب کے بعد عوام الناس کو صرف اپنی ضروریات کی فکر ہوتی ہے اور وہ مکمل ہو جائے تو وہ کسی شر کیلئے آمادہ نہیں ہوتے۔ (خصوصاً ایسی حکومت میں جہاں امن وسکون، اخوت، مساوات عدل وانصاف میسر ہو جو اسلامی حکومتوں کا طرۂ امتیاز تھا)

تیسری صدی ہجری تک جو دور تدوین کا زمانہ تھا فارس میں کوئی ایسی طاقت موجود نہ تھی جو کسی سازش کی سرپرستی کر سکتی، بلکہ اس مدت میں فارسی ساحل اس قدر مطمئن اور پرسکون تھا جس کی نظیر نہیں ملتی، لہٰذا اس سازش کا واقعات کی حقیقت میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے سیاست کا میدان ہی چھوڑ دیا اور علم کی طرف متوجہ ہو گئے سازش کا ان کی زبان پر نام تک نہ آیا، بلکہ یہ ادارہ طلوع اسلام کے دفتر میں ہوا۔ (۲۶)

تدوین حدیث کا جو تاریخی تسلسل ہے، اس پر نظر ڈالنے سے یہ فسانہ خود بخود فاسد ہو جاتا ہے، ظن وتخمین کے پراگندہ خیالات شکوک وشبہات کی وادی میں ایسے ہی بھٹکتے پھریں گے یہی وجہ ہے کہ خود ان کی اپنی باتیں ایک دوسرے سے متعارض نظر آتی ہیں۔ انہیں پراگندہ خیالات میں سے ان کی وہ اٹکل باتیں بھی ہیں جو صحابی رسول اور امام وقت امام زہری کے سلسلے میں کی گئی ہیں۔

وضع حدیث کے متعلق جو ہوائی اڑائی ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ امام زہری رحمۃ اللہ

---

(۲۶) تفصیل کے لیے دیکھیے مقالات حدیث ص ر ۲۲۵ تا ص ر ۲۹۰، حجیت حدیث ص ر ۱۷۲

علیہ کو ملوث کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے، مستشرقین کے پروردہ لوگوں میں بعض اتنے بذی اللسان ہوگئے کہ انہوں نے صحابی رسول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر بھی زبان طعن دراز کی۔ چونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام میں احادیث رسول کے سب سے بڑے حافظ تھے، اور امام زھری حدیث رسول کی تدوین کے معمار ہیں لہٰذا انہوں نے ضغائن کی چھری اور حقد کے جلن پر دروغ بافی کا زہر آلود پانی چڑھا کر ان صاحب عدل وضبط، امانت ودیانت پر چلانے کی کوشش کی۔ ان کو شکم پرور کہہ کر اپنی شکم پروری کا انتظام کیا۔ کاش کہ صحیح بخاری کتاب الاطعمة باب ماکان النبي صلى الله اليه وسلم وأصحابه ياكلون کی وہ روایت پڑھ لیتا جس میں انھوں نے بھُنی ہوئی بکری کی دعوت کو یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ رسول اللہ ﷺ کو نانِ شعیر بھی میسر نہ تھا۔ کیا شکم پرست آدمی اس طرح کی دعوت کو مسترد کردے گا۔

دراصل ان حضرات کی مخلصانہ کارکردگی برائے خدماتِ حدیث روز روشن کی طرح عیاں ہیں جن کو علم حدیث کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے اور ہر منصف مزاج ان کی خدمات کو سراہتا ہے اور یہی مستشرقین کے شاگردوں کے دلوں کو چھیدتا ہے۔

امام زہریؒ سے متعلق ان کے غیر معقول شبہات کا بھرپور جائزہ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ نے اپنی مشہور کتاب "السنة ومكانتها" میں لیا ہے، مذکورہ کتاب کی فصل سادس کا مطالعہ اس سلسلہ میں کافی مفید ہوگا۔ (۲۷)

ابوریہ مصری جوان مستشرقین کا نمائندہ ہے حضرت ابو ہریرہ کے تعلق سے جو ہرزہ سرائی کی ہے اور شیطانی الہامات کا مجموعہ تیار کیا ہے، اس کا علمی جواب بھی یہیں پر ملاحظہ فرمائیں۔ خود ابوریہ کی شخصیت کیا ہے، علمی میدان میں وہ کس قدر مادر زاد ننگا ہے اس کی بھی وضاحت کردی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ رحمہ اللہ نے "ظلمات أبي رية" میں اور علامہ معلمی یمانی رحمہ اللہ نے "الأنوار الكاشفة" میں اس کے اختراعات واکاذیب کا بخوبی آپریشن کیا ہے۔

---

(۲۷) دیکھیے ص ۱۸۷-۲۳۵

خدمات حدیث سے متعلق محدثین کی مخلصانہ خدمات اور قربانیوں کی سراہنا ہر حقیقت پسند اور منصف مزاج کرتا ہے، سنت کے دفاع کے سلسلہ میں ہر باب میں حسب ضرورت انہوں نے کتابیں تحریر کیں۔ چونکہ موجودہ دور کے منکرین درحقیقت مستشرقین کے نمائندے ہیں انہیں پر ان کامکمل اعتماد ہے، لہٰذا جن کتابوں میں ان کا جواب دیا گیا ہے وہ مستشرقین کا جواب بھی ہے، موجودہ دور کی کتابیں عموماً دونوں کیلئے مشترک ہوتی ہیں، مخالفین سنت، اس کے معترضین، مشککین اور لاپرواہی برتنے والوں کے جواب میں بہت ساری کتابیں تحریر کی گئی ہیں جن کا احصاء ممکن نہیں، اس سلسلہ کی کچھ کتابیں یہ ہیں۔

دفاعی کتابیں :

- الاشتشراق والمستشرقون : عمر فروخ
- الأنوار الكاشفة لمافي كتاب أضواء السنة من الزلل والتضليل والمجازفة : شيخ عبدالرحمن المعلمي
- ظلمات أبي رية أمام أضواء السنة المحمدية: شيخ محمد عبدالرزاق حمزه.
- الردالقويم على المجرم الأثيم : شيخ حمود عبدالله التويجرى.
- الدفاع عن السنة وردشبهات المستشرقين: ڈاكٹر محمد محمد ابو شهبة.
- السنة ومكانتها : ڈاكٹر مصطفى سباعى
- السنة قبل التدوين : ڈاكٹر عجاج خطيب
- الحديث والمحدثون : شيخ محمد أبوزهو
- منزلة السنة وبيان أن لا يستغنى عنه : شيخ محمد ناصر الدين الألبانى
- دراسات في الحديث النبوى : ڈاكٹر محمد مصطفى أعظمى

- عناية المحدثين بمتن الحديث : ڈاکٹر محمود الطحان
- زوابع في وجه السنة : شيخ صلاح الدين مقبول
- منهج نقد المتن عند علماء المحدثين : ڈاکٹر صلاح الدين ادلبی
- الدفاع عن أبی هريره : شيخ عبدالمنعم صالح
- السنة فی مكانتها وفی تاريخها : ڈاکٹر عبدالحليم محمود
- أبوهريرة فی ضوء مروياته : ڈاکٹر محمد ضياء الرحمن الأعظمی
- اهتمام المحدثين بنقد الحديث سنداً ومتناً : ڈاکٹر محمد لقمان سلفی

اردو زبان میں بہت سی گراں قدر تالیفات ہیں مثلاً :

- دلیل الفرقان بجواب اہل القرآن : مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری
- حجیت رسول اور اتباع رسول : مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری
- حجیت حدیث : (مجموعہ مقالات مولانا محمد اسماعیل سلفی وشیخ البانی)
- مقالات حدیث : جمع وترتیب مولانا محمد اسمٰعیل سلفی
- علوم الحدیث فنی فکری اور تاریخی مطالعہ : ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
- صیانۃ الحدیث : مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی
- خالص اسلام : محمد داؤد صاحب راز دہلوی
- تفہیم اسلام : مسعود احمد بی۔ایس۔سی
- تدوین حدیث : مولانا مناظر احسن گیلانی
- حدیث رسول کا تشریعی مقام : ترجمہ غلام احمد حریری
- انکار حدیث حق یا باطل : شیخ صفی الرحمٰن اعظمی
- دوام حدیث : حافظ محمد گوندلوی

- آئینۂ پرویزیت : عبدالرحمٰن گیلانی
- مقامِ حدیث : پروفیسر اشفاق ظفر
- علوم حدیث مجموعہ مقالات، ترتیب : رفیق احمد سلفی
- استشراق اور مستشرقین : ترجمہ محمد جمال ندوی
- فتنہ انکار حدیث کا نیا روپ : غازی عزیر
- تحقیق سے تحریف تک : انیس الرحمٰن مدنی
- یہودی سازشیں اور فتنہ انکار حدیث : انعام اللہ خان پشاور
- جرح و تعدیل : ڈاکٹر اقبال احمد بسکوہری

ان کے علاوہ فتنہ انکار حدیث کے نام سے مختلف کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ جناب ڈاکٹر عبدالروف ظفر صاحب نے علوم الحدیث میں فتنہ انکار حدیث کے رد میں لکھی جانے والی کتب میں بیلین کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ (۲۸)

ان خدمات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنت کے متوالوں نے ہر زمانہ میں سنت کی بھرپور حفاظت کی ہے۔ اللہ رب العالمین ان کی خدمات کو قبول فرمائے آمین۔

☆☆☆

---

(۲۸) ملاحظہ ہو (۸۳۳-۸۳۵)

باب چہارم

حدیث رسول کی تشریحی خدمات

تشریحی خدمات

محدثین عظام نے حدیث رسول کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور امت اسلامیہ کو جو تحفہ دیا ہے اس میں سے ایک بے مثال اور مایۂ ناز تحفہ حدیثِ رسول کی توضیحی وتشریحی خدمات ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا خطاب رب العالمین کی نگرانی اور اس کی عطا کردہ روحانی قوت کے زیر سایہ ہوتا تھا۔ اللہ کا فرمان ہے ﴿ وما ينطق عن الهوى ، إن هوإلا وحي يوحى ﴾ (نجم : ۱-۲) آپ اپنی خواہش سے تکلم نہیں فرماتے، یہ تو وحی ہے جو منزل من اللہ ہوتی ہے، لہٰذا آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا کلمہ بڑا وسیع معنی رکھتا تھا جو ادبی لطافت، شیریں کلامی اور اثر انگریزی کا نادر نمونہ ہوتا تھا خود آپ کا فرمان ہے "اوتيت جوامع الكلم" (۱) مجھ کو جوامع الکلم عطا کیا گیا ہے، یعنی میری گفتگو میں الفاظ کی قلت اور معنی کی کثرت پائی جاتی ہے۔

آپ کا خطاب اور آپ کے کلمات ادب وبلاغت کا سرچشمہ، سلاست ولطافت کا نمونہ ہوتے تھے آپ کی اصل زبان اور لب ولہجہ قریشی تھا جو خالص عربی زبان تھی، اسی زبان ولب ولہجہ میں قرآن کریم کا نزول ہوتا تھا جس کو ﴿بلسان عربي مبين﴾ (شعرا : ۱۹۵) خالص عربی زبان۔ کے شرف سے نوازا گیا ہے، جب قرآن کریم کے اس کے اصلی لب ولہجہ میں لکھنے کی بات آئی تو حضرت عثمان نے فرمایا تھا کہ اگر زید بن ثابت اور دیگر لوگوں میں عربیت کا اختلاف ہو تو اس کو قریش کی عربیت پر لکھو کیونکہ قرآن کریم کا نزول لغت قریش پر ہوا ہے۔ (۲)

خالص عربی زبان جس کو آپ نے بادیہ میں سیکھا تھا۔ اس پر رب العالمین کے کلام کے پر تو نے چار چاند لگا دیا تھا لہٰذا آپ کی زبان مبارک، آپ کے دل ودماغ اور خیالات عطاء الٰہی کے

---

(۱) بخاری (۶۴۹۶) بلفظ بعثت بجوامع الکلم مسلم (۸۱۲) (۲) بخاری (۴۹۸۵)

عکاس اور نورِ نبوت سے پرنور تھے، لہٰذا فصاحت کی بلندی و بلاغت کی پرواز، معیاری گفتگو، لب ولہجہ کا کیا پوچھنا، ایسا لگتا تھا جیسے موتی کی لڑیاں بکھر رہی ہیں، یقیناً جس ذات کو جوامع کلم عطا کیا گیا ہو وہ ایسا ہی ہوگا، بعض ضعیف روایتوں میں آپ کی جانب یہ قول منسوب ہے کہ " أنا أفصح العرب ، بيد أني من قريش واسترضعت في بني سعد بن بكر" (۳) میں قریشی ہوں۔ بنو سعد میں پرورش ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود میں پورے عرب میں سب سے زیادہ فصیح زبان جانتا ہوں یعنی لغت قریش کیساتھ ساتھ اللہ تعالی نے آپ کو دیگر قبائل کے لب ولہجہ میں بھی فائق بنایا تھا، آپ کو اس میں صرف عبور ہی نہیں تھا بلکہ آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا اور کیوں نہ ہو اس دین رحمت کی نشر و اشاعت اس کا سننا اور سمجھنا کسی ایک قبیلہ کیلئے نہ تھا، لہٰذا رب العالمین نے پوری قوم کی زبان آپ کو عطا کیا تھا۔

آپ کے پاس مختلف قبائل کے لوگ تشریف لاتے تھے، آپ ان سے انہیں کی زبان میں اور انہیں کے لہجہ میں گفتگو فرماتے جس کو خود قریش کے لوگ سمجھنے میں دقت محسوس کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے بنی فہد سے خطاب کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم اور آپ ایک ہی خاندان، ایک ہی گھر کے ہیں لیکن اس کے باوجود آپ جو خطاب مختلف وفود سے فرماتے ہیں وہ ایسی گفتگو ہوتی ہے جس کو کبھی کبھی ہم نہیں سمجھ پاتے تو آپ نے فرمایا کہ "أدبني ربي فأحسن تاديبي وربيت في بني سعد " (۴) بنی سعد میں مجھ کو تربیت ملی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری تربیت خود میرے خالق نے کی ہے اور بہت اچھی تربیت کی ہے۔ روایت ضعیف ضرور ہے لیکن بنی سعد میں شق صدر کا واقعہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

لہٰذا آپ کا تکلم جس قبیلہ سے ہوتا تھا وہ انہیں کے اسلوب اور لہجات میں ہوتا تھا جس کو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن ان کے بعض کلمات دوسروں کے لیے اجنبی اور غریب ہوتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مختلف قبائل کے لوگ آپ کی باتوں کو سن کر اور سمجھ کر جاتے تھے اور اس کی تعبیر

---

(۳) الفائق فی غریب الحدیث (۱/۱۱)، نیز دیکھیے ضعیف الجامع الصغیر (۱۴۰۰، ۱۴۰۴)

(۴) کشف الخفاء (۱/۷۰) سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ (۲۱۸۴)

اپنی زبان میں کرتے تھے تو دوسرے قبائل والوں کے لیے وہ کلمات غریب ہو جاتے تھے۔

دور رسول، اور صحابہ کرام کے ابتدائی دور میں اہل زبان کی کثرت تھی خالص بادیہ کی زبان مستعمل تھی، غیر اہل زبان سے اختلاط نہیں تھا جس کی وجہ سے غریب کلمات کی تعداد بہت کم تھی، آہستہ آہستہ جب آمد و رفت میں وسعت ہوئی اہل زبان کا اختلاط مختلف اطراف و اکناف سے آنے والے لوگوں سے ہوا، فصیح اور غیر فصیح، صاحب زبان اور غیر صاحب زبان ایک دوسرے سے خلط ملط ہونے لگے تو اس میں عام مستعمل کلمات اور انتہائی سہل زبان کا استعمال کیا جانے لگا، اور خاص زبان مخصوص لوگوں کے استعمال میں رہ گئی اس لیے دیگر لوگوں کے لئے وہ زبان اور اس کے کلمات غریب اور مشکل ہوتے گئے، اس طرح آہستہ آہستہ غرابت میں اضافہ ہوتا گیا۔

اور جب آپ کا پیغام عرب سے نکل کر عجم میں پہنچا تو انہوں نے بھی عربی زبان سیکھا جو ان کی ایک ضرورت تھی۔ لہٰذا انہوں نے اپنی ضرورت کے مطابق عام بول چال والی زبان پر اکتفا کیا، معیاری عربی زبان جو اہل بادیہ کی زبان سمجھی جاتی تھی، اس کے فصیح کلمات، بلیغ اسلوب نادر جملے، کنایہ وتعریض، استعارہ، تمثیل اشباع وایجاز، مجاز وبدیع جو عام زبان میں مستعمل نہ تھے وہ ان کے لیے مشکل اور غریب ہو گئے۔

ایک مرتبہ کسی نے ایک بادیہ نشین سے یہ کہا کہ میں آپ سے ایک غریب کلمہ کا معنی جاننا چاہتا ہوں، اس نے کہا، کلمہ غریب نہیں ہوتا ہے یہ قوم عرب کی زبان ہے غریب تم اور تم جیسے لوگ ہو جو اس کے معنی کو نہیں جانتے۔ (۵)

ابوزید صاحب غریب الحدیث نے ایک اعرابی سے کہا کہ "محبنطی" (پستہ قد) کسے کہتے ہیں اس نے کہا کہ "المتکاکی" کو انہوں نے کہا کہ متکاکی کیا ہے، اس نے کہا "المتآزف" انہوں نے کہا کہ متآزف کیا ہے اس نے کہا، تم بے وقوف ہو ہٹ جاؤ سامنے سے۔ (٦)

---

(۵) غریب الحدیث للحربی (۱/۱۰) مقدمہ محقق

(٦) غریب الحدیث ابن جوزی (۱/۹) مقدمہ محقق

عربی زبان میں جو وسعت پائی جاتی ہے وہ بھی اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتی ہے کون سا کلمہ کب کس معنی میں مستعمل ہوتا ہے اوران کے اشتقاق سے متفرع ہونے والے اور مشابہ کلمات کن معنی میں مستعمل ہوتے ہیں اور یہ کلمہ مختلف قبائل میں کس معنی میں مستعمل ہوتا ہے اس کا جاننا ضروری ہے جس میں اہل زبان کو مہارت ہوا کرتی تھی، اس کے نہ جاننے سے بھی غرابت کا وجود ہوتا ہے۔

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ : علم حدیث اور آثار جو اشرف علوم ہیں یہی دائرہ اسلام کا محور ہیں ان کا سمجھنا فرض کفایہ ہے جن میں ان کے الفاظ کی معرفت اور پھر معنی کی معرفت انتہائی اہم ہے، ان میں الفاظ کی معرفت معنی کی معرفت پر مقدم ہے۔ پھر یہ الفاظ مفرد بھی ہوتے ہیں اور مرکب بھی، ان میں مفرد کی معرفت مقدم ہے کیونکہ مفرد کی ترکیب ہی سے مرکب تیار ہوتا ہے، یہ مفرد الفاظ کبھی عام ہوتے کبھی خاص۔

عام : وہ کلمہ ہے جس کو ہر کوئی سمجھتا ہے کیونکہ عام خطاب میں یہی جاری وساری ہوتا ہے۔

خاص : وہ ہے جس میں مشکل اور نادر الفاظ مستعمل ہوتے ہیں جن کو ہر کس وناکس نہیں جانتا، ان کو وہی لوگ جانتے جو اس میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، اس قسم کے الفاظ کی معرفت سب سے اہم ہوتی ہے۔

پھر ان کی معرفت ذاتی بھی ہوتی ہے، صفاتی بھی، ذاتی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلمہ کا وزن اس کی بنیاد، اس کے حروف کی تالیف اور ضبط معلوم کی جائے تا کہ کوئی کلمہ دوسرے کی جگہ نہ چلا جائے۔

صفاتی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی حرکت، اور اعراب کو سمجھا جائے تا کہ فاعل ومفعول میں تبدیلی نہ ہونے پائے کلمات کی معرفت ذاتی کے لیے مخصوص علم ہے جس کو علماء لغت واشتقاق سب سے بہتر جانتے ہیں یہ ان کے لیے مخصوص فن ہو گیا، اور صفاتی معرفت علماء نحو وصرف کا علم ہو گیا جو اس کو سب سے بہتر جانتے ہیں اگر چہ ان دونوں علوم میں تلازم ہے۔ (۷)

---

(۷) النھایۃ فی غریب الحدیث لابن اثیر (۱/ ۳-۴)

اس طرح ایک کلمہ کی معرفت کے لیے مختلف علوم کے معرفت کی ضرورت پڑتی ہے، جس کو علماء اسلام نے سیکھا اور اس میں عبور حاصل کیا اس طرح سے یہ علوم وفنون کتاب وسنت کے خادم علم بن گئے کیوں کہ جب کتاب وسنت کے معنی ومفہوم کے وضاحت کی ضرورت پڑی جو خالص عربی زبان میں ہیں تو ان میں وارد کلمات کی تشریح، ان سے متفرع اور مشتق ہونے والے کلمات اور ان کے معانی کی تبدیلی کس حدیث یا آیت میں کون سا لفظ کس معنی میں مستعمل ہے، اور اس کے اشتقاقی اور مشابہ کلمات کس، کس معنی میں مستعمل ہیں ان کی وضاحت، معنی مفہوم کی تعیین کی ضرورت پیش آنے لگی تو اہل علم نے اپنی خدمات کو پیش کیا، اور ہر صاحب فن اپنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے خدام کتاب وسنت کے قافلہ میں شامل ہو گیا۔

اہل لغت وادب، اصحاب بلاغت وعلماء نحو وصرف وغیرہ نے اپنے اپنے فنون سے اس کی مدد کی۔ محدثین نے شرح حدیث کے لیے روایت بالمعنی، پس منظر، شان ورود کے ساتھ ساتھ مختلف قبائل اور بادیہ نشینوں کے لب ولہجہ، اور اسلوب خطاب، ضرب المثل، ادباء کے خطابات شعراء کے اشعار وغیرہ سے مدد لیا اور مختلف طرح کی خدمات انجام دیا جس کے نتیجے میں بڑی بڑی لغت کی کتابیں بھی تیار ہو گئیں جس میں ہر قسم کے مشتق کلمات کو ذکر کیا گیا۔

اس ضمن میں جو سب سے اہم اور نمایاں کارکردگی منظر عام پر آئی اور جس کو سبقت اور اولیت حاصل ہوئی وہ حدیث رسول کی تشریحی خدمات ہیں جس کا پہلا زینہ غریب الفاظ کی تشریح اس کے معنی ومفہوم کی تعیین اور وضاحت تھی، جو حدیث رسول میں مستعمل تھے۔ انہیں کتابوں کو ''کتب غریب حدیث'' کہا جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس تشریحی خدمت میں تنوع آتا گیا اور ہر کلمہ کا معنی ومفہوم بتایا جانے لگا، احکام کا استنباط ہونے لگا، ناسخ ومنسوخ کی تعیین، مختلف الحدیث کی وضاحت اور اس میں وجہ توفیق بتائی جانے لگی، کلام رسول کی وضاحت کے لیے جو بھی ضروری امور تھے سب کو حل کیا جانے لگا، درس وتدریس میں اس کا اہتمام ہوا، اور کتابی شکل میں ان معلومات کو جمع کر دیا گیا یہی وہ کتابیں ہیں جن کو کتب شروح حدیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

پھران شرحوں میں تنوع آیا کوئی شرح منفصل بنی، کوئی متوسط اور کوئی مختصر ہوئی، کوئی تعلیقات کے راستہ پر گامزن ہوئی کسی نے حاشیہ آرائی پسند کیا، کسی نے بعض ضروری کلمات اور جملوں کی تشریح پر اکتفا کیا، اس طرح گوناگوں خدمات کے ذریعہ حدیث رسول کی وضاحت اور تشریح کر کے اس تشریحی خدمات کو بے مثال بنا دیا گیا، جب کہ ابتداء میں محض ایک آدھ کلموں پر اکتفا کیا جاتا تھا۔

فی الحال غریب الحدیث سے متعلق جو تصنیفی خدمات ہیں اس پر معلومات پیش کرنا مقصد ہے تا کہ محدثین عظام کے اس خدماتی پہلو کو اجاگر کیا جائے جو دراصل تشریحی خدمات کا پہلا نمونہ ہے قبل ازیں کہیں کہیں حسب ضرورت اس کی تشریح مترادف کلمہ سے کر دی جاتی تھی جس کا نمونہ مدرج کی شکل میں موجود ہے دور تحریر سے پہلے درس وتدریس کے وقت اگر تشریح کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ کر دی جاتی تھی یا حسب ضرورت طلبہ اپنے اساتذہ سے دریافت کر لیا کرتے تھے، اس سے زیادہ کی ضرورت ان کو نہیں پڑتی تھی۔

غریب :

غریب اس کلمہ کو کہتے ہیں جس کا معنی مشکل یا مخفی ہو۔امام خطابی فرماتے ہیں کہ :

غریب کلام غامض اور سمجھنے میں مشکل کلام کو کہا جاتا ہے جیسے کہ غریب انسانوں میں اس کو کہا جاتا ہے جو اپنے وطن سے دور ہو۔غریب کلام کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا معنی سمجھ سے دور اور مخفی ہوتا ہے محنت ومشقت کے بعد اور دریافت کرنے کے بعد سمجھا جاتا ہے، دوسرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کلمہ دور و دراز بادیہ یا قبائل کے استعمال میں ہوتا ہے عام استعمال میں نہیں ہوتا جب وہ عام آدمی کے پاس آتا ہے تو وہ تعجب میں پڑ جاتا ہے کیوں کہ وہ اس کے لیے غریب ہوتا ہے حالانکہ جہاں مستعمل ہے وہاں غریب نہیں۔ (۸)

---

(۸) مقدمہ غریب الحدیث للخطابی

کتب غریب حدیث

کتب غریب حدیث تحریر کرنے والے علماء ومحدثین کی ایک طویل فہرست ہے جن میں ابوعبیدۃ معمر بن مثنی تیمی (متوفی ۲۱۰ھ) کا نام نامی سرفہرست ہے۔ جنہوں نے غریب الحدیث کے نام سے چند اوراق میں ایک کتاب تحریر کی جس نے اس دور کی ضرورت کو پوری کر دیا، بقول علامہ ابن اثیر یہ ایک مختصر کتاب ہے جس میں تھوڑے ہی کلمات کا ذکر ہے۔ لیکن یہ قلت عدم معرفت کی بناء پر نہیں تھی۔ بلکہ اس کی وجہ سبقت عمل ہے جو شخص کسی موضوع پر پہلے قلم اٹھاتا ہے تو وہ قلیل ہی ہوتا ہے اور اسمیں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے دور میں جہالت اتنی عام نہیں تھی لہٰذا ان کے سامنے کلمات غریبہ کی تعداد کم تھی ان کو زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ (۹)

نصر بن شمیل مازنی (متوفی ۲۰۳ھ) ابوعبیدہ سے پہلے انہوں نے ''غریب الحدیث'' کتاب لکھی جو ان کی کتاب سے بڑی اور شرح وبسط سے تھی۔ (۱۰)

علامہ کتانی کہتے ہیں صحیح قول کے مطابق سب سے پہلی کتاب نصر بن شمیل کی ہے۔ (۱۱)

حالانکہ علامہ ابن اثیر نے جس طرح وضاحت سے تحریر کیا ہے اس سے ان کا متاخر ہونا واضح ہے، غالباً جن لوگوں نے متقدم کیا ہے انہوں نے تاریخ وفات کا خیال کیا ہے۔

محمد بن مستنیر (متوفی ۲۰۶ھ) جو ابن قطرب سے مشہور ہیں۔ انہوں نے ''غریب الآثار'' نام کی کتاب تحریر کی۔

عبدالملک بن قریب اصمعی (متوفی ۲۱۶ھ) نے اس فن پر ایک اچھی کتاب تحریر کی، یہ

---

(۹) مقدمہ النھایۃ فی غریب الحدیث ابن اثیر (۵/۱) (۱۰) النھایۃ (۵/۱)

(۱۱) الرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۱۵

سب ابوعبیدہ ہی کے دور کے ہیں ان سب کی کتابیں اس فن کے ابتدائی مرحلہ کی کتابیں ہیں اور تقریباً کمیت وکیفیت میں ایک جیسی ہیں۔ (۱۲)

غریب الحدیث :

ابوعبید قاسم بن سلام ھروی ازدی (متوفی ۲۲۴ھ) سابقہ حضرات کے بعد غریب الحدیث میں آپ نے کتاب تحریر کی جو ایک مثالی کتاب بن گئی۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ غریب الحدیث میں سب سے پہلی تصنیف ہے۔ علامہ کتانی کہتے ہیں کہ غالباً کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے انتہائی محنت ومشقت اور تتبع سے کام کیا ہے یہاں تک کہ اس کے قدوہ اور نمونہ بن گئے، ورنہ سب سے پہلے نضر بن شمیل نے کتاب لکھی ہے۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ : غریب حدیث میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جسے انہوں نے مکمل قدرت ومہارت کیساتھ الفاظ کو جمع اور بیان کیا معنی کو صحیح تعبیر عطا کیا۔ (۱۳)

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ : اگر چہ ان کا عمل متاخر ہے لیکن درجہ میں متقدم ہے وہ اس فن کے امام وپیشوا بن گئے انہوں نے اسمیں اپنی پوری عمر صرف کردی، خود ان کا بیان ہے کہ یہ میری زندگی کا خلاصہ ہے جس میں یقیناً وہ صادق ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال کا تلاش کرنا جمع کرنا اور پھر وضاحت کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

ان کی یہ کتاب اہل علم کے یہاں مرجع ومعتمد بنی رہی یہاں تک کہ ابومحمد ابن قتیبہ کی کتاب منظر عام پر آئی جنہوں نے انہیں کے نقش قدم پر عمل کیا۔ (۱۴) یہ کتاب غریب الحدیث لابی عبید قاسم بن سلام کے نام سے چار جلدوں میں حیدر آباد سے مطبوع ہے اگر چہ کلمات غیر مرتب مذکور ہیں لیکن آخری جلد میں جو مرتب فہرست ہے اس سے کسی بھی کلمہ کی تلاش انتہائی آسان ہے۔

پھر آگے کا سلسلہ جاری رہا اپنے اپنے ذوق وفہم اور ضرورت کے مطابق اہل علم نے بڑی سرگرمی سے اس میں حصہ لیا، اس علمی سفر کا جو آغاز تیسری صدی ھجری میں ہوا تھا ساتویں صدی تک جاری رہا جب علامہ ابن اثیر نے، النہایۃ کی تالیف کی۔

---

(۱۲) النہایۃ ص ۱/۶ (۱۳) مقدمہ غریب الحدیث (۱۴) مقدمہ النہایۃ (۱/۶)

مذکورین کے علاوہ تیسری صدی میں جن لوگوں نے یہ خدمت انجام دیا وہ مندرجہ ذیل ہیں :

حسن بن محبوب سرار (متوفی ۲۰۳ھ)

اسحاق بن مرار ابوعمر شیبانی (متوفی ۲۱۰ھ)

ابوزید انصاری سعید بن اوس (متوفی ۲۱۵ھ)

ابن الاعرابی محمد بن زیاد (متوفی ۲۳۱ھ)

عمرو بن ابی عمرو شیبانی (متوفی ۲۳۱ھ)

علی بن مغیرہ اثرم (متوفی ۲۳۲ھ)

ابومروان عبدالملک بن حبیب مالکی اِلبیری (متوفی ۲۳۸ھ)

ابوجعفر محمد بن حبیب بغدادی نحوی (متوفی ۲۴۵ھ)

ابوجعفر محمد بن عبداللہ بن قادم (۲۵۱ تک گھر واپس نہیں آئے)

شمر بن حمدویہ ہروی (متوفی ۲۵۵ھ)

ثابت بن ابی ثابت کاتب ابوعبید قاسم بن سلام (متوفی)

سلمہ بن عاصم کوفی ابومحمد (متوفی ۲۷۰ھ)

غریب الحدیث والآثار :

ابن قتیبہ : ابومحمد عبداللہ بن مسلم (متوفی ۲۷۶ھ) کی ہے یہ کتاب قاسم بن سلام کی کتاب کے بعد سب سے زیادہ شہرت یافتہ ہے حتی کہ اس کے ظہور کے بعد اُس کا درجہ ثانوی ہوگیا۔

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب غریب الحدیث والآثار میں کافی مشہور ہے جو ابوعبید کے طریقہ پر تصنیف کی گئی ہے، جو حدیث ابوعبید کی کتاب میں تھی اس کو انہوں نے نہیں ذکر کیا ہے الا یہ کہ کوئی خاص ضرورت ہو، یہ کتاب اس سے کچھ مطول ہے۔

ابن قتیبہ نے مقدمہ کتاب میں یہ کہا ہے کہ میرے خیال میں ان دونوں کتابوں قاسم بن سلام اور ابن قتیبۃ کی کتاب کے بعد غریب حدیث میں کسی گفتگو کی ضرورت نہیں رہ جائے گی۔

علامہ کتانی نے اس کو ابن سلام کی کتاب کا ذیل قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ اپنے اصل سے بڑی ہے اس میں ان کے اوہام کی بھی نشاندہی کی ہے، اور اصلاح الغلط کے نام سے ایک خاص کتاب تحریر کی ہے۔ (۱۵)

غریب الحدیث :

ابواسحاق ابراہیم بن اسحاق حربی (متوفی ۲۸۵ھ)

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں غریب حدیث میں ان کی کتاب مشہور ہے جو کئی جلدوں میں ہے غریب کلمات کو جمع کر کے مفصل شرح کیا، لیکن اسمیں حدیثوں کو اپنی سند سے نقل کیا اور ایک کلمہ کے لیے مکمل حدیث کو نقل کر دیا، اس کی وجہ سے کتاب طویل ہوگئی اور متروک ہوگئی، حالانکہ یہ انتہائی مفید کتاب تھی اس کے مولف امام وقت اور حافظ عصر تھے، فقہ وحدیث ادب ولغت کے ماہر تھے۔

جن لوگوں نے ان سے پہلے کتابیں لکھی تھیں ان میں کوئی کتاب منظم اور مرتب نہیں تھی۔ سوائے ان کی کتاب کے حالانکہ طوالت کی وجہ سے اس میں بھی غریب کلمہ تلاشنا مشکل ہوتا تھا۔ (۱۶) کتاب تین جلدوں میں در سلیمان ابراہیم عابر کی تحقیق سے مطبوع ہے لیکن ناقص ہے صرف پانچویں جلد جو اصل کتاب کی آخری جلد ہے وہی تین جلدوں میں مطبوع ہے۔

ابوالعباس محمد بن زید المبرد (متوفی ۲۸۵ھ)

محمد بن عبدالسلام خشنی (متوفی ۲۸۶ھ)

ابوالخیر اشبیلی فرماتے ہیں کہ یہ کتاب تقریباً بیس جزء میں ہے حدیث رسول گیارہ اجزاء، حدیث صحابہ چھ جز، حدیث تابعین پانچ اجزاء ہیں۔ (۱۷)

ابوالعباس ثعلب احمد بن یحییٰ (متوفی ۲۹۱ھ) کتاب کا نام غریب الحدیث ہے۔

چوتھی صدی ہجری بھی اس عمل سے خالی نہ رہا جن شخصیات نے اس دور میں اپنی خدمات انجام دیں ان میں سے کچھ یہ ہیں :

---

(۱۵) الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱۶ (۱۶) النہایۃ (۶/۱) (۱۷) الفہرست ص ۱۹۵

قاسم بن ثابت سرقسطی (متوفی ۳۰۲ھ) ان کی کتاب کا نام ہے " الدلائل فی شرح ما أغفله أبو عبيد و ابن قتيبة في غريب الحديث" ہے۔ (۱۸) ابوعلی قالی فرماتے ہیں کہ : اندلس میں ''الدلائل'' کی طرح میرے علم میں کوئی کتاب نہیں تحریر کی گئی ابن ترفی کہتے ہیں : اگر وہ یہ کہتے کہ مشرق میں بھی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی تو ان کی بات غلط نہ ہوتی اس کتاب کو ان کے والد نے مکمل کیا جن کی وفات ان کے بعد (متوفی ۳۱۳ھ) میں ہوئی۔

ابومحمد قاسم بن محمد انباری (متوفی ۳۰۴ھ)

ابوموسی سلیمان بن محمد حامض (متوفی ۳۰۵ھ)

محمد بن کیسان (متوفی ۳۲۰ھ)

محمد بن عثمان بن جعد تلمیذ ابن کیسان

محمد بن حسن بن درید (متوفی ۳۲۱ھ)

محمد بن قاسم ابوبکر انباری (متوفی ۳۲۸ھ)

کہا جاتا ہے کہ ان کی کتاب ۴۵۰۰۰ ورق میں تھی۔ (۱۹)

ابوالحسین عمر بن محمد مالکی (متوفی ۳۲۸ھ)

محمود بن احمد حموی ابن خطیب (متوفی ۳۳۴ھ)

ابوعمر محمد بن عبدالواحد غلام ثعلب (متوفی ۳۴۵ھ)

ابن درستویہ ابومحمد عبداللہ بن جعفر (متوفی ۳۴۷ھ)

غريب الحديث :

امام ابوسلیمان حمد بن سلیمان خطابی (متوفی ۳۸۸ھ)

امام خطابی کی یہ کتاب بھی کافی مشہور ہے اور اس فن کی امہات کتب میں شمار کی جاتی ہے

---

(۱۸) الرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۱۶

(۱۹) وفیات الاعیان (۳/۴۶۴)

علامہ کتانی نے اس کو قتبی کا ذیل قرار دیا ہے؛ بقول ابن اثیر اس میں انہوں نے ابوعبید اور ابن قتیبہ کے منہج اور طریقہ تالیف کو اپنایا ہے؛ اس میں انہیں احادیث کو ذکر کیا ہے جو ابوعبید اور ابن قتیبہ کی کتاب میں نہیں ہے۔

خود امام خطابی فرماتے ہیں کہ جب میں نے توجہ سے تتبع شروع کیا تو یہ کتاب ان دونوں کے کتاب کے تقریبا برابر ہوگئی حالانکہ ابھی بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن کی تفسیر میں نہ کر سکا اور ان کو چھوڑ دیا تاکہ اللہ اپنے جس بندے پر اس کو واضح کر دے وہ اس کو کر لیں۔ (۲۰) یہ کتاب جامعہ ام القری سے مطبوع ہے۔

الغریبین :

اس کے بعد پانچویں صدی میں کچھ اور بہتر اور جامع کتابیں تحریر کی گئیں جن میں ابوعبید احمد بن محمد ھروی (متوفی ۴۰۱ھ) کی کتاب غریبین یعنی "غریبی القرآن و الحدیث" انتہائی اہم سمجھی جاتی ہے اور جب "غریب الحدیث" میں ھروی کا نام لیا جاتا ہے تو اس سے یہی مراد ہوتے ہیں، جبکہ دیگر اور حضرات کی نسبت بھی ھروی ہے۔ جنہوں نے غریب الحدیث میں کتابیں لکھی ہیں، خود قاسم بن سلام کی نسبت بھی ھروی ہے یہ ان دو کتابوں میں سے ایک ہے جس کو علامہ ابن اثیر نے اپنی کتاب "النھایة" کے لیے بنیاد بنایا ہے۔ یہ علامہ ازھری جو اپنے زمانہ کے ماہر لغت وادب تھے جن کی کتاب "تہذیب اللغہ" ہے ان کے شاگرد ہیں، انہوں نے اپنی کتاب میں قرآن وحدیث دونوں کے غریب کو جمع کیا ہے اور اس کتاب کو حروف معجم پر اس طرح مرتب کیا ہے کہ ان سے پہلے ایسا کسی نے نہیں کیا، احادیث سے غریب کلمات کو لے کر حروف معجم پر مرتب کر کے اس کی تشریح کر دی ہے، ابوعبید وابن قتیبہ اور دیگر سابقہ کتابوں کو اپنے اضافہ کے ساتھ یکجا کر دیا ہے، اس طرح یہ کتاب ایک جامع اور منظم کتاب ہوگئی جس سے استفادہ بہت آسان ہوگیا، لہذا یہ کتاب عام لوگوں کے لیے مرجع اور معتمد بنی رہی یہاں تک کہ زمخشری کی کتاب منظر عام پر آگئی۔ (۲۱)

---

(۲۰) النهاية (۸/۱) (۲۱) النهاية (۸/۱-۹)

اس صدی کے دیگر مولفین یہ ہیں :

ابو القاسم اسمٰعیل بن حسن بن غازی (متوفی ۴۰۲ھ) ہیں۔ان کی کتاب کا نام "سمط الثریا" ہے۔

ابو الفتح سلیم بن ایوب رازی (متوفی ۴۴۷ھ) کتاب کا نام "تقریب الغریبین" ہے۔دار الکتب المصریہ میں اس کا نسخہ موجود ہے۔

اسماعیل بن عبد الغافر راوی صحیح مسلم (متوفی ۴۴۹ھ)

ان کے بعد چھٹی صدی میں بھی اس فن پر کام ہوا اُن میں سے کچھ حضرات یہ ہیں :

ابراہیم بن محمد بن ابراہیم نسوی (متوفی ۵۱۹ھ)

ابو الحسن عبد الغافر بن اسمٰعیل فارسی (متوفی ۵۲۹ھ) جن کی کتاب کا نام "مجمع الغرائب" ہے۔

الفائق فی غریب الحدیث :

اس صدی کی ایک اہم کتاب : ''الفائق فی غریب الحدیث'' ہے یہ علامہ ابو القاسم جار اللہ محمود زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی تالیف ہے، جو اسم با مسمی ہے، غریب حدیث کے ہر معمہ کو انہوں نے حل کر دیا، اور کتاب کو حروف معجم پر مرتب کر کے آسان کر دیا البتہ اس میں پریشانی یہ ہے کہ جب کسی ایک کلمہ کی بنیاد پر حدیث کی شرح کی تو اس حدیث میں موجود دوسرے غریب کلمات کی شرح بھی کر دیا ہے، اس طرح کے کلمات کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ (۲۲) ہر حرف کے خاتمہ کے بعد اس حرف سے متعلق بعض کلموں کے مقامات جن کا ذکر وہاں نہیں ہے ان کی جانب اصل مادہ ذکر کر کے اشارہ کر دیا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں مطبوع ومتداول ہے۔

مشارق الأنوار علی صحاح الآثار :

انہیں میں سے ایک کتاب "مشارق الأنوار علی صحاح الآثار" ہے جس کے مؤلف قاضی عیاض اندلسی (متوفی ۵۴۴ھ) ہیں، یہ کتاب صحیحین اور موطا امام مالک سے متعلق

(۲۲) النھایۃ (۹/۱)

ہے۔غریب کلمات، اختلاف، ضبطِ الفاظ وغیرہ پر توجہ دیا ہے۔

علامہ کتانی فرماتے ہیں کہ اگر اس کو جواہر سے وزن کیا جائے یا آب زر سے لکھا جائے تو بھی کم ہے۔ (۲۳)

ایسے ہی "مطالع الأنوار علی صحاح الآثار" ہے جو ابو اسحاق ابراہیم بن یوسف کی تالیف ہے جو ابن قرقول (متوفی ۵۶۹ھ) کے نام سے مشہور ہیں یہ سابقہ کتاب کی قدرے اضافہ کے ساتھ مختصر ہے۔

المغیث فی غریب القرآن والحدیث :

اس فن کی ایک انتہائی اہم کتاب "المغیث فی غریب القرآن والحدیث" ہے جو ابو موسیٰ محمد بن ابوبکر الاصبہانی (متوفی ۵۸۱ھ) کی تالیف ہے، علامہ ابن اثیر نے اس کتاب کو، ھروی کی کتاب کے ساتھ اپنی کتاب کے لیے بنیاد بنایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ابو موسیٰ اصبہانی جو حافظ وقت اور مرجع طلاب تھے انہوں نے اس فن پر کتاب تحریر کی جسمیں ھروی نے چھوٹے ہوئے کلمات کو انہیں کے طرز پر تحریر کیا، یہ ان کی کتاب کے حجم اور طریقہ میں بالکل مساوی ہے، میں نے اس کتاب کو غایت حسن وکمال والا پایا جو ھروی کی کتاب کا تکملہ تھا تو میں نے مناسب سمجھا کہ ان دونوں کتابوں سے کلمات غریبہ کو جن کا تعلق حدیث سے ہے جمع کر کے، اس سے مشتق کلمات کا جو ان میں نہیں ہے اضافہ کردوں۔ (۲۴)

غریب الحدیث :

اسی سلسلہ ذھبیہ کی ایک اہم کڑی علامہ ابن الجوزی عبدالرحمن بن علی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵۹۷ھ) کی کتاب ہے، جو مختصر ضرور ہے لیکن طلبہ کے لیے بہت مفید ہے، عموماً ایک کلمہ سے غریب کی تشریح کر کے کام ختم کردیا ہے وہ فرماتے کہ کلمہ کی تصریف واشتقاق وغیرہ کتب لغت کا کام ہے میں نے یاد کرنے والوں کے لیے اختصار سے کام لیا ہے اور پھر حروف معجم پر مرتب کردیا ہے یہ کتاب اختصار کے باوجود جامع کتاب ہے جو دو جلدوں میں مطبوع ہے۔

---

(۲۳) الرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۱۸ (۲۴) النھایۃ (۱/۱۰)

بالآخر یہ گرانقدر سلسلہ خدمات آکر ایک عظیم کتاب میں ضم ہوگئے جو اسم با مسمی ہے وہ ہے۔

النهاية في غريب الحديث :

یہ علامہ ابن اثیر ابو السعادات مبارک بن محمد جزری (متوفی ۶۰۶ھ) کی تالیف ہے، جو اپنے فن کی ایک نامور کتاب ہے، انہوں نے اپنی اس کتاب کی تالیف کے لیے دو اہم کتابوں کو بنیادی مرجع بنایا ہے امام ھروی کی کتاب غریبی القرآن والحدیث اور ابو موسی اصبہانی کی کتاب المغیث فی غریب القرآن والحدیث، ان دونوں کتابوں نے سابقہ مصادر کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا تھا، علامہ ابن اثیر نے ان دونوں کتابوں سے غریب القرآن کو الگ کر کے صرف غریب حدیث وآثار کو منظم ومرتب کر دیا اور اس میں اپنے اضافہ کے ذریعہ چار چاند لگا دیا اس طرح یہ کتاب اس فن کی انتہائی جامع ومنظم کتاب بن گئی جس کا نام انہوں نے "النهاية في غريب الحديث" پسند کیا جو یقیناً اسم با مسمی ہے کیونکہ النہایۃ کے بعد شاذ ونادر ہی غریب کلمات باقی بچے ہیں۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ : یہ غریب حدیث میں سب سے بہتر سب سے جامع مشہور اور متداول کتاب ہے۔ (۲۵)

ابو عبید ھروی کی کتاب سے ماخوذ کلمات اور حدیث کے لیے (ھ) کا رمز اور ابو موسی کی کتاب کے لیے (سینا) کا رمز استعمال کیا ہے جس پر کوئی رمز نہیں ہے وہ ان کا اپنا اضافہ ہے۔

علامہ ابن اثیر کے بعد جن لوگوں نے اس سلسلہ میں کچھ اور کام کیا ہے اس میں شیخ موفق الدین ابن قدامۃ (متوفی ۶۲۰ھ) ہیں جنہوں نے قاسم بن سلام کی کتاب کو مرتب کیا ہے۔ اور علامہ ابن حاجب ابو عمرو عثمان بن عمر (متوفی ۶۴۶ھ) قابل ذکر ہیں۔

بقیہ جن لوگوں نے ان کے بعد کام کیا ہے عموماً وہ ابن اثیر ہی کی کتاب سے کچھ نہ کچھ متعلق ہیں چنانچہ صفی الدین محمود بن ابوبکر ارموی (متوفی ۷۲۳ھ) نے اس پر ذیل تحریر کیا۔

امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) اس کی مختصر تحریر کی جس کا نام " الدر النثير" ہے پھر کچھ زیادات جمع کیا جس کا نام "التذييل و التذنيب على نهاية الغريب" ہے، اس

---

(۲۵) الرسالۃ المستطرفۃ ص/ ۱۱۷

کا نسخہ دارالکتب المصریہ اور برلین میں موجود ہے۔

عیسی بن محمد صفوی (متوفی ۹۵۳ھ) نے بھی اس کا اختصار کیا ہے جو اس کے نصف حجم کے برابر ہے اسی طرح شیخ علی بن متقی حسام الدین ہندی (متوفی ۹۷۵ھ) نے بھی اس کا اختصار کیا ہے۔

اسماعیل بن محمد بن بردس (متوفی ۷۸۵ھ) نے "النهاية" کو نظم میں پرویا ہے، اس سے جہاں النهاية کی قدر و قیمت سمجھ میں آتی ہے وہیں یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ علماء امت نے حدیث رسول کی خدمت کتنے کتنے انداز میں کیا ہے، اس طرح کی کتابوں کا نظم میں پرونا کس قدر مشکل کام ہے لیکن انہوں نے وہ بھی کر کے دکھا دیا اس نظم کا نام "الكفاية في نظم النهاية" ہے جس کا نسخہ برلین میں (۱۶۵۹) نمبر پر موجود ہے۔

النهاية پانچ جلدوں میں بڑی سائز میں مطبوع ہے۔

یہ وہ گرانقدر تشریحی خدمات ہیں جو غریب حدیث کی شکل میں امت کو عطا کی گئی ہیں دیگر تشریحی خدمات کہیں زیادہ ہیں۔

غریب حدیث کے سلسلہ میں ابو عبید معمر بن مثنی، ابن قتیبہ، امام خطابی، حربی، ھروی، زمخشری، اصبہانی، ابن الجوزی کی کتابیں امہات کتب سمجھی جاتی ہیں، جن کو النہایہ نے اپنے دامن میں سابقہ دونوں کتابوں کے ساتھ سمیٹ لیا ہے، اللہ رب العالمین ان کی خدمات کو قبول فرما کر ان کے لیے قیامت تک صدقہ جاریہ بنائے رکھے۔ آمین (۲۶)

☆☆☆

---

(۲۶) ملاحظہ ہو: الفهرست ابن نديم ص: ۱۲۹، فهرست ماروا‌ه عن شيوخه ابن خيرالاشبيلي ص: ۱۸۵، الرسالة المستطرفه للكتاني، مقدمه غريب الحديث لابن الجوزى (مقدمه محقق) مقدمه غريب الحديث لابن قتيبه، مقدمه غريب الحديث قاسم بن سلام (مقدمه محقق)، مقدمه الفائق، مقدمه النهاية فى غريب الحديث مقدمه مؤلف و (مقدمة محقق)۔

شروح حدیث

محدثین عظام کی تشریحی خدمات کی دوسری کڑی شرح حدیث ہے جس میں غریب الحدیث سے آگے بڑھ کر کتب حدیث میں سے کسی کتاب میں موجود حدیثوں کی تشریح، راویوں کی معرفت، متن حدیث سے ماخوذ مسائل اور دیگر حدیثی معلومات کی وضاحت کی جاتی ہے، اس طرح کی کتابوں کو کتب شروح حدیث کہا جاتا ہے۔

کتب شروح حدیث کی تعداد بے شمار ہے کیونکہ کتب حدیث کی تعداد خود ہی بہت ہے، لہذا اس کی شرحوں کا شمار انتہائی مشکل امر ہے، محدثین کی خدمات بھی اس سلسلہ میں متنوع اور مختلف ہیں، بعض شرحیں کافی مفصل ہوتی ہیں، بعض متوسط اور بعض مختصر، اور بعض تعلیقات، افادات اور حواشی کی شکل میں ہوتی ہیں، پھر زبانیں بھی مختلف ہو جاتی ہیں ہر دور میں شروح حدیث کی معرفت اور پھر ان کی تالیفات پر اطلاع بھی مشکل امر ہے، آج بھی کتنی ایسی شرحیں ہیں جن کا تذکرہ صرف کتب تواریخ میں پایا جاتا ہے لیکن آج تک ان کا پتہ نہ لگ سکا، کتنی شرحیں جنگوں میں ضائع کر دی گئیں، کچھ دیگر حادثات کا شکار ہو گئیں۔

جن کتابوں کا ذکر اہل علم نے کیا ہے ان میں سے کچھ کتابوں کا تذکرہ یہاں پر محض محدثین کرام کی عظیم خدمات کو اجاگر کرنے کیلئے بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے ورنہ ان کی خدمات کا احاطہ ناممکن ہے۔

ان کتابوں کا تذکرہ اصحاب فہارس نے اپنی کتابوں میں کیا ہے خاص طور سے حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں، علامہ کتانی نے "الرسالۃ المستطرفہ" میں، محمد فواد سزگین نے "تاریخ التراث العربی" میں، علامہ صدیق نواب حسن خاں نے "الحطۃ فی ذکر الصحاح

السنـــــة " علامہ عبدالرحمن مبارکپوری نے مقدمہ شرح ترمذی میں خصوصی طور سے کیا ہے بعض حضرات جنہوں نے محدثین میں سے کسی کی مفصل سوانح حیات تحریر کی ہے انہوں نے ان کی کتاب حدیث کی شرحوں کو بھی بتایا ہے، بہت سارے اہل علم نے مخصوص کتاب کی شرحوں پر کام کیا ہے ضمناً اس کی تمام شرحوں پر گفتگو بھی کی ہے، ان سے استفادہ اس باب میں کافی مفید ہے۔

اقسام شرح :

حاجی خلیفہ فرماتے ہیں کہ شرح حدیث کی تین قسمیں ہوتی ہیں :

پہلی قسم : "قـال أقول " سے شرح کرنا۔یعنی شارح مولف کے قول کو ذکر کر کے پھر "اقــول" کہہ کر اس کی تشریح کرتا ہے جیسے شرح المقاصد، اس میں شرح کے ساتھ ساتھ متن بھی مذکور ہوتا ہے خواہ وہ حاشیہ میں ہو یا شرح کے ساتھ ملا کر ہو۔

دوسری قسم : "قــولـہٗ" سے شرح کرنا اسمیں مکمل متن نہیں لکھا جاتا ہے کیونکہ یہاں پر مقصد صرف قابل شرح مقامات کی تشریح ہوتی ہے، اگر چہ بعض نساخ حاشیہ میں متن بھی ذکر کر دیتے ہیں جیسے فتح الباری شرح صحیح البخاری لابن حجرؒ۔

تیسری قسم : شرح'' مزدوج'' اس میں شرح ومتن کی عبارت خلط ملط ہوتی ہے پھر ش، م لکھ کر یا متن کے اوپر خط لگا کر متن کو واضح کیا جاتا ہے، متاخرین کا عموماً یہی طریقہ ہے حالانکہ اس میں شرح ومتن خلط ملط ہونے سے محفوظ نہیں رہتے۔ (۱)

چونکہ کتب حدیث میں بعض کتابوں کو بہت اہمیت حاصل ہے معاشرہ میں ان کا بہت اونچا مقام ہے اس لیے اس طرح کی کتابوں کی شرح لکھنے کیلئے محدثین نے کافی مشقت کی ہے، بلکہ ایک ایک کتاب کی کئی کئی شرحیں لکھی ہیں، مثلاً صحیحین، موطاء سنن اربعہ جن کو دواوین اسلام ہونے کا شرف حاصل ہے جن کو صحاح ستہ اور کتب ستہ کا بھی لقب ملا ہوا ہے، امت کی نگاہ میں یہ کتابیں انتہائی محترم ہیں، شریعت کا دارومدار انہیں پر ہے، کتب حدیث کے نام پر یہی کتابیں پڑھائی جاتی

---

(۱) کشف الظنون (۱/۳۷)

ہیں، لہٰذا کثرت شروح کا بھی شرف ان کو حاصل ہے، مثلاً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الجامع الصحیح" کو لے لیجیے، اس کی اس قدر شرحیں وحواشی تحریر کی گئی ہیں جس کی کوئی مثال نہیں، چونکہ اس کتاب کو امت نے از روئے صحت قبول کیا ہے اور کتاب اللہ کے بعد بطور صحت اصح ترین کتاب قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس کتاب پر علماء کی توجہ اور ان کی عنایتیں قابل دید ہیں۔

اس کتاب کی شرحوں کا ذکر محترمہ غزالہ حامد جزاھا اللہ خیراً نے اپنے M.A. کے رسالہ میں حصول سند کے لیے ۱۹۶۶ء میں ایک قیمتی مقالہ تحریر کرکے کیا تھا جو کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے اس میں انہوں نے دوسو سے زائد شروح وحواشی کو ذکر کیا ہے جبکہ بہت ساری شرحیں ان کے علم میں نہ آسکیں پھر کتنے لوگوں نے اس کے بعد شروح وتراجم تحریر کیے ہیں اس کا بھی پتہ نہیں۔

موصوفہ کی کتاب کا نام "شروح بخاری" ہے اس میں مطبوع شرحوں کے بارے میں جو معلومات میسر ہوسکیں اس کا بھی تذکرہ کیا ہے، اگر اس کا قلمی نسخہ موجود ہے تو کس کتب خانہ میں اشارہ فرمایا ہے، معرفت شروح بخاری کے تعلق سے اس کا مطالعہ کافی مفید ہے۔

بہر حال صحیح بخاری کی شرحوں میں سے کچھ کا تذکرہ یہاں کیا جارہا ہے۔

شروح صحیح بخاری

أعلام السنن : یہ امام خطابی ابوسلیمان حمد بن محمد بستی (متوفی ۳۸۸ھ) کی تالیف ہے جو صحیح بخاری کی سب سے پہلی شرح ہے، امام خطابی نے اس سے پہلے سنن ابوداؤد کی ایک شرح "معالم السنن" کے نام سے تحریر کیا تھا اس سے فارغ ہونے کے بعد صحیح بخاری کی شرح تحریر کی ہے۔

اس کے قلمی نسخے بانکی پور، پٹنہ اور ایاصوفیہ میں موجود ہیں، نیز دیگر جگہوں پر بھی اس کے نسخے پائے جاتے ہیں۔ (۲)

شرح ابن بطال : یہ امام ابوحسن علی بن خلف عرف ابن بطال (متوفی ۴۴۹ھ)

---

(۲) شروح بخاری ص/۱۰۰، تاریخ التراث العربی (۱/۱۷۷)

کی تالیف ہے، یہ ایک مالکی عالم تھے اس لیے فقہ مالکی کا اس پر غلبہ ہے گویا کہ یہ کتاب فقہ مالکی کا مجموعہ ہے، اصل موضوع کتاب سے کوئی خاص تعارض نہیں کیا ہے۔ (۳)

اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں دیکھیے ۔ (۴)

شرح ابن منیر اسکندرانی : اس کا نام "البدر المنیر الساری فی الکلام علی البخاری" ہے، یہ ناصر الدین علی بن محمد بن منیر اسکندرانی (متوفی ۶۹۵ھ) کی مفصل شرح ہے جو دس ضخیم جلدوں میں ہے۔

شرح ابن منیر حلبی : یہ قطب الدین عبدالکریم بن عبدالنور بن منیر (متوفی ۷۳۵ھ) کی تالیف ہے یہ کتاب کافی مفصل ہے نصف کتاب تک اس کی دس جلدیں ہیں اس کے قلمی نسخے برلن وغیرہ میں موجود ہیں۔ (۵)

الکوکب الدراری : یہ علامہ کرمانی شمس الدین محمد بن یوسف کرمانی (متوفی ۷۸۶ھ) کی متوسط شرح ہے جو کافی مشہور ہے اور بہت مفید ہے اس کی تالیف (۷۷۵ھ) میں مکہ مکرمہ میں مکمل ہوئی تھی۔ اس میں لغوی الفاظ کی تشریح، نحوی اعراب، ضبط روایات، اسماء راویان نیز دفع تعارض پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ (۶)

یہ کتاب مطبوع ومتداول ہے۔

التلویح شرح الجامع الصحیح : یہ امام مغلطائی بن قلیج ترکی (متوفی ۷۹۲ھ) کی ایک طویل اور مفصل شرح ہے۔

التنقیح لألفاظ الجامع الصحیح : اس کتاب کے مؤلف علامہ زرکشی بدرالدین محمد بن بہادر (متوفی ۷۹۴ھ) ہیں، یہ ایک مختصر شرح ہے جس میں مشکل کلمات، غامض اعراب، ضبط اسماء جن میں تصحیف کا امکان ہے اس پر خصوصی عنایت کی ہے اور ایسے فوائد کا

---

(۳) تاریخ التراث العربی (۱/۱۷۸) (۴) کشف الظنون (۱/۵۴۶)

(۵) کشف الظنون (۱/۵۴۶)، تاریخ التراث (۱/۱۷۸)

(۶) کشف الظنون (۱/۵۴۶)

ذکر کیا ہے جس سے صاحب فہم وفراست بڑی بڑی شرحوں سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ (۷)

کتاب مصر سے مطبوع ہے، قلمی نسخے مختلف جگہوں پر دستیاب ہیں۔ (۸)

شواهد التوضیح : یہ علامہ ابن ملقن سراج الدین عمر بن حفص (متوفی ۸۰۴ھ) کی تالیف ہے یہ بیس جلدوں پر مشتمل صحیح بخاری کی ایک مفصل شرح ہے، امام سخاوی کا خیال ہے کہ اس کے لیے انہوں نے زیادہ تر اپنے استاذ علامہ مغلطائی کی کتاب پر اعتماد کیا ہے، اس پر کچھ اضافہ بھی کیا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کا نصف اول بہت بہتر ہے لیکن نصف آخر زیادہ سودمند نہیں۔ (۹)

اس کے مختلف نسخے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ (۱۰)

منح الباری شرح صحیح البخاری : یہ علامہ فیروز آبادی، صاحب قاموس محمد بن یعقوب (متوفی ۸۱۷ھ) کی تالیف ہے، ربع عبادات تک یہ کتاب بیس جلدوں میں ہے اس کے اختتام کا اندازہ چالیس جلدوں کا تھا، بقول علامہ سخاوی اس میں فتوحات مکیہ کے مباحث کو زیادہ تر نقل کر دیا ہے اس لیے یہ کتاب علماء کے یہاں مرغوب نہ رہی۔ (۱۱)

اللامع الصبیح بشرح الجامع الصحیح : یہ علامہ محمد بن عبد الدائم برماوی (متوفی ۸۳۱ھ) کی تالیف ہے جو علامہ زرکشی اور کرمانی کی شرحوں سے ماخوذ ہے، البتہ کچھ ایضاحات وتنبیہات کا اضافہ ہے، یہ شرح بہت اچھی ہے جو چار جلدوں میں ہے اس کے نسخے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہیں۔ (۱۲)

اس طرح تحریر شرح بخاری کا یہ سلسلہ رواں دواں رہا، اہل علم ہر دور میں اپنی نگارشات پیش کرتے رہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ صحیح بخاری کا جو مقام تھا اور اس کی جو قدر و قیمت ملت اسلامیہ کے دلوں میں تھی اس کے شایان شان کوئی جامع شرح نہ تیار کی جا سکی، جس کا شکوہ علامہ

---

(۷) کشف الظنون (۱/۵۴۹) (۸) تاریخ التراث (۱۸۰-۱۸۱)

(۹) کشف الظنون (۱/۵۴۷) (۱۰) تاریخ الادب العربی (۳/۱۶۹)

(۱۱) شروح بخاری ص/۱۱۱ (۱۲) تاریخ التراث (۱/۱۱۲)

ابن خلدون نے کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ صحیح بخاری کی شرح امت کے ذمہ قرض ہے۔ (۱۳)

فتح الباری شرح صحیح البخاری

بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب امت سے اس قرض کو حافظ ابن حجر کے ذریعہ اتارا گیا، اس کتاب کا نام "فتح الباری شرح صحیح البخاری" ہے اس کے مؤلف شہرہ آفاق ہیں جن کا نام نامی شہاب الدین احمد بن علی عسقلانی ہے جو حافظ ابن حجر سے معروف ہیں آپ کی وفات مصر میں (متوفی ۸۵۲ھ) میں ہوئی۔

یہ ایک علمی شاہکار وفنی دستاویز ہے جو اپنی مثال آپ ہے، اس کے منظر عام پر آنے کے بعد اس کو "لاھجرة بعد الفتح" کا اعزاز بخشا گیا، یعنی فتح الباری کے بعد اب کسی شرح بخاری کی ضرورت باقی نہ رہی۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ صحیح بخاری کی سب سے مشہور ومتداول اور قابل اعتماد شرح ہے، اس کتاب کا مقدمہ جو شرح کتاب سے پہلے تحریر کیا گیا تھا، "ھدی الساری" کے نام سے موسوم ہے جس کی تالیف میں تقریباً سات سال کا وقفہ لگا، ۸۰۷ھ میں اس کی ابتدا ہوئی اور ۸۱۳ھ میں خاتمہ پھر ۸۱۷ھ سے شرح کی ابتدا کی گئی جو تقریباً آخری عمر تک جاری رہی اور ۸۴۲ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ (۱۴)

صحیح بخاری ہی سے متعلق پھر ایک کتاب "تغلیق التعلیق" کے نام سے تصنیف کی جس میں ان تمام روایتوں کی متصل سندوں کا ذکر کیا ہے جن کو تعلیقات بخاری کہا جاتا ہے، علامہ عینی نے اس شرح پر کہیں کہیں کچھ اعتراض کیا تھا اس کا بھی جواب "انتقاض الاعتراض" کے نام سے دیا ہے۔

فتح الباری کی شہرت اس کی تعریف کرنے سے بے نیاز کر دیتی ہے، جس وقت یہ کتاب منظر عام پر آئی اسی وقت سے شہرت یافتہ ہوگئی، اتنی شہرت کسی اور شرح حدیث کو نہیں ملی، سلاطین

---

(۱۳) مقدمہ ابن خلدون (۳۳۸/۲-۳۳۹) اردو ترجمہ (۱۴) کشف الظنون (۵۴۸/۱)

وقت نے اس کو اشرفیوں سے وزن کر کے خریدا، پوری ملت اسلامیہ میں یہ مؤلف ہی کے دور میں منتشر ہو چکی تھی آج تک اس کی شہرت برقرار ہے علماء امت نے اس پر اعتماد کیا ہے، کتاب کی تکمیل پر مؤلف نے دعوت عام کی جس میں پانچ سو دینار صرف ہوا۔ (۱۵)

عمدة القاری

یہ کتاب علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد عینی (متوفی ۸۵۵ھ) کی گرانقدر تالیف ہے، فتح الباری کے بعد صحیح بخاری کی مشہور ترین شرح ہے، دونوں کے مولفین ہم عصر تھے جن میں تنافس کا بھی جذبہ تھا حافظ ابن حجر بحثیت شافعی اور علامہ عینی بحثیت حنفی شہرت یافتہ عالم تھے، دونوں حلقوں کے افراد نے اپنی اپنی مسلکی تصلب کو ان شرحوں سے وابستہ کیا اور ہر ایک نے اپنے اپنے حساب سے ان میں مقارنہ کیا ہے کتاب کی شرح مؤلف نے ۸۲۱ھ میں شروع کیا تھا اور ۸۴۷ھ میں مکمل کیا۔

صاحب کشف الظنون فرماتے ہیں کہ اس میں فتح الباری سے کافی مدد لی گئی ہے، کہیں کہیں مکمل ورق نقل کیا ہے، حافظ ابن حجر کی شرح کو ان کی اجازت سے ایک شاگرد برہان بن خضر کے واسطہ سے حاصل کرتے تھے۔ (۱۶)

یہ شرح ابتداء میں انتہائی مفصل اور جامع ہے لیکن انتہا میں وہ تفصیل وجامعیت بالکل ناپید ہے آخر میں حاشیہ کی شکل اختیار کر گئی ہے، اس شرح میں مختلف جگہوں پر جو حوالے دیے گئے ہیں خاص طور سے آخری کتاب میں اس میں نسیان بہت ہے کیونکہ جس جگہ کا حوالہ ہے وہاں اس کی شرح نہیں ہے بلکہ یہاں اس جگہ کا حوالہ دیا ہے جہاں پر سابق جگہ کا حوالہ ہے، اس طرح حدیث کی شرح دونوں جگہوں میں سے کہیں نہیں ہے۔

میرے ایک حنفی استاذ ڈاکٹر محمود میر حفظہ اللہ نے جامعہ اسلامیہ مدینہ میں شرح حدیث کے مادے کی تدریس کے وقت اپنے تلامذہ کو اس طرح کے مختلف حوالے سے مطلع کیا تھا جن

---

(۱۵) سیرت البخاری ص ر ۱۸۳ (۱۶) سیرۃ البخاری ص ر ۱۸۷

چیزوں کو حافظ ابن حجر نے عمداً چھوڑ دیا تھا اس کو آپ نے مفصل ذکر کیا ہے مثلاً مکمل متن، راویوں کی مکمل سوانح حیات، انساب پر تفصیلی گفتگو، علم معانی، علم بیان، علم بدیع و دیگر اسلوب بلاغی وغیرہ۔

حافظ ابن حجر سے کسی نے ان علوم کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ آپ کی کتاب میں کیوں نہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ دراصل یہ رکن الدین کی شرح سے ماخوذ ہے چونکہ وہ شرح ناتمام تھی اس لیے آئندہ مشقت کے خوف سے میں نے اس کو تحریر نہیں کیا۔ بہر حال یہ کتاب صحیح بخاری کی سب سے بہترین شرح ہے۔ (۱۷)

ارشاد الساری : یہ علامہ شہاب الدین احمد بن محمد بن خطیب قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ) کی تصنیف ہے، یہ ایک بڑی شرح ہے اس میں فتح الباری اور کرمانی کو مختصر کر کے جمع کر دیا گیا ہے۔ (۱۸)

اس طرح شرح بخاری کا سلسلہ ہر دور میں چلتا رہا اور کچھ نہ کچھ عمل ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

اس کے اردو ترجمے اور شروح میں سے کچھ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں :

صحیح بخاری مترجم : یہ کتاب مرزا حیرت دہلوی کی ہے جس کا ترجمہ مطلب خیز ہے، جا بجا قوسین میں وضاحت بھی موجود ہے۔ (۱۹)

فیض الباری : یہ شیخ محمد ابوالحسن سیالکوٹی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے اس میں صحیح بخاری کا ترجمہ تیس پاروں میں کیا گیا ہے، کیونکہ برصغیر میں صحیح بخاری کو تیس پاروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

تیسیر الباری : یہ علامہ وحید الزماں صاحب کی تالیف ہے جنہوں نے مختلف کتب حدیث کو اردو زبان میں منتقل کیا ہے، یہ کتاب مطبوع اور متداول ہے۔

أنوار الباری : یہ مولانا انور شاہ کشمیری کے افادات کا مجموعہ ہے جس کے مرتب آپ کے داماد مولانا احمد رضا بجنوری ہیں، اس میں حب مذہب کا غلبہ ہے اس لیے بہت سی قابل اعتراض باتیں شامل ہیں، "اللمحات الی مافی أنوار الباری من الظلمات" تالیف شیخ رئیس احمد ندوی حفظہ اللہ میں اس کا جواب ہے۔

---

(۱۷) سیرۃ البخاری ص ر ۱۸۸ (۱۸) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ر ۱۲۷ (۱۹) سیرۃ البخاری ص ر ۲۰۵

ارشاد الساری : یہ مفتی رشید احمد لدھیانوی کی تصنیف ہے۔

ترجمہ و تشریح صحیح بخاری : یہ مولانا محمد داود صاحب راز دہلوی کی تالیف ہے جو مطبوع ہے۔

مختصر صحیح بخاری : یہ علامہ زین الدین زبیدی کی تالیف ہے، اس کا اردو ترجمہ معمولی تعلیقات کے ساتھ مطبوع ہے جس کو مشہور عالم دین مولانا عبد الستار حماد حفظہ اللہ نے کیا ہے۔

اس کتاب کا انگریزی اور فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ شیخ نیاز احمد عبد الحمید طیبی استاذ جامعہ محمدیہ مالیگاؤں میں ہندی ترجمہ کیا ہے جو ابھی مطبوع نہیں ہے۔ ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ خالد حنیف صاحب بھی اس کا ترجمہ کر رہے ہیں۔

اس طرح علمائے امت نے تشریحی خدمات میں صحیح بخاری کو عظیم مرتبہ سے نوازا ہے اللہ تعالیٰ ان حضرات کی کوششوں کو قبول فرمائے اور ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے آمین۔

شروح صحیح مسلم

کتب حدیث میں صحیح بخاری کے بعد صحیح مسلم کا درجہ ہے جس کا اصل نام "المسند الصحیح" ہے کتاب کی عظمت و وقار کا خیال کرتے ہوئے اہل علم نے اس کی بھی بڑی اچھی خدمت کی ہے اور اسکی مختلف شرحیں تحریر کی ہیں ان شرحوں میں سے سب سے بہتر اور عمدہ شرح :

المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج : جو امام نووی ابو زکریا یحیٰ بن شرف نووی ؒ (متوفی ۶۷۷ھ) کی تالیف ہے، اس پر امام نوویؒ نے ایک جامع مقدمہ بھی تحریر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی ضعف ہمتی اور قلت رغبت کا خوف نہ ہوتا تو بڑی مفصل شرح لکھتا جو سو جلدوں سے اوپر ہوتی۔ (۲۰)

---

(۲۰) شرح مسلم مع النووی (۵/۱)

اس کتاب کی یہی شرح سب سے زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کی دیگر شرحوں میں کچھ یہ ہیں :

المعلم بفوائد مسلم : یہ ابوعبداللہ محمد بن علی مازری (متوفی ۵۳۶ھ) کی تصنیف ہے، اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہیں۔ (۲۱)

إکمال المعلم فی شرح مسلم : یہ قاضی عیاض بن موسیٰ یحصبی مالکی (متوفی ۵۴۴ھ) کی شرح ہے جو دراصل المعلم کی تکمیل ہے۔ امام نووی نے اپنی شرح میں اس پر کافی اعتماد کیا ہے۔ اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ (۲۲)

إکمال اکمال المعلم : یہ امام ابوعبداللہ محمد بن خلیفہ تونسی (متوفی ۸۲۷ھ) کی تالیف ہے جو چار بڑی جلدوں میں ہے۔ اس میں قاضی عیاض، امام نووی، امام قرطبی اور امام مازری کی شرح سے استفادہ کرتے ہوئے مزید قیمتی فوائد کو جمع کیا ہے، نیز اپنے استاذ محمد بن عرفۃ کی گرانقدر معلومات کر ذکر کیا ہے، ان کتابوں کے لیے خاص اشارہ استعمال کیا ہے۔ م : سے امام مازری، ع : سے قاضی عیاض، ط : سے قرطبی، د : سے امام محی الدین نووی، شیخ : سے ابن عرفۃ کو مراد لیا ہے۔ یہ کتاب مطبوع ہے۔ (۲۳)

مکمل إکمال الاکمال : محمد بن محمد بن یوسف سنوسی (متوفی ۸۹۲ھ) کی تالیف ہے سابقہ کتاب کے ساتھ سات جلدوں میں مطبوع ہے۔

شرح صحیح مسلم : علامہ ابوالفرج عیسیٰ بن مسعود زواوی (متوفی ۷۴۴ھ) یہ پانچ جلدوں میں ہے اس میں المعلم، الاکمال، المفہم اور المنہاج کو یکجا کردیا ہے۔

الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج : یہ امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی تالیف ہے۔ اس کی ابتدائی فصلوں میں امام مسلم کے شروط، حدیثی مصطلحات، مشکل کی

---

(۲۱) تاریخ التراث العربی (۱/۲۱۰) (۲۲) تاریخ التراث (۱/۲۱۱)

(۲۳) سیرۃ البخاری ص/ ۳۵۳

والقاب اور اسماء کو ذکر کر دیا ہے، اصل کتاب میں مشکل کلمات اور مشکل اعراب کی وضاحت کر دی ہے، نیز دفع تعارض اور اختلاف روایات پر روشنی ڈالی ہے۔ مبہم اشیاء کی وضاحت اور استنباط مسائل پر توجہ دی ہے یہ کتاب "وشی الدیباج" کے ساتھ مطبوع ہے۔

وشی الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج : علی بن سلیمان دمناتی (متوفی ۱۲۹۸ھ) کی تالیف ہے یہ کتاب سابقہ کتاب کے ساتھ مطبوع ہے نام سے کام ظاہر ہے۔ علامہ مبارکپوری فرماتے ہیں کہ یہ دیباج کی مختصر ہے جو اختصارِ مخل ہے۔ (۲۴)

السراج الوهاج : نواب صدیق حسن خاں (متوفی ۱۳۰۷ھ) یہ کتاب دراصل اس مختصر کی شرح ہے جس کو امام منذری نے صحیح مسلم سے مختصر کیا تھا، کتاب مطبوع ہے۔

فتح الملهم بشرح صحیح مسلم : شبیر احمد دیوبندی (متوفی ۱۳۶۹ھ) کی ناقص تالیف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شرح حنفی طلبہ کو امام نوویؒ کی شرح سے محفوظ کرنے کے لیے تحریر کی گئی تھی۔ مفہوم کی وضاحت کے لیے شرح مسلم اور اسناد وغیرہ کے لیے فتح الباری سے مدد لی گئی ہے مسائل فقھیہ میں مذہب کو غلبہ دلایا گیا ہے۔ (۲۵)

مولفؒ نے صرف کتاب النکاح تک اس کی شرح کی تھی۔ بعد میں اس کی تکمیل آپ کے صاحب زادے محمد تقی عثانی نے کیا ہے۔ فی الحال یہ شرح ۱۲ جلدوں میں مطبوع ہے۔

اردو شرحوں میں علامہ وحید الزماں (متوفی ۱۳۳۸ھ) کی شرح کافی مشہور ہے جس میں ترجمہ کے ساتھ شرح نووی کا خلاصہ بھی ہے۔

البحر المواج : یہ حافظ عبداللہ غازیپوریؒ کی تالیف ہے جس میں مقدمہ مسلم کی مفصل شرح کی گئی ہے، اسی طرح علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے بھی مقدمہ صحیح مسلم کی تفصیلی شرح کی ہے۔ علامہ مبارکپوری کا کہنا ہے کہ اس کے مقدمہ کی چھ شرحیں کتب خانہ محمودیہ مدینہ میں موجود ہیں۔ (۲۶)

---

(۲۴) سیرۃ البخاری (۳۵۴) (۲۵) سیرۃ البخاری ص/۳۵۶ حاشیہ (۲۶) سیرۃ البخاری ص/۳۵۰

اس کی دیگر شرحیں بھی ہیں، علامہ عبدالسلام مبارکپوریؒ نے سیرت بخاری میں صحیح مسلم اور اس کے مختصرات اور مقدمہ کی جملہ اکتیس شرحوں کا ذکر کیا ہے، نیز صیانۃ صحیح مسلم جو علامہ ابن الصلاح کی کتاب ہے اس کے محقق ڈاکٹر موفق بن عبداللہ نے کتاب کی تقدیم میں اڑھتالیس شرحوں کا تذکرہ کیا ہے، اس میں سے زیادہ تر شرحیں مفقود ہیں، صرف چند ہی مطبوع ہیں، کچھ کے قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، جن کی تفصیل فواد سزکین نے تاریخ التراث العربی میں بیان کی ہے۔ (۲۷)

شروح موطاء

موطاء امام مالک کو کتب حدیث میں سبقت و امامت کا شرف حاصل ہے، دوسری صدی ہجری میں جب عالم اسلام میں ابواب پر حدیثوں کے جمع کرنے کا کام شروع ہوا تو اس سنہری کڑی کے ایک روشن ستارہ امام مالکؒ تھے۔

جس دور میں امام ابن جریج (متوفی ۱۵۰ھ) ربیع بن صبیح (متوفی ۱۶۰ھ) سعید بن أبي عروبة (متوفی ۱۵۶ھ) حماد بن سلمة (متوفی ۱۶۷ھ) سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) معمر بن راشد (متوفی ۱۵۳ھ) عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) افق پر چمک رہے تھے اس وقت امام مالک کو امامت کا درجہ حاصل تھا۔ (۲۸)

آپ اپنی اس کتاب پر چالیس سال تک نظر ثانی کرتے رہے جس کی ابتدا تقریباً دس ہزار حدیثوں سے ہوئی تھی بالآخر ہر سال کم کرتے کرتے موجودہ مقدار پر مکمل ہوئی۔

امام مالکؒ نے اس کتاب کو اپنے دور کے ستر فقہائے مدینہ پر پیش کیا جنہوں نے آپ کی موافقت کی اسی بنیاد پر آپ نے اس کتاب کا نام موطاء رکھا خلیفہ ہارون رشید اور خلیفہ ابوجعفر منصور

---

(۲۷) سیرۃ بخاری ص ۱/۳۵۱-۳۵۶، صیانۃ صحیح مسلم ص ۹/۷۱-۷۷، تاریخ التراث العربی (۱/۲۱۰-۲۱۱) تہذیب ابن قیم (۱/۹-۱۰) کتاب مطبوع ہے۔

(۲۸) التمهيد لمافي الموطأمن المعاني والأسانيد (۱/۶۲)

نے اس کتاب کو نظام سلطنت بنانا چاہا لیکن امام مالک نے منع کر دیا۔ (۲۹)

اس کتاب کے مختلف نسخے اور راوی ہیں جن میں ابو محمد یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر مصمودی (متوفی ۲۳۴ھ) کا نسخہ سب سے زیادہ مشہور ہے اور جب موطاء کا نام لیا جاتا ہے تو یہی نسخہ مراد ہوتا ہے، اس کی جو شرحیں علماء اسلام نے کی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں :

شرح ابو مروان عبد الملک بن حبیب مالکی (متوفی ۲۳۹ھ) یہ اس کتاب کی پہلی شرح ہے لیکن اس کی شرحوں میں سب سے زیادہ مشہور اور مفصل شرح :

التمهيد لما في المؤطا من المعاني والأسانيد ہے، جو حافظ مغرب ابو عمرو بن عبد البر یوسف بن عبد اللہ قرطبی (متوفی ۴۶۳ھ) کی شرح ہے، اس شرح کے بارے میں علامہ ابن حزم کا یہ خیال ہے کہ اس کی کوئی نظیر میرے علم میں نہیں۔

یہ شرح بہت عمدہ اور مفصل ہے، شرح میں مذکور حدیثیں بھی مؤلف کی اپنی سند سے مخرج ہیں، لیکن اس شرح سے استفادہ قدرے مشکل ہے کیونکہ اس کی ترتیب مولف نے امام مالک کے اساتذہ کی ترتیب پر رکھا ہے جس طرح کتب معاجم کی ترتیب ہوتی ہے۔ ہر استاذ کی حدیثوں کو یکجا کر کے شرح کیا ہے، اگر یہ شرح کتاب کی ترتیب پر ہوتی تو اس کا افادہ دو چند ہو جاتا، خاص طور سے علمائے مشرق کے لیے اس میں مشروح حدیث تلاش کرنا کافی مشکل ہے، کیونکہ امام مالک کے اساتذہ کے نام کی جو ترتیب آپ نے حروف مُعجم پر دیا ہے وہ مغربی حروف مُعجم کی ترتیب پر ہے جو مشرقی ترتیب سے کافی مختلف ہے، کتاب پہلی بار حکومت مراکش (مغرب) کے زیر اہتمام طبع ہوئی ہے غالباً یہ چھتیس اجزاء پر مشتمل ہے۔ اس کی ۱۶ جلدیں راقم کے پاس موجود ہیں۔

الاستذكار في شرح مذاهب علماء الامصار : یہ بھی حافظ ابن عبد البر کی کاوش کا نتیجہ ہے، التمہید کافی مفصل تھی لہٰذا اس کا خلاصہ آپ نے الاستذکار میں کیا ہے، جو موطاء کی ترتیب پر ہے۔

---

(۲۹) کشف الظنون (۲/۱۹۰۸)، الحطہ ص/ ۱۸۲

المنتقی : یہ ابوالولید سلیمان بن خلف باجی (متوفی ۴۷۴ھ) کی تالیف ہے۔ یہ الاستذکار کا خلاصہ ہے، اس کے علاوہ امام باجی نے "الایماء" اور "الاستیفاء" کے نام بھی اس کی شرح تحریر کی ہے۔

القبس : یہ قاضی ابوبکر محمد بن العربی مغربی (متوفی ۵۴۶ھ) کی تالیف ہے جس کا مکمل نام "القبس فی شرح موطاء مالک بن انس" ہے۔

کشف المغطاء فی شرح الموطاء : یہ امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی تالیف ہے۔

تنویر الحوالک : یہ بھی امام سیوطی کی تالیف ہے جو کتاب مذکور کا خلاصہ ہے۔

شرح الزرقانی : محمد بن عبدالباقی زرقانی مصری۔ (متوفی ۱۰۱۴ھ) کی تصنیف ہے۔

المصفی : امام احمد بن عبدالرحیم شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) کی تالیف ہے جو فارسی زبان میں ہے اس میں صرف احادیث و آثار کی شرح کی ہے امام مالک کے اقوال و بلاغات وغیرہ کو حذف کر دیا ہے۔

المسوی : یہ بھی شاہ صاحب کی تالیف ہے جو عربی زبان میں مختصر شرح ہے۔

ان شرحوں کے علاوہ ابوالولید بن صفار کی شرح "الموعب" ہے نیز محمد بن سلیمان بن خلیفہ، ابوبکر بن سابق الصقلی جن کی شرح کا نام "المسالک" ہے، نیز قاضی ابوعبداللہ بن الحاج اور ابوالولید بن العواد، ابومحمد بن حمید بطلیوسی النحوی کی شرح ہے نحوی کی شرح کا نام "مقتبس" ہے، اسی طرح ابوالقاسم بن حذاء کاتب، ابوالحسن اشبیلی، ابن شراحیل، ابوعمر طلمنکی، عاصم نحوی، یحییٰ بن مزین جن کی کتاب کا نام "المستقصیہ" ہے اور محمد بن ابی زمنین جن کی کتاب کا نام "المعرب" ہے، وغیرہ شرحوں کا ذکر ملتا ہے۔

أوجز المسالک إلی موطا مالک : یہ محمد زکریا کاندھلوی کی شرح ہے۔ (۳۰)
ان تحریروں سے محدثین کرام اور علمائے اسلام کی کاوشوں کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ جو انہوں نے موطاء کی شرح سے متعلق کیا ہے، اور ان شاء اللہ ہر دور میں یہ عمل جاری رہے گا۔

اس کا اردو ترجمہ علامہ وحید الزماںؒ نے دیگر فوائد کے ساتھ کیا ہے جو " مؤطا امام مالک" مترجم کے نام سے مطبوع ہے۔

شروح سنن ابوداؤد

صحیحین کے بعد جن کتابوں کو کافی شہرت ملی ان میں سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ سرفہرست ہیں۔ انہیں کتابوں کو دواوین اسلام اور صحاح ستہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کتابوں کا جو مقام ہے اس کو سمجھتے ہوئے اہل علم نے ان کی بڑی خدمت کی ہے انہیں خدمات میں سے ان کی شرحیں بھی ہیں۔

سنن ابوداؤد چونکہ احادیث احکام پر مشتمل ہے اس لیے اس ناحیہ سے اس میں موجود حدیثوں کی ضرورت امت کے ہر مذہب و مسلک کو پڑتی تھی، لہٰذا اس کی شرح کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جارہی تھی، جس کو اہل علم نے پورا کرنے کی کوشش کی، کتب حدیث میں غالباً سب سے پہلے اسی کی شرح تحریر کی گئی ہے اس کی کچھ شرحیں یہ ہیں :

معالم السنن : یہ امام خطابی ابوسلیمان حمد بن محمد بستیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) کی تالیف ہے جو اس کتاب کی سب سے پہلی شرح ہے، اہل علم نے اس پر بھرپور اعتماد کیا ہے، امام خطابیؒ کی علمی شخصیت کا اس کتاب پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔

تهذيب سنن أبي داؤد وإيضاح مشكلاته : یہ علامہ ابن قیم ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر (متوفی ۷۵۱ھ) کی شرح ہے۔ آپ نے علامہ منذری کی ''مختصر سنن ابوداؤد'' کی تہذیب کی ہے اس میں علل حدیث پر کافی توجہ کی گئی ہے، کتاب میں مشکل کلمات کی تشریح اور

---

(۳۰) کشف الظنون (۲/۱۹۰۷)

اس باب میں صالح احادیث کا اضافہ کیا ہے۔ (۳۱)

السنن بعجالة المعالم : شہاب الدین ابومحمود احمد بن مقدسی (متوفی ۷۶۸ھ) یہ معالم السنن کی مختصر ہے، بعض حضرات نے اس کا نام "عجالة العالم من کتاب المعالم" بتایا ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے۔ (۳۲)

شرح ابن رسلان : یہ احمد بن حسین بن رسلان (متوفی ۸۴۴ھ) کی شرح ہے، جس کی تحقیق جامع الامام محمد بن سعود میں ہو چکی ہے۔

مرقاة الصعود : یہ امام سیوطیؒ (متوفی ۹۱۱ھ) کی تصنیف ہے جو سنن ابوداؤد کی مختصر شرح ہے۔

فی الحال اس کی دو شرحیں مشہور و متداول ہیں۔

عون المعبود : علامہ شمس الحق عظیم آبادی اور آپ کے بھائی کی تالیف ہے، کتاب کے مقدمہ اور خاتمہ سے یہی پتہ چلتا ہے۔ (۳۳)

بذل المجهود فی حل سنن ابی داؤد : یہ علامہ خلیل بن احمد سہارنپوری (متوفی ۱۳۴۶ھ) کی تصنیف ہے جو مطبوع اور مفید ہے۔

تعليق عون المعبود : مولانا عبدالتواب ملتانیؒ (متوفی ۱۳۶۶ھ) کی تالیف ہے۔

التعليق على سنن ابی داؤد : مولانا عبدالجلیل صاحب سامرودیؒ (متوفی) کی تالیف ہے۔

اسی طرح سے تعلیقات محمود الحسن دیوبندی (متوفی ۱۳۳۹ھ)، تعلیقات قاضی حسین بن محمد یمانی (متوفی ۱۳۴۱ھ)، تعلیقات فخر الحسن گنگوہی (متوفی ۱۳۴۶ھ)،

---

(۳۱) تہذیب ابن قیم (۱/۹-۱۰) کتاب مطبوع ہے۔

(۳۲) تقدیم بر سنن ابوداؤد (۱/۸۴) نسخہ دارالدعوۃ دہلی

(۳۳) عون المعبود (۱/۲،۴/۵۵۳)

تعلیقات محمد انور شاہ کشمیری (متوفی ۱۳۵۲ھ)، تعلیقات شبیر احمد عثمانی (متوفی ۱۳۶۹ھ) وغیرہ ہیں۔

اردو تراجم میں شیخ وحید الزماں صاحب (متوفی ۱۳۳۸ھ) کا ترجمہ مع فوائد "الهدی المحمود" کے نام سے ہے جو مطبوع ہے۔

اس سلسلہ کی ایک سنہری کڑی مجلس علمی دار الدعوہ دہلی سے شائع ہونے والا اردو ترجمہ، مع تخریج وتحشیہ اور حدیثوں پر حکم کے ساتھ تین ضخیم جلدوں میں مطبوع ہے یہ انتہائی مفید اور علمی نسخہ ہے۔

رفقاء دار الدعوہ شاہین باغ نئی دہلی جنہوں نے سنن ابوداؤد پر یہ گرانقدر اور قابل تحسین خدمات پیش کی ہیں۔ اس میں تحقیق نص حدیث، ترقیم، تشکیل، تخریج، تصحیح، تضعیف کیساتھ ساتھ، نہایت ہی سلیس اور باوقار ترجمہ کیا ہے، نیز مفید ترین تعلیقات وضروری معلومات سے مزین کیا ہے۔ دیگر کتب ستہ پر اسی طرز کا عمل کرنے کا پروگرام ہے، بعض پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین

اس کتاب کی تقدیم میں شروح ابوداؤد نیز تعلیقات وحواشی ملا کر کل پینتیس کتابوں کا ذکر کیا ہے، اس کی زیادہ تر شرحیں ناتمام ہیں یا پھر مفقود وغیر مطبوع ہیں جس کی تفصیل مقدمہ مذکور میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۳۴)

فی الحال یہ کتاب ایک جامع شرح کی محتاج ہے جو علامہ شمس الحق عظیم آبادی کی نفیس شرح غایۃ المقصود جیسی ہو، سوء قسمت کہ آپ کی یہ شرح مفقود ہوگئی اگر مکمل موجود ہوتی تو امت سے اس کے شرح کی ذمہ داری ختم ہو جاتی، اس کا جو حصہ مطبوع ہے اس سے اس شرح کی جامعیت بخوبی سمجھی جا سکتی ہے۔

---

(۳۴) تقدیم بر سنن ابوداؤد (۱/ ۸۴-۸۷)

شروح سنن ترمذی

امام ترمذی کی ''السنن'' جس کو ''جامع'' ہونے کا بھی شرف حاصل ہے، فن حدیث کی بہت اہم کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں علوم حدیث کی گرانقدر معلومات کے ساتھ ساتھ مفتی بہ مسائل پر احادیث رسول کا ذکر کیا ہے، اس میں اقوال علماء اور فقہیات پر بھی توجہ کی گئی ہے، اس لیے اہل علم نے اس پر کافی توجہ دیا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کی زیادہ تر شرحیں ناقص یا مفقود ہیں، اس کی مشہور شرحوں میں کچھ یہ ہیں :

عارضة الأحوذی فی شرح جامع الترمذی : یہ حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ اشبیلی (متوفی ۵۴۳ھ) کی تالیف ہے جو ابن العربی (نہ کہ ابن عربی) مالکی سے مشہور ہیں، یہ سنن ترمذی کی پہلی مکمل شرح ہے، لیکن اس میں بہت ساری ایسی چیزوں کو ترک کر دیا گیا ہے جن کی شرح کی ضرورت تھی، پھر بھی یہ کتاب اس کی شرح کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، امام سیوطی فرماتے ہیں کہ : ابن العربی کے علاوہ کوئی کامل شرح میرے علم میں نہیں ہے۔

شرح جامع الترمذی : یہ علامہ ابن سید الناس محمد بن محمد یعمری شافعی (متوفی ۷۳۴ھ) کی تالیف ہے، اس میں کافی تفصیل سے شرح کی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ سنن ترمذی کی دو تہائی کتاب ہی کی شرح ہو پائی جو دس جلدوں پر مشتمل تھی، تفصیل کی وجہ سے مؤلف اسکو مکمل نہ کر سکے کیوں کہ فنون حدیث کے علاوہ دیگر فنون کی باتیں بھی اس میں درج کی گئی ہیں۔

شرح العراقی : ابن سید الناس کی شرح کی تکمیل امام زین العابدین عبدالرحیم بن حسین عراقی (متوفی ۸۰۶ھ) نے کی تھی، اس شرح کا کامل نسخہ مدینہ منورہ میں موجود ہے۔

قوت المغتذی : یہ امام عبدالرحمن جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (متوفی ۹۱۱ھ) کی مختصر شرح ہے، جو سنن ترمذی ہندوستانی نسخہ کے حاشیہ پر مطبوع ہے۔

امام سیوطی کے بعد اس کی مختلف شرحیں کی گئیں مثلاً :

شرح الجامع الترمذی : علامہ ابوالطیب محمد بن طیب سندی (متوفی ۱۱۰۹ھ)

شرح الجامع الترمذی : ابوالحسن بن عبدالھادی سندی (متوفی ۱۱۳۹ھ)

نفع قوت المغتذی : یہ سید علی بن سلیمان مغربی (متوفی ۱۲۹۸ھ) کی تالیف ہے جو امام سیوطی کی کتاب کی تلخیص ہے، لیکن زیادہ مفید نہیں۔

اس طرح سنن ترمذی کی شرح کی ضرورت بہر حال محسوس کی جارہی تھی جو اس کی شایان شان ہو کیوں کہ امام سیوطی کے بعد بھی جو بھی شرحیں تحریر کی گئیں ان میں ابن عبدالھادی کے علاوہ کوئی شرح مکمل مطبوع نہیں، یہ بھی بہت زیادہ مفید نہیں تھی۔

تحفة الأحوذی شرح جامع الترمذی

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری (متوفی ۱۳۵۳ھ) اللہ کے فضل و کرم سے سنن ترمذی کی ایسی جامع شرح علامہ مبارکپوری کے بدست مکمل ہوئی جو اس کتاب کے شایان شان تھی، اس کے بعد سنن ترمذی کی کسی اور شرح کی ضرورت باقی نہیں رہی، اس طرح امت کے ذمہ جو قرض تھا آپ کے ہاتھوں مکمل ادا کیا گیا، اس شرح کو اہل عرب و عجم سب نے پسند کیا، یہ کہنا صحیح ہے کہ اس روئے زمین پر سنن ترمذی کی یہ سب سے عظیم اور عزیز شرح ہے، یہ شرح مطبوع و متداول ہے، اس شرح پر ایک گرانقدر مقدمہ ہے جو فتح الباری کے مقدمہ ھدی الساری کے طرز پر ہے، یہ مقدمہ الگ سے بھی مطبوع ہے، جس کا نام مقدمۃ تحفۃ الاحوذی ہے۔

استاذ محترم شیخ عبیداللہ رحمانی شیخ الحدیثؒ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں جن ضروری امور کا لحاظ کیا گیا ہے وہ کسی دوسری شرح میں نہیں مل سکے گی۔ مثلاً :

۱- جامع ترمذی کے ہر راوی کا ترجمہ بقدرِ ضرورت

۲- جامع ترمذی کے تمام حدیثیں کی تخریج یعنی ترمذی کے علاوہ اور کن محدثین کی کتابوں میں یہ روایت ہے۔

۳- "وفی الباب" کے حدیثوں کی تخریج۔

۴۔ تصحیح و تحسین میں جہاں امام ترمذی سے تساہل ہوا ہے اس کی وضاحت اور دیگر ائمۂ کرام کے اقوال کی روشنی میں تمام تصحیحات و تحسینات کی تائید۔

۵۔ اسنادی و متنی اشکالات کی وضاحت۔

۶۔ غلط اور باطل تاویلات جن کو مقلدین نے کیا تھا اس کی تردید۔

۷۔ ہر مذہب کے دلائل اور راجح کا بیان۔

۸۔ مسائل غیر مرجوحہ کے دلائل کا جواب۔ (۳۵)

علامہ عبدالسلام مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "سیرۃ البخاری" میں سنن ترمذی کی سترہ شرحوں کا ذکر کیا ہے۔

مولانا ابوالعاص وحیدی نے اپنے ایک گرانقدر مقالہ میں جو "علوم حدیث" کے مجموعہ میں مطبوع ہے، جس کا عنوان ہے، "جامع الترمذی کی تین شروح" اس میں آپ نے سنن ترمذی کی بائیس شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ (۳۶)

جائزة الأحوذی فی التعلیقات علی سنن الترمذی : یہ ابونصر ثناء اللہ بن عیسیٰ خاں مدنی کی تالیف ہے جو ادارۃ البحوث الاسلامیہ (جامعہ سلفیہ بنارس) سے چار جلدوں میں مطبوع ہے۔

کچھ سنن ترمذی سے متعلق علماء احناف کے افادات بھی ہیں جو باقاعدہ شرح تو نہیں لیکن فائدے سے خالی بھی نہیں ہیں۔ مثلاً :

الکوکب الدراری : افادات رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ) شیخ الحدیث رحمانی فرماتے ہیں کہ ناصر کی تحشیہ نے اس کو کارآمد بنا دیا ہے۔

الورد الشذی : افادات محمود حسن دیوبندی (متوفی ۱۳۳۹ھ)

---

(۳۵) سیرۃ البخاری ص ر ۳۶۴ حاشیہ

(۳۶) تفصیل کے لیے دیکھیے 'سیرۃ البخاری' تالیف عبدالسلام مبارکپوری ص ر ۳۶۰-۳۶۳، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ۱۸۱-۱۹۰، علوم حدیث ص ر ۳۵۴-۳۵۵

العرف الشذی : افادات انورشاہ کشمیری (متوفی ۱۳۵۲ھ) شیخ رحمانی فرماتے ہیں کہ بہتر ہوتا کہ یہ کتاب شائع نہ کی جاتی تاکہ صاحب تقریر کے مشہور قوت حافظہ! تبحر علمی کو ٹھیس نہ لگتی اور بھرم قائم رہتا۔ (۳۷)

الطیب الشذی : افادات اشفاق الرحمٰن کاندھلوی (متوفی ۱۳۷۷ھ)

شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ یہ رشید احمد صاحب کی تقریر سے ماخوذ ہے اور علمی اغلاط کا مجموعہ ہے۔

اردو میں اس کا ترجمہ وشرح شیخ بدیع الزماں لکھنوی (متوفی ۱۳۱۰ھ) کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو "جائزۃ الشعوذی" کے نام سے مطبوع ہے۔

مؤسسۃ دارالدعوۃ نئی دہلی جس کے سربراہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی حفظہ اللہ ہیں، کتب ستہ پر کام کرنے کا ایک جامع پروگرام رکھتے ہیں وہاں سے بھی سنن ترمذی پر اردو زبان میں اس طرز پر کام ہوا ہے جس طرح سنن ابوداؤد پر ہوا ہے، فی الحال یہ کتاب منظر عام پر نہیں آئی ہے، امید ہے کہ جلد ہی قارئین کے ہاتھوں میں آجائے گی، کتاب پاکستان میں طبع ہوئی ہے، اردو داں طبقہ کے لیے یہ کتاب کافی مفید اور نفع بخش ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

شروح نسائی

امام نسائی کی کتاب "السنن" سنن اربعہ کی ایک اہم کڑی ہے، سنن کبریٰ کی تالیف کے بعد جب امام نسائی نے اس کو حاکم رملہ کے پاس پیش کیا تو انہوں نے سوال کیا کہ کیا اس میں سب صحیح حدیثیں ہیں، امام نے جواب دیا کہ نہیں، تو امیر نے یہ کہا کہ اس میں سے صحیح حدیثیں الگ کردیں، چنانچہ آپ نے منتخب حدیثوں کو اس میں یکجا کردیا جس کا نام "المجتبیٰ" رکھا، جو "سنن صغریٰ" کے نام سے مشہور ہے۔ (۳۸)

اس کتاب کی شرح کرنے کی اہل علم نے کوشش ضرور کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب آج تک اپنی جامع شرح کے انتظار میں ہے، اس پر جو کام ہوا ہے عموماً تعلیق یا حاشیہ کی شکل میں ہوا ہے۔

---

(۳۷) سیرۃ البخاری ص ۳۶۵ حاشیہ (۳۸) کشف الظنون (۱۰۰۶/۲)

علامہ محمد منیر دمشقی فرماتے ہیں کہ اس کی شرح وتعلیقات پر علماء نے وہ توجہ نہیں دی جو مطلوب ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب کا انداز بہت کم اور تراجم بالکل واضح ہیں، لہٰذا صحیحین اور سنن ابوداؤد پر زیادہ توجہ دیا۔ (۳۹) اس کی بعض شرحیں یہ ہیں :

الامعان شرح سنن النسائی ابی عبدالرحمن : یہ علامہ ابوالحسن علی بن عبداللہ انصاری اندلسی (متوفی ۵۶۷ھ) کی تالیف ہے "نیل الابتهاج بتطریز الدیباج" میں تحریر ہے کہ یہ اس کتاب کی بامقصد اور مفصل شرح ہے کسی نے اس طرح اس کتاب کی شرح نہیں کی ہے۔ (۴۰)

شرح ابن الملقن : یہ امام ابن الملقن (متوفی ۸۰۴ھ) کی زوائد نسائی پر شرح ہے۔ (۴۱)

اس کتاب کی شروح وحواشی سے متعلق کچھ اور کتابیں جو مندرجہ ذیل ہیں :

الزهر الربی علی المجتبیٰ : یہ امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی تالیف ہے۔

حاشیۃ السندی : ابوالحسن نورالدین بن عبدالہادی (متوفی ۱۱۳۸ھ)

یہ دونوں کتابیں سنن نسائی کے ساتھ حاشیہ پر مطبوع ہیں، اوپر سنن کا متن ہے، درمیان میں امام سیوطی کی شرح اور نیچے حاشیہ سندھی ہے۔

سندھی کا حاشیہ زیادہ واضح ہے۔ (۴۲)

حاشیہ : اس پر ایک حاشیہ شیخ ابوعبدالرحمن پنجابی کا ہے جو تفسیر محمدی کے مؤلف ہیں اس کی تکمیل ابویحییٰ محمد شاہجہاں پوری نے کی ہے۔

---

(۳۹) سنن نسائی (۱/ ۱۳) تقدیم ترجمہ وحیدالزماں صاحب

(۴۰) سنن نسائی مترجم (۱/ ۱۳) تقدیم محمد عطاءاللہ بھوجیانی

(۴۱) کشف الظنون (۲/ ۱۰۰۶) (۴۲) تاریخ التراث (۱/ ۲۶۸)

حاشیہ : ایک لطیف حاشیہ شیخ حسین بن محمد انصاری کا ہے جس کو شیخ محمد عطاء اللہ بھوجیانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں شامل کرلیا ہے۔

تعلیقات السلفیہ : یہ کتاب علامہ محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کی ہے اس میں امام سیوطی، امام سندھی کے حواشی کا احاطہ کیا ہے یہ کتاب مطبوع ہے اور کافی مفید ہے۔

التعلیقات المنتقی علی سنن المجتبیٰ : یہ استاذ محترم شیخ عبدالسلام ابو اسلم مدنی حفظہ اللہ استاذ جامعہ سلفیہ بنارس کی تالیف ہے جو سنن نسائی کی دوسری جلد پر تعلیق ہے، یہ کتاب طلبہ و علماء کے لیے کافی مفید ہے، اگر یہ مکمل ہو جاتی تو بہت بہتر ہوتا۔ شیخ اس وقت درس و تدریس چھوڑ کر کے اس کے لیے لگے ہوئے ہیں۔

اردو زبان میں سنن نسائی کا ترجمہ مختصر تشریح کے ساتھ علامہ وحید الزماں رحمہ اللہ (۱۳۳۸ھ) کی گرانقدر خدمات کا نتیجہ ہے جو مطبوع ہے۔

مؤسسۃ دارالدعوۃ نے بھی اردو زبان میں اس کا ترجمہ، تخریج، تصحیح کا کام کرایا ہے جو ابھی طبع نہیں ہوسکی ہے، امید ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی زیور طبع سے آراستہ ہوگی۔ (۴۳)

ان تمام خدمات متنوعہ کے باوجود یہ کتاب ایک جامع اور مفصل شرح کی محتاج ہے جو کتب ستہ کے اہم سلسلہ سنن نسائی کی شایان شان ہو۔ و ماذلک علی اللہ بعزیز

شروح سنن ابن ماجہ

سنن ابن ماجہ سلسلہ کتب ستہ کی آخری کڑی ہے، اس کے کتب ستہ میں شامل کیے جانے سے پہلے کتب خمسہ کی اصطلاح متعین تھی، اور یہی کتب خمسہ (صحیحین اور سنن ثلاثہ) امہات کتب سمجھے جاتے تھے پھر کتب ستہ کی اصطلاح متعین ہوئی کسی نے سنن دارمی کو کتب ستہ میں شمار کیا، کسی نے موطا مالک کو اس میں شامل کیا، سنن ابن ماجہ کو اس میں سب سے پہلے ابوالفضل ابن طاہر مقدسی (متوفی ۵۰۷ھ) نے شامل کیا، اہل علم نے اس کو قبول کرلیا، اور اسی پر اجماع ہوگیا،

---

(۴۳) مزید معلومات کے لیے دیکھیے کشف الظنون (۱۰۰۶/۲)، تاریخ التراث العربی (۲۶۸/۱) تقدیم علامہ عطاء اللہ بھوجیانی، برترجمہ علامہ وحید الزماں (۱/ ۱۳-۱۴)

علامہ صلاح الدین خلیل کیکلدی (متوفی ۷۶۱ھ) نے سنن دارمی کو اس میں شامل کرنا مناسب سمجھا ہے کیوں کہ اس میں ابن ماجہ کے مقابلہ میں ضعیف روایتیں کم ہیں، سنن ابن ماجہ کو کثرت زوائد کی بناء پر اس میں شامل کیا گیا ہے۔

بحیثیت شروح وتعلیقات اس پر توجہ اگرچہ کم رہی پھر بھی جو کتابیں اس سے متعلق تحریر کی گئی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔

حافظ علاء الدین مغلطائی بن قلیج (متوفی ۷۶۲ھ) نے اس کے ایک قطعہ کی شرح پانچ جلدوں میں کی ہے۔

علامہ ابن ملقن (متوفی ۸۰۴ھ) نے زوائد خمسہ کی شرح "ماتمس إليه الحاجة على سنن ابن ماجه" کے نام سے تحریر کی ہے۔

شیخ کمال الدین محمد بن دوسی دمیری (متوفی ۸۰۸ھ) نے بھی ایک شرح تحریر کی ہے جس کا نام "الديباجه على سنن ابن ماجه" ہے۔

برہان الدین سبط بن عجمی حلبی (متوفی ۸۴۱ھ) نے بھی ایک شرح لکھی ہے۔

علامہ سیوطی کا ایک مختصر حاشیہ "مصباح الزجاجة" ہے۔

علامہ ابوالحسن سندھی (متوفی ۱۱۳۸ھ) اور ابوسعید عبدالغنی مجددی (متوفی ۱۲۹۵ھ) رحمہما اللہ نے بھی اس کی شرح لکھی ہے، مؤخر الذکر کی شرح کا نام "انجاح الحاجة" ہے جو ایک مختصر شرح ہے، اور ہندوستانی نسخہ کے ساتھ سنن کے حاشیہ پر مطبوع ہے۔ (۴۴)

اس کتاب کا اردو ترجمہ علامہ وحید الزماں نے شروع کیا تھا، کتاب الطہارۃ کے باب "باب التوقيت في المسح" تک پہنچے تھے کہ آپ کی وفات ہوگئی اس کا مکمل اردو ترجمہ جناب عبدالحکیم خان اختر شاہجہانپوری نے کیا ہے جو مطبوع ہے۔

اس طرح امہات کتب حدیث کی شروح کا سلسلہ جب سے شروع ہوا کسی نہ کسی شکل میں یہ عمل جاری رہا اور ان شاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا اور حدیث رسول کی خدمت ہوتی رہے گی۔

---

(۴۴) مقدمہ سنن ابن ماجہ مترجم (۱۴/۱-۱۵)، الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ (۲۵۶-۲۵۷)

دیگر شروح حدیث

شرح سنن دارمی :

سنن دارمی کتب حدیث میں شہرت یافتہ کتاب ہے، اس کے مؤلف امام ابومحمد بن عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی (متوفی ۲۵۵ھ) ہیں، یہ اپنے زمانہ کے چار ممتاز محدثین میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کو امام وقت اور سید العلماء کا خطاب بھی ملا ہوا ہے، محمد بن بشار کا فرمان ہے کہ اپنے زمانہ میں دنیا میں چار نادر زمانہ ائمہ محدثین تھے امام بخاری، بخاری میں۔ امام مسلم نیسا پور میں، امام ابوزرعہ ری میں اور امام دارمی سمرقند میں، ان کے شاگردوں میں کتب ستہ کے تین مولفین امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ترمذی کا شمار ہوتا ہے۔ صحیح کے علاوہ دوسری کتابوں میں امام بخاری نے بھی ان کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ آپ کے دور میں جمع احادیث صحیحہ ومقبولہ کا رجحان غالب تھا لہذا سنن دارمی میں اس کا اہتمام کرنا بعید نہیں، اس کتاب کو مسند کے نام سے بھی موصوف کیا جاتا ہے جو متصل کے معنی میں ہے، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں بنیادی طور سے متصل روایتوں کے ذکر کرنے کا مقصد تھا، اب اگر اس میں غیر متصل اور منقطع روایت کا وجود ہے تو وہ ضمناً ہے یا متابعات وشواہد میں ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض علماء اسلام نے اس کو کتب صحاح میں شمار کیا ہے۔ جیسا کہ علامہ مغلطائی نے نقل کیا ہے۔

علامہ مغلطائی، حافظ علائی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ اس کو کتب خمسہ کے بعد کتب ستہ میں شمار کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس کے رجال میں ضعف سنن ابن ماجہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ منکر اور شاذ حدیثیں نادر ہیں۔ اس کی سندیں سنن ابن ماجہ سے عالی ہیں۔

عبداللہ ہاشم یمانی جنہوں نے اس کتاب کی تحقیق اور حدیثوں کی تخریج کی ہے وہ فرماتے

ہیں کہ : اس میں شاذ ونادر ہی منکر، شاذ، مرسل اور موقوف روایتیں ہیں، عموماً اس کی روایتیں صحیح ہیں، آپ نے اس کو سنن نسائی کے مساوی درجہ دیا ہے، جو بقول آپ کے درجہ بندی میں صحیحین کے بعد ہی ہیں، نیز فرمایا ہے کہ سنن ابن ماجہ سے کہیں زیادہ از روے سند وصحت بہتر ہے۔ (۴۵)

عبداللہ ہاشم رحمہ اللہ کے علاوہ محمد عبدالعزیز خالدی، فواز احمد رمزی ہمراہ خالد السبع نے بھی اس کی تحقیق وتخریج کی ہے، حسین سلیم اسد نے بھی اس کی تحقیق کی ہے۔

اس کے کسی قابل ذکر شرح کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ویسے بھی یہ کتاب توجہ کی مستحق ہے خصوصاً جبکہ اس کو کتب ستہ میں شمار کرنے کا استحقاق بھی حاصل ہے، اس کی ایک شرح "فتح المنان" کے نام سے مطبوع ہے جس کی تعداد کے اعتبار سے اس میں جملہ (۳۷۷۵) حدیثیں ہیں۔ (۴۶)

اس کے اردو تراجم بھی ہیں مثلاً مرزا حیرت دہلوی کا ترجمہ لیکن اس کا سب سے بہتر ومفید اور کامیاب ترجمہ رفیق محترم حافظ محمد الیاس عبدالقادر حفظہ اللہ کا ہے جس کو مرکزی جمعیت اہل حدیث نے طبع کیا ہے۔ جو دو ضخیم جلدوں میں ہے جملہ صفحات (۲۴۶۴) اور حدیثوں کی تعداد (۳۵۴۳) ہے اس ترجمہ میں تخریج حدیث کے علاوہ حدیثوں پر حکم لگا دیا گیا ہے، جو انتہائی مشکل عمل ہوتا ہے لیکن مفید ترین نتیجہ اور لب لباب یہی ہے۔ اس کے علاوہ مذکور احادیث کی وضاحت بھی حسب ضرورت مختصر اور جامع انداز میں کر دی ہے جس سے قاری کو بڑا سکون ملتا ہے، اس کے لیے فوائد، وضاحت اور مسائل وغیرہ کا عنوان قائم کیا ہے، یہ حدیث رسول کی بڑی عظیم خدمت ہے اللہ رب العالمین مترجم، طابع وناشر کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

شرح مسند الامام أحمد :

کتب احادیث میں ایک اہم کتاب امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ کی تالیف "المسند"

---

(۴۵) مقدمہ کتاب (۷/۱) (۴۶) تقدیم ڈاکٹر راز ہری برترجمہ محمد الیاس عبدالقادر مدنی

ہے جو چالیس ہزار حدیثوں کا مجموعہ ہے جس کی روایتیں عموماً مقبول ہیں اتنی بڑی کتاب ہونے کے باوجود بھی اہل علم نے اس کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی، بلکہ اس کی روایتوں کو ابواب پر مرتب کیا، اور اس کی شرح بھی تحریر کی، مختصر بھی کیا، غریب کی شرح بھی کی چنانچہ :

مشہور لغوی عالم غلام ثعلب ابوعمر محمد بن عبدالواحد (متوفی ۳۴۵ھ) نے اس کے غریب کلمات کو جمع کیا اور اس کی تشریح کی۔

علامہ ابن ملقن رحمہ اللہ (متوفی ۸۰۴ھ) نے مختصر کیا، امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے اس پر تعلیق تحریر کی جس کا نام "الـــزبـــر جـــد" رکھا، ابوالحسن عبدالہادی سندھی (متوفی ۱۳۳۹ھ) نے اس کی ایک بڑی شرح تحریر کی تھی جو پچاس کاپیوں میں تھی، شیخ زین الدین عمر بن احمد الشماع حلبی نے اس کو مختصر کیا۔ (۴۷)

اس کی ترتیب مختلف حضرات نے کی ہے جس میں علامہ احمد بن عبدالرحمٰن بن محمد البنا ساعاتی کی مختصر بھی ہے جس کو (۱۳۵۱ھ) میں آپ نے مکمل کیا جس کا نام " الفتح الربانی بترتيب المسند الامام أحمد الشيباني " رکھا پھر اس کی شرح وتخریج ایک دوسری کتاب میں کی جس کا نام "بلوغ الأماني من أسرار الفتح الرباني'' رکھا یہ دونوں کتابیں ایک ساتھ مطبوع ہیں۔ (۴۸)

شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ نے اس کے کچھ حصوں کی تحقیق وتخریج کی ہے اور روایتوں پر حکم لگایا ہے جو بیس چھوٹی جلدوں میں مطبوع ہے، لیکن ابھی یہ ایک ثلث بھی نہیں ہے، بعد میں شیخ شعیب أرناؤط نے اس کی تحقیق وتخریج کی ہے جو پچاس جلدوں میں طبع ہو چکی ہے، اس کی طباعت وزارۃ الشئون الاسلامیہ ریاض نے کی ہے

الجوهر النقی :

کتب احکام میں ایک بڑی عظیم کتاب " السـنـن الـكبرى " ہے جو امام ابوبکر احمد بن

---

(۴۷) کشف الظنون (۲/۲۶۵)   (۴۸) الحدیث والمحدثون (۳۷۷)

حسین بن علی بیہقی (متوفی ۴۵۸ھ) کی بڑی گرانقدر تالیف ہے۔ علامہ کتانی فرماتے ہیں کہ "لم یصنف فی الاسلام مثله" یعنی اپنے فن پر اس طرح کی کتاب تصنیف ہی نہیں کی گئی، امام بیہقی نے اس میں یہ التزام کیا ہے کہ کوئی موضوع حدیث تحریر نہیں کریں گے۔ (۴۹) یہ کتاب دس جلدوں میں بڑی سائز میں مطبوع ہے۔

اس کتاب پر علامہ ابن ترکمانی علاء الدین بن علی ماردینی (متوفی ۷۴۵ھ) نے تعلیق چڑھائی ہے جس کا نام "الجوهر النقی فی الرد علی البیهقی" ہے، اس تعلیق میں اگرچہ کتاب میں عمومی طور سے اعتراضات و مناقشات ہیں لیکن بحیثیت تعلیق افادات سے خالی نہیں جیسا کہ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

پھر اس کی تلخیص قاسم بن قطلوبغا (متوفی ۸۷۹ھ) نے کی ہے جس کا نام "ترجیح الجوهر النقی" رکھا ہے۔

التعلیق المغنی علی سنن الدار قطنی :

امام دار قطنی کی علمی شخصیت کسی پر مخفی نہیں علل حدیث میں مہارت تامہ رکھنے والے امام دار قطنی کی سنن ان کے فنی مہارت پر غماز ہے آپ حافظ عصر سے معروف ہیں، نام علی بن عمر دار قطنی ہے (متوفی ۳۸۵ھ) آپ کی کتاب "السنن" مشہور کتاب ہے جس میں آپ نے غرائب سنن کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے طرق، متابع وشواہد کو ممکن حد تک جمع کیا ہے، جمع طرق پر یہ سب سے بڑی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اس کتاب پر علامہ ابوالطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی (متوفی ۱۳۲۹ھ) کی ایک تعلیق ہے جس کا نام "التعلیق المغنی علی سنن الدار قطنی" ہے، یہ کتاب تعلیق سنن دار قطنی کے ساتھ مطبوع ہے۔

---

(۴۹) الرسالة المستطرفة ص ر ۲۶

شرح السنة :

اس سلسلہ کی ایک اہم کتاب "شرح السنة" ہے جو امام بغوی محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود فراء (متوفی ۵۱۶ھ) کی تالیف ہے، "مشکاۃ المصابیح" بھی آپ ہی کی تالیف ہے۔

شرح السنۃ فی نفسہ فن حدیث کی نہایت ہی جامع اور ممتاز کتاب ہے جس میں آپ نے اپنی سندوں سے حدیثوں کو تحریر کرنے کے بعد ضروری تشریح بھی کر دی ہے حدیثوں کی تخریج، راویوں کے نام کی وضاحت کے ساتھ ساتھ لغوی تشریح، غامض مفہوم کی وضاحت نہایت سلیس اور مختصر انداز میں کر دیا ہے۔ محقق کی تعلیقات نے اس میں چار چاند لگا دیا ہے، یہ کتاب زہیر شاویش اور شعیب ارناؤط کی قیمتی علمی تحقیق سے مزین ہو کر ۱۶ جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔

شروح مشکاۃ المصابیح :

ہندوستان میں دو کتابیں انتہائی مقبول ہیں اور مدارس عربیہ میں شامل نصاب ہیں ان میں سے ایک کتاب کا نام "مشکاۃ المصابیح" ہے اور دوسری کا نام "بلوغ المرام" ان کی اہمیت اور ضرورت کی بنیاد پر اہل علم نے اس پر خصوصی توجہ دیا ہے۔

"مشکاۃ المصابیح" دراصل خطیب تبریزی رحمہ اللہ علیہ کی کتاب "المصابیح" پر اضافی وتہذیبی کام ہے جس کو صاحب شرح السنۃ امام بغوی رحمہ اللہ نے انجام دیا ہے اس کی مفصل اور کامل شرح شیخ حسین بن محمد طیبی (متوفی ۷۴۳ھ) نے کی ہے جس کا نام "الکاشف عن حقائق السنن" ہے جو غیر مطبوع ہے، اس کی دوسری شرح ملا علی بن سلطان قاری (متوفی ۱۰۱۴ھ) نے کی ہے جو اس کی مشہور اور متداول شرح ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۵۲ھ) نے بھی اس کی شرح کی ہے جس پر خاص مکتب فکر کی ترجمانی غالب ہے نقد حدیث پر کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ (۵۰)

---

(۵۰) تقدیم مراعاۃ المفاتیح (۸/۱)

اس کی ایک بے مثال شرح ہمارے شیخ ابوالحسن عبیداللہ رحمانی مبارکپوری (متوفی ۱۴۱۴ھ) رحمہ اللہ کی ہے، جس کا نام ''مرعاۃ المفاتیح'' ہے، یہ اس کتاب کی جامع شرح ہے، لیکن افسوس کہ اس کی تکمیل سے قبل ہی شیخ کی رحلت ہوگئی جو حصہ مشروح ہے وہ مطبوع بھی ہے۔ فریوائی اکیڈمی دہلی نے اس کی تکمیل کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ محترم شیخ رفیق احمد سلفی (غالب صاحب) نے اس پر کام شروع کر دیا ہے۔

اردو زبان میں اس کے مختلف تراجم ہیں : مثلاً

أشعة اللمعات ترجمه مشكوة : شاہ عبدالحق دہلوی

مشكاة مترجم : عبدالحکیم خان اختر شاہجہاں پوری

مظاهر حق جديد ترجمه مشكوٰة : قطب الدین دہلوی

أنوار المصابيح ترجمه مشكاة المصابيح : مولانا عبدالسلام صاحب بستوی

طريق النجاة : ڈاکٹر محمد لقمان سلفی

اس میں مشکوۃ کی صحیح حدیثوں کی ترجمانی کی گئی ہے۔

شروح بلوغ المرام

بلوغ المرام جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (متوفی ۸۵۲ھ) کی تالیف ہے، فن احکام کی انتہائی جامع کتاب ہے اس کی مختلف شرحیں لکھی گئی ہیں مثلاً :

البدر التمام : قاضی شریف الدین حسین بن محمد مغربی

سبل السلام : محمد بن اسماعیل امیر صنعانی یہ البدر التمام کی اضافہ کیساتھ تلخیص ہے

مسك الختام شرح بلوغ المرام : نواب صدیق حسن خاں بھوپالی (متوفی ۱۳۰۷ھ) یہ فارسی زبان میں ہے۔

فتح العلام : یہ نواب صاحب کے صاحبزادے نورالحسن بن صدیق حسن (متوفی ۱۳۳۰ھ) کی تالیف ہے جس میں سبل السلام پر اضافہ کے ساتھ اس کی تلخیص ہے۔

بلوغ المرام کو امیر صنعانیؒ نے منظوم کیا ہے، اس کے حدیثوں کی تخریج " الالـــمـــام بتـخـريج أحاديث منظومة بلوغ المرام" کے نام سے علامہ محمد بن محمد بن یحییٰ صنعانی نے کی ہے۔ دونوں کتابیں بیک ساتھ مطبوع ہیں۔

اس کے علاوہ :

حاشية : الشیخ احمد حسن الدہلوی (متوفی ۱۳۳۸ھ)

اتحاف الكرام : شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری (متوفی ۲۰۰۶ھ)

فقه الاسلام : شیخ شیبۃ الحمد وغیرہ اس کی مفید شروح وتعلیقات ہیں۔

اردو زبان میں اس کی ایک جامع شرح شیخ صفی الرحمٰنؒ کے قلم سے منظر عام پر آ چکی ہے جو کافی مفید ہے اس کا ایک ترجمہ عبد التواب صاحب ملتانی کا بھی ہے۔

شروح عمدة الأحكام

عمدۃ الاحکام علامہ عبد الغنی بن عبد الواحد مقدسی (متوفی ۶۰۰ھ) کی تالیف ہے جو متفق علیہ روایتوں کا انتخاب ہے یہ فن احکام کی ایک مختصر کتاب ہے، مختلف علماء نے اس کی شرح کی ہے اس کی مشہور شرحوں میں :

أحـكـام الاحـكـام : ہے جو علامہ تقی الدین ابن دقیق (متوفی ۷۰۲ھ) کی تالیف ہے جو چار اجزاء میں مطبوع ہے، آپ نے اس کی ایک بہت مفصل اور مدلل شرح تحریر کی تھی جس کا نام "الامام " رکھا تھا لیکن وہ مفقود ہوگئی۔

صاحب کشف الظنون فرماتے ہیں کہ اس کی شرح عبد اللہ بن محمد بن احمد تلمسانی (متوفی ۷۸۱ھ) نے کی ہے جس کا نام "تیسیر المرام" ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس میں ابن دقیق، ابن عطار اور فاکہانی کے کلام کو جمع کر دیا ہے۔

علامہ ابن ملقن سراج الدین عمر بن حفص (متوفی ۸۰۴ھ) نے اس کی ایک بڑی عظیم شرح تحریر کی ہے جو ان کی پسندیدہ کتابوں میں سے ہے جس کا نام "الاعلام " رکھا ہے، اس

کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی اس کی شرح کی ہے۔ (۵۱) علامہ ابن ملقن نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے اور اپنی اس شرح کا مختلف کتابوں میں حوالہ دیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے اس کی وسعت اور علمی معلومات کا پتہ چلتا ہے اس کے قلمی نسخہ کا ایک زیراکس خاکسار مدینہ منورہ سے لایا تھا تاکہ اس کی تحقیق کی جا سکے لیکن دوسرا نسخہ دستیاب نہ ہو سکا کتاب طویل بھی ہے نسخہ بھی سقیم ہے اس لیے یہ کام نہ کر سکا۔

عمدہ الاحکام کی مطبوعہ شرحوں میں "تیسیـــر الـعــلام" بھی ہے جو عبداللہ بن عبدالرحمٰن آل بسام کی شرح ہے جو نہایت آسان اور منظم شرح ہے۔

نیل الأوطار :

کتب احکام میں ایک بڑی عظیم کتاب منتقی الأخبار ہے جو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے جدامجد عبدالسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جمع کیا ہے، اس کتاب کی شرح علامہ شوکانی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۵۰ھ) نے کی ہے جس کا نام "نیل الاوطار" ہے یہ شروح حدیث میں بڑی ممتاز شرح سمجھی جاتی ہے جو فتح الباری کے طرز پر ہے بعض علماء اس کا تعارف فتح الباری صغیر سے کرتے ہیں، یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں آٹھ اجزاء پر مشتمل ہے جو مطبوع و متداول ہے۔

شرح الجامع الصغیر :

الجامع الصغیر علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی تالیف ہے جس میں احادیث قولیہ کو اطراف پر جمع کر کے حروف معجم کی ترتیب پر مرتب کر دیا ہے، کتاب کے مصدر اصلی، صحابی رسول اور حدیث کے حکم کی وضاحت کر دی ہے۔

علامہ عبدالرؤف مناوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۳۱ھ) نے اس کتاب کی دو شرحیں تحریر کی ہیں ایک مفصل ہے جس کا نام "فیـض الـقـدیـر شـرح الجامع الصغیر" رکھا ہے اور دوسری متوسط ہے جس کا نام "التیسیر شرح الجامع الصغیر" ہے، یہ دونوں شرحیں مطبوع ہیں۔ (۵۲)

---

(۵۱) دیکھیے کشف الظنون (۲/۱۱۶۵) (۵۲) الرسالۃ المستطرفۃ ۱۴۶

جامع الأصول من أحاديث الرسول :

اس کتاب کو علامہ ابن اثیر جزری (متوفی ۶۰۶ ھ) رحمہ اللہ نے مرتب کیا ہے جس میں کتب ستہ اور موطاء مالک کی روایتوں کو جمع کر کے مختلف ذیلی کتابوں میں تقسیم کر دیا ہے ہر کتاب کو ابواب اور ہر باب کو فصلوں میں تقسیم کیا ہے، کتابوں کو حروف معجم پر مرتب کیا ہے، یہ کتاب شروح حدیث میں نہیں بلکہ الجوامع میں شمار کی جاتی ہے، لیکن چونکہ ہر موضوع سے متعلق روایات کو ذکر کرنے کے بعد مشکل کلمات کی تشریح، دیگر حدیثی معلومات جس کا تعلق مذکور حدیث سے اس طرح واضح کر دیا ہے جس سے حدیث کا معنی ومفہوم واضح ہو جاتا ہے بناء بریں اس کتاب کو یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

ان تمام شروحات حدیثیہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ محدثین اور علمائے امت نے حدیث رسول کی تشریحی خدمات انجام دینے میں جو نمایاں کام کیا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہ تو محض بطور نمونہ ''مشتے از خروارے'' کی ایک جھلک ہے، کتنی شرح اور تعلیقات ایسی ہیں جو نہ تو کتب فہارس میں آسکی ہیں اور نہ منظر عام پر آئی ہیں۔ اہلِ علم نے ان کو تحریر کیا اور پھر ان کا پتہ نہ چل سکا۔ دینی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے اساتذہ اور طلبہ عموماً جس حدیث کی کتابوں کو پڑھتے پڑھاتے ہیں اس کا نوٹس بھی تیار کر لیتے ہیں جو اسی قبیل سے ہے۔

اللہ رب العالمین ان خدام سنت نبوی کے اعمال قبول فرما کر ان کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اردو زبان میں کتب حدیث کی خدمات شروح وتراجم کے لیے ملاحظہ ہو، اہل حدیث کی تصنیفی خدمات، نیز دیکھیے یادگار مجلہ اہل حدیث بمناسبت پاکوڑ کانفرنس مارچ ۲۰۰۴ء۔

پاکستان سے چھپنے والے مجلّہ محدث میں چند سال قبل ایک مقالہ خدمات علوم حدیث طبع ہوا تھا جو بہت جامع اور معلوماتی ہے۔

☆☆☆

کتب ناسخ ومنسوخ

شرح حدیث سے متعلق ایک اہم خدمت جس کو علمائے امت نے حدیث رسول ﷺ کی خدمت کے طور پر انجام دیا ہے، وہ کتب ناسخ ومنسوخ کی تحریر ہے۔ ناسخ ومنسوخ کی معرفت اہل حدیث وفقہ کے لیے انتہائی ضروری ہے، کیونکہ اسی علم کے ذریعہ یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ شریعت کا کون سا حکم ختم کیا جا چکا ہے اور کون سا باقی ہے، پھر ختم شدہ حکم کے بدلے میں کوئی دوسرا حکم وارد ہوا ہے یا نہیں، اس کا علم نہ رکھنے سے انسان کبھی ایسی چیز پر عمل کر سکتا ہے جو شریعت میں مطلوب نہیں اور جو مطلوب ہے اس پر عمل ترک ہو سکتا ہے۔ لہٰذا شرح حدیث میں اس کی بڑی شدید ضرورت پڑتی ہے تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ کون سی حدیث منسوخ ہے اور کون ناسخ ہے کس کا حکم باقی ہے اور کس کا ختم ہو چکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اور دیگر اہل علم نے اس پر کافی توجہ دی ہے، کسی کو محدث کا خطاب دینے کے لیے اہل علم نے ناسخ ومنسوخ کی معرفت اس کے لیے ضروری قرار دیا ہے، ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گذر ایک قاضی کے پاس سے ہوا آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا ناسخ ومنسوخ معلوم ہے؟ قاضی نے جواب دیا کہ نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تب تو تم خود ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کر ڈالو گے۔ (۱)

اسی طرح سے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے، محدث وقت محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ فتویٰ وہی شخص دے سکتا ہے جو ناسخ ومنسوخ کی معرفت رکھتا ہے۔ (۲)

امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ ایسا علم ہے جس کے محتاج علماء وفقہا اور محدثین سب

---

(۱) نواسخ القرآن ابن جوزی ص/ ۱۰۵، الاعتبار ص/ ۶ (۲) الاعتبار ص/ ۶

ہوتے ہیں۔ (۳)

نسخ کا معنی : لغوی اعتبار سے نسخ دو معنوں میں مستعمل ہوتا ہے کسی چیز کو ختم کرنا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا۔ (۴)

شرعاً نسخ کا معنی یہ ہے کہ شارع کسی متقدم حکم کو کسی متاخر حکم سے اٹھا دیں۔ (۵)

یہ مفہوم متاخرین اہل علم کے یہاں ہے، البتہ متقدمین مطلق تبدیلی کو نسخ کہتے تھے، خواہ وہ کسی بھی طرح سے ہو۔ (٦)

نسخ کی معرفت کوئی آسان بھی نہیں، اس کے لیے جملہ احادیث رسول ﷺ پر نظر رکھنی ضروری ہوتی ہے، بغیر معرفت اور بغیر دلیل کے کسی کو ناسخ ومنسوخ کہنا جرم عظیم ہے، یہ شارع کے حکم میں مداخلت کے مترادف ہے، جن لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ خصم کے دلائل کا جب کوئی جواب نہیں دے پاتے تو فوراً نسخ کا دعوی کر بیٹھتے ہیں وہ بہت بڑے جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں، عدم معرفت کی بنیاد پر فتوی دینا یا کسی کے قول کو قبول کر لینا کوئی قابل ستائش فعل نہیں، پھر تعصب وتنگ نظری کی بنیاد پر دلائل کو رد کر دینا علمی خیانت ہے، عالم کو اپنے علم کے دائرہ میں محدود رہنا چاہیے، خاص طور سے ناسخ ومنسوخ کے معاملہ میں جس کی معرفت ہر کس وناکس کے بس کی نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ جیسے غازی علم وفن کو اللہ رب العالمین نے یہ معرفت عطا کی تھی، انہیں اس میں بڑی مہارت حاصل تھی، آپ کی ذات سب سے پہلی شخصیت ہے جس نے اس فن کو جلا بخشی اور اپنی مشہور کتاب ''الرسالۃ'' میں اس کو فنی حیثیت دی، اس کے علمی اصول وضوابط کی بنیاد رکھی، اس فن کی معرفت کے لیے مذکورہ کتاب کا مطالعہ کافی مفید ہوگا۔

نسخ کے وجود کے تعلق سے اہل علم میں اختلاف رائے ضرور ہے لیکن صحیح قول جو مبنی بر دلیل ہے وہ یہ ہے کہ نسخ کا وجود شریعت میں ہے، اس کی دلیل خود رب العالمین کا یہ قول ہے کہ ﴿ مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا﴾ (بقرہ : ۱۰٦)

---

(۳) مقدمہ اصول التوفیق (۴) الصحاح، القاموس (۵) مقدمہ ابن الصلاح ص ر ۲۵۰

(٦)

شرائطِ نسخ :

نسخ کی مختلف شرائط ہوتی ہیں، جب ان شرائط کا ثبوت کسی نص پر ہوگا تب ہی اس کو ناسخ ومنسوخ قرار دیا جاسکتا ہے ورنہ نہیں، وہ شرائط یہ ہیں :

۱- ناسخ خطاب شرعی ہو، حکم شرعی نہ ہو کیونکہ حکم مکلف کے مرنے پر ختم ہوجاتا ہے خطاب شرعی ختم نہیں ہوتا ہے، مکلف کے مرنے پر جو حکم شرعی ختم ہوتا ہے اس کو نسخ نہیں کہا جاتا بلکہ ازالہ حکم کہا جاتا ہے۔ (۷)

۲- منسوخ حکم شرعی ہو عمل نہ ہو، کیونکہ عمل سے عاجز ہونا شرعی تعبد کو ختم کردیتا ہے، مثلاً وضو سے عاجز شخص کا تیمم کرنا، گویا کہ وضو اس سے ختم ہوگیا، اس ازالہ کو نسخ نہیں کہا جاتا کیونکہ تیمم وضو کا بدل ہے لہٰذا حکم کا اٹھا دینا اس پر صادق نہیں آتا۔

۳- منسوخ مخصوص زمانہ کے ساتھ مقید نہ ہو، کیونکہ مقید وقت سے وقت کے خاتمہ پر حکم کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس کو نسخ نہیں کہیں گے۔ بلکہ یہ زوال حکم ہے۔ (۸)

۴- ناسخ کا منسوخ سے متاخر ہونا۔ کیونکہ اگر وہ متاخر نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ متصل ہو تو نسخ نہیں ہوسکتا بلکہ بیان ہوتا ہے۔ (۹)

یہ چار ایسی شرطیں ہیں جو نسخ کے لیے متفق علیہ ہیں جب یہ شرطیں پائی جائیں گی تب ہی نسخ ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔

اس کے علاوہ کچھ اور شرطیں ہیں جو مختلف فیہ ہیں مثلاً :

۵- دونوں حدیثیں قوت میں برابر ہوں یا ناسخ منسوخ سے قوی ہو۔ (۱۰)

۶- منسوخ ایسی چیز ہو جس کا نسخ ہونا صحیح ہو۔ کیونکہ اخبار استفہام وغیرہ میں نسخ نہیں ہوتا۔ (۱۱)

---

(۷) المستصفی للغزالی (۱/۱۲۱) (۸) التمہید (۲/۳۴۰)

(۹) التمہید (۲/۳۴۰)، الاعتبار ص/۹ (۱۰) الاحکام للآمدی (۳/۱۶۴)

(۱۱) ارشاد الفحول ص/۱۸۶

۷- ناسخ فعل کے حکم کو اٹھانے والا ہو نہ کہ فعل کو اٹھانے والا ہو۔ مثلاً نماز میں بیت اللہ کا استقبال کرنے کا حکم پھر اس کو منسوخ کر کے خانہ کعبہ کو قبلہ بنانا، یہ نماز کا نسخ نہیں بلکہ نماز کے ایک حکم استقبال بیت المقدس کا نسخ ہے۔ (۱۲)

۸- ناسخ و منسوخ میں حکم اس طرح متعارض ہو کہ ان پر یکجا عمل کرنا ممکن نہ ہو، اگر دونوں پر عمل ممکن ہے تو ایک دوسرے کے لیے ناسخ نہیں ہوسکتا۔ (۱۳)

نسخ کی قسمیں :

نسخ کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک کو نسخ بدل کہتے ہیں جس میں منسوخ کا کوئی نہ کوئی بدل ہوتا ہے، دوسرے کو نسخ غیر بدل کہا جاتا ہے جس میں منسوخ کی جگہ کوئی دوسرا حکم نہ ہو۔

نسخ کا حکم بندوں کی مصلحت کے اعتبار سے رب العالمین کی مرضی و مہربانی کی بنیاد پر ہوتا ہے، کبھی شریعت کو بتدریج نافذ کرنا مقصد ہوتا ہے، کبھی ان کی دوسری مصلحت کی وجہ سے تبدیلی کردی جاتی ہے۔ کبھی عادت اور عبادت میں فرق کرنے کے لیے ایسا کردیا جاتا ہے، کبھی بندوں کی آزمائش کے لیے ایسا کیا جاتا ہے تاکہ ان میں سے مطیع اور معاند میں فرق سامنے آجائے۔

نسخ کی معرفت :

نسخ معلوم کرنے کے چار اہم ذرائع ہوتے ہیں :

۱- رسول اللہ ﷺ کا بنفس نفیس یہ خبر دینا کہ فلاں ناسخ ہے اور فلاں منسوخ جیسے آپ کا یہ کہنا " کنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها" (۱۴)

۲- کسی صحابی کی خبر صریح سے: کہ فلاں متقدم ہے اور فلاں متاخر جیسے حضرت جابرؓ کا یہ کہنا کہ " كان آخر الأمرين ترک الوضوء مماممسته النار" (۱۵)

---

(۱۲) التمهيد (۲/۳۴۱) (۱۳) نواسخ القرآن ص/ ۹۵

(۱۴) مسلم، جنائز (۹۷۷) (۱۵) ابوداؤد طہارۃ ص/ ۱۹۲

۳- تاریخ سے : یعنی بذریعہ تاریخ یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کا فلاں عمل یا حکم متقدم ہے اور فلاں متاخر ہے جیسے حضرت ثوبان وشداد رضی اللہ عنہما کی روایت " أفطر الحاجم والمحجوم" (۱۶) جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت "احتجم وھو صائم " (۱۷) سے متقدم ہے کیونکہ ابن عباس کی روایت حجۃ الوداع اور حضرت ثوبان کی روایت فتح مکہ کے موقع کی ہے۔ (۱۸)

۴- رسول کے متاخر عمل سے : یعنی اللہ کے رسول نے کسی عمل کا حکم دیا پھر آپ نے بذات خود اس کے خلاف عمل کیا جیسے مالک بن ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو بغیر کوڑا لگائے ہوئے رجم کرنے کی روایت (۱۹) "الثیب بالثیب جلد مأۃ ورجمه بالحجارۃ" (۲۰) کے منسوخ ہونے پر دلیل ہے۔ رسول کے عمل متاخر سے کس امر کے منسوخ ہونے کا مسئلہ علماء کے یہاں مختلف فیہ ہے۔

۵- صحابی کے کہنے سے کہ یہ ناسخ ہے یا یہ منسوخ ہے۔ حالانکہ اکثر علماء نے اس کو نسخ کی معرفت کے لیے قبول نہیں کیا ہے کیونکہ اسباب نسخ میں اختلاف ہے، جب کہ دیگر علماء نے اس کو قبول کیا ہے کیونکہ صحابی رسول بغیر علم کے ایسا نہیں کہہ سکتے۔

۶- اجماع صحابہؓ سے : یعنی تمام صحابہؓ دو حدیثوں میں سے کسی ایک پر عمل نہ کرنے پر اجماع کر لیں۔ اجماع نسخ تو نہیں کر سکتا البتہ نسخ پر دلیل ہوتا ہے۔ یعنی اگر دوسری روایت منسوخ نہ ہوتی تو تمام صحابہ اس کے ترک پر اجماع نہ کرتے۔

نسخ کے ضوابط اصول حدیث اور اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہوتے ہیں۔

نسخ چونکہ کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں میں واقع ہوا ہے لہٰذا ناسخ ومنسوخ کے نام سے کافی کتابیں علماء امت نے تصنیف کی ہیں۔ اس میں سے زیادہ تر کتابیں کتاب اللہ سے متعلق ہیں

---

(۱۶) ابوداؤد بسند صحیح (۲۳۶۷) (۱۷) بخاری (۱۹۳۹) (۱۸) مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۵۱/
(۱۹) بخاری (۶۸۲۰) (۲۰) مسلم (۱۶۹۰)

سنت رسول ﷺ سے متعلق ناسخ ومنسوخ کی کتابیں کم ہیں۔

پھر اس میں دو طرح کی کتابیں ہو سکتی ہیں ایک وہ ہیں جس میں صرف قواعد وضوابط ناسخ ومنسوخ ہوں، دوسری وہ ہیں جس میں ناسخ اور منسوخ حدیثیں مذکور ہوں۔

پہلی قسم میں کوئی خاص کتاب میرے علم میں نہیں ہے۔ البتہ اس کے ضوابط اصول فقہ اور اصول حدیث کے خاص ابواب میں یکجا ہوتے ہیں جن لوگوں نے ناسخ ومنسوخ پر کتابیں تحریر کی ہیں انہوں نے بھی بعض مسائل اپنی کتاب کے مقدمہ میں ذکر کیے ہیں۔

دوسری قسم کی کتابوں میں کچھ کا تذکرہ صاحب "کشف الظنون" نے کیا ہے اس میں سے اکثر وبیشتر کتابوں کے بارے میں معلومات میسر نہ ہو سکی، بہت ممکن ہے کہ اس میں سے اکثر کا وجود بھی نہ ہو، بہر حال ناسخ ومنسوخ احادیث سے متعلق مندرجہ ذیل حضرات نے اپنی خدمات پیش کی ہیں :

احمد بن اسحاق انباری	(متوفی ۳۱۸ھ)
محمد بن بحر اصبہانی	(متوفی ۳۲۲ھ)
ابو جعفر احمد بن محمد بن نحاس	(متوفی ۳۳۸ھ)
ابو محمد قاسم بن اصبغ قرطبی	(متوفی ۳۴۰ھ)
ابو حفص عمر بن شاہین	(متوفی ۳۸۵ھ)
ابو القاسم ھبۃ اللہ بن سلامۃ	(متوفی ۴۱۰ھ)
ابو بکر بن محمد بن موسیٰ حازمی	(متوفی ۵۸۴ھ) (۲۱)

موخر الذکر کتاب اس فن کی سب سے جامع کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کا نام "الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ" ہے جو ۲۵۴ صفحات پر مشتمل اور مطبوع ہے، اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں ناسخ ومنسوخ سے متعلق کچھ اصولی باتیں ہیں پھر ترجیحات کی شکلوں کا ذکر

---

(۲۱) کشف الظنون (۱۹۲۰/۲)، "الحطة فی ذکر الصحاح الستة"

کیا ہے، پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس کی ابتدا کتاب الطہارۃ سے ہے۔

علامہ ابن شاہین کی کتاب کو ابراہیم بن علی (متوفی ۷۴۴ھ) نے جو ابن عبدالحق سے معروف ہیں ایک جلد میں مختصر کیا ہے۔ علامہ ابن الجوزی (متوفی ۵۹۷ھ) نے نواسخ قرآن کے علاوہ نواسخ حدیث پر بھی کتاب تحریر کی ہے ان کی مطبوع کتاب کا نام "أخبار أهل الرسوخ في الناسخ والمنسوخ" ہے اس کتاب کو آپ نے اپنی بڑی کتاب سے مختصر کیا ہے جس کا نام "إعلام العالم بعد رسوخه بحقائق ناسخ الحديث ومنسوخه" اور یہ کہا ہے کہ صرف اکیس حدیثیں ایسی ہیں جن کو منسوخ کہا جاسکتا ہے، بقیہ کے بارے میں نسخ کا دعویٰ صحیح نہیں، انہیں اکیس روایتوں کو اپنی اس مختصر کتاب میں تحریر کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ :

"فمن سمع بخبر يدعى عليه النسخ وليس في الكتاب فليعلم وهاء تلك الدعوى" جس شخص کو کسی حدیث کے منسوخ ہونے کی خبر ملے اور وہ اس کتاب میں موجود نہ ہو تو سمجھ لے کہ اس کا دعویٰ کمزور اور باطل ہے۔

پھر ان احادیث میں بعض کے منسوخ ہونے کی تردید بھی کی ہے، ایسا لگتا ہے کہ بعض اہل علم نے ان روایتوں کو منسوخ کہا تھا اس لیے امام ابن الجوزی نے اس کا ذکر کیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ تیرہ حدیثیں منسوخ ہیں۔ وہ یہ ہیں :

منسوخ حدیثیں :

۱- توضؤا مما مست النار

۲- الماء من الماء

۳- أن النبي ﷺ كان يضع يديه بين ركبتيه إذا ركع

۴- أنه (ابن مسعود) سلّم على النبي ﷺ وهو يصلي فردّ عليه السلام

۵- إذا رأيتم الجنازة فقوموا

۶- من أدركه الصبح وهو جنب فلا صوم له

۷- أفطر الحاجم والمحجوم

۸- صام عاشوراء وأمر بصيامه

۹- الاستمتاع بالنساء

۱۰- أن النبي ﷺ نهى أن يؤكل لحم الأضاحي بعد ثلاث

۱۱- أنه نهى عن الدباء، والمزفت، والنقير

۱۲- لاتكتبوا عنّي شيئا سوى القرآن

۱۳- التعذيب بالنار

علامہ صدر الدین علی بن علاء الدین فرماتے ہیں کہ : امام ابن الجوزی کے قول کی صداقت پر عقل شہادت دیتی ہے، بہت سارے فقہاء عدم علم یا اپنی مذہب کی تائید کے لیے نسخ کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ : جن حدیثوں کے واقعی منسوخ ہونے پر علماء کا اجماع ہے وہ دس حدیثیں بھی نہیں ہیں۔ (۲۲)

حالانکہ ان میں سے بعض حدیثوں میں اہل علم نے جمع کی صورت بھی بتائی ہے۔ مثلاً "الماء من الماء" کو بدخوابی پر محمول کرنا، سلام کے جواب کو اشارے پر محمول کرنا، عدم جواب کو زبان سے جواب پر محمول کرنا، کتابت کی ممانعت کو مخصوص حالات پر محمول کرنا۔

بہر صورت منسوخ حدیثوں کی تعداد زیادہ نہیں۔

☆☆☆

(۲۲) أخبار أهل الرسوخ ص ۲۳ حاشیہ

کتب اختلاف حدیث ومشکل الحدیث

محدثین عظام کی خدمات عظیمہ اور مساعی جلیلہ کا ایک نمونہ کتب اختلاف حدیث اور کتب مشکل الحدیث کی تصنیف ہے۔

اختلاف حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ احادیث رسول جو باہم بظاہر متعارض ہیں ان میں جمع وتطبیق کے ذریعہ مماثلت پیدا کرنے، یا ناسخ ومنسوخ کی معرفت یا ترجیح کے ذریعہ تعارض ظاہری کو ختم کرنے کا امکان موجود ہو، اس علم کو "علم تلفیق الحدیث" بھی کہا جاتا ہے۔ (۱)

مختلف الحدیث : اصطلاح میں مختلف حدیث یا اختلاف حدیث ان مقبول حدیثوں کو کہا جاتا ہے جن میں بظاہر تعارض ہو لیکن تطبیق ممکن ہو۔

تعارض : دو مقبول حدیثوں کا بطور مخالف بظاہر ایک دوسرے کے مدمقابل ہونا۔ (۲)

توفیق : (تطبیق، جمع) ایک متعارض حدیث کا دوسری مخالف حدیث کے موافق کرنا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دو متعارض مقبول روایتوں میں سے ہر ایک کو ایسی چیز پر محمول کر کے جس کا وہ احتمال رکھتی ہیں۔ اتفاق پیدا کر دیا جائے جس سے دونوں حدیثیں ایک ہو جائیں۔

اصول التوفیق :

اگر دونوں حدیثوں میں توفیق کا امکان ناممکن ہو تو پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں کوئی ناسخ ومنسوخ تو نہیں جس کے معلوم کرنے کے مختلف ذرائع ہوتے ہیں، کبھی یہ رسول اللہ ﷺ کے قول ہی میں مذکور رہتا ہے کبھی صحابہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کبھی تاریخ کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے، کبھی اجماع صحابہ اس پر دلالت کرتی ہے، جس کی تفصیل کتب ناسخ ومنسوخ کے

---

(۱) الحطۃ ص/۸۹ (۲) التعریفات ص/۶۹

عنوان میں گذر چکی ہے۔ جس روایت کے حکم کو ختم کیا جاتا ہے اس کو منسوخ اور جس کے ذریعہ ختم کیا جاتا ہے اس کو ناسخ کہتے ہیں۔

اگر توفیق ممکن نہ ہو اور ناسخ ومنسوخ بھی نہ ہو تو تیسرے نمبر پر ترجیح کی کیفیت دیکھی جاتی ہے۔

ترجیح : ترجیح کا مطلب یہ ہے کہ دونوں حدیثوں میں سے کسی ایک حدیث کے ساتھ ایسی چیز ملی ہوئی ہے جو اس کو اس کے مخالف سے طاقتور بنا دیتی ہے۔

ترجیح کے بہت سارے اسباب ہوتے ہیں جن میں سے بعض کا تعلق سند سے اور بعض کا متن سے اور بعض کا کسی امر خارجی سے ہوتا ہے۔

مشکل الحدیث : بعض اہل علم کے یہاں مشکل الحدیث اور مختلف الحدیث میں کوئی فرق نہیں ہے دونوں ایک معنی میں مستعمل ہیں، جبکہ دیگر اہل علم نے دونوں میں فرق کیا ہے۔

مقبول سند سے مروی اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا معنی ومفہوم بظاہر ناممکن یا خلاف عقل یا کسی شرعی قاعدہ سے متعارض ہو۔ (۳)

اس میں تعارض کا پایا جانا ضروری نہیں ہوتا، اگرچہ اس کا امکان پایا جاتا ہے، البتہ مختلف الحدیث میں تعارض کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے، مختلف الحدیث کو اصول وضوابط کے ذریعہ ختم کیا جاتا ہے، جبکہ مشکل الحدیث کو عقلی دلائل، علمی قواعد وغور وفکر سے ختم کیا جاتا ہے۔

مختلف الحدیث میں محدثین عظام کی خدمات دو طرح کی ہیں :

۱- مختلف الحدیث کے اصول وضوابط متعین کرنا۔

۲- مختلف الحدیث پر کتابیں تحریر کرنا۔

جہاں تک اصول وضوابط کا معاملہ ہے تو یہ کتب مصطلح الحدیث میں مذکور ہوتے ہیں ویسے زیادہ تر تفصیلی گفتگو اصول فقہ کی کتابوں میں تعارض ادلہ کے باب میں کی جاتی ہے، اصول

---

(۳) مختلف الحدیث وموقف النقاد منہ ص/ ۳۶

حدیث ایک مستقل علم ہے اور اصول فقہ ایک الگ فن ہے، ہر ایک پر علماء نے بے شمار کتابیں تحریر کی ہیں، اصول حدیث کی کتابیں ایک خاص منہج وفکر کی ہوتی ہیں جن کا اصل مقصد حدیث رسول کی حفاظت ہے، جبکہ اصول فقہ کی کتابیں عموماً مذاہب فقہیہ کے تابع ہوتی ہیں یعنی ہر مذہب والوں نے مسائل کو مستنبط کرنے کے لیے اپنے اپنے اصول بنائے ہیں یہ ان کے رہنما خطوط ہوتے ہیں۔

یہاں پر صرف ان کتابوں کی جانب اشارہ کرنا مقصد ہے جو خاص اس فن میں تحریر کی گئی ہیں۔ جہاں تک کتب ضوابط کا مسئلہ ہے تو اس پر سب سے پہلی تالیف امام شافعی رحمہ اللہ کی ہے جو کتاب "الأم" کے ساتھ "اختلاف حدیث" کے نام سے مطبوع ہے لیکن چونکہ یہ پہلی کتاب ہے اس لیے اس میں اصول وضوابط بہت زیادہ نہیں ہیں بلکہ بنیادی اہم اصول مذکور ہیں، پھر متعارض حدیثوں کا مجموعہ مختلف ابواب پر منقسم ہے جن میں ان اصولوں کی بنیاد پر تطبیق بین المتعارضین کی وضاحت کی گئی ہے۔

اس فن پر کوئی کتاب جو اس کے ضوابط کے جامع ہو میرے علم میں متقدین کے یہاں موجود نہیں حالانکہ یہ ضوابط کتب مصطلح اور کتب اصول فقہ کے ابواب میں مذکور ہیں اور انہیں کی بنیاد پر تطبیقی مثالیں بھی ہیں۔

موجودہ دور میں ڈاکٹر اسامہ عبداللہ خیاط جن کو بعد میں امام حرم مکی ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے اس فن پر ایک کتاب تالیف کی ہے جس کا نام "مختلف الحدیث وموقف النقاد منه" رکھا ہے بعد میں یہی کتاب "مختلف الحدیث بین المحدثین والأصولیین والفقهاء" کے نام سے طبع ہوئی ہے، جس میں اس فن کے جزئی وکلی قواعد کو جمع کیا ہے، راقم نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب ترتیب دی ہے جس کا نام "أصول التوفیق بین الأحادیث المتعارضة " ہے یہ کتاب ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے لئے تحریر کی گئی ہے، لیکن اب تک طبع نہ ہوسکی۔

اردو زبان میں بھی ایک مختصر کتاب جس میں مذکورہ کتاب کا خلاصہ ہے جو طباعت کے

لیے تیار ہے امید ہے کہ جلد ہی یہ کتاب محبانِ سنت نبوی کے ہاتھ میں آجائے گی۔

البتہ مختلف روایتوں کو اکٹھا کر کے ان میں تطبیق کی کیا کیفیت اور شکل بنتی ہے، اس پر ابتدائی کام امام شافعی رحمہ اللہ نے کیا ہے، آپ ہی نے اس فن کی بنیاد رکھی ہے، اس کے بعد علامہ ابن قتیبہ دینوری اور امام طحاوی رحمہما اللہ نے اس کو جلا بخشی لیکن ان حضرات کا مقصد استیعاب کرنا نہیں تھا۔

جن حضرات نے شروح حدیث پر کتابیں تحریر کی ہیں انہوں نے بھی اپنی شرحوں میں متعارض حدیثوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان میں تطبیق کی کیا صورت ہوسکتی ہے اس کی بھی وضاحت فرمائی ہے، جن اصولی کتابوں میں اس کے مباحث ہیں وہاں بھی مثال کے طور پر متعارض حدیثوں کو ذکر کے جس قاعدہ سے توفیق ہوسکتی ہے اس میں ذکر کیا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب میں کل اُنسٹھ حدیثیں ہیں اور علامہ ابن قتیبۃ کی کتاب میں اکیاون اُحادیث ہیں، جبکہ امام طحاوی کی کتاب جو سولہ جلدوں میں مطبوع ہے اس میں کل دوسو ستائیس متعارض حدیثیں ہیں بقیہ مشکل الحدیث وتکرار اسنادو متن سے متعلق ہیں، اگر ان تمام حدیثوں کو اکٹھا کیا جائے تو ان میں کچھ مکررات بھی ہوں گی اس طرح ان کتابوں میں متعارض روایتوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔

لہٰذا خالص متعارض روایتوں کو کتب شروح اور اس فن کی کتابوں سے جمع کرنا، اس میں وجہ تعارض اور تطبیق کی کیفیت کی وضاحت کرنا ایک بہتر عمل ہوگا، کسی خاص موضوع یا کسی خاص کتاب کی روایتوں سے ابتداء کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک تالیف ڈاکٹر سلیمان بن محمد بن علی الدبیخی کی منظر عام پر آچکی ہے جس کا تعلق احادیث عقائد میں تعارض سے ہے، ممکن ہے اور حضرات نے اس موضوع پر کام کیا ہو، لیکن اپنے علم میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر سلیمان صاحب کی کتاب کا نام " أحاديث العقيدة التي يوهم ظاهرها التعارض في الصحيحين" ہے اللہ رب العالمین ان کو جزائے خیر عطا فرمائے یہ بہت مناسب پیش قدمی ہے اہل علم اس نقش قدم پر چل کر

یہ کام مکمل کر سکتے ہیں، خاکسار نے بھی اس سلسلہ میں کچھ کام شروع کیا تھا لیکن کتاب الطھارۃ سے آگے نہ بڑھ سکا اس میں متعارض روایتوں کی تخریج، ان کا حکم، وجہ تعارض، دفع تعارض اور اس سے متعلق علماء کے علمی اقوال کو جمع کیا گیا ہے، لیکن افسوس کہ کثرتِ اعمال کی وجہ سے کافی دنوں سے یہ کام رکا ہوا ہے۔ اللہ رب العالمین اس کے تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مشکل الحدیث سے متعلق بھی کوئی الگ تالیف میرے علم میں نہیں ہے ایک چھوٹی سی کتاب جناب قصیمی صاحب کی ہے، امام ابن قتیبہ کی کتاب میں بھی مشکل الحدیث مذکور ہے جبکہ امام طحاوی رحمہ اللہ کی کتاب کا نام ہی مشکل الحدیث ہے لیکن اس میں متعارض روایتیں بھی ہیں بہر حال جمع احادیث متعارضہ سے متعلق جو چند تالیفات ہیں اگر چہ ان میں مشکل الحدیث بھی ہیں ان کا تذکرہ وتعارف پیش خدمت ہے۔

اختلاف الحدیث

تالیف امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ)

یہ امام شافعی رحمہ اللہ کی نگارشات کا مرقع ہے جس میں ایک علمی مقدمہ ہے جو اس فن کے بنیادی اصولوں کو شامل ہے۔ اس کے بعد متعارض روایتوں میں تطبیق کے قواعد ہیں۔

پہلے باب میں تعارض ازروئے مباح کا ذکر کرتے ہوئے مختلف ابواب کی حدیثوں سے توفیق کی صورت واضح کی ہے۔

باب دوم میں مجمل ومفسر، عام وخاص میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے تعارض کے ہونے پر گفتگو کیا ہے۔

تیسرے باب میں مقبول اور عدم مقبول روایتوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے تعارض ہونے پر گفتگو کی ہے۔

اسلوب تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی ایسے مخاطب سے گفتگو کر رہے ہیں جو ان چیزوں کا منکر ہے اور تعارض کا بہانہ بنا کر حدیث رسول کو رد کرنے کی کوشش کرتا ہے، لہٰذا اسلوب میں قوت،

دلائل میں کثرت، بحث و مباحثہ میں گرمی کی جھلک نظر آتی ہے۔

کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ یہ اس فن کی پہلی کتاب ہے جو ایک امام وقت کے علمی غزارت سے ماخوذ ہے۔

کتاب کا تعلق صرف اختلاف حدیث سے ہے اس میں مشکل الحدیث پر کوئی گفتگو نہیں ہے۔

تاویل مختلف الحدیث

تالیف ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ)

یہ کتاب اس وقت کی پیداوار ہے جب یونانی فلسفہ کا سنت رسول پر یلغار ہو رہا تھا، جو تعارض اور ناقابل فہم بنا کر حدیثوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اپنی عقل کو معیار حق سمجھتے تھے، خصوصاً اس کتاب میں فرقہ زنادقہ کو مخاطب کیا گیا ہے، غالباً اسی وجہ سے اس کا مقدمہ کافی طویل ہو گیا ہے۔ یہ چھیاسی صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں کل ۱۱۳ حدیثیں ہیں جس میں مشکل اور متعارض سب شامل ہیں، اس میں سے کچھ وہ ہیں جو اجماع کے خلاف ہیں، کچھ وہ ہیں جو قیاس کے خلاف ہیں، کچھ ایسی بھی ہیں جو عقل و نظر کے خلاف ہیں، کچھ مشاہدہ کے خلاف ہیں۔

اس میں جملہ متعارض روایتوں کی تعداد اکیاون ہے۔ مشکل حدیثیں پینتالیس ہیں، کتاب اللہ سے مخالف روایتوں کی تعداد سترہ ہے، معترض کے اعتراض کو ذکر کرنے کے بعد پھر اس کا رد کیا ہے جس پر کتاب و سنت، ادب و لغت سے استدلال کیا ہے۔

یہ کتاب اپنے علمی مقدمہ کی وجہ سے ممتاز ہے، ساتھ ہی ساتھ مشکل احادیث کا جواب دینے میں یہ پہلی کتاب ہے، مضبوط اسلوب، کتاب و سنت، لغت و اشعار سے استشہاد پیش کرنے میں بھی اس کتاب کو خصوصی امتیاز حاصل ہے۔

3

مشکل الآثار

امام طحاوی ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامۃ (متوفی ۳۲۱ھ)

یہ کتاب اس سلسلہ کی تیسری اور سب سے اہم کتاب ہے، کتاب کے نام سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں صرف مشکل احادیث کا ذکر ہے حالانکہ ایسا نہیں، اس میں مختلف الحدیث کا بھی تذکرہ ہے۔ خود مولف کے بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں مسائل واحکام کے استنباط کے ساتھ ساتھ مشکل احادیث اور مختلف احادیث کا ذکر اور جن کو یہ حدیثیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں ان کو سمجھانا مقصد ہے۔ کتاب میں احادیث کو اگرچہ ابواب میں تقسیم کیا ہے لیکن اس میں کسی خاص ترتیب کا خیال نہیں ہے مطبوعہ محقق نسخہ کے اعتبار سے جملہ احادیث (۶۱۷۹) ہیں جن میں شواہد، متابعات ومکررات بھی شامل ہیں۔ ان میں سے (۲۴۷) روایتیں مختلف الحدیث ہیں، البتہ مشکل الحدیث، مختلف الحدیث اور استنباط مسائل سے متعلق احادیث سب خلط ملط ہیں۔

اگر ہر موضوع سے متعلق حدیثوں کو الگ الگ کردیا جاتا تو بہت اچھا ہوتا اور بہت مفید عمل ہوتا۔

دیگر کتابیں :

ان تین اہم کتابوں کے علاوہ دیگر تالیفات بھی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں :

مشکل الحدیث : ابوبکر محمد بن حسن بن فورک (متوفی ۴۰۶ھ) یہ کتاب مطبوع ہے۔

مختصر مشکل الآثار : ابوالولید باجی سلیمان بن خلف (متوفی ۴۷۴ھ) یہ امام طحاوی کی کتاب کا اختصار ہے۔

مختصر مشکل الآثار : امام محمد بن احمد بن رشد (متوفی ۵۲۰ھ)

مختصر مشکل الآثار : یوسف بن موسیٰ حنفی (متوفی ۸۰۳ھ) یہ کتاب امام باجی کی کتاب کا اختصار ہے۔

امام سخاوی نے فتح المغیث (۶۶/۴) میں علامہ ابن حزم ظاہری ابو محمد علی بن احمد (متوفی ۴۵۶ھ) کی ایک عظیم تالیف کا ذکر کیا ہے جو بقول ان کے دس ہزار اوراق پر محیط تھی۔

تنبیه الافهام فی مشکل أحادیثه ﷺ : ابو محمد عبدالجلیل بن موسیٰ قصری (متوفی ۶۰۸ھ)

رفع التعارض عما یوهم التناقض فی الکتاب والسنة : نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی مقدسی (متوفی ۷۱۰ھ)

مشکلات الأحادیث النبویة وبیانها : عبداللہ بن علی قصیمی، یہ ایک مختصر جلد میں مطبوع ہے اس میں ان حدیثوں کا تذکرہ ہے جو جدید سائنسی علوم کے اعتبار سے مشکل معلوم ہوتی ہیں، اس کی وضاحت کی ہے۔

ابن فورک اور عبداللہ بن علی قصیمی کی کتاب کے علاوہ دیگر کتابوں کے بارے میں کوئی خاص معلومات میسر نہ ہوسکیں، صرف کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ (۴)

☆☆☆

(۴) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "أصول التوفیق بین الأحادیث المتعارضة" آخری باب

کتب تخریج حدیث

تخریج : لفظ "تخریج" محدثین کے یہاں مختلف دور میں مختلف معنی میں مستعمل ہوا ہے، متقدمین کے یہاں حدیث رسول ﷺ کو اپنی سند سے بیان کرنے اور منظر عام پر لانے کو تخریج کہا جاتا تھا۔ اس معنی کے اعتبار سے تخریج کا عمل اسی وقت سے جاری ہے جس وقت سے روایت حدیث کا کام جاری ہے یعنی دور رسول ﷺ سے۔ یہاں تک کہ سلسلہ اسناد کا خاتمہ ہوگیا اور اس معنی کا استعمال بھی ختم ہوگیا، کچھ حضرات نے اس کے بعد "انتخاب حدیث" کے معنی میں بھی اس کو استعمال کیا ہے۔

متاخرین کے یہاں حدیث کی نسبت ورہنمائی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے اور یہی معنی آج تک مستعمل ہو رہا ہے۔ (۱)

فن تخریج علوم حدیث کا ایک علم ہے جس پر گفتگو اصول حدیث کی کتابوں میں پائی جاتی ہے لیکن ان میں یہ گفتگو بہت کم ہے، مؤخر الذکر معنی کے اعتبار سے اہل علم کو اس کی ضرورت چوتھی صدی تک محسوس نہیں ہوئی، کیونکہ وہ حضرات کتب حدیث کے اس قدر قریب تھے اور حافظہ اتنا مضبوط تھا کہ وہ حدیثوں کے مصادر اور ان کی جگہوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔

تعریف تخریج : مصادر اصلیہ کی جانب حدیث کی نسبت اور اس کی جگہ کی جانب رہنمائی کرنا اور ان پر حکم لگانا۔

مصادر اصلیہ : مصادر اصلیہ متن حدیث کی ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں ان کے مؤلفین نے مشائخ سے سن کر روایتوں کو اپنی سند سے جمع کیا ہے۔ مثلاً صحیحین، سنن اربعہ، مسند احمد

---

(۱) تحفۃ التخریج ص ۱۳-۱۵

وغیرہ، اسی طرح سے وہ کتابیں جو اگرچہ فن حدیث کی نہیں ہیں لیکن ان میں حدیثیں مؤلف کتاب کی اپنی سند کے واسطہ سے منقول ہوتی ہیں، لہٰذا ان کو مصادر اصلیہ کہا جاتا ہے یہ کتب حدیث کی ملحقات ہوتی ہیں، مثلاً فن تفسیر میں تفسیر ابن جریر طبری، فن فقہ میں "الأم" تالیف امام شافعی، فن رجال میں "التاریخ الکبیر" تالیف امام بخاری وغیرہ۔ یعنی مصادر اصلیہ ان کتب حدیث اور ان کے ملحقات کو کہا جاتا ہے جن میں حدیثیں مؤلف کی اپنی سند سے مذکور ہوں۔ (۲)

مصادر اصلیہ تک پہنچنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں جن میں سے بعض بواسطہ متن اور بعض بواسطہ سند ہوتے ہیں، انہیں کو طریقۂ تخریج حدیث کہا جاتا ہے۔

تعریف کتب تخریج : حدیث کی ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں کسی کتاب میں موجود حدیثوں کی نسبت ان کے مصادر اصلیہ کی طرف کر دی جائے اور ان کی جگہ اور حکم بتادیا جائے۔ (۳)

کتب تخریج کا وجود : کتب تخریج کے وجود کا پس منظر یہ ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں جب مختلف علوم اسلامیہ کا ظہور ہوا اور مختلف فنون پر کتابیں تحریر کی جانے لگیں مثلاً تفسیر، فقہ، تاریخ، سیرت، ادب، لغت وغیرہ تو ان کتابوں میں ان کے مؤلفین نے احادیث رسول ﷺ سے استدلال کیا، لیکن محدثین کے طریقے پر حدیث کی جانچ پرکھ کئے بغیر کتابوں میں شامل کرلیا، انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ مستدل حدیث حقیقت میں حدیث رسول ﷺ ہے یا نہیں؟ قابل قبول ہے یا قابل رد؟ صحیح ہے یا ضعیف؟ اور عموماً اسناد سے عاری حدیثیں نقل کرلیں ان کا مرجع و مصدر بھی ذکر نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح کی کتابوں کے ذریعہ ضعیف و موضوع روایتوں کی نشر و اشاعت ہونے لگی، صحیح وضعیف میں تمیز کیے بغیر ان پر عمل ہونے لگا۔ علمائے امت نے اس نقص کو محسوس کیا اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات کا اندازہ لگایا، لہٰذا انہوں نے اس طرح کی کتابوں میں موجود روایتوں کی تخریج کر دی یعنی یہ بتادیا کہ اصلاً یہ روایت کس کتاب کی ہے، اس کی سند کیا ہے، اس کا

---

(۲) رہبر تخریج ص ۲۳-۲۴ (۳) مصدر سابق ص ۳۰

حکم کیا ہے، قابل قبول ہے یا نہیں، اس کے متابع وشواہد ہیں کہ نہیں، اس میں کوئی کمی تو نہیں، جن کتابوں میں یہ کام کیا گیا انہیں کتابوں کو کتب تخریج حدیث کہا جاتا ہے۔

اس طرح کی کتابوں کی ابتداء پانچویں صدی ہجری سے ہوئی جب امام بیہقی رحمہ اللہ (متوفی ۴۵۸ھ) نے "السنن الکبری" وغیرہ میں روایت ذکر کرنے کے بعد صحیحین میں اس کا وجود کہاں ہے، اشارہ فرمایا اور "تخریج أحادیث الأم" کے نام سے ایک کتاب تحریر کی، اسی طرح سے خطیب بغدادی رحمہ اللہ (متوفی ۴۶۳ھ) نے اس فن پر کتاب تحریر کی، آہستہ آہستہ فن تخریج میں کتابوں کی تحریر کا سلسلہ شروع ہوا، دیکھتے دیکھتے کتابوں کا انبار ہوگیا، اس فن کی خدمت کرنے والوں میں امام زیلعی (متوفی ۷۶۲ھ) امام ابن الملقن (متوفی ۸۰۴ھ) حافظ ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ) امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) اور امام زرکشی کا نام نمایاں ہے۔

کتب تخریج کا شمار کرنا کافی مشکل کام ہے کیونکہ دن بدن جدید کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، کتب فہارس اور کتب تخریج کی محقق کتابوں کی تقدیم (مقدمہ) میں ان کتابوں کی فہرست دیکھی جاسکتی ہے، یہاں پر بطور نمونہ چند کتابیں مختلف فنون سے متعلق ذکر کی جارہی ہیں جس سے محدثین کی خدمات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

فن فقہ کی کتابیں مختلف فقہی درسگاہ (مکاتب) ہونے کی وجہ سے زیادہ ہیں، ہر مذہب والے ان پر اعتماد کرتے ہیں اور اپنی مستدل روایت پیش کرتے ہیں اس لیے فن فقہ میں حدیثیں کافی مقدار میں ہوتی ہیں، فن فقہ سے متعلق کچھ مشہور کتابیں یہ ہیں :

مختلف فنون میں کتبِ تخریج :

نصب الراية لأحاديث الهداية : تالیف امام زیلعی (متوفی ۷۶۲ھ)

اس میں فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الهداية" میں مذکور روایتوں کی تخریج کی گئی ہے۔

البدر المنير في تخريج الأحاديث والآثار الواقعة في الشرح الكبير :

تالیف امام سراج الدین عمر بن علی بن الملقن (متوفی ۸۰۴ھ) اس میں فقہ شافعی کی

مشہور کتاب "الشرح الکبیر" میں موجود حدیثوں کی تخریج ہے۔ "الشرح الکبیر" امام غزالی کی کتاب "الوجیز" کی شرح ہے جو فقہ شافعی میں ہے۔

ارواء الغلیل فی تخریج أحادیث منار السبیل : تالیف علامہ محمد ناصر الدین الالبانی (متوفی ۱۴۲۰ھ) منار السبیل فقہ حنبلی میں ایک اہم کتاب ہے جو "دلیل الطالب لنیل المطالب" کی شرح ہے اس شرح میں جن حدیثوں سے استدلال کیا گیا ہے اس کی تخریج محدث عصر علامہ البانی رحمہ اللہ نے کیا ہے اور اس کا نام ارواء الغلیل رکھا ہے۔

تخریج الأحادیث النبویة الواردة فی مدونة الامام مالک : تالیف ڈاکٹر طاہر محمد دردیری "المدونة الکبری" فقہ مالکی کی بہت مشہور کتاب ہے جس کو قاضی سحنون نے جمع کیا ہے، اس میں موجود حدیثوں کی تخریج ڈاکٹر طاہر محمد دردیری نے کی ہے۔

یہ چار اہم فقہی مکتبہ فکر سے متعلق کتابیں ہیں۔

اس کے علاوہ دیگر فنون کی بعض کتابیں یہ ہیں :

تفسیر :

تخریج أحادیث الکشاف : یہ امام زیلعی (متوفی ۷۶۲ھ) کی تالیف ہے اس میں مشہور معتزلی عالم محمد بن احمد زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی مشہور کتاب "الکشاف عن حقائق التنزیل" جو فن تفسیر میں ہے، اس میں وارد حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے۔

تحفة الراوی فی تخریج أحادیث البیضاوی : یہ محمد بن حسن دمشقی (متوفی ۱۱۷۵ھ) کی تالیف ہے جو علامہ عبداللہ بن عمر بیضاوی (متوفی ۶۵۸ھ) کی تالیف "أنوار التنزیل واسرار التاویل فی التفسیر" ہے جو "تفسیر بیضاوی" کے نام سے معروف ہے، اس میں وارد شدہ حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے۔

اصول فقہ :

تخریج احادیث اصول البزدوی: یہ علامہ قاسم بن قطلوبغا (متوفی ۸۷۹ھ) کی تالیف

ہے،جس میں علامہ علی بن محمد بزدوی کی کتاب "کنز الوصول الی معرفة الاصول" جو "اصول بزدوی" کے نام سے مشہور ہے، اس میں جو حدیثیں موجود تھیں ان کی تخریج کی گئی ہے۔

تخریج أحادیث المختصر الکبیر : یہ علامہ ابن الملقن عمر بن علی (متوفی ۸۰۴ھ) کی تالیف ہے، جس میں امام ابن حاجب کی اصول فقہ میں تالیف کردہ تصنیف میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان کی تخریج کی گئی ہے۔

تخریج أحادیث اللمع : یہ عبداللہ بن محمد غماری کی تالیف ہے، جس میں امام ابواسحاق شیرازی (متوفی ۴۷۶ھ) کی فن اصول فقہ کی کتاب "اللمع" میں موجود حدیثوں کی تخریج ہے۔

سیرت نبوی :

تخریج أحادیث الشفاء بحقوق المصطفی : یہ علامہ قاسم بن قطلوبغا (متوفی ۸۷۹ھ) کی تالیف ہے، جس میں آپ نے فن سیرت کے ایک گوشہ "شمائل رسول" سے متعلق قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ) کی مشہور کتاب : "الشفاء بحقوق المصطفی" میں جو حدیثیں وارد ہیں اس کی تخریج ہے۔ اسی طرح :

مرویات غزوة بنی مصطلق : ابراہیم بن محمد قربی

مرویات صلح الحدیبیة : حافظ محمد عبداللہ الحکمی

الذهب المسبوک فی تخریج أحادیث غزوہ تبوک : استاد محترم عبدالقادر حبیب اللہ سندھی رحمہ اللہ کی تالیف ہے۔

فن عقیدہ :

تخریج أحادیث شرح العقائد النسفیة : یہ امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی تالیف ہے، جس میں عقیدہ کی کتاب 'العقائد النسفیة' میں موجود حدیثوں کی تخریج ہے۔

تخریج احادیث شرح الطحاویۃ : یہ علامہ محمد ناصر الدین البانی (متوفی ۱۴۲۰ھ) کی تالیف ہے، جس میں امام طحاوی رحمہ اللہ کی کتاب "العقیدۃ الطحاویۃ" کی شرح جو علامہ ابن ابی العز حنفی نے کی ہے۔ اس میں جو حدیثیں تھیں اس کی تخریج کی ہے۔

لغت :

فلق الأصباح فی تخریج أحادیث الصحاح : از امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) اس میں مشہور لغوی عالم اسماعیل بن حماد جوہری (متوفی ۳۹۳ھ) کی لغت کی مشہور کتاب "الصحاح" میں وارد حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے۔

نحو :

تخریج الأحادیث والآثار التی وردت فی شرح الکافیہ : علامہ عبدالقادر بغدادی (متوفی ۱۰۹۳ھ) اس میں فن نحو کی مشہور کتاب شرح الکافیہ میں جو حدیثیں موجود تھیں ان کی تخریج ہے۔

اس طرح مختلف اسلامی فنون میں جو کتابیں تحریر کی گئی ہیں، جن میں حدیث رسول ﷺ سے اس کتاب کے موضوع سے متعلق روایتوں سے استدلال کیا گیا ہے، جن کی نشر و اشاعت بلا سوچے سمجھے ہو رہی تھی۔ علماء نے تلاش و جستجو کر کے ان حدیثوں کے اصل مصدر کو بتا دیا اور حسب ضرورت ان پر حکم لگا کر آنے والے لوگوں کیلئے یہ مسئلہ آسان کر دیا۔ پھر بھی بہت ساری ایسی کتابیں اب بھی موجود ہیں جن کی خدمت کی ضرورت ہے۔

"کتب تخریج حدیث" کا تعلق "شروح حدیث" سے اس اعتبار سے بہت گہرا ہے کہ جب کوئی بھی محدث کسی حدیث کی کتاب کی شرح کرتا ہے تو اس میں ضمناً یہ بھی ذکر کرتا ہے کہ مؤلف نے جس حدیث کو یہاں ذکر کیا ہے یہ حدیث دیگر کتب حدیث میں اور کہاں کہاں موجود ہے، ان دونوں کے الفاظ میں کہاں کہاں فرق ہے، دوسری کتاب میں روایت بالمعنی بھی ہو سکتی ہے جس سے شرح حدیث میں بھی مدد ملتی ہے، کبھی دوسری روایت میں شان ورود بھی

ہوتا ہے یا ایسا اضافہ ہوتا ہے جس سے کسی مبہم امر کی تعیین ہو جاتی ہے۔ نیز اس سے کثرتِ مسائل اور استنباط میں مدد ملتی ہے۔

کبھی ان کتابوں کی شرحوں میں یہ بتانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ مذکورہ حدیث اور کہاں کہاں پائی جاتی ہے یا اس کا حکم کیا ہے، اس طرح کی تمام چیزوں میں کتب تخریج حدیث سے بہت مدد ملتی ہے بنابریں شروح حدیث کے عنوان کے تحت کتب تخریج کی جانب اشارہ کر دینا ضروری سمجھا گیا۔

ایک چیز کی طرف اور اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تخریج حدیث سے متعلق یہ وہ کتابیں ہیں جن میں عملاً حدیثوں کی تخریج کی جاتی ہے اور انہیں کتابوں کو ''کتب تخریج'' کہا جاتا ہے۔

فن تخریج میں کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو اصول وضوابط پر مبنی ہوتی ہیں یعنی ان میں یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی بھی حدیث کی تخریج کیسے کی جاسکتی ہے، اس کے مصادر اصلیہ تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے، اس پر حکم کیسے لگایا جاسکتا ہے۔

ایسی کتابوں کو کتب ضوابط تخریج حدیث کہہ سکتے ہیں، اس طرح کی کتابیں موجودہ دور کی ایجاد ہیں۔

میرے علم کے مطابق سب سے پہلے اصول وضوابط پر موضوعی کتاب ڈاکٹر محمود طحان رحمہ اللہ نے تحریر کی ہے، جس کا نام "أصول التخريج و دراسة الأسانيد" رکھا ہے دیگر کتابوں میں "كشف اللثام عن اسرار تخريج حديث سيد الأنام" ہے جو ڈاکٹر عبد الموجود مصری کی کتاب ہے، اسی طرح سے "تخريج الحديث النبوي" ہے جو ڈاکٹر عبد الغنی مزہر عتیق کی مختصر سی کتاب ہے۔ اس موضوع پر راقم کی ایک تالیف عربی زبان میں ہے جس کا نام "تحفة التخريج الى طرق التخريج" ہے ایک دوسری کتاب بھی (اردو زبان میں) ہے جس کا نام

"رھبر تخریج حدیث" ہے بعض دیگر حضرات نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔

ان کے علاوہ شروح حدیث میں اور دیگر قسم کی کتابوں سے بھی مدد لی جاتی ہے، مثلاً کتب مراسیل، کتب مبہمات، کتب اسباب ورودِ حدیث، کتب علل حدیث وغیرہ۔ ان میں سے کسی بھی پہلو کو علمائے اسلام ومحدثین عظام نے باقی نہیں چھوڑا ہے بلکہ ہر قسم میں کتابیں تالیف کی ہیں جس سے ان کی دیگر خدمات کے علاوہ تشریحی خدمات کا اندازہ بہت اچھی طرح سے کیا جاتا ہے۔

خاتمہ

اللہ جل جلالہ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے اس کتاب کے جمع وتدوین کی توفیق بخشی اور اس کو اختتام تک پہنچایا۔

اس کتاب کو تحریر کرنے کا مقصد ابناء امت اسلامیہ، طلبہ و طالبات کو ان کاوشوں سے روشناس کرانا ہے جو سنت رسول کی حفاظت کے لیے سلف نے پیش کیا۔

کتاب کے پہلے باب میں سنت رسول کا معنی ومفہوم، مقام اور دینی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے ان عملی خدمات اور حفاظت حدیث کی تدبیروں کا ذکر ہے جو تلاش، تحقیق، حفظ، مذاکرہ، عمل، تبلیغ اور درس وتدریس میں احتیاط کے طور پر کیا گیا۔ پھر تدوین حدیث کے مختلف ادوار کو دورِ رسول سے دورِ اصحاب کتب ستہ تک واضح کیا گیا ہے جس میں صحیحین پر خصوصی گفتگو ہے۔

دوسرے باب میں تحفظ سنت کی علمی خدمات کی جھلک ہے جو اصول حدیث، علم اسناد، علم جرح وتعدیل، علم اسماء رجال، علم معرفت وضعِ حدیث کا تعارف، علامات سند ومتن کا تذکرہ ہے جن سے گھڑی ہوئی روایتوں کی گرفت کی جاتی ہے۔

تیسرے باب میں دفاعی خدمات تحریر کیے گئے ہیں اس میں خصوصی توجہ وضع حدیث کے دفاع پر دی گئی ہے اس میں وضع حدیث کی تاریخ حدیث گھڑنے کے سیاسی، دینی، ذاتی اسباب کے ساتھ ساتھ مختلف عصبیت کے دخل کو واضح کیا گیا ہے۔ کذابین اور موضوعات کی نشان دہی کتب ضعفاء رجال اور ضعفاء حدیث پر گفتگو کی گئی ہے، اس کے بعد فتنہ انکار حدیث کا تذکرہ ہے جس میں انکار سنت کی تاریخ، منکرین کے شبہات ودلائل کا تجزیہ اور ان کے اہم اعتراضات کا جواب ہے۔ نیز خبر واحد کے متعلق مفصل گفتگو ہے۔ منکرینِ خبرِ آحاد کے دلائل اور اس کا جواب، بغیر کسی تفریق کے عقیدہ اور احکام میں یکساں حجت ہونے پر واضح دلائل اور مخالفین کے دلائل کا رد کیا گیا ہے، چلتے چلتے تعارض حدیث کو لے کر جو حضرات تکلیف میں ہی ان کی تکلیف کا علاج بتایا

گیا ہے۔ استشراق نے حدیث رسول پر کیچڑ اچھالنے کی جو کوشش کی ہے اس کی بیخ کنی، نیز مستشرقین کا تعارف اور ان کے مبلغِ علم کا تجزیہ اور بعض مصادر کا تذکرہ ہے جو دفاع سنت سے متعلق ہیں۔

چوتھے باب میں تشریحی خدمات کا تذکرہ ہے جس میں کتب غریبِ حدیث کا بیان اور پھر حدیث کی اہم کتابوں کی شرحوں، تعلیقات اور اردو ترجمہ کی جانب رہنمائی ہے۔ کتب ناسخ و منسوخ، اختلاف حدیث اور کتب تخریج حدیث کا بیان ہے۔

اس کتاب کے یہ اہم عناوین ہیں جو اپنے دامن میں مختلف ذیلی موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہیں، اس کتاب کے مطالعہ سے جو اہم نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں :

(۱) رسول اللہ ﷺ کی سنت کا بڑا عظیم مقام ہے۔ اس کی عظمت کا ثناخواں رب کا قرآن ہے، اس کی رفعت شان اور اعلیٰ مقام پر شاہد رسول کا فرمان ہے، آپ کی سیرت مقدسہ اس کے عظمت کی نشانی ہے، صحابہ کرام اس کے تقدس کے پاسبان تھے۔ محدثین عظام ائمہ دین نے اس کی آبیاری کی، علماء امت اسی کے خوشہ چین ہیں۔ پوری امت اس کی قدرداں اور اس کے فضل اور عالی مقام کا معترف ہے۔ جس نے اس کی عظمت کا اقرار کیا وہ شامل دین ہوا، جس نے اس سے بیزاری اور برأت اختیار کی وہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بسر و چشم اس کا قبول کرنا، برضا و رغبت اس کو تسلیم کرنا ہر صاحب ایمان کی شان ایمانی ہے۔

(۲) دراصل یہی سنت رسول دین اسلام کی روح ہے، یہ اللہ رب العالمین کی جانب سے نازل کردہ تفصیلی نظام اور وحی الٰہی ہے جو جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا گیا ہے۔ آپ کے اقوال اور آپ کے افعال اس وحی کی مرہون منت ہیں۔ یہی دین کا اصل مرجع و ماخذ ہے اور سرچشمہ اسلام ہے، انسانوں کی ہدایت کی کنجی یہی ہے، زندگی گزارنے کا طریقہ اسی میں ہے۔ دین اسلام کا روح پرور معاشرہ اسی سے ماخوذ ہے۔

(۳) یہی سنت رسول قرآن کریم کے معنی مفہوم کا نگہبان ہے، اس کی تشریح و تفسیر کا

پاسبان ہے۔ اس کے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ محض ایک دھوکہ ہے اور قرآن دانی کا تصور خواب وخیال ہے۔

(۴) صحابہ کرام، محدثین عظام، ائمہ دین اور علماء امت نے سنت رسول ﷺ کی حفاظت کے لیے جو قربانیاں پیش کی ہیں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کو داخلی اور خارجی فتنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جو بیش بہا خدمات انجام دیں ہیں وہ بے مثال ولازوال ہیں۔ تلاش وجستجو کی مہم ہو، یا تحقیق وتدقیق کا کارنامہ، حفظ ومذاکرہ کا مرحلہ ہو، یا عمل درآمد اور تبلیغ کی ذمہ داری، کوئی بھی گوشہ ان سے فروگذاشت نہ ہوا، تلاش وجستجو کی انوکھی مثالیں، طالب علم کے نادر واقعات، تحقیق وتدقیق کے بیش بہا کارنامے وغیرہ انھیں قدوسی نفوس کی سیرت وکردار میں ملیں گے۔ ایک ایک حدیث کی تلاش وتحقیق کے لیے ہزاروں میل کا سفر کرنا، انھیں کی یادگار ہے۔ سنتِ رسول ﷺ میں معمولی غلطی کی اصلاح کے لیے صحرا نوردی کرنا، بحر وبر کو عبور کرنا، بیابان کی خاک چھاننا انھیں کے نصیب میں تھا۔ ان سنت کے متوالوں نے سنتِ نبوی کی حفاظت کی خاطر جان ومال کی پرواہ نہ کی۔ اعزا واقربا کی محبت کو بالائے طاق رکھا، نہ اہل وعیال کی فکر نے اس میں خلل ڈالا، نہ غربت وبے سروسامانی رکاوٹ بنی۔ وہ تمام تدبیریں جو انسانی عقلوں میں آسکتی تھیں ان کو احادیث رسول کی حفاظت کے لیے استعمال کیا۔

(۵) تحریر حدیث کا عمل ہو یا تدوین حدیث کی ذمہ داری اس کا بیڑا بھی انھوں نے اٹھایا اور نہایت ہی بہتر طریقے سے بحسن وخوبی اس کو اختتام تک پہنچایا۔ تحریر حدیث کی ابتدا رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے ہوئی، آپ کی اجازت سے تحریر کردہ حدیث کے مجموعہ کا نام صحابی رسول عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ''الصادقۃ'' رکھا جو تحریری دستاویز کا قدیم ترین مجموعہ ہے۔

آہستہ آہستہ یہ تحریر ترقی کے راستوں کو طے کرتے ہوئے صحیفہ، رسالہ، جزء، مجموعہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے خاص خاص مسائل سے متعلق حدیثیں جمع کرنے کا کام شروع ہوا۔

مسائل زکاۃ، مسائل حج، مسائل طلاق وغیرہ تصنیفات منظر عام پر آنے لگیں۔ اس کے جمع وتدوین میں مزید وسعت آئی جس کے نتیجہ میں موطا، مصنف، جامع اور سنن نامی کتابوں کا ظہور ہوا۔ یہاں تک کہ جمع حدیث کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوگیا اور ہر صحابی کی روایتوں کو مسند کا نام دے کر اکٹھا کر دیا گیا، چنانچہ ہر عالم صاحب کتاب نظر آنے لگا اور ہر طرف مسانید ہی مسانید نظر آنے لگیں۔ یہاں تک کہ تدوین حدیث کا سب سے سنہرا دور آ گیا۔ احادیث کو اعلیٰ اور معیاری سندوں کی بنیاد پر تحریر کرنے کا دور آیا۔ چنانچہ صحیح احادیث کا جامع مجموعہ تیار ہوا۔ قابل قبول اور قابل عمل روایتوں کا انتخاب عمل میں آیا۔ اصطلاحی معنی میں کتب صحاح اور کتب سنن نہایت ہی پسندیدہ اور مربوط شکل میں ابواب وکتب پر مرتب ہوکر کے عمل کے لیے آسان تر شکل میں آ گئے۔ تیسری صدی کے خاتمہ کے ساتھ تدوین حدیث کا یہ سلسلہ ذھبیہ تقریباً مکمل ہوگیا اور حدیث رسول صحیح، حسن، اور قابل قبول سندوں کے ذریعہ قیامت تک کے لیے محفوظ ہوگئی۔

(۶) ساتھ ساتھ دیگر خوبیاں بھی شامل حال رہیں۔ دقیق تر علمی اصول وضوابط، رجال حدیث کی معرفت کے پیمانے، سند ومتن کے پرکھنے کے لیے کلی قاعدے اور جزئی طریقے تیار کیے گئے۔ جس کا وہم وگمان بھی سابقہ امتوں کے دل ودماغ میں نہ آیا تھا۔ یہ خوبیاں انھیں سعادت مندوں کے حصے میں آئیں جس کی مثال پیش کرنے سے پوری دنیا قاصر اور عاجز ہے۔ ان کے بنائے ہوئے علمی اصول انتہائی معتدل، عقل وخرد کے تقاضوں کو پورا کرنے والے اور دل ودماغ کو جلا بخشنے والے ہیں۔

ان ضوابط اور اصولوں کی ایجاد اس جماعت کا عظیم کارنامہ ہے۔ اصول حدیث کی معرفت اس کے اسرار ورموز اور مصطلحات سے واقفیت، علم جرح وتعدیل اور اس کے پیچ وخم کا ادراک، اسناد کی نازک گتھیاں اور علتوں کی پہچان، اسماء رجال کی بھول بھلیاں، راویان حدیث کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، ان کے ناموں کی پہچان، ایک ہی نام ونسب کے ہزاروں افراد کی تعیین ان کی کنیت، ان کے القاب، ان کے حسب ونسب کا علم، اچھے اور برے کی تمیز انھیں قدوسی نفوس کی

جانفشانی اور انھیں کے کدوکاوش کی نشانی اور نتیجہ ہیں۔

اگر ان مایہ ناز ہستیوں کی یہ کاوشیں نہ ہوتیں تو سنت رسول کی عطر بیزی سے اسلامی معاشرہ معطر نہ ہوتا۔ یہ دین جسد بے جان کی طرح بے وقعت رہتا۔ ظلمت وضلالت کا ہر جگہ دور دورہ ہوتا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(۷) یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے امت کو حدیث گھڑنے والوں کا پتہ دیا۔ اس کار شر میں کس جماعت اور کن افراد کا رول اور کتنا حصہ رہا، اس کو اجاگر کیا۔ کون سی جماعت سرخیل تھی اور کون سے افراد نامور تھے۔ کس نے اپنے لیے کون سا موضوع پسند کیا مع حسب ونسب ان کی نشان دہی کی۔ روافض ہوں یا زنادقہ، سیاست داں ہوں یا عوام، زاہدان قوم ہوں یا خانقاہی صوفیا، مبتدعین ہوں یا موئدین مذہب، دین دار ہوں یا دنیا دار، شہرت طلب خطبہ ہوں یا گداگر، تعصب پسند ہوں یا فریب خوردہ کسی کو نہ چھوڑا۔

نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا　　　کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا

حدیثیں گھڑنے والوں کو گھڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اس کے اسباب وعلل کیا تھے۔ سند کی خامیاں ہوں یا متن کی کمزوریاں دونوں طریقوں سے کذب بیانی کی گرفت کی اور اس کے اصول وضوابط بتائے۔ گھڑی ہوئی حدیثوں پر چھاپہ مارا اور اس کو منظر عام پر لا کھڑا کیا۔ ان حدیثوں کی فہرست تیار کر کے تحریری شکل میں امت کے ہاتھ میں تھما دیا کہ کہیں ان من گھڑت روایتوں سے دھوکہ نہ کھا جائیں۔ کتب موضوعات، کتب ضعفائے حدیث، کتب ضعفاء رجال انھیں کاوشوں کا نمونہ ہیں۔

(۸) جب اعدا اسلام نے یہ ہرزہ سرائی شروع کی کہ احادیث رسول قابل اعتنا نہیں اس کی تحقیق میں خلل اور اس کی حفاظت میں نقص ہے تب انھوں نے حفاظت کے طور طریقوں کو پھر سے واضح فرمایا۔

انکار سنت کا مزاج کیسے بنا؟ منکرین سنت کے شبہات وخدشات کیا کیا ہیں، عقلی ونقلی

دلائل کی روشنی میں ان کی تردید فرمائی اور ثابت کر دیا کہ سنتِ رسول ﷺ آج بھی سرچشمہ حیات ہے جو تشنہ لبوں کو سیراب کرنے کی وہی صلاحیت رکھتی ہے جو دورِ رسول اور دورِ صحابہ میں رکھتی تھی، بس پینے کا قرینہ چاہیے۔

کون کہتا ہے کہ وہ ساغر و مینا نہ رہا
ساغر و مینا تو رہا پینے کا قرینہ نہ رہا (مولانا ذاکر ندویؒ بسکوہری)

(۹) جن حضرات نے خبر احاد کے انکار کا شوشہ نکالا، یا عقیدہ و احکام میں باعتبار حجت تفریق کیا ان کی وجہت نظر میں جو کمی تھی اس کو واضح فرمایا، دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے انکارِ خبرِ واحد کی کمزوری کو اجاگر کیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ اجماع صحابہ کی خلاف ورزی ہے کیوں کہ پہلی صدی گزرنے کے بعد یہ مزاج امت میں پیدا کیا گیا جو دراصل تمام احادیث نبوی کے انکار کا زینہ ہے۔ لہٰذا ایسا مزاج رکھنا فاسد مزاج ہے بلا کسی تفریق کے مقبول احادیث رسول پر عمل کرنا واجب اور ضروری ہے۔

منکرین خبر آحاد کی تردید کرتے ہوئے یہ بتا دیا کہ خبر واحدی ہی دراصل شریعت کی بنیاد ہے۔ کوئی بھی خبر واحد اپنے اندر جو حکم رکھتا ہے وہ عقیدہ سے خالی نہیں۔ ایک شخص نماز ادا کرتا تو اس میں وجود باری تعالیٰ، عقیدہ توحید، آخرت پر ایمان لانا خود بخود شامل ہوتا ہے۔ خبر متواتر کی اصل بنیاد خبر واحد ہی پر ہوتی ہے، جب ایک محدیث حدیث کی سندوں کو جمع کر کے اس کے متواتر ہونے کی خبر دیتا ہے۔ تب ہی تواتر کا پتہ چلتا ہے۔ اس محدث کا خبر دینا فی نفسہ خبر آحاد ہے۔ لہٰذا اس کا انکار یا عقیدہ و احکام میں باعتبار استدلال فرق کرنا غیر منطقی بات ہے۔ یہ محض غیر مقبول ذہنی تصورات ہیں۔ خبر واحد کے انکار سے دنیا کا پورا نظام غیر یقینی بن جاتا ہے۔ لہٰذا جو بھی خبر قابل اعتبار مخبر کے ذریعہ سے مروی ہو تو وہ قابل علم و عمل ہوتی ہے اور علم یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ درجات میں فرق ضرور ہو سکتا ہے۔

(۱۰) بہت سارے حضرات نے حدیث رسول کو اس بنیاد پر شک کے دائرہ میں کر دیا

ہے۔ کیونکہ اس میں ان کے خیال میں متضاد باتیں ہیں۔ لہذا اس کا نتیجہ اس سے اعراض اور دوری اختیار کرنا ہوا۔ کیونکہ رسول کی باتیں متضاد نہیں ہوسکتیں اور متعارض حدیثیں مشکوک ہوگئیں تو ہر ایک کا یہی حکم بنا۔

ان حضرات کی اس خام خیالی اور شیطانی وسوسہ کو بہت اچھی طرح ان علماء امت نے واضح فرمایا اور یہ بتایا گیا کہ حدیث رسول میں تضاد و تعارض موجود ہی نہیں، جو تعارض بظاہر نظر آتا ہے وہ تعارض حقیقی نہیں محض قاری کی نگاہ میں وہ متعارض ہے جس کے بہت سارے اسباب ہوتے ہیں اگر کسی کو اس طرح کا شبہ ہو جائے تو اس کے لیے جمع و توفیق کا راستہ اور ضابطہ دیا۔ نسخ کی معرفت کے ذریعہ اس کو حل کرنے کا سلیقہ دیا۔ ترجیح کی مختلف صورتیں ہوتی ان کے ذریعہ سے اس ظاہری تعارض کو حل کرنے کا طریقہ بتایا۔

تعارض سمجھنا محض انسانی علم کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تعارض نہ تو کتاب اللہ میں ہے اور نہ سنت رسول میں، دفع تعارض کے اصول وضوابط کے نمونے امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب اختلاف الحدیث میں، امام ابن قتیبہ کی کتاب تاویل مختلف الحدیث میں، امام طحاوی کی کتاب مشکل الأحادیث میں نیز کتب اصول حدیث اور اصول فقہ میں موجود ہیں۔ فنی طور پر ان اصولوں کو خصوصی تالیفات میں جمع کر دیا گیا ہے۔

(۱۱) موجودہ دور میں جب مستشرقین نے مسلمانوں کے فکر پر یلغار کرنا چاہا، ان کو اپنے رسول کی سنت اور سیرت سے دور رکھنے کی ہر طرح کی تدبیریں کیں، سابقہ شکوک وشبہات کی کالا بازاری شروع کی، جدید اسلوب اور نئے قالب میں اس کو اپنی فکر کی پیداوار بتا کر امت مسلمہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت بھی خدام سنت نبوی کا یہ دستہ سینہ سپر ہو گیا۔ ان کی سراغ رسانی کی، ان کے کالا بازاری اور سیاہ کرتوتوں کو طشت از بام کیا۔ ان کے گھٹیا سامان کو اسلامی معاشرے میں چلنے نہ دیا، البتہ خالص دینی علوم سے دور رہنے والے کچھ افراد اس سے دھوکہ میں ضرور آ گئے۔

علمائے امت نے ان کے تمام سازشی ٹولوں کا پتہ لگایا۔ ان کی تخریب کاریوں پر ضرب کاری لگائی گئی۔ ان کے وجود، ان کی تاریخ، ان کے مقاصد کو واضح کیا۔ ان کی علمی خیانتوں کی گرفت کی۔ باطل تاویلوں کو پاش پاش کر دیا۔ ناقابل اعتبار افسانوی کتابوں سے استدلال اور قابل قبول دلائل سے اعراض کا بھانڈہ پھوڑ دیا۔ نصوص شرعیہ کو توڑ مروڑ کر سیاق وسباق سے الگ کر کے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کے غیر علمی غیر اخلاقی کوششوں کو منظر عام پر لے آئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان کی تحقیق میں وہ کشش باقی نہ رہی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔

(۱۲) محدثین عظام اور علمائے امت نے جب یہ ضرورت محسوس کی کہ حدیث رسول میں موجود بعض کلمات کچھ لوگوں کے لیے ندرت اور غرابت کا باعث بن رہے ہیں اس کے معنی ومفہوم کے سمجھنے میں دقت آرہی ہے تو انھوں نے اس کی وضاحت کی اور اس کو آسان الفاظ میں ادا کیا۔ موقع ومحل پر کیا معنی ہے، دیگر کن کن معنوں میں وہ کلمہ مستعمل ہے۔ بڑی اچھی طرح سے واضح کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ''کتب غریب حدیث'' کا انبار لگ گیا۔

آگے چل کر جب جملہ حدیثوں کے معنی ومفہوم سمجھنے کی ضرورت پڑی، حدیث سے مستنبط مسائل کی حاجت ہوئی تو ''کتب شروح حدیث'' کا ذخیرہ تیار کر دیا۔ ایک ایک کتاب کی کئی کئی شرحیں، تعلیقات حواشی تحریر ہو گئے۔ مختصر کی ضرورت ہے وہ بھی حاضر، مطول اور مبسوط کی ضرورت ہے وہ بھی موجود متوسط سے دلچسپی ہے وہ بھی میسر، غرضیکہ سنت رسول کی خدمت اس کی حفاظت اور وضاحت کے سلسلہ میں کتب خانے تیار ہو گئے۔

جس حدیث کا معنی ومفہوم خلاف عقل یا خلاف نقل نظر آرہا تھا اس کی بھی وضاحت کتب شروح حدیث میں کر دی گئی۔ متعارض میں توفیق، ناسخ ومنسوخ کی معرفت وغیرہ بہم پہنچائی گئی۔ اس سلسلہ میں مخصوص کتابیں بھی تحریر کی گئیں۔

(۱۳) اس کتاب کے مطالعہ سے یہ تمام نتائج آپ کے سامنے روز روشن کی طرح واضح ہو جائیں گے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں آپ کو ان شاء اللہ کوئی دشواری نہ ہوگی کہ صحابہ کرام سے لے کر

آج تک علمائے امت نے دین مبین وسنت رسول کی حفاظت کے لیے جو کوششیں کی ہیں تاریخ عالم میں اس کی کوئی مثال نہیں۔ ان کی کوششوں اور خدمات کو دیکھ کر انسان ششدر ہو جاتا ہے کہ آخر یہ سب کیسے ممکن ہوا! حقیقت یہ ہے کہ ان کی خدمات جلیلہ امت مسلمہ پر عظیم احسان ہیں، یہ اسلامی تاریخ کا وہ روشن باب ہے جو قیامت تک یوں ہی جگمگا تا رہے گا۔

یقیناً یہ سب کچھ ہوا اور جو بھی ہوا وہ درحقیقت اُس غیبی مدد کی بنا پر ہوا جس کا وعدہ اللہ نے کیا تھا کہ ''ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی محافظ ہیں۔'' چنانچہ اس نے ایسے قدوسی نفوس کا وجود بخشا جو اپنے رسول کی سنت اور آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت کے لیے وہ سب کچھ کر کے دکھا دیا جو سابقہ قوموں اور امتوں کے وہم وگمان میں بھی نہ آیا تھا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت اور ناقابل فراموش امر واقعی ہے۔

اللہ رب العالمین سے دعا ہے کہ وہ اپنے ان مخصوص بندوں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے اور ﴿مع الذين أنعم الله عليهم﴾ (النساء : ٦٩) میں شامل فرمائے اور اس کتاب کے مؤلف کو بھی ان کی رفاقت عطا فرمائے نیز اس کتاب کو امتِ مسلمہ کے لیے مفید بنائے۔ آمین

والحمدلله رب العالمين وصلى الله على محمد وعلى آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين.

والسلام

ڈاکٹر اقبال احمد بسکوہری

۲۹ / ۰۴ / ۱۲